URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات Green Box والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

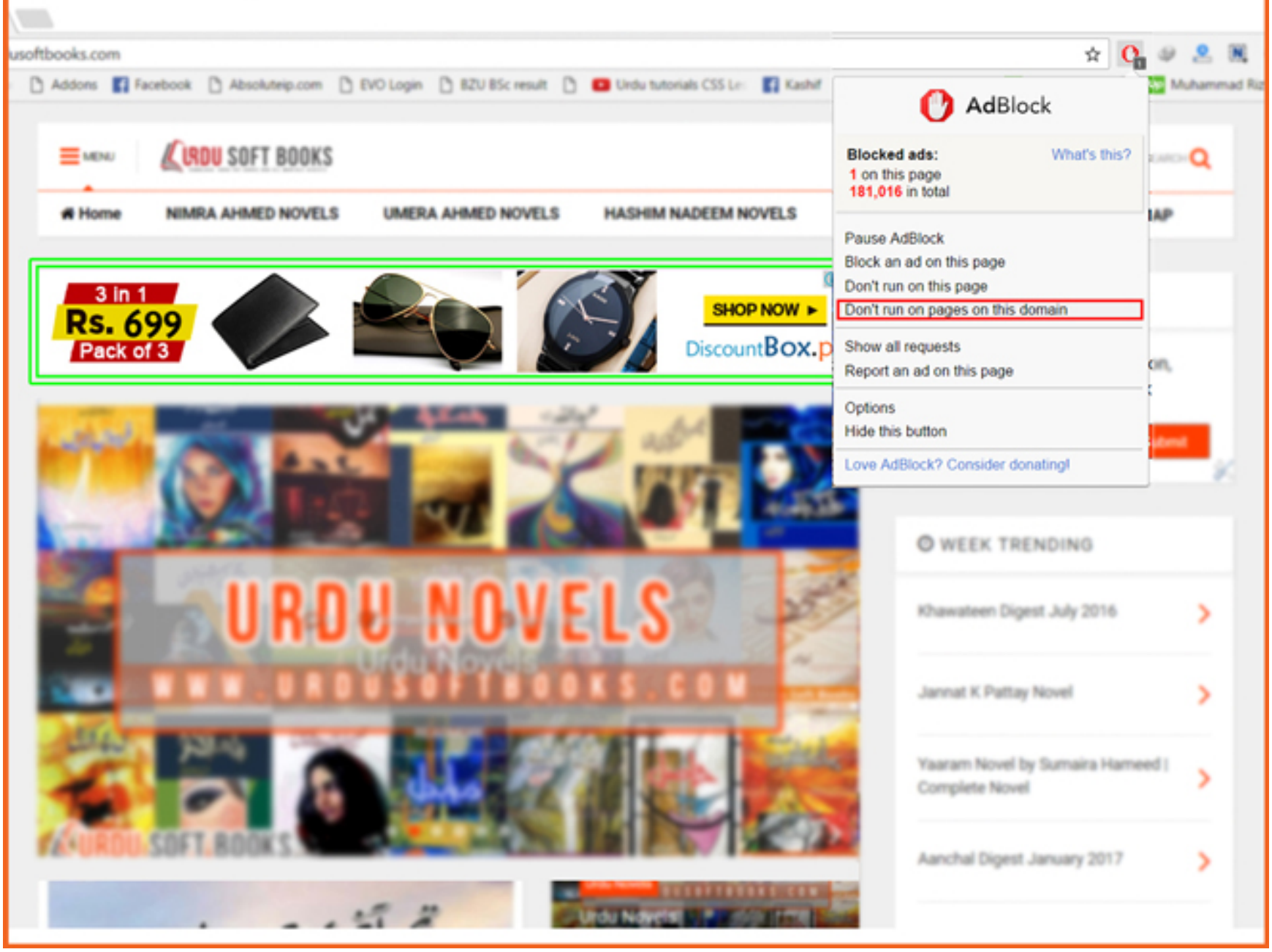

سرگزشت 07
شاعرِ شاہی
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

گفت و شنید 08
شہر خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت 16
نوائے خلیل
ڈاکٹر ساجد امجد
اس ادیب کا احوالِ زیست
جو قسمت بنانے نکلا تھا

خراجِ تحسین 43
آپا جی
زین مہدی
اردو ادب میں ہلچل
مچا دینے والی ناول نگار کا تذکرہ

تحریر خاص 71
جون کی شخصیات
صائمہ اقبال
اس ماہ سے جڑی اہم
شخصیات کا ذکرِ خاص

حادثات 80
موت کے روبرو
شکیل ادریس
موت بالکل سامنے
آ کھڑی ہوئی تھی

معلومات 85
نایاب پرندے
سعید احمد سلطان
ان پرندوں کا تذکرہ
جو معدوم ہو رہے ہیں

فلم نگری 101
بابائے سندھی فلم
انور فرہاد
پاکستانی فلمی دنیا کے
ایک اہم ہدایت کار کی کتھا

ذکر خاص 119
سدا بہار صداکار
شکور پٹھان
وہ پاکستان ٹیلی ویژن کی
دنیا کا ایک مشہور نام تھا

مناظر پاکستان 125
فن پارے
مختار آزاد
دور دراز خطے میں بکھرے
آرٹ کا تذکرہ

سفر کہانی 127
شمشال سے ٹورنٹو
ندیم اقبال
جہاں بانی کا شہکار ایک
الگ انداز کی داستان

تحقیق 151
کتب خانے
ایاز راہی
معلومات کے شائقین
کے لیے تحفۂ خاص

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

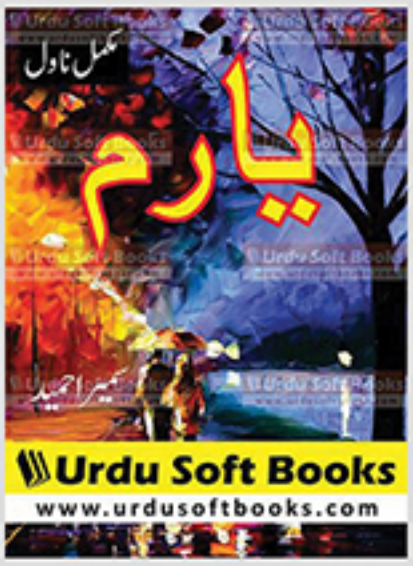

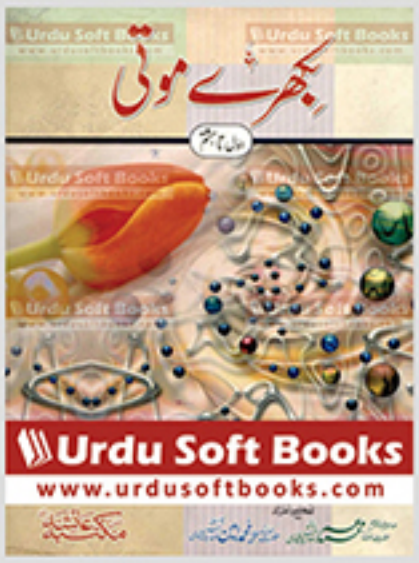

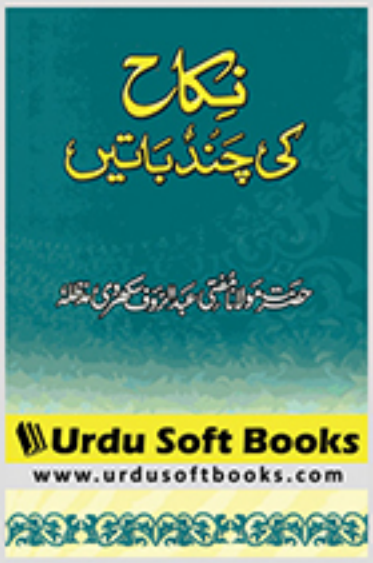

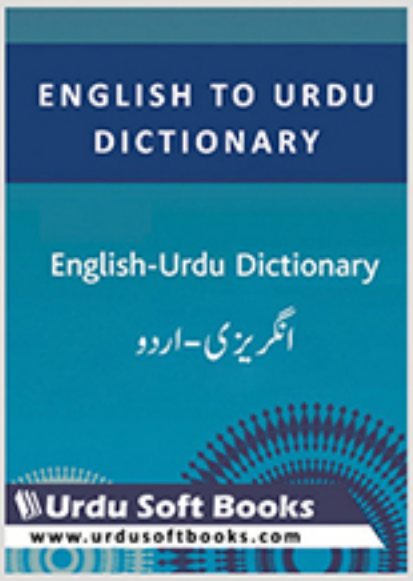

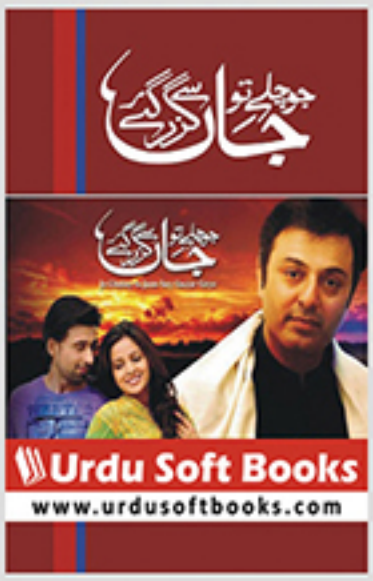

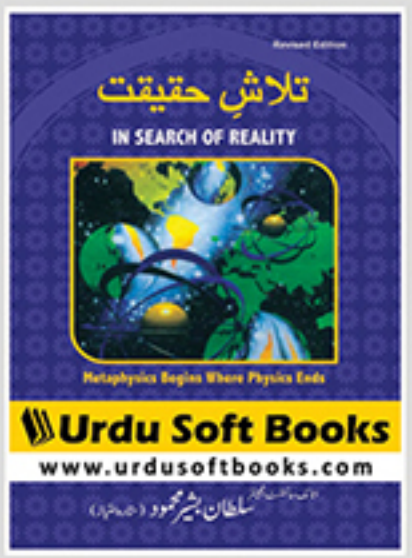

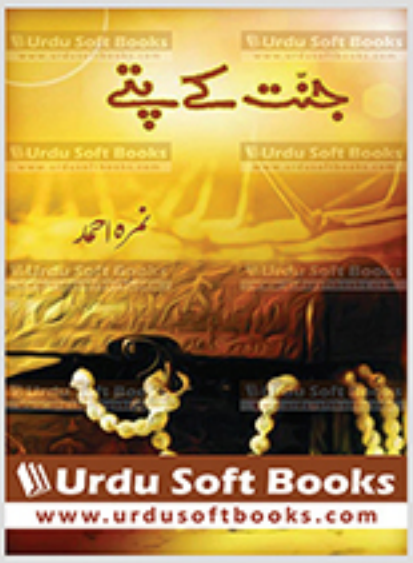

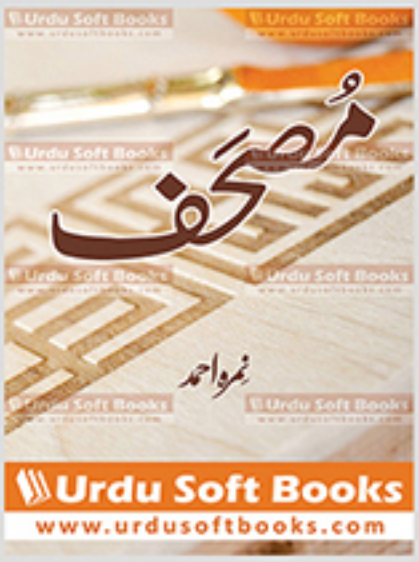

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

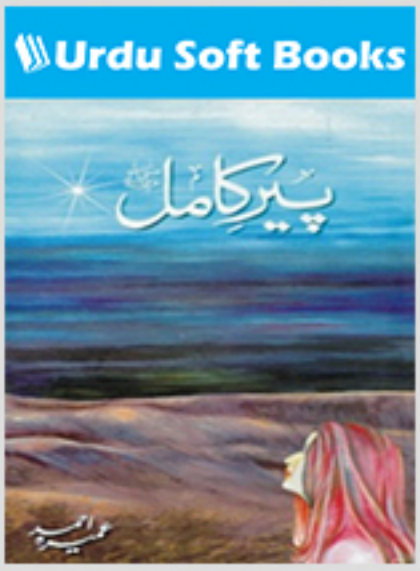

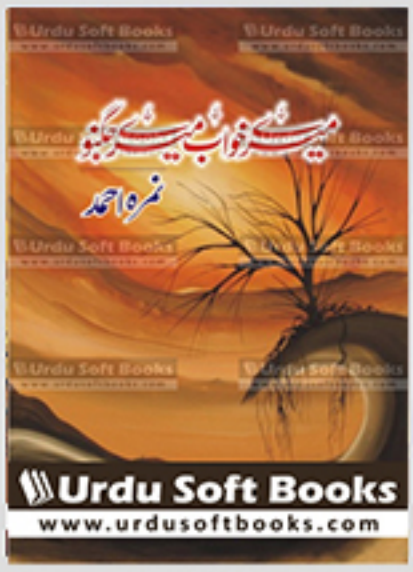

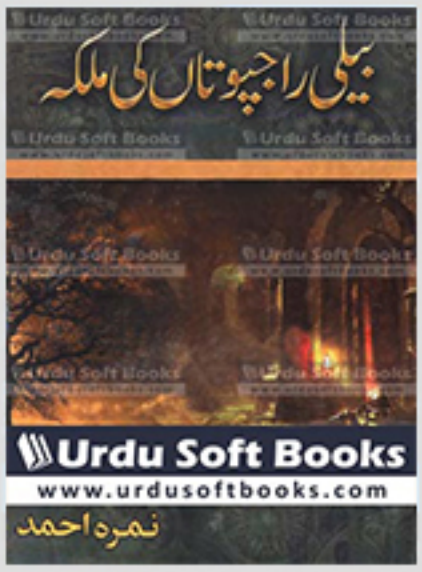

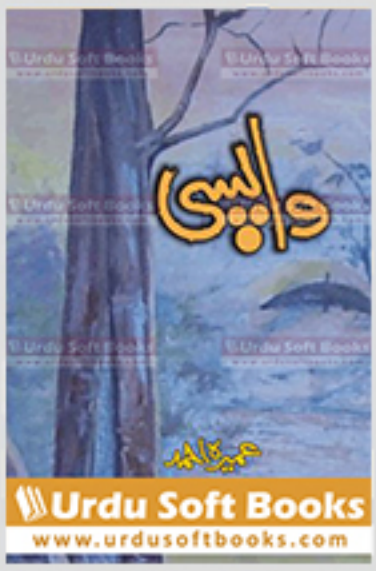

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

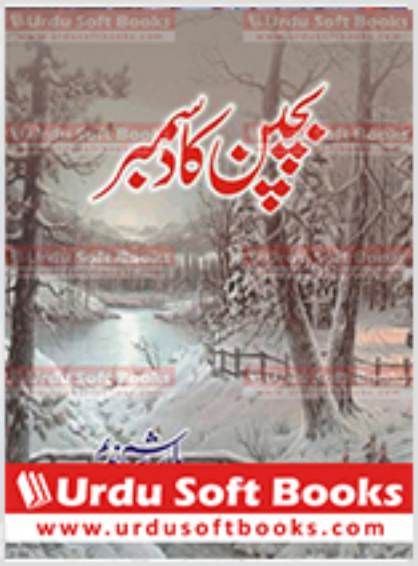

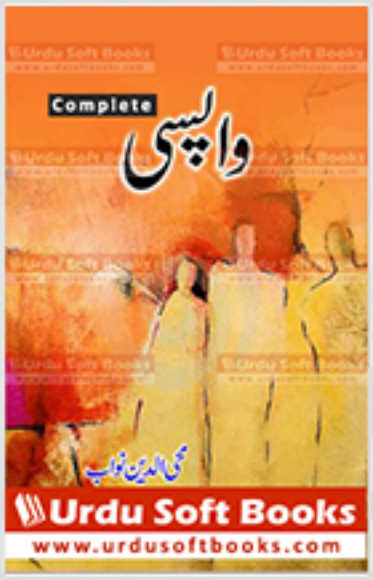

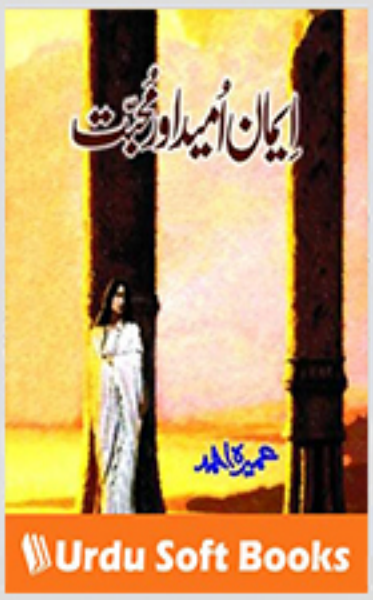

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تذکرہ — 155
ہنری ملاح
طارق عزیز
سمندر میں کمند ڈالنے والے کا ذکر

معاشرت — 158
ناسور
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایک معصوم نوجوان کی لہو گرما دینے والی داستان

پہلی سچ بیانی — 200
خوداعتمادی
سعدیہ علی
اس نے خوداعتمادی سے ٹوٹتے گھر کو بچالیا

دوسری سچ بیانی — 215
جنونی
شمائلہ
وہ اس کی خاطر جنونی ہوگیا تھا

تیسری سچ بیانی — 221
قرض
زویا اعجاز
ایک دل دکھا دینے والی سچ بیانی

چوتھی سچ بیانی — 239
اسیرذات
عارفہ
ایک مکار بھائی اور معصوم بہن کی سچ بیانی

پانچویں سچ بیانی — 251
گم شدہ
اجمل
اس کی ملاقات ایک بھٹکی ہوئی روح سے ہوگئی تھی

چھٹی سچ بیانی — 259
ایک موقع
محمد محسن
خدا ہر ایک کو ایک موقع ضرور دیتا ہے

ساتویں سچ بیانی — 267
تیرا بھائی
محمد امجد
بڑبولے پن کا نتیجہ کتنا خطرناک نکلا

آٹھویں سچ بیانی — 273
جیسی کرنی
محمد عارف قریشی
اس نے جو کچھ کیا اسی کا پھل سامنے آیا

نویں سچ بیانی — 277
آئیڈیل
مظہر سلیم
ان لوگوں کے لیے سبق جو آئیڈیل تلاش کرتے ہیں

سوغات — **
پارچے
قارئین / ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

شاعرِ شاہی

بھارت میں ایک شہر ہے لیٹہ۔ اسی ضلع میں ایک معروف گاؤں ہے مومن آباد۔ یہاں بڑے بڑے علماء وسورما پیدا ہوئے۔ اسی گاؤں میں سیف شمسی رہا کرتے تھے جو نہایت بہادر تھے اور صف شکنی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے لیکن کم سخن تھے۔ محفل میں بھی خاموش رہتے تھے۔ ترک النسل تھے لیکن تعلیم سے نابلد تھے۔ انہی کے گھر 652 ہجری میں ایک بچے نے جنم لیا، وہ تو امی تھے مگر اس بچے کو تعلیم یافتہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے ایک ساتھ دو دو اتالیق مقرر کر رکھے تھے۔ دو دو پڑھانے والے ہوں تو پھر بچہ بھی تعلیم میں زیادہ دلچسپی لینے لگتا ہے۔ اس کے نانا عماد الملک بھی اس بچے میں کچھ زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ گو کہ نانا سلطانی سے محروم تھے لیکن حقیقت میں وہی سلطان تھے۔ انہوں نے ہی پورے ہندوستان کو حوصلگی سے قابو میں کر رکھا تھا اور تخت کی آڑ میں تمام حکم نامے وہی جاری کرتے تھے۔ دو سو تر کی اور دو سو ہندی غلام و دس ہزار سواران کی سرکار میں تھے۔ ہر تہوار پر ان کی طرف سے کلاہ وقبا تقسیم ہوتا۔ باورچی خانے سے بکثرت محتاجوں کو کھانا ملتا تھا۔ ستر برس تک ان کا داب و دورہ رہا۔ نانا کے انتقال کے وقت وہ ہوش مند ہو چکا تھا۔ اس لیے اس نے شہزادہ قتلو خان عرف جھجو (علاؤ الدین محمد بن اعزاز الدین کشلی خان ملقب بہ خان اعظم سلطان بلبن کا بھتیجا) کی مصاحبی میں چلا گیا۔ دو سال تک وہ شہزادے کی سرکار میں رہا۔ کئی قصیدے اس کی شان میں کہے۔ ہمیشہ وہ شہزادے کی مجلس میں حاضر رہتا اور اپنی خوش بیانی سے حاضرین کو مسرور کرتا۔ ایک روز بادشاہ (سلطان غیاث الدین بلبن) کا چھوٹا بیٹا بغرا خاں، خان معظم قتلو خاں کے ہاں مہمان آیا (یہ دونوں چچازاد تھے) منجملہ ندیموں کے شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی ساتھ تھے۔ خان معظم کی مصاحبت میں صرف وہی تھا۔ بغرا خاں کے مصاحب چھیڑ چھاڑ کرتے تو وہی قتلو خاں کی جانب سے جواب دیتا۔ اس نے بغرا خان کے مصاحبوں کا قافیہ تنگ کر دیا تھا۔ اس نے لطائف وظرافتوں سے محفل کو گرما دیا تھا۔ اس کی حاضر جوابی سے خوش ہو کر بغرا خاں نے سونے سے بھری تھال اس کے سامنے رکھ کر کہا کہ یہ آپ کے باورچی خانے کا خرچ ہے۔ قتلو خاں کو یہ امر شاق گزرا۔ اس نے قتلو خاں سے معذرت بھی کی لیکن قتلو خاں کا دل صاف نہ ہوا۔ تکدر اس قدر بڑھا کہ اس کی صفائی کی فکر ہونے لگی۔ اس نے اپنی عزت بچانے کے لیے شہر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا اور وہ بے سروسامانی میں سامانے کی جانب چل پڑا (سامانے کا حاکم بغرا خاں تھا جو سلطان غیاث الدین بلبن کا دوسرا بیٹا تھا) وہ سامانے پہنچا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور وہ ندیم خاص مقرر ہو گیا۔ ابھی اس کا دورِ عروج تھا کہ بغرا خاں نے اپنے لشکر کے ساتھ لکھنوتی کی جانب کوچ کیا۔ 678 ہجری میں لشکر دہلی سے نکلا تھا کہ قاصد سلطانی پہنچا اور حکم ہوا کہ بغرا خاں مع لشکر سپاہ شاہی سے مل جائے۔ وہ بھی لشکر کے ساتھ سپاہ شاہی سے ضم ہو گیا۔ چلتے چلتے ایک سال گزر چکا تھا لیکن لکھنوتی ابھی بھی دور تھا (لکھنوتی بنگالے کا قدیم اسلامی دارالسلطنت تھا جو ڈھاکا شہر سے کئی کوس دور تھا اور اس شہر کو "گور" بھی کہتے تھے جو اب ویران پڑا ہے) اس شہر پر طغرل حکمراں تھا۔ اسے بغرا خاں نے شکست دی تو شاہِ ہند کی جانب سے وہ علاقہ بغرا خاں کو دے دیا گیا۔ بغرا خاں کے مصاحب شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر کی خواہش تھی کہ وہ بھی بغرا خاں کے دربار سے منسلک رہے مگر اس نے واپسی کا قصد کر لیا اور شاہی سپاہ کے ہمراہ دلی لوٹ آیا۔ دہلی میں قآن الملک (خان شہید) فاتح کی صورت داخل ہو رہا تھا۔ اس کی سخنوری کی شہرت اس تک بھی پہنچ چکی تھی، اس نے اسے دربار میں بلا کر ندیمی کا خلعت بخشا اور ملتان ساتھ چلنے کی فرمائش کر دی۔ وہ خان شہید کی سپاہ کے ساتھ ملتان کے لیے چل پڑا۔ ملتان میں زبردست معرکہ ہوا اور شہزادہ شہید ہو گیا۔ وہ بھی گرفتار ہو گیا، اسے جب دربار میں پیش کیا گیا تو اسے سخنور ہونے کی وجہ سے رہا کر دیا گیا۔ وہ واپس دلی آ گیا۔ کچھ دنوں تک وہ اپنے آبائی علاقے مومن پور عرف پٹیالی میں رہا پھر اسی عرصے میں سلطان عادل غیاث الدین کی وفات ہو گئی (685ھ) اور دولت معزی کا علم بلند ہو گیا، اسے دربار میں طلب کیا گیا۔ دربار میں ملک نظام الدین کا دور دورہ تھا اور وہ اس سے پرخاش رکھتا تھا۔ اسے خوف ہوا کہ کہیں نظام الدین اسے نقصان نہ پہنچا دے اس لیے اس نے حاتم خاں کے زیرِ سایہ پناہ لے لی۔ امیر نے اسے زرِ کثیر عطا کیا۔ ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ نظام الدین جنت کو سدھارا اور اسے دربار میں طلب کر لیا گیا۔ خلعت ندیمی عطا ہوا۔ وقت تیزی سے گزرنے لگا اور اس کی سخنوری کا چرچا بڑھنے لگا۔ اس کے اشعار زبان زدِ عام رہنے لگے اسی دوران وہ دربار شاہی کے ساتھ دربار باطنی میں بھی حاضری دینے لگا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا قرب پا کر وہ انہی کے رنگ میں رنگنے لگا۔ بالآخر 8 شوال 725ھ کو وہ شاعرِ شاہی دہلی میں ہی راہی ملک عدم ہوا۔ اسے لوگ امیر خسرو کے نام سے جانتے ہیں۔

☆☆☆

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جلد 27 ❖ شمارہ 05 ❖ جون 2017ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ٭ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

’’میں نے ہاتھ کے اشارے سے ٹیکسی روکی۔ طارق روڈ چلنے کا کہا اور پچھلی سیٹ پر ڈھے گیا۔ ٹیکسی کچھ آگے بڑھی، ایک بڑی بی شٹل کاک برقع میں سڑک پار کررہی تھیں۔ ڈرائیور نے بریک لگا دیا۔ عین اسی وقت عقب سے ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا، سرخ رنگ کی چمچماتی اسپورٹ کار سے بھنا تا ہوا ایک نوجوان اترا۔ ٹیکسی کے پاس آ کر اس نے ایک موٹی سی گالی دی اور کھڑکی سے ہاتھ اندر کر کے ٹیکسی والے کی گردن پکڑ کر بولا۔ ’’باپ کی سڑک سمجھا ہے ابھی ٹکر ہو جاتی۔‘‘

ٹیکسی والے نے گردن چھڑا کر نوجوان کو دیکھا، اس کے جارحانہ رویے پر منمنا کر بولا۔ ’’سر ایک عورت سامنے آ گئی تھی۔‘‘ نوجوان بڑبڑاتا ہوا واپس چلا گیا، نوجوان کی حرکت پر میں نے اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ یہ کہاں کی شرافت ہے۔ ایک ذرا سی غلطی پر گردن پکڑ لی۔ گالیاں دیں۔ ڈرائیور بڑبڑایا‘ جسے دیکھو غریب پر چڑھ دوڑتا ہے جیسے غریب کی کوئی عزت ہی نہیں ہے۔‘‘ میں اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔ ٹیکسی آگے بڑھی۔ ابھی کچھ ہی دور گئی تھی کہ سڑک کے درمیان ایک رکشا کھڑا نظر آیا۔ شاید یکا یک اس کا انجن بند ہو گیا تھا۔ رکشا ڈرائیور اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹیکسی والا بھنا تا ہوا اترا اور کار والے سے ملی گالی سے بھی موٹی گالی بکتے ہوئے رکشے والے کو تماچا رسید کر کے بولا۔ ’’ابھی ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو......!‘‘

یہ منی کہانی ہمارے معاشرے کا آئینہ بنتی دکھائی دے رہی ہے۔ ہر ایک اپنے سے کمزور پر رعب ڈالنا ضروری سمجھنے لگا ہے اور دعویٰ ہے کہ ہم ایک اچھے معاشرے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہمارا صبر و تحمل سے بھرا معاشرہ نہ جانے کہاں کھو گیا ہے۔

معراج رسول

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

شہرِ خیال

☆ اعجاز احمد سٹھار نور پور تھل سے۔ ''بہن طاہرہ نگزار نے میدان مار لیا ہے بلکہ ان کا تبصرہ ہر ماہ انفرادی حیثیت میں بہترین ہوتا ہے چلو اس بار انہیں اعزاز بھی مل گیا۔ رضا احمد اعوان، عریشہ، رانا شاہد، سعید احمد چاند، انور عباس، عبدالجبار رومی انصاری، امیر حمزہ اشرف نے محبتیں پیش کی ہیں۔ یاد کیا۔ سراہا دلی طور پر شکریہ قبول کریں۔ قیصر خان، سیال شریف دربار پر حاضری دینے میں مصروف ہیں جب دلی مراد مل جائے گی تو ہماری طرف متوجہ ہوں گے۔ عمران ڈیلی نامدار بھکر نے مونگ پھلی اور مونگی بیچ کر رقم گھر میں محفوظ کر لی۔ گندم گیہائی کے بعد ڈیرہ پر رکھوالی اور چنے آڑھتی کے گودام میں پہنچا کر رقم گن کر جیب میں ڈال لی ہے اس سارے اہتمام کا مقصد میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ اپنی حاضری لگوا چکے۔ ''مئی کی شخصیات'' میں وہ پہلے والی چمک دمک نظر نہیں آئی۔ مصباح الحق اور فاطمہ بھٹو سے متعلق معلومات نئی تھیں۔ باقی شخصیات کے بارے میں کچھ نہ کچھ پڑھتے رہے ہیں۔ اس ماہ یہ سلسلہ بس گزارا ہی تھا (جی نہیں اس سلسلے کا یہ آخری مضمون ہے)۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں ندیم اقبال قارئین کی توقع پر پورا اتر رہے ہیں۔ میری رائے میں کئی مقامات پر گفتگو کو طول دیا گیا ہے لیکن مجموعی طور پر توجہ حاصل کر رہی ہے اور مصنف ادارہ کے لیے قابلِ فخر اضافہ ہیں اور یہ ساتھ آنے والے سالوں میں بھی چلے گا ''کیا تیرا بگڑتا'' میں محمد شیراز ملک سے باہر چلے گئے۔ بھلا یہاں کتنے حادثات ہوئے۔ بے وقت کی اموات ہوئیں اور دنیا پیچھے روتی سسکتی رہ گئی اور سب کی اہمیت اپنے علاقے اور ملک میں ہوتی ہے کچھ لوگ بے مقصد، بیماری اور عذاب میں زندگی گزار جاتے ہیں۔ پیدائشی معذور پیدا ہوتے ہیں۔ کئی بزرگوں کو کہتے سنا ہے کہ اب دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اللہ موت دے دے لیکن سب اپنے وقت پر ہوتا ہے اور واقعی کئی ہستیاں ایسی ہیں جن کو موت ہمارے ہاتھوں سے چھین کر لے جاتی ہے اور بچے بیوی اور والدین تمام عمر سسکتے بلکتے رہتے ہیں، بس اللہ کی مصلحت وہ خود ہی جانتا ہے۔ ''ناسور'' کی جیسی اٹھان ہے کرداروں کا چناؤ، واقعات کو آگے بڑھانا، سب کی فطرت کے مطابق مصروفیات اور آپس کا الجھاؤ کمال کا ہے۔ اب سچ بیانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ''برا وقت'' میں نائلہ نے جس گینگ سے ٹکر لی تھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اگر بھرے بازار میں عزت دار گھرانے کی لڑکی کا زبردستی ہاتھ پکڑ لیا تو خون خرابہ اور شرم کی بات ہے سو کہانیاں جنم لیتی ہیں کبھی لڑکی کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ شہلا تو کشتیاں جلا چکی تھی۔ جب سب آئینہ تھا تو رضوان کو نائلہ کو آلہ کار نہیں بنانا چاہیے تھا پھر راشد کتنا شریف تھا اور قابل فخر جوان تھا لیکن تنہائی بذات خود گناہ پر اکساتی ہے ایسا رسک لینا ہی نہیں چاہیے۔ بہرحال وہ خیر خیریت سے تمام گورکھ دھندوں سے نکل آئی۔ ''خلش'' میں جہانگیر اور بدر شروع میں انسانوں کو مکڑیوں کی طرح مسلتے رہے جب معاف کرنے کا وقت تھا تب انتقام کی آگ سرد کرتے رہے، کیا مرنے والے سارے قصوروار تھے۔ کتنے معصوم بھینٹ چڑھ گئے۔ نمرہ کے دل میں کتنے ارمان اور ذہن میں خواب تھے ان کی تعبیر کتنی بھیانک ملی۔ کسی کو معاف کر دینا سنت ہے لیکن ہم دوسروں کو بڑھ چڑھ کر نصیحتیں کرتے ہیں لیکن خود کو ایسی پابندیوں سے آزاد سمجھتے ہیں اگر ایسی سوچوں کو تحریک ملتی رہی تو قتل و غارت گری کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ ''غلط ہاتھ'' میں شوکت اور فوزیہ نے وقت کے تقاضے اور حالات کے مطابق صحیح فیصلہ کیا۔ یوں بچوں کو بھی تحفظ مل گیا اگر وہ جھجک محسوس کرتے اور لوگوں کی باتوں سے گھبراتے تو اولاد عدم تحفظ کا شکار ہو جاتی۔ زرینہ اسی محرومی کی وجہ سے غلط ہاتھوں میں چلی گئی اور بلیک میل ہو کر اپنا دکھ اور کمزوری کسی کو بتا نہ سکی۔ ''وفا پرست'' اور ''گورکن'' مافوق الفطرت کہانیاں ہیں یہ انسانی ذہن کی سوچ میں نہ آنے والے واقعات ہیں۔ بس اللہ کی ذات سچی اور مددگار ہے، کائنات کے سارے راز اس کے اپنے قبضے میں ہیں باقی سب ''چکر'' ہے۔''

☆ ملک ثاقب شاد تنولی ایڈووکیٹ تحصیل حویلیاں ضلع ایبٹ آباد سے رقم طراز ہیں۔ ''شہرِ خیال میں قدم رکھا۔ طاہرہ نگزار کرسی صدارت پر بیٹھی تھیں اور سدرہ بانو کرسی کرسی کے ورد میں مصروف نظر آئیں۔ سدرہ بانو آپ کے الفاظ سے اتفاق کرتا ہوں اور یہ سطور شائع ہونے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تک آپ کو چند دن پہلے ہونے والے واقع کا بخوبی علم ہو گیا ہو گا جب سرگودھا کے ایک جعلی پیر نے 20 زندگیوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔ افسوس صد افسوس ہم لوگ کہاں جا رہے ہیں۔ بے گناہوں کی لاشیں اٹھا اٹھا کر ہمارے کندھے تھک گئے ہیں۔ اللہ ان ظالموں کو اپنے قہر کا نشانہ بنا دے، (آمین) جناب اعجاز حسین سٹھار صاحب ہمیشہ کی طرح اپنے قلم سے الفاظ کے موتیوں کی مالا پروتے نظر آئے۔ بہت خوب سٹھار صاحب۔ دیگر تبصروں میں لاہور سے منظر علی خان، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے اویس شیخ، سمندری سے عریشہ، بورے والا سے رانا محمد شاہد اور ڈاکٹر روبینہ نفیس کے تبصرے قابلِ تعریف تھے۔ ڈاکٹر ساجد امجد ہمیشہ کوزے میں سمندر کو بند کرتے ہیں۔ سردارِ سخن اردو ادب کے پیاسوں کے لیے ایک نادر تحریر تھی۔ شکیل صدیقی صاحب ڈان نیوز کا احاطہ کرتے نظر آئے۔ ''باغی'' پر دل باغ باغ ہو گیا۔ آج بھی ایسے ہی کسی باغی کی ضرورت ہے۔ ''ابھرتے ستارے'' زریاب وصلی نے کرکٹ کے ستاروں پر ایسا مضمون لکھ کر یقین جانیے خوش کر دیا۔ ''رقصِ آتش'' اچھی تحریر تھی۔ حادثات تو ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ احتیاطی تدابیر سے ان کی تعداد کو کم کیا جا سکتا ہے۔ ''بیت بازی'' میں اچھے اشعار پڑھنے کو ملے۔ اب ذرا تذکرہ ہو جائے سچ بیانیوں کا۔ ''راندۂ درگاہ'' غلط فہمی اور غفلت کی وجہ سے برباد ہوتی ایک لڑکی کی داستان تھی۔ پڑھ کر افسوس ہوا۔ افسوس کہ ایسے واقعات ہمارے معاشرے میں عام ہیں۔ ''سزا'' ایک اچھی تحریر تھی۔ نعیم نے بغیر بتائے ذرا سی بات پر گھر چھوڑ دیا اور اس کی بیوی نے بھی جرم کیا کہ اپنا پتا کسی کو نہ بتایا۔ بہر حال اچھا ہوا کہ دیر ہی سے سہی لیکن دونوں مل تو گئے۔ ''موت کا کنواں'' پڑھ کر افسوس ہوا اصغر جیسے آستین کے سانپ ہر جگہ پلتے رہتے ہیں۔ ''فیصلہ'' صرف ایک کہانی ہی محسوس ہوئی۔ بہر حال نسیم نے دونوں کو اپنا کر دریا دلی کا ثبوت دیا۔ باقی شمارہ زیرِ مطالعہ ہے۔ اس اُمید پر تبصرہ لکھ دیا کہ کسی طرح وقت پر پہنچ جائے۔''

☆ محمد عمران خان بھکر سے لکھتے ہیں۔ ''تعبیر خیال میں نظر دوڑائی تو طاہرہ گلزار کو کرسی صدارت پر براجمان پایا، تبصرہ بھی شاندار تھا۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب کا تبصرہ بھی خوب تھا، بہت پسند آیا۔ اس کے علاوہ رضا احمد اعوان، سلیم رشید، رانا محمد شاہ، آفتاب احمد، انور عباس شاہ اور عبدالجبار رومی کے خیالات بھی اچھے لگے۔ اس بار قیصر خان غیر حاضر تھے۔ (تقریباً تیس خطوط پرچہ پریس جانے کے بعد ملا جس میں کئی اہم شخصیت کے خطوط تھے) اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف۔ پہلی سچ بیانی ''براوقت'' بہت اچھی تھی۔ تعلیمی اداروں میں کس طرح طلباء و طالبات کی زندگی کو مسخ کیا جا رہا ہے یہ افسوس کی بات ہے۔ اب تعلیمی ادارے بھی ایسی گھناؤنی سازشوں کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔ ''خلش'' میں بدر نے بہن کے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا۔ حیرت کی بات ہے کہ کوئی بھائی اپنی بے قصور بہن کے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے۔ ''گورکن'' پراسرار تحریر تھی جس نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ ''عشق ناکام'' بہت پسند آئی۔ ناصر نے اپنی بزدلی سے نگہت کو کھو دیا۔ محبت تو انسان کو بہادر بناتی ہے لیکن ناصر نے حوصلہ کھو دیا۔ پھر محبت بھی کھو دی۔ ''غلط ہاتھ'' بھی بہترین کاوش تھی۔ شوبز کی دنیا بہت رنگین ہوتی ہے لیکن کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے یہ قدم رکھنے پر ہی پتا چلتا ہے۔ ''اچھوت'' میں ایک مرض نے دو دلوں میں جدائی ڈال دی۔ وفا پرست، پہیلی اور فیروزہ بھی پسند آئیں۔ منظر حسن کی ''نام بے نام'' بہت پسند آئی۔ ''یادیں'' بہترین کاوش تھی۔ ''چھین لے آزادی'' اور ''مقدس درخت'' بھی پسند آئیں، آخر میں ''تعبیر خیال'' کے دوستوں کو خلوص بھرا اسلام۔''

☆ غلام حسین ضیاء کی آمد بھکر سے۔ ''مئی 2017ء کا سرگزشت پوری آب و تاب کے ساتھ آیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اتنے اچھے مضامین پر تبصرہ اس ناچیز کی سوچ سے بالا ہے پھر بھی ''تعبیر خیال'' میں دستِ ناتواں سے عرض گزار ہوں۔ اُمید ہے غلطی معاف فرمائیں گے۔ طاہرہ گلزار کا تبصرہ بڑے اچھے اور مہذبانہ انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ خاص طور پر عبدالحفیظ داد کے مستحق ہیں کہ بقول طاہرہ گلزار انہوں نے توے پر بیٹھ کر تبصرہ لکھا ہے۔ یہ ضرب المثل پہلے ہماری نظروں سے نہیں گزرا۔ (حیرت ہے، یہ تو ایک مشہور کہاوت ہے) ''مقدس درخت'' اور ''موت کے نرغے میں'' بھی اچھی تحریریں ہیں۔ ''چھین لے آزادی'' پنجاب کی سرزمین سے بلند ہونے والی بغاوت کا تفصیلی بیان ہے۔ ''ناسور'' ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی چوتھی قسط جا رہی ہے اور کہانی ٹرک و بسوں کے اڈے پر ہی گھوم رہی ہے۔ شاید اگلی قسط میں کچھ تبدیلی نظر آئے۔ ''براوقت'' ایک نصیحت آموز کہانی ہے۔ کالجوں میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے ماحول سے بچائے۔ ''انتقام کی خلش'' نے کتنے گھروں کا صفایا کر دیا۔ اس کہانی کے انجام کے بعد کچھ نہ بچا ہو گا۔ ''غلط ہاتھ'' شوبز کے جال میں پھنس جانے والی لڑکیوں کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے۔ ''وفا پرست'' بڑی عجیب تحریر ہے۔ موت کے بعد وہ اپنے محبوب کو ملنے آئی یہ کیسی وفا ہے؟ ''گورکن'' پر مجھے شک ہے کہ یہ کوئی سچ بیانی نہیں ہے کیونکہ موت کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں (اللہ والوں کے پاس ایک علم ہوتا ہے کشف القبور)۔ ''پہیلی'' رشتہ داروں میں ایسے طور طریقے زیب نہیں دیتے۔ رشتوں کی قدر انسانی فریضہ ہے۔ ''فیروزہ'' ایک معصوم لڑکی کا اذیت ناک انجام، در بدر دھکے کھانے تین گھروں میں برتن مانجھ کر پیٹ پالنا، اف! اللہ رحم کرے۔ وکیل صاحب نے خوب ترس کھایا۔ ''اچھوت'' ایک حقیقت ہے۔ محبت تو خوب صورتی سے ہوتی ہے۔ بدصورتی تو نفرت کی علامت ہے۔ کوڑھ جب محبوبہ کو لگا تو عشق بہت دور بھاگ نکلا۔ اس بار ''سرگزشت'' بہت محنت سے پیش کیا گیا ہے۔ آپ اور آپ کا اسٹاف مبارک باد کا مستحق ہے، جزاک اللہ۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

☆سیف اللہ کا ملک وال سے تبصرہ۔ ''طاہرہ گلزار صاحبہ کو مبارک دینے کے بعد عرض کروں گا کہ انہوں نے صفحہ 8 لائن 26 میں لکھا ہے کہ منظور علی خان لاہور سے تشریف لائے اور صفحہ 9 لائن 6 میں لکھا ہے کہ رضا احمد اعوان حاضر تھے اب تنقید کے لیے نہیں بلکہ اپنے علم کے اضافے کے لیے پوچھوں گا کہ دوسرے کو مخاطب کرنے کے لیے اس کا تشریف لانا مناسب ہے یا حاضر ہونا یا دونوں ٹھیک ہیں (دونوں) مقدس درخت اور جنریشن گیپ دونوں معلوماتی اور حقائق پر مبنی ہیں اس لیے اچھی لگیں۔ موت کے نرغے میں تحریر انسانی حوصلہ کی پُراثر تحریر ہے۔ قاسم رضا اور انور فرہاد قابلِ رشک یادداشت کے مالک ہیں۔ دونوں کے پاس معلومات کا خزانہ ہے۔ سمجھ نہیں آرہا کہ نمبرون کسے کہیں۔ انور صاحب نے سدھیر کی شادیوں کے سلسلے میں زیبا سے شادی کو پتا نہیں کیوں پوشیدہ رکھا ہے۔ مصلحت وہی بہتر سمجھتے ہیں۔ چھین لے آزادی میں ملنگی اور جگا کی زندگیوں کا پتا چلا معلومات میں اضافہ ہوا۔ مجھے ایسے لگا ہے جیسے صفحہ 176 پر وڈیرے کا نام لکھمیر خاں لکھا ہے اور صفحہ 180 پر ارباز خان لکھا ہے سمجھ نہیں آئی کہ نام کیسے بدل گیا ہے (مسودے میں ہی غلط نام تھا)۔ یادیں تحریر سے یادداشت بڑھانے کے طریقے اور نسخے معلوم ہوئے۔ نام بے نام میں مزاحیہ اور بے تکے ناموں سے آگاہی ہوئی۔ تیرا کیا بگڑتا پڑھنے سے اس مصرعہ کو سمجھنے میں آسانی ہوئی کہ ''حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔''

☆عبدالجبار رومی انصاری کا تجزیہ لاہور سے۔ ''سرگزشت مئی کا شمارہ اپنی خوب صورتی و رنگینی سے مزین اپنے وقت پر ہی مل گیا۔ یہ ایسا میگزین ہے جو اپنی ہر طرح کی تحریروں کی وجہ سے ہر جگہ مقبول ہے۔ جس میں قاری کو اس کے ذوق کے مطابق تحریریں پڑھنے کو ملتی ہیں تو اس کا شوق دوچند ہو جاتا ہے اور پڑھتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہے اور ایسی ادبی خوشیاں اللہ پاک ہر کسی کو دے، بات ہو رہی ہے اتحاد و اخوت کی۔ اپنے تئیں تو ہر کوئی چاہتا ہے کہ ہر طرف اخوت و بھائی چارے کی فضا قائم ہو اور اس کی اشد ضرورت بھی ہے لیکن عوامی سطح پر کون آگے آئے جو اتحاد و اخوت کو اس کی روح کے مطابق قائم کرے؟ ہمارے رہنما تو ویسے ہی اپنے اپنے چکروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ کسی کی کون سنے؟ خدانہ کرے کہیں کوئی انہونی ہو جاتی ہے تو رہنما آکے رٹا رٹایا بیان داغ دیتے ہیں کہ عوام صبر و ہمت اور اتحاد و اخوت کا مظاہرہ کریں لیکن عملی طور پر کچھ نہیں ہوتا اور حالات جوں کے توں رہتے ہیں۔ خود میں قوت برداشت پیدا کریں تبھی باہمی اتحاد و اخوت کو فروغ ملے گا۔ علم و ادب گھرانے کا گوہر ادیبہ مصداق فاطمہ کی سرگزشت بے حد عمدہ رہی، جس نے ہر طرح کے حالات میں قلم کو تھامے رکھا جنہوں نے ناولوں سے لے کر افسانوں تک اور ادبی تصانیف سے بچوں کے ادب تک اور سوانح حیات سے تراجم و تدوین تک، اپنی تحریروں کو جلا بخشی۔ انہوں نے ادب میں بڑا کام کیا ہے۔ موت کے نرغے سے بچ نکلنا اس کے لیے بڑی ہمت کی بات تھی اور جنگی حالات میں تو جذبۂ حب الوطنی سے سرشار سپاہی کے لیے کچھ بھی کر گزرنا ممکن ہوتا ہے۔ چاند ستاروں کی دنیا اور اس جیسی تحریریں میری پسندیدہ ہوتی ہیں۔ ایک جگہ یہ کہنا کہ سات ستاروں کے جھرمٹ میں کسی ریچھ کا خاکہ تصور میں بھی نہ آیا۔ ایسا نہیں ہے بلکہ سات ستاروں کے جھرمٹ کے ساتھ تیرہ ستارے اور ہیں اور یہ مل کر بیس ستارے ''دب اکبر'' یعنی بڑے ریچھ کو مکمل کرتے ہیں جسے ہم بچپن سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ صرف سات ستارے تو چمچ کی شکل بھی بناتے ہیں۔ باقی تحریر بے حد عمدہ اور زبردست ہے۔ اپنے وقت کی مایہ ناز مگر اب گمنام فنکار بھی بھولی بسری تحریروں میں آکر امر ہو جاتے ہیں جیسے حیدر باندی پر تحریر نے ایک گمنام مغنیہ سے روشناس کروایا۔ بیشک لالہ سدھیر بھی ایک بڑے ہیرو تھے اور ان جیسا کوئی بھی نہیں بن سکا۔ ہر سال دس فلمیں ریلیز ہوں اور ان سب کا ہیرو لالہ سدھیر یہ فنکار کے بہترین پرفارم کی نشانی ہے وہ جس طرح عوام کے دلوں میں بسے اور بستے ہیں یہ بھی اعزاز کی بات ہے۔ جنریشن گیپ اچھی تحریر تھی۔ ایسا گیپ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ رشتے داروں میں چھوٹے سے بڑوں تک کو آپس میں گھل مل کر بیٹھنا چاہیے۔ خاص کر بچوں کو ایسی دلچسپی سے کہانیاں سنانا چاہیں کہ ان میں بھی اخلاقی شعور پیدا ہو۔ ٹورنٹو میں شہباز اور سرجی کے ساتھ تو تماشے لگتے تھے، ادھر امریکا میں بھی خوب دلچسپی کا سامان کیے ہوئے ہیں، اب لیڈی لبرٹی کے مجسمے پر چڑھے سرجی نے جانے کیا حرکت کر دی ہے کہ یہاں بھی دلچسپ تماشا دیکھنے کو ملے گا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بہت اچھی جا رہی ہے۔ ''مئی کی شخصیات'' میں مصباح الحق، علی ظفر، رنگیلا، مصطفیٰ قریشی اور فاطمہ بھٹو پر تحریر زبردست تھی۔ نام بے نام دلچسپ تحریر تھی پاکستان میں ایسے ناموں کی بھرمار ہے جیسے فیصل آباد کے قریب گھسیٹ پورہ ہے اور دنیا پور میں ایک چھوٹے سے گاؤں کا نام چغل چک ہے، ہے نا عجیب نام؟ معروف ہستیوں کی موت کا تذکرہ ''کیا تیرا بگڑتا'' بھی عبرت اثر تھا۔ برا وقت کہہ کر نہیں آتا، یہ سچ ہے کہ ہر کسی کو اپنا اچھا برا پتا ہوتا ہے لیکن پھر بھی جوان لڑکے لڑکیاں اپنی ہی ڈگر پر چلتے ہیں اور کسی کی بھی نصیحت کو خاطر میں نہیں لاتے۔ زرینہ کی دوسری ماں نے اسے غلط راستے پر ڈالا تو زرینہ اپنے والد سے بھی دور ہو گئی۔ شوکت نے بروقت انجم اور اس کی ماں کو سمجھا کر اچھا کیا اور پھر ایک فیملی بن گئے مگر زرینہ غلط ہاتھوں میں رہ کر دنیا سے منہ موڑ گئی۔ ''ناسور'' میں شاید کوئی اہم موڑ سامنے آئے گا ورنہ ابھی تک تو کہانی صبر و برداشت سے آگے بڑھ ہی نہیں رہی ہے۔ ''تم بچے پرندوں کی طرح ہوتے ہو معصوم اور سچے'' کیا عمدہ جملہ ہے۔ زاہی بابا بڑے درویش صفت گورکن تھے جنہیں مرنے والے کی پہلے خبر ہو جاتی تھی اور پھر ان کے شاگرد نے ہی انہیں مار ڈالا انوار بابا کے لیے یہ پچھتاوا ہی جانگسل تھا آخر گورکنی کرتے کرتے وہ بھی تھک چکا تھا، عمدہ کہانی تھی۔ عورت بار بار پیار نہیں کرتی کسی کو چاہتی ہے تو ایک ہی دفعہ نگہت اور ناصر نے بھی ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا تھا لیکن حالات نے دونوں کو جدائی دے دی اور عشق ناکام ٹھہرا۔ اچھوت میں نشان علی کو اپنی محبت سلمیٰ سے کنارہ کشی کرنی پڑی کیونکہ وہ کوڑھ زدہ ہو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

گئی تھی۔ یہ الگ بات کہ مرنے کے بعد نشان علی سلمٰی کے قریب ہو گیا۔ عورت کو سمجھنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے، پہیلی میں نائلہ، شائلہ کا اتار چڑھاؤ ایک دوسری کے الٹ تھا پھر سنی بھی ان کے ساتھ ویسے ہی رہتا لیکن پھر وہ دونوں پہیلی کیسے بنتیں۔ ''شہرِ خیال'' کے باسیوں میں طاہرہ نگزار کو مسندِ صدارت مبارک ہو۔ رضا احمد اعوان، اعجاز حسین، رانا محمد شاہد، سعید احمد چاند اور امیر حمزہ کے تبصرے عمدہ ہیں۔ ''بیت بازی'' میں نجمی رحمٰن، امجد علی، فرخندہ مرزا اور سیف اللہ کے اشعار اچھے تھے۔''

☆ عمران بلا کا مراسلہ لاہور سے۔ ''مجھے شاعری کا بہت شوق ہے۔ میں نے ہر موضوع پر شاعری لکھی ہے جن میں سے میں کچھ آپ کو لکھ کر بھجوا رہی ہوں۔ اگر پسند آئیں تو پلیز ضرور شائع کریں۔ (پہلی بات تو یہ کہ شاعری لکھی نہیں کہی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ سرگزشت میں غزلیں، نظمیں نہیں لگتیں۔ ایک مشورہ ہے کہ ابھی آپ کسی اچھے شاعر کو اپنی نظمیں دکھا کر مشورہ کریں)''

☆ انور عباس شاہ کا بھکر سے نامہ خلوص۔ ''مئی کا شمارہ ہمیں صحیح وقت پر مل گیا۔ ''شہرِ خیال'' میں طاہرہ نگزار اپنے بھرپور تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت کی زینت بنی نظر آئیں۔ رضا احمد اعوان بھی اپنے جامع تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ''گورکن'' مافوق الفطرت ایک لرزہ خیز تحریر تھی جو کہ سرگزشت کے معیار پر بالکل پوری اتری۔ ''برا وقت'' ایک سبق آموز تحریر تھی۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو بغیر سوچے سمجھے بڑے بڑے فیصلے کر لیتے ہیں اور ان کی آنکھیں تب کھلتی ہیں جب ان پر برا وقت آ پڑتا ہے۔ سابقہ قسطوں کی طرح ''ناسور'' کی چوتھی قسط بھی دلچسپ تھی۔ ''کیا تیرا بگڑتا'' ایک مختصر لیکن مکمل تحریر تھی۔ ''نام بے نام'' بھی ایک مختصر لیکن بے حد دلچسپ تحریر تھی۔ منظر امام صاحب کی تحریر ''مقدس درخت'' معلومات کا خزانہ تھی۔ اس تحریر کو پڑھ کر ہمیں بہت سے درختوں کے بارے میں آگاہی حاصل ہوئی جن کے بارے میں ہم پہلے نہیں جانتے تھے۔ منظر امام صاحب کا بے حد شکریہ۔ ''مئی کی شخصیات'' میں ملک کی کئی اہم شخصیات شامل تھیں۔ ''ستاروں کی دنیا'' بھی ایک پیارا مضمون تھا۔ ستاروں کے متعلق پہلے بھی سرگزشت میں مضمون شائع ہوتے رہے ہیں لیکن اس مضمون کی بات ہی کچھ اور تھی۔ ''چھین لے آزادی'' کمال کی تحریر تھی جس نے اس شمارے کو چار چاند لگا دیئے۔ ''پہلا سپر اسٹار'' لالہ سدھیر کے متعلق ایک سپرہٹ تحریر ثابت ہوئی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کامیابی سے اپنے سفر کی طرف گامزن ہے اس تحریر کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ ''ادیبہ'' بھی ایک جامع تحریر تھی۔''

☆ ضلالین زارا نے ضلع چکوال سے لکھا ہے۔ ''میں چار سال سے آپ کے رسالے کی خاموش قاری ہوں۔ آج پہلی بار خط لکھنے کی جرأت کر رہی ہوں۔ اُمید ہے آپ ردی کی ٹوکری سے بچائیں گے۔ آپ کے رسالے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ انور فرہاد کی ''بے چارہ'' بہت اچھی تھی۔ واقعی شوبز کسی کی ساتھی نہیں۔ کسی دن آپ معین اختر پر بھی لکھیں۔ ندیم اقبال مبارک ہو آپ کے سرجی کا سیاپا بہت پسند ہے، ویل ڈن۔''

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے آئے ہیں۔ ''یک طرفی سرگزشت معروف مزاح نگار شوکت تھانوی کے بارے میں تھی۔ شرارتی ذہن شروع سے ہی ان کی طبیعت کا حصہ تھا جس نے انہیں مزاح نگار بننے میں مدد دی۔ معراج رسول صاحب کا اداریہ اس حوالے سے اہم تھا کہ جہاں امیر یعنی بااثر افراد اور عام عوام کے لیے الگ الگ قوانین ہوں، وہاں ایسی کہانیاں ہی جنم لیتی ہیں۔ ملک یا معاشرے ایمانداری اور انصاف پر مبنی نظام سے ہی چلتے ہیں وگرنہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ ملک اور معاشرہ ایماندار اور ذہین آدمی کو افورڈ نہیں کرتا۔ ''شہرِ خیال'' میں طاہرہ نگزار کرسی صدارت پر تھیں۔ رضا احمد اعوان! آپ نے صحیح لکھا کہ ایک دور تھا جب شبنم کا شمار پاکستان کی صفِ اول کی ہیروئنز میں ہوتا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ ہر عروج کو ایک نہ ایک دن زوال ہے۔ محمد عمران خان ''شہروں کے نام'' آپ کو مختصر لگی؟ کوشش کروں گا کہ باقی شہروں پر اس کا دوسرا حصہ بھی جلد لکھوں۔ سلیم رشید! آپ نے صحیح لکھا کہ لاہور کو اورنج لائن ٹرین کی وجہ سے اکھاڑ دیا گیا ہے۔ لاہور اپنی تاریخی

''آہ! ایم اے راحت''

عرصہ تک جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز سے منسلک رہنے والے ایم اے راحت بھی دنیا سے روٹھ گئے۔ انہوں نے ناول نگاری کی ابتداء اس وقت کی تھی جب ابن صفی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ایسے وقت میں انہوں نے جاسوسی ناولوں کے قارئین کا اپنے اسلوب کی وجہ سے ایک الگ حلقہ بنا لیا تھا۔ پھر وہ جاسوسی ڈائجسٹ گروپ کے پرچوں کی طرف آ گئے اور کئی ناقابلِ فراموش سلسلے لکھے جن میں صدیوں کا بیٹا، طالوت کے علاوہ بھی بہت سے مقبول سلسلے شامل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق انہوں نے آٹھ سو سے زائد ناولز اور کئی ہزار کہانیاں لکھیں۔ ایم اے راحت کے گزر جانے سے ڈائجسٹ کی دنیا کو ایک دھچکا سا پہنچا ہے۔ ہم سب ان کی موت پر افسردہ ہیں۔ تمام قارئین سے استدعا ہے کہ مرحوم کے لیے سورہ فاتحہ ضرور پڑھیں۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

عمارات اور ایک خاص کلچر کی نمائندگی کرتا ہے۔ سعید احمد چاند، عبدالجبار رومی، تحریر کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امیر حمزہ اشرف، آپ کی بات ٹھیک ہے، قصور ایجاد کا نہیں، استعمال کا ہے مگر جب ایجاد کا زیادہ استعمال منفی ہونے لگے تو پھر چیک اینڈ بیلنس کا انتظام ہونا چاہیے وگرنہ تو بگاڑ پیدا ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ اس دفعہ سدرہ بانو ناگوری نظر نہیں آئیں؟ اردو ادب میں کیسی کیسی منفرد قلم کار گزری ہیں۔ صالحہ عابد حسین نے ایک مشکل دور میں کہ جب عورت پر طرح طرح کی قدغنیں تھیں، ایسی تحریریں لکھیں جو ان کا نام اور کام زندہ جاوید کر گئیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے خوب لکھا۔ درختوں کی اہمیت اور پرستش کے حوالے سے منظر امام کی تحریر بھی دلچسپ رہی۔ ایڈونچر سے بھرپور دوسری جنگ عظیم کا واقعہ ''موت کے نرغے میں'' شکیل ادریس نے زبردست لکھا۔ ثناء ثاقب نے آج کے دور کے ایک اہم مسئلے ''جنریشن گیپ'' کو موضوع بنایا۔ جنریشن گیپ درحقیقت ہماری معاشرتی تنزلی کی اہم وجہ ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ وقت جو ہم اپنے پیاروں، خوب صورت رشتوں کو دیتے تھے اب وہ کمپیوٹر، موبائل اور انٹرنیٹ کو دیتے ہیں۔ پاکستان کے پہلے سپر اسٹار لالہ سدھیر پر انور فرہاد نے کمال کا لکھا۔ لالہ سدھیر کی آخری فلم ''سن آف اَن داتا'' آج بھی یاد ہے۔ وہ حقیقی معنوں میں باکمال اداکار تھے۔ زویا اعجاز پنجاب کے باغیوں کے حوالے سے بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ نظام لوہار کے بعد اب ملنگی پر ان کا انداز بیان متاثر کن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ پنجاب کی دھرتی اپنے بہادروں نظام، ملنگی، پرنام اور جگت سنگھ کو کبھی نہیں بھلا سکتی جنہوں نے اپنے حق کے لیے انگریزی نظام سے بغاوت کی۔ ''مئی کی شخصیات'' میں اس دفعہ بھی بہت پیاری شخصیات کا تذکرہ تھا۔ مصباح الحق اپنی آخری ٹیسٹ سیریز کھیل رہے ہیں۔ پہلا ٹیسٹ میچ پاکستان جیت چکا ہے۔ دعا ہے کہ باقی بھی جیت کر مصباح کو بہت اچھے طریقے سے الوداع کیا جائے۔ علی ظفر، مصطفیٰ قریشی، رنگیلا اور فاطمہ بھٹو پر بھی خوب لکھا۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ یقیناً بیرون ملک جانے والوں کے لیے معلومات کا خزانہ ہے۔ خوشی ہوئی یہ پڑھ کر کہ ان کی کتاب ''نانگا پربت کا عقاب'' مارکیٹ میں آگئی ہے۔ ''یادیں'' شیراز خان کی نفسیات کا احاطہ کرتی ایک جداگانہ تحریر تھی۔ محمد شیراز کی تحریر زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یعنی موت کے حوالے سے دلچسپ تحریر تھی۔ اچانک موت نہ صرف اس کے پیاروں بلکہ چاہنے والوں کو بھی ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ''برا وقت'' چونکا دینے والی کہانی تھی۔ تعلیمی اداروں میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو نظر انداز نہ کریں اور ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھیں۔''

☆ عریشہ کاسمندری سے ای میل۔ ''منفرد اور دلچسپ تحریروں سے مزین سرگزشت پچیس اپریل کی صبح ملا۔ معراج رسول کی سوچ اور فکر آج حرف بحرف پوری ہو رہی ہے۔ شہر خیال کی چیئر پرسن طاہرہ گلزار تھیں۔ طویل اور جامع تبصرہ ان کی ڈائجسٹ سے محبت کا آئینہ تھا۔ محمد عمران خان، آپ سے متفق ہوں۔ مزاح ہر کوئی نہیں لکھ سکتا اور بعض اوقات تو مزاح کے نام پر ایسی تحریر سامنے آتی ہے کہ سمجھ ہی نہیں آتی روئیں یا ہنسیں۔ اعجاز حسین سیٹھار، بھیا! ساتھیوں سے نوک جھوک میں تو سارا خط لکھنا زیادتی ہوئی ناں۔ سلیم رشید نے جو المیہ بیان کیا وہ سیاست دان سمجھ جائیں تو بھلا ہو۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب اِکا دُکا لوگوں کے سوا باقیوں کا وہی وتیرہ ہے جو میں نے بتایا۔ انور عباس شاہ! آپ کی مجبوری سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ مجبوری سبھی کے ساتھ تو نہیں ہو سکتی ناں۔ رضوانہ قریشی کے اعتراضات اور ایڈیٹر کے متعلق سوچ قابلِ مذمت ہے۔ سرگزشت جیسا انفارمیٹو اور معیاری رسالہ کم از کم میری نظروں سے نہیں گزرا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے ایک عظیم شاعر کی نواسی کا بہت روانی سے تعارف کروایا۔ صالحہ حسین کی ذاتی زندگی بہت متاثر کن تھی مگر افسوس ان کا کوئی ناول، افسانہ، مضمون نہیں پڑھا۔ منظر امام نے مقدس درختوں کے متعلق جو انکشافات کیے ان کو پڑھ کر ہنسی بھی آئی اور فخر بھی ہوا کہ بطور مسلم ہم ان خرافات سے دور ہیں۔ جنریشن گیپ نے بچپن کی بہت سی میٹھی یادیں تازہ کر دیں مگر اب وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی؟ پہلا سپر اسٹار میں لالہ سدھیر سے ملاقات اچھی لگی۔ چھین لے آزادی میں ملنگی اور جگا ایک نئے روپ میں سامنے آئے ورنہ فلموں میں ان کے کرداروں پر اتنا مصالحہ لگا دیا گیا ہے کہ کوئی مزہ ہی نہیں رہا۔ اب بات ہو جائے صائمہ اقبال کے مقبول ترین سلسلہ کی۔ ان کا انداز بیان ذاتی طور پر مجھے بہت پسند ہے، تحقیق بھی بہت کمال کا کرتی ہیں لیکن پچھلے کچھ مہینوں سے جن شخصیات پر لکھا جا رہا ہے وہ پچھلے سال بھی ان ہی صفحات پر شائع ہو چکا ہے۔ مثال کے طور پر مصباح الحق، عاطف اسلم، شان، علی ظفر، ایوب خان، عمر اکمل، فاطمہ بھٹو، اے حمید، شیخ مجیب الرحمان، شاہد آفریدی، انضمام الحق، غلام محمد، رنگیلا، ضمیر جعفری، حاکم علی زرداری، نازیہ حسن۔ (یہ سلسلہ اسی ماہ اختتام کو پہنچا لیکن آپ نے جتنے نام لکھے ان میں سے چند ہی دوبارہ شامل ہوئے ہیں اور یہ بتا بھی دیا ہے کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے)۔ دیگر مضامین میں یادیں، نام بے نام اور کیا تیرا بگڑتا پسند آئے۔ سچ بیانیوں میں برا وقت کی نائلہ نے بروقت اچھا قدم اٹھا کر عزت محفوظ کر لی۔ خلش میں اعجاز احمد راحیل نے طاہر جاوید مغل کے انداز میں کہانی لکھی۔ مکالمے پڑھ کر ایسا لگا کہ مغل صاحب کی دیوی، للکار اور دیگر ناول کے نقرات کا ریمکس پڑھ رہے ہیں۔ زریں قمر کی گورکن بہت سنسنی خیز اور بہترین کہانی تھی۔ پہیلی پڑھ کر بے چارے سنی کی حالت پر ہنسی بھی آئی اور نائلہ کے کردار پر افسوس بھی ہوا۔''

☆ منشی محمد عزیز مئے کا ای میل لندن وہاڑی سے۔ ''مئی کا شمارہ 23 اپریل کو ملا تو دھڑکتے دل کے ساتھ کھولا کیونکہ بہت عرصے بعد خط بھیجا تھا مگر افسوس صد افسوس؟ سرورق موجودہ دور کا بہترین عکاس تھا اور سرورق کی کہانی ''برا وقت'' بھی سبق آموز تحریر تھی۔ آج کل یونیورسٹی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

درسگاہ کم اور جرائم کا گڑھ زیادہ بن گئی ہے۔ ''خلش'' میں حساس طبیعت کا مالک بدر غیرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بہن کو قتل تو کر بیٹھا لیکن خود بھی ضمیر کی عدالت میں مجرم بن کر خود کو سزا دینے سے نہ روک سکا۔ ''غلط ہاتھ'' میں شوبز کی ظاہری رنگینیوں کے پس پردہ گھٹا ٹوپ اندھیروں کو اجاگر کیا گیا۔ ''وفا پرست'' میں سچی محبت کا المناک انجام رنجیدہ کر گیا۔ ''پہیلی'' اسم بامسمیٰ تھی۔ ''اچھوت'' بھی اداس کر دینے والی کہانی تھی۔ سلمیٰ کی بیماری نے اس سے محبت بھی چھین لی۔ ''عشق ناکام'' میں لکھے جانے والے مکالمے کسی منجھے ہوئے لکھاری کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ ناصر کی سستی نے اس کے عشق کو ناکام کر دیا۔ دیگر تحریروں میں حیدر باندی کا نام میرے لیے نیا تھا۔ مدھیر کی مکمل حالاتِ زندگی سے آگاہی ہوئی مگر کچھ باتیں نہ جانے کیوں مصنف نے مس کر دیں۔ زویا اعجاز ماشاء اللہ بہت تیزی سے عروج کی جانب گامزن ہیں۔ بہت زبردست سلسلہ شروع کر رکھا ہے، زویا جی نے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ دیگر دوستوں نے بھی خوب لکھا۔ باقی باتیں بعد میں۔''

☆ حنیف ادیب نے لاہور سے لکھا ہے۔ ''مئی کا شمارہ پیشِ نظر ہے۔ ابھی تو چند صفحات کی ہی ورق گردانی کی ہے۔ زیادہ پڑھ نہیں سکا تاہم ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر صالحہ عابد حسین پر اور ندیم صاحب کا سفرنامہ پڑھ لیے۔ ادب سے ایک قدیم رشتہ ہونے کے باعث صالحہ عابد حسین کا نام نیا نہ تھا تاہم جو معلومات ان صفحات پر ہمارے فاضل مضمون نگار نے بیان کیں ان سے بہت استفادہ ہوا اور بہت سی باتیں اس معروف مصنفہ سے متعلق معلوم ہوئیں۔ ٹورنٹو کا سفرنامہ حسبِ سابق اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سرگزشت کے صفحات پر جگمگا رہا تھا اور اس کی روشنی نے قلب و نظر کو منور کر رکھا ہے۔ مضمون نگار کا دلکش و دلچسپ اندازِ بیان سونے پر سہاگے سے کم نہیں۔ اس دلچسپ سفرنامے کو پڑھتے ہوئے اس وقت تک رسالے کو ہاتھوں سے رکھا نہیں جاتا جب تک کہ اس کے حرفِ آخر کو نظریں چھو نہ لیں۔ یک طرفی تحریر میں اس بار عظیم مزاح نگار شوکت تھانوی کا ذکر تھا۔ یہ بھی محترم قارئین کے لیے حرف و لفظ کی ایک بیش بہا سوغات تھی۔''

☆ انجم فاروق ساحلی کا تجزیہ لاہور سے۔ ''مئی کے سرگزشت کا ٹائٹل مختلف مناظر سے سجا ہوا دیدہ زیب تھا۔ خط شائع کرنے کا شکریہ۔ ''شہرِ خیال'' کا دلچسپی اور اشتیاق سے جائزہ لیا۔ سبھی ساتھیوں نے محنت اور عرق ریزی سے تبصرے قلم بند کیے۔ سلیم رشید صاحب کا تبصرہ بڑا فکر انگیز تھا۔ انہوں نے اپنے تنقیدی آئینے کو معاشرے کے ہر مقام سے گزارا۔ ان کے گلے شکوے بجا ہیں۔ لاہور کی سڑکوں پر جگہ جگہ کھدائی، خراب راستے، اورنج ٹرین کے کام نے لوگوں کو سفر کی انتہائی اذیت سے دوچار کر رکھا ہے۔ اس بار بھی سرگزشت تحقیق و تخلیق کے جواہر ریزوں سے سجا ہوا تھا۔ کوئی اور جریدہ سرگزشت کے برابر مواد فراہم نہیں کر سکتا۔ مدیر سرگزشت کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے جو تمام تحریروں میں لفظ اور خیال کے اہتمام اور حرمتِ تحریر کا پورا خیال رکھتے ہیں۔ ''مقدس درخت'' دلچسپ اور معلومات سے بھرپور ہے۔ درخت زمین کی زینت اور حیات پرور اجزا کا اہم منبع ہے۔ یک طرفی سرگزشت مزاح نگار بہت پسند آئی۔ ''جنریشن گیپ'' بڑا اہم موضوع ہے۔ جوں جوں آگے بڑھتے گئے دلچسپی بڑھتی گئی۔ ''ناسور'' کی موجودہ قسط خوب ہے۔ ''ستاروں کی دنیا'' اور ''یادیں'' معلومات سے بھرپور ہیں۔ ''چھین لے آزادی'' ولولہ انگیز اور پُرتاثیر ہے۔ ''ادیبہ'' اور کچھ تحریریں زیرِ مطالعہ ہیں۔ آپ بیتیوں میں نائلہ، خلش، وفا پرست خوب ہیں (آپ کی کہانیاں نمبر آنے کی منتظر ہیں)۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے کراچی سے لکھا ہے۔ ''مئی کے گرم ترین موسم میں خاتون سرگزشت کا چہرہ بہار کے موسم کی طرح خوشگوار لگا۔ طاہرہ نگزار کے لیے صرف اتنا کہ گزشتہ پانچ ماہ کے سب تبصروں سے زیادہ خوب صورت تھا۔ یہ سب ''شہرِ خیال'' کے ساتھیوں پر بے حد اعتماد کا مظہر ہے کہ طاہرہ نگزار نے اپنا دکھ شیئر کیا۔ دل کی گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ آپ کو دعا دیتے ہیں کہ خدا آپ کو بہت سارا سکھ اور خوشیاں دے (آمین)۔ چیف صاحب، اتحاد و اخوت کی ضرورت میں طلب رسد کا فقدان ہے۔ طلب ہو گی تو رسد کی اہمیت بھی ہو گی۔ ابھی تو ہم شتر بے مہار ہیں کیونکہ ہمارے شتربان اپنی اپنی مستیوں میں گم ہیں۔ انجم فاروق ساحلی کو ہم نے گزشتہ ایام میں یاد کیا تھا کہ وہ لکھاری بن کر دوست نہیں رہے۔ تشریف آوری سرپرائز تھی ہمیں بہت اچھا لگا، اس کے ساتھ ہی عرض ہے کہ وہ شکایات کی کہانیوں سے نکل کر کچھ دیگر موضوعات پر بھی قلم آزمائی کریں۔ کچھ نیا کریں۔ ادب کی صالحہ اور ادبی صالحہ کچھ بھی کہیں صالحہ عابدہ حسین کے ادب میں ادب ہمیشہ باادب رہے گا۔ خونِ دل دے کر ادب کے گلاب کا رخ نکھارنے والی صالحہ نے کٹھن حالات میں خود کو منوایا۔ ادب کی اس سے بڑی لاج اور کیا ہو گی۔ زویا اعجاز اس مرتبہ ملنگی کی داستان حیات سنا رہی تھیں۔ پچھلی مرتبہ نظام لوہار اور رنگے ہاتھوں جبرو کو بھی شامل کر لیں یہ سب ہمارے ہیرو تھے (گزشتہ شمارے میں یہ دونوں تھے)۔ مقدس درختوں کی پوجا پاٹ دیکھی تو موت کے نرغے میں جا پھنسے۔ شاندار ایڈونچر سے نمٹ کر سحر زدہ کی سی کیفیت میں باہر نکلے تو ''جنریشن گیپ'' کی کتھا سامنے تھی۔ ثناء ثاقب دادی اماں نہیں ہو سکتیں اور طے ہے کہ وہ دادا ابا بھی نہیں ہو سکتے۔ اپنے نام کی نزاکت انہوں نے خود کلیئر کر دی اور اندازِ تحریر نے ان کی عمر کیونکہ موجودہ دور کے دادا ابا، نانا ابا انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے بارے میں پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو مفید مشورے اس لیے نہیں دے سکتے کہ وہ موبائل فون، گوگل اور واٹس اپ کی مدد میں خود ان کے محتاج ہیں۔ ثناء ثاقب کے مشورے مفید ہیں اور قابلِ عمل بھی۔ ہاتھ سے جاتی ہوئی نسل کو بچایا جا سکتا ہے۔ حیدر باندی پر قاسم رضا نے بہت عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ بھارت کے

دلیپ کمار کی طرح پاکستانی اداکار سدھیر کو بھی پہلے سپر اسٹار کا درجہ حاصل ہے۔ انور فرہاد سدھیر کو شاندار خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔ بہت سی پرانی یادیں سرگزشت پڑھتے ہوئے امڈ آتی ہیں۔ ''ستاروں کی دنیا'' میں علی اوتھ نامی ستارہ سورج سے ایک سو آٹھ گنا زیادہ روشن ہے پڑھ کر حیرت ہوئی کہ رب عظیم کی کائنات میں کیسی کیسی رفعتیں پنہاں ہیں۔ ''مئی کی شخصیات'' میں فاطمہ بھٹو کا تذکرہ سرپرائز تھا۔ ہمارے کرکٹ کپتان مصباح الحق کھیل کی تمام تر عزتوں اور عظمتوں کے ساتھ رخصت ہو رہے ہیں اور ساتھ ہی یونس خان بھی۔ ملک کے محب وطن اور غیر متنازع کپتانوں کو سلام محبت۔ ندیم اقبال صاحب کو بھی سلام عشق جو ہمیں ان سے اور ان کی تحریر سے ہے۔ ''یادیں'' اور ''نام بے نام'' دلچسپ تھیں۔ ''کیا تیرا بگڑتا اگر'' پروین شاکر کسٹم میں ملازم تھیں۔ ایک انٹرویو کے دوران ہم نے شکایت کی کہ باہر ملازمت کے لیے آنے والے لوگوں سے اقربا پروری برتی جا رہی ہے۔ وہ اٹھیں اور ہمارے ساتھ باہر آئیں اور ہمیں ٹائپ رائٹر پر بٹھا کر بولیں کہ اتنے الفاظ فی منٹ ٹائپ کر دیں، میں ابھی آپ کی ملازمت کنفرم کرتی ہوں۔ ہم فیل ہو گئے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے مقررہ تعداد سے کم الفاظ ہمیں ٹائپ کرنے کو کہا تھا۔ اسماعیل شاہ پردے پر نظر آنے والے اسماعیل شاہ سے زیادہ خوب صورت اور وجیہہ تھے ان سے ملنا اور متاثر ہونا لازم و ملزوم تھا۔ ''ناسور'' ابھی تک مناسب جا رہی ہے۔ نائلہ کی سچ بیانی تعلیمی اداروں میں پھیلے ہوئے جرائم پر مبنی تھی۔ اہل اقتدار سب اپنی اپنی مستیوں میں گم ہیں قوم کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ''خلش'' عبرت انگیز تحریر تھی۔ بدرے یعنی بدر نے اپنی ماں جائی کو اپنے ہاتھوں سے اس لیے گولی ماردی کہ وہ اس کے انتقام کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ اف خدایا انسان کتنا گر جاتا ہے کہ اس سے خونی رشتے بھی محفوظ نہیں رہتے۔ ''پہیلی'' از راجت وفا راجپوت میں الجھ کر رہ گئے۔ دلچسپ کہانی تھی۔''

☆ رضا احمد اعوان کی آمد دریا خان بھکر سے۔ ''مئی کا شمارہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اس باریک سخنی میں ہمارے پسندیدہ مزاح نگار شوکت تھانوی کا ذکر اچھا لگا۔ ''شہرِ خیال'' میں جھانکا تو بھانت بھانت کی بولیاں سننے کو ملیں۔ باجی طاہرہ گلزار جی! آپ نے کہا کہ دوسروں پر ہاتھ ذرا ہولا رکھا کریں۔ حالانکہ میں نے تو ایک حقیقت بیان کی تھی اور حقیقت کو کسی صورت جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ اس حقیقت کی تصدیق و تائید اس بار لگنے والے قاسم رضا کے مضمون ''حیدر باندی'' میں بھی ہے۔ پیرا ملاحظہ فرمائیے۔ ''پوری فلمی دنیا ان کی مٹھی میں تھی۔ اپنے عروج میں بہت پیسا بنایا۔ لیکن اڑا دیا جب وفات پائی تو المیہ دیکھیں اہل محلہ نے آپس میں چندہ جمع کر کے پاک و ہند کے اس عظیم استاد شاعر کے کفن دفن کا بندوبست کیا۔'' بورے والا کے جناب رانا محمد شاہد نے بھی میری بات کی تائید کی۔ کوئی مانے نہ مانے حقیقت، حقیقت ہوتی ہے۔ بہرحال مسند صدارت مبارک ہو۔ ''مقدس درخت'' بور کر گئی۔ شکیل ادریس کی ''موت کے نرغے میں'' نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ ''جزیشن گیپ'' بھی کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ ''حیدر باندی'' بہترین کاوش تھی۔ قاسم رضا مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اداکار سدھیر پر لکھا گیا مضمون ''پہلا سپر اسٹار'' بھی عام سی تحریر ثابت ہوئی۔ زویا اعجاز کی کہانی ''چھین لے آزادی'' بہترین تحریر تھی۔ ''مئی کی شخصیات'' میں رنگیلا، مصطفیٰ قریشی، علی ظفر جلوہ افروز تھے۔ ''ناسور'' اچھی جا رہی ہے۔ ''بیت بازی'' کی بجائے موضوعاتی سلسلہ شروع کر دیں تو زیادہ بہتر ہوگا اور پاکیزہ کی طرح پہلا، دوسرا، تیسرا اچھے اشعار پر انعامات بھی دیے جائیں تو کیا ہی بہتر ہوگا۔ سچ بیانیوں میں ''پہیلی'' بہت اچھی کہانی تھی۔ ''عشق ناکام'' میں افسانوی الفاظ کی تکرار نے خاصا بور کیا دیگر کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ ''شہرِ خیال'' میں سلیم رشید، انجم فاروق ساحلی، سعید احمد چاند کے تبصرے پسند آئے۔''

☆ نزابت افشال مہورہ فتح جنگ سے لکھتی ہیں۔ ''خوب صورت سرگزشت نے اپنا روئے مبارک دکھایا۔ یک صخی سرگزشت میں شوکت تھانوی پر کئی مضامین ہم پہلے بھی پڑھ چکے ہیں۔ جن حضرات نے نہیں پڑھا تھا ان کو بار دگر سے فائدہ ہوگا۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح خوب رہا۔ لالچی اور بے ضمیر لوگ ایسے ذہین افراد کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر ان کی زندگی کا چراغ گل کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے بھرپور انداز میں حاضر تھے۔ صالحہ عابد حسین مولانا حالی کی نواسی تھیں ظاہر ہے اردو ادب میں اگر وہ اپنا مقام پیدا نہ کرتیں تو پھر کون کرتا؟ حالی جن کے متعلق ان کے استاد مرزا غالب نے فرمایا تھا کہ اگر تم شاعری نہ کرو گے تو یہ اپنی ذات پر بہت بڑا ظلم کرو گے۔ حالی نے مسدسِ حالی جیسی طویل نظم سے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا جس کی داد سر سید احمد خان نے بہت ہی عجیب الفاظ میں دی تھی۔ حالی کے علاوہ مولانا شبلی نعمانی نے بھی 1914ء میں ہی وفات پائی تھی۔ اقبال نے مرثیہ لکھا جس میں دونوں ہستیوں کا ذکر تھا۔ منظر امام گرمیوں کے آغاز ہی میں ''مقدس درخت'' کی چھاؤں دے گئے۔ زبردست تحریر تھی۔ ''جنریشن گیپ'' زبردست زورِ قلم کا نتیجہ تھی۔ موت کے نرغے میں پھنسے ہوئے شکیل ادریس کو زویا اعجاز بار بار کہہ رہی تھیں کہ ''چھین لے آزادی'' زبردست معلوماتی تحریر تھی۔ شورش کاشمیری کی داستان حیات بوئے گل، نالہ دل دود چراغ محفل اور پس دیوار زنداں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں ایک آزاد ملک سے نوازا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اپنے عروج پر ہے ندیم اقبال صاحب، سفرنامہ شائع ہونے پر مبارک باد۔ یادیں ایک معلوماتی اور منفرد انداز کی تحریر تھی لیکن رائٹر نے صفحہ نمبر 143 پر حسرت موہانی کا جو شعر درج کیا اس کا مصرعہ اول درست نہیں تھا۔ درست یوں ہے کہ ''بھلا تا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں''۔ ''کیا تیرا بگڑتا'' مختصر مگر دلچسپ تحریر تھی اس میں چالیس سال کی عمر میں فوت ہونے والے عظیم شاعر مصطفیٰ زیدی اور 32 سال کی عمر میں فوت ہونے والے شکیب جلالی کو شامل کیا جا سکتا تھا۔ برا وقت شاندار

تحریر تھی لیکن اختتام اچانک کیا گیا۔ خلش، غلط ہاتھ، وفا پرست، گورکن، فیروزہ، اچھوت اور عشق ناکام بہترین تحریریں تھیں۔ خصوصاً اس بار اقتباسات بہت معلوماتی تھے۔ طاہر گلزار سسٹر کو "شہرِ خیال" میں اس بار صدارت مل گئی۔ لیجیے اب مرد حضرات کی خیر نہیں۔ رضا اعوان، عمران خان، اعجاز حسین ستھار، سلیم رشید، رانا محمد شاہد، آفتاب احمد، سعید احمد، انور عباس شاہ اور رومی صاحب عمدہ تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ سیف اللہ ملکوال، بھائی آپ نے گانے کی جو تصحیح کی وہ بھی درست نہیں 'گاتا' حقیقت میں اس طرح ہے کہ نی چنے دی اے بند کلیے تینوں جیڑے ویلے رب نے بنایا۔ امیر حمزہ اشرف یاد کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ آخر میں ایک بات پوچھنا چاہوں گا کہ مارچ میں دو تحریریں بھیجی تھیں۔ کیا وہ قابلِ اشاعت ہیں۔ (فریب زن اور قبائے منافقت ابھی پڑھی نہیں ہے)۔"

☆ آغا نیاز مگسی کا شہداد کوٹ سے تصحیح کا تقاضا۔ "ماہنامہ سرگزشت کے گزشتہ ایک شمارے میں شہروں کے نام کے عنوان سے جناب رانا محمد شاہد کے قلم سے تحریر کردہ مضمون کا مطالعہ کیا جس میں اسلام آباد کا رقبہ 906 کلومیٹر اور راولپنڈی کا رقبہ 259 کلومیٹر بتایا گیا جس کو پڑھ کر ہمارا حیرت میں مبتلا ہونا لازمی ٹھہرا اور ہم ابھی تک ورطۂ حیرت میں پڑے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے؟ زیادہ سے زیادہ 50 یا 60 کلومیٹر کا رقبہ تو ممکن ہو سکتا ہے لیکن سینکڑوں کلومیٹرز پر پھیلے اسلام آباد اور اس سے ملحقہ راولپنڈی کا شہر کم از کم ہماری عقل سے بالاتر ہے۔ چنانچہ گزارش ہے کہ ان دونوں شہروں کے رقبوں کی درست معلومات فراہم کی جائے یا اس کی وضاحت کی جائے کہ اسلام آباد کا رقبہ 906 کلومیٹر اور راولپنڈی کا رقبہ 259 کلومیٹر کیسے اور کس طرح واقع ہے؟ (ویکی پیڈیا پر چیک کر کے دیکھا یہی رقبہ لکھا ہے۔ آپ بھی چیک کر لیں یاد رہے کہ رقبہ ہمیشہ مربع میں ہوتا ہے۔)"

☆ سدرہ بانو ناگوری نے ملیر کراچی سے لکھا ہے۔ "اداریہ پڑھ کر چونکے ارے یہ تو مشال کی کہانی لگتی ہے اسی مشال کی جسے ایک تعلیمی ادارے میں تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ اسی مشال کی جس کی لاش کی بے حرمتی کی گئی۔ اسی مشال کی جس کی دردناک موت پر وڈیوز بنا کر تماشا بنایا گیا۔ سنا ہے کہ سپریم کورٹ نے از خود اس سانحے کا نوٹس لیا ہے۔ اس بار "شہرِ خیال" میں ہمارا خط غائب تھا۔ پتا نہیں راستے میں کہیں کھو گیا یا پھر محکمہ ڈاک والوں کی مہربانی سے اِدھر اُدھر ہو گیا۔ طاہرہ آپا کو طویل اور خوب صورت تبصرے پر صدارت کی کرسی بہت بہت مبارک۔ خوش رہیے آپا جی۔ رضا احمد، عمران خان، رانا شاہد، آفتاب احمد نصیر، سعید احمد چاند، عبدالجبار رومی، طاہرہ نگزار اور انور عباس بھائی کا خصوصی شکریہ کہ آپ سب نے اپنے اپنے خطوط میں انتہائی محبت اور خلوص کے ساتھ میرے تبصرے پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور اپنی رائے سے نوازا۔ ایک مرتبہ پھر بہت شکریہ۔ رضوانہ قریشی صاحبہ سے ایک ریکوئسٹ ہے کہ محترمہ اگر آپ کو سرگزشت سے اتنی ہی شکایات ہیں تو آپ پڑھتی ہی کیوں ہیں اور پھر بڑے دھڑلے سے خط بھی لکھ ڈالتی ہیں بھئی حیرت ہے آپ پر اور کوشش کریں کہ بجائے دوسروں پر تنقید کرنے کے اپنے لفظوں پر غور کرنا سیکھیں۔ صفحات پلٹے تو ایک عرصے بعد صنف نازک کو ابتدائی صفحات پر براجمان پایا۔ ادیب تو پڑھتے ہی رہے ہیں مگر اس دفعہ ایک ادیبہ ایک بڑا نام ایک بڑا مقام ڈاکٹر صاحب نے مصداق فاطمہ کے ساتھ ساتھ الطاف حسین حالی کے ذکر کو بھی کھول کر رکھ دیا بھئی واہ ڈاکٹر صاحب ویلڈن۔ ثناء ثاقب نے مختصر سے جائزے میں "جنریشن گیپ" کو بڑی خوب صورتی سے نبھایا۔ "یادیں" اچھا تاثر چھوڑ گئیں۔ منظر امام نے "مقدس درختوں" کے تقدس کو نہایت دلچسپی سے بیان کیا۔ "ناسور" اس دفعہ عام سی قسط رہی۔ "شمشال سے ٹورنٹو" کا نام بدل کر اب "ٹورنٹو سے نیویارک" رکھ دینا چاہیے۔ ندیم بھائی نے لکھا ہے کہ جتنا زیادہ گھریلو تشدد امریکا میں ہوتا ہے اتنا شاید ہی کسی ملک میں ہوتا ہوگا۔ لیکن امریکا تو ہمیشہ دنیا کو اپنا اچھا رخ دکھاتا ہے اپنی خامیوں پر بھی وہ پردہ ڈال کر ایسے پیش کرتے ہیں کہ ان پر خوبیوں کا گمان ہو اور ایک ہم ہیں چھوٹے چھوٹے ایشوز کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ اپنا چہرہ اپنی تصویر تو خود ہم نے مسخ کی ہے امریکا برسوں گزر جانے کے بعد بھی ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے حملے کو بھول نہیں پایا اور ہم، ہمیں تو یہ یاد نہیں رہتا کہ گزرے سالوں میں کیا کچھ کھو چکے ہیں۔ پہلی سچ بیانی میں مصنفہ نے یونیورسٹی میں ہونے والے گھناؤنے کھیل کا پردہ فاش کیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا حکومت ان سازشوں سے بے خبر ہے طالب علم بے راہ روی کا شکار ہو رہے ہیں ہماری نسلیں اجڑ رہی ہیں اور اعلیٰ عہدیداروں نے اپنی آنکھیں کیوں بند کر رکھی ہیں۔ "گورکن" نے عجیب سے بھید کھولے پڑھ کر حیران ہیں کہ کیا یوں بھی ہو سکتا ہے۔ "اچھوت" میں بے چاری سلمیٰ کو بڑی اذیت اور تکلیف کا سامنا رہا۔ سلمیٰ اپنی بیماری کے ہاتھوں اچھوت بن کر رہنے پر مجبور ہو گئی۔ "عشق ناکام" آخری سچ بیانی انداز بیان یوں لگا کہ جیسے یہ تحریر ندیم اقبال نے لکھی ہو مگر بہر حال جس نے بھی لکھی بہت خوب اور محبت کی اداؤں کے انوکھے سلسلے اور انہی سلسلوں کا انتہائی تکلیف دہ انجام، کیا محبتیں یوں بھی بکھرتی ہیں۔ حادثے یوں بھی ہوتے ہیں۔ غلط ہاتھ، فیروزہ، وفا پرست ان تینوں سچ بیانیوں میں جو کچھ ہوا بہت غلط ہوا باقی پورا شمارہ عمدہ اور نہایت خوب صورت رہا۔ آخر میں تمام پڑھنے والوں کو رمضان کے مقدس مہینے کی آمد بہت بہت مبارک ہو۔"

تاخیر سے موصول خطوط: مومنہ اقبال، سیالکوٹ۔ ایاز احمد صدیقی، نعمان اشرف، ظہیر احمد تبسم، کراچی۔ ثناء بتول، جھنگ۔ نوازش علی خان، لاہور۔ ارباز بزمی، چنیوٹ۔ راجا رحیم، کوئٹہ۔ صنم اقبال، سرگودھا۔ فہیم الدین، پشاور۔ عباس بٹ، میرپور آزاد کشمیر۔ عنایت علی زیدی، فیصل آباد۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نوائے خلیل

ڈاکٹر ساجد امجد

ضرورتوں کے محاذ پر وہ تنہا تھا، دل ریزہ ریزہ تھا، غم و الم کی یورش تھی اور کوئی پرسانِ حال نہ تھا، ضبط کے پل صراط پر کھڑا وہ سوچ رہا تھا کہ اس جھلستی دھوپ میں صرف اعلیٰ ہمتی ہی اسے آگے بڑھا سکتی ہے۔ اسی عزم نے اسے مہمیز کیا اور اس نے تعلیم کے میدان میں قدم مضبوط کرنا شروع کردیے۔ پھر وہ وقت بھی آگیا کہ اسے اردو کے اہم قلمکاروں میں شمار کیا جانے لگا۔

اردو کے ایک معروف قلمکار کا دلچسپ زندگی نامہ

تلواریں نیام میں چلی گئیں، میدانوں میں شہر آباد ہو گئے، تہذیب نے دامن پھیلایا جس نے چاہا اس کی آغوش میں آیا۔ طور طریقے، انداز بدل گئے۔ تلوار چھوڑتے ہی ہاتھ قلم اٹھانے کے لیے مچل گئے۔ یہ سب ہوا لیکن اچانک نہیں ہوا۔ دس نسلیں گزریں تو زمین بدلی آسمان بدلا۔ یہ ایک خاندان کی کہانی ہے جو افغانستان سے آیا تھا۔ یہ کہانی سردار سالار خاں سے آگے بڑھ کر حافظ قادر بخش تک پہنچی تھی۔ تلوار کی نوک قلم کی نوک میں تبدیل ہو گئی تھی اور جو کچھ تبدیل ہوا وہ اپنی جگہ۔

ہندوستان کے سلطان بہلول لودھی نے عنان حکومت سنبھالی تو اپنی مضبوطی کے لیے اپنے ہم قوم پٹھانوں کو افغانستان سے لاکر ہندوستان میں بسانے کا فیصلہ کیا۔ آنے والوں میں سردار سالار خاں بھی شامل تھے۔ ان کی شجاعت کے صلے میں سلطان نے انہیں ایک بڑی جاگیر عطا کی جس میں تیس دیہات شامل تھے۔ اس نسبت سے ان کے گاؤں کا نام ''سی وہ'' یعنی تیس دیہات پڑ گیا۔

سردار سالار خاں سینے پر بہادری کا تمغا سجائے سلطان کا ساتھ دیتے اور شجاعت کے جھنڈے گاڑتے رہے۔ ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی اسی پیشہ سپاہ گری کو اپنائے رکھا لیکن تلوار کی دھار کند ہوتی گئی اور دسویں پشت کے آتے آتے کتاب نے تلوار کی جگہ لے لی۔

حافظ قادر بخش نے اردو، فارسی کی تکمیل کی اور قرآن مجید حفظ کیا۔ وہ تقویٰ، طہارت، اتباع سنت میں اپنے خاندان میں ممتاز تھے۔ اس خاندان کے وہی پہلے شخص تھے جو گھر سے باہر گئے۔ پٹنہ سے آگے ایک مقام دانا پور ہے وہاں ایک مدرسے میں پڑھانے لگے۔ وہ اپنے ساتھ اپنے یتیم بھتیجے محمد شفیع خاں کو بھی لیتے گئے۔

بھتیجا اور یتیم بھتیجا، پرورش قادر بخش کے حصے میں آئی۔ انہوں نے محمد شفیع کو قرآن حفظ کرایا اور اردو، فارسی کی تعلیم خود دی۔ پھر مزید تعلیم کے لیے دانا پور کے مدرسے میں داخل کرایا۔

حافظ قادر بخش کی تعلیم میں جو کمی رہ گئی تھی وہ انہوں نے بھتیجے کی شکل میں پوری کی۔ اسے عالم دین بنایا اور طریقت کی تعلیم کے لیے ایک بزرگ حضرت چاند شاہ ٹانڈوی کے مرید ہو گئے۔ محمد شفیع نے گاؤں گاؤں جاکر تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کر دیا۔ ان کی تقریروں میں ایسا اثر تھا کہ لوگ جوق در جوق ان کی طرف سمٹ آتے۔ اپنی اس گرم بازاری کو دیکھتے ہوئے اپنی فکر کو منظم تحریک کی صورت

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات Green Box والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

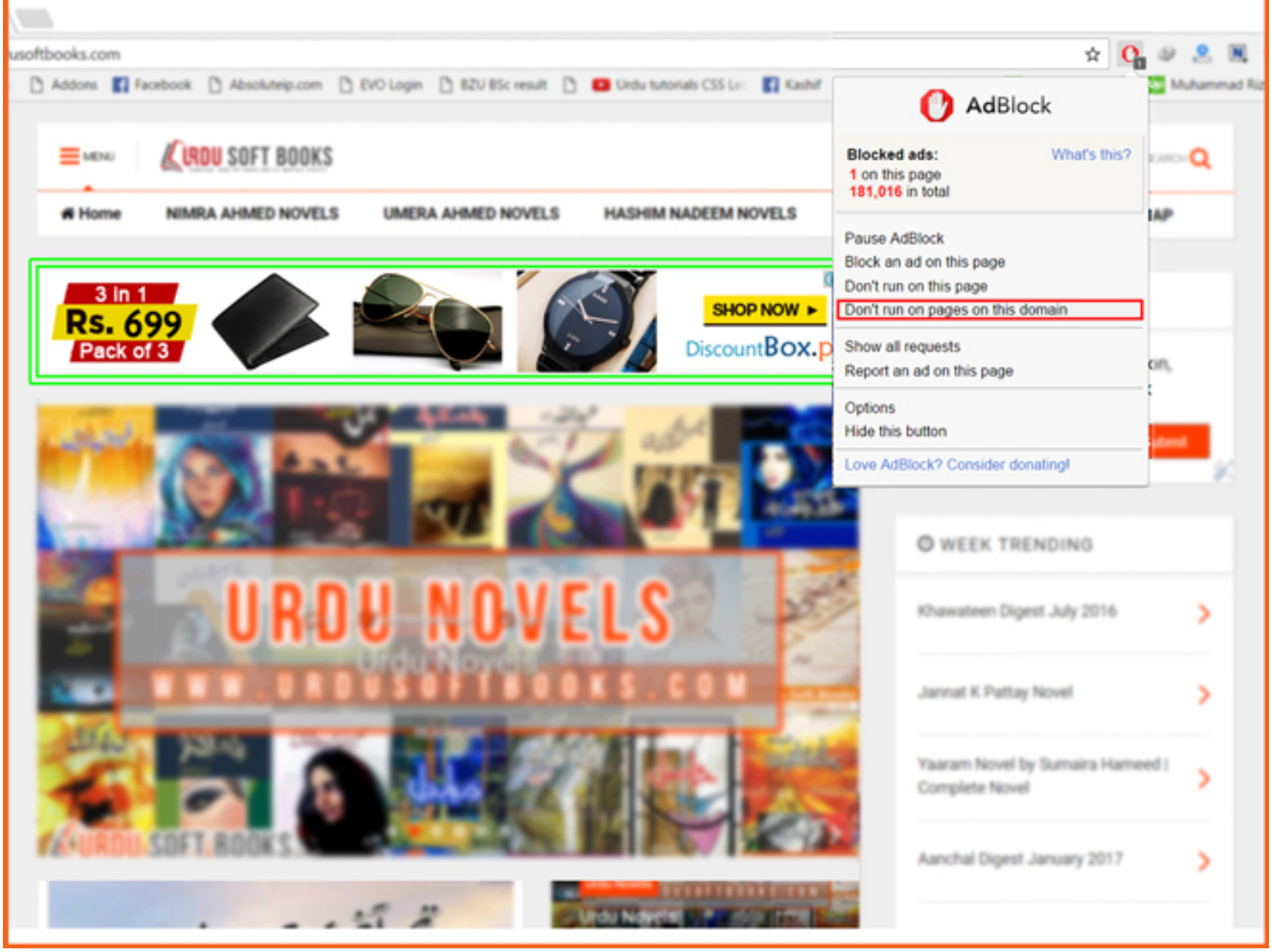

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دینے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے انجمن اصلاح معاشرت قائم کی۔ بعد میں اس انجمن کا نام اصلاح المسلمین تجویز ہوا۔ اسی انجمن کے تحت سرائے میر، اعظم گڑھ میں ایک مدرسہ مدرستہ الاصلاح کا سنگ بنیاد بڑی دھوم دھام سے رکھا گیا۔ انہوں نے مولانا شبلی نعمانی سے مدرسے کی سرپرستی کے لیے درخواست کی۔ مولانا نے نہ صرف سرپرستی قبول کر لی بلکہ اس کا نصاب بھی مرتب فرمایا۔ گویا چلتی تلواریں بالکل ہی زنگ آلود ہو گئیں اور اس خاندان کا رخ مذہبی علوم کا مرکز بن گیا۔

مولانا محمد شفیع نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد دوسری شادی لازمی ہو گئی کیونکہ پہلی بیوی سے دو بچے تھے اور انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

اس بیوی سے بھی پانچ بچے، چار بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

سب سے چھوٹا بیٹا 9 اگست 1927ء کو سلطان پور میں پیدا ہوا۔ اس کا نام خلیل الرحمٰن رکھا گیا۔ اسی بچے کو دنیائے ادب میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام سے مشہور ہونا تھا۔

خلیل نے ہوش سنبھالا تو گھر کی فضا مذہبی ہی دیکھی۔ باپ عالم دین تھے لہٰذا ابتدائی تعلیم کے لیے گھر سے دور جانا نہیں پڑا۔ والد کی نگرانی میں قرآن پڑھنے بیٹھ گئے۔ گھر پر ہی اردو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ کچھ دور نہیں تھا کہ خلیل کو مذہبی تعلیم کے لیے مدرسے میں بٹھا دیا جاتا۔ اس کی تیاریاں بھی ہو چکی تھیں کہ اس کے والد کے چچا زاد بھائی حافظ عبدالقادر تشریف لائے۔ مولانا محمد شفیع نے اپنا عندیہ ان پر ظاہر کیا۔

''میں خلیل کے بارے میں آپ سے مشورہ کرنے والا تھا۔''

''کیا ہوا۔ کیا کر دیا خلیل نے؟''

''میں نے شکایت نہیں مشورہ کہا ہے۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں کیسا مشورہ؟''

''صاحب زادے نے پوری تیاری کر لی ہے اب چاہتا ہوں اسے مدرسے کے مولوی کے سپرد کر دوں۔''

''بھائی صاحب، اب وقت تیزی سے تبدیل ہو رہا ہے۔ جب تک یہ بڑا ہو گا وقت اور بدل چکا ہو گا لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ یہ مدرسے کی بجائے کالج کی تعلیم حاصل کرے۔''

''شاید آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ مذہب سے دور چلا جائے۔''

''خدانخواستہ میں یہ کیوں چاہوں گا۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ آنے والے وقتوں میں کالج کی تعلیم ہی کام آئے گی۔ رہی مذہب سے دوری کی بات تو تمہارے گھر کی فضا مذہبی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ خلیل مذہب سے دور چلا جائے۔ اگر گیا تو اسے سیدھا کرنے کے لیے ہم بھی یہیں ہیں تم بھی یہیں ہو۔''

عبدالقادر خاں کی یہ بات خلیل کے والد کی سمجھ میں آ گئی۔ خلیل کو قریبی گاؤں ''مینا پارہ'' کے پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔

خلیل کے گھر میں مذہب کا ہر وقت چرچا رہنے کے علاوہ علم و ادب کا اثر بھی کم نمایاں نہیں تھا۔ مولانا محمد شفیع ادب کا نہایت سلجھا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ عظیم آباد (پٹنہ، بہار) کے شعرا کی صحبتوں میں بیٹھ چکے تھے۔ خود بھی شاعر تھے۔ شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری سے مشورہ سخن بھی کر چکے تھے۔ حافظہ ایسا تھا کہ بحر طویل کے نعتیہ قصائد پورے کے پورے یاد تھے۔ والدہ کا حال بھی یہ تھا کہ معمولی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نظم و نثر کی کتب پڑھ سکتی تھیں۔ رات کو جب سب بچے سونے کے لیے لیٹتے تو ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے اقتباسات سنایا کرتی تھیں۔

خلیل کے چچا حافظ عبدالغفار مجلسی آدمی تھے۔ انہوں نے فارسی کی اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی۔ فارسی کے سیکڑوں اشعار یاد تھے۔ کھیتی باڑی کرنے کے باوجود مجلسیں گرم رکھتے اور قصہ گوئی و لطیفہ گوئی سے محفلیں آباد رکھتے تھے۔ کئی ادبی رسائل گھر پر آتے تھے جو کم سن خلیل کی نظروں سے گزرتے تھے۔ وہ ان سے پوری طرح مستفید نہیں ہو رہا تھا لیکن دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی جو آئندہ اس کے کام آنے والی تھی۔ وہ ابھی دقیق کتابوں کے سمجھنے کے لائق نہیں تھا لیکن حافظہ ایسا قوی تھا کہ جہاں کوئی اچھا شعر سننے کو مل جاتا اسے یاد کر لیتا اور گاؤں کی پگڈنڈیوں پر گاتا پھرتا۔ ایک دن وہ کھیتوں کے درمیان دوڑتا ہوا جا رہا تھا اور کوئی شعر اس کی زبان پر تھا جسے وہ ترنم سے پڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ گاؤں کا ایک شخص بشیر خلیفہ بھی اسی راستے سے گزر رہا تھا۔ اس نے جو خلیل کو گنگناتے ہوئے دیکھا تو اس کے سامنے آ گیا۔ ''خلیل..... تو تو بڑا اچھا گاتا ہے۔''

''میں گا نہیں رہا ہوں۔ ایک شعر تھا جسے ترنم سے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پڑھ رہا تھا۔"

"چلو یہی سہی۔ تم شعر بھی کہتے ہو؟"

"چاچا، میں کہاں شاعری کر سکتا ہوں۔ یہ تو کسی کا شعر تھا جو مجھے یاد ہو گیا تھا۔ ایسے بہت سے شعر مجھے یاد ہیں۔"

"یار تجھے شاید یقین نہ آئے۔ میں شعر کہتا ہوں۔ "برہا" اور "پچرا" (دیہاتی اصناف) میں بہت سے شعر کہہ رکھے ہیں۔"

"اچھا!" خلیل نے کہا۔ "مگر تم تو پڑھے لکھے بھی نہیں ہو۔"

"یہی تو کمال ہے۔ یقین نہیں تو سناؤں؟"

"ابھی نہیں۔ میں تمہارے گھر آؤں گا۔ آرام سے بیٹھ کر سنوں گا۔"

"چل جیسی تیری مرضی۔" بشیر خلیفہ نے کہا۔

خلیل اسی طرح دوڑتا ہوا گھر تک آ گیا۔ راستہ کٹ گیا تھا لیکن بشیر خلیفہ اس کے ذہن سے نہیں اترا تھا۔ وہ رات بھر اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اس پر رشک کرتا رہا۔ دوسرے دن اسکول گیا اور واپسی میں اپنے گھر آنے کی بجائے بشیر خلیفہ کے گھر پہنچ گیا۔

بشیر خلیفہ نے وعدے کے مطابق اسے اشعار سنائے اور وہ عادت کے مطابق اپنی کاپی پر لکھتا رہا۔ بشیر خلیفہ کو اس کی یہ عادت بڑی اچھی لگی۔

"یار تو ایک کام کر۔"

"کہو چاچا۔"

"تجھے معلوم ہے میں لکھتا تو جانتا نہیں۔ شعر کہتا ہوں۔ بہت سے بھول بھی جاتا ہوں۔ تو کبھی کبھی آ جایا کر میرے اشعار لکھ دیا کر۔"

"آ جایا کروں گا چاچا۔"

وہ پابندی سے ان کے گھر جانے لگا اور بڑے شوق سے ان کے اشعار کاپی پر اتار اتار کر انہیں دیتا رہا۔

تھوڑے دن نہیں گزرے تھے کہ خلیل کو بھی شوق ہوا کہ شاعری کرے۔ سوال یہ تھا کہ کیا شاعری کرے۔ وہ سوچتے سوچتے اس کیاری کی طرف گیا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے لگائی تھی۔ اس پھلواری کو دیکھتے ہی اسے نظم لکھنے کا خیال آیا۔ اپنے کمرے میں آیا اور نظم لکھنے بیٹھ گیا۔ چند گھنٹوں کی محنت کے بعد نظم تیار ہو گئی۔ یہ نظم والد نے سنی تو بے حد خوش ہوئے اور بے اختیار کہہ اٹھے۔ "ہمارے گھر میں بھی ایک شاعر پیدا ہو گیا ہے۔"

خلیل کو شاعر ہونے کا ثبوت دینا تھا لیکن ابھی نہ اس کی عمر ایسی تھی نہ تعلیم۔ ابھی تو اس نے درجہ چہارم پاس کیا تھا۔ درجہ چہارم پاس کرنے کے بعد اسے سرائے میر کے مڈل اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں اسے یہ آسانی تھی کہ "مدرسۃ الاصلاح" کی لائبریری اس کی دسترس میں تھی بلکہ دوسروں کے مقابلے میں اس مدرسے پر اس کا اختیار زیادہ تھا۔ اس لیے کہ یہ مدرسہ اس کے والد کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔ اس لائبریری کے محرکین میں بھی اس کے بھائی شامل تھے۔

وہ جب پہلے دن لائبریری میں گیا تو یہ دنیا ہی اس کے لیے نئی تھی۔ ہر طرف کتابیں دیکھ کر اس کا دل مچل گیا۔ لگتا تھا تمام کتابیں ایک ہی سانس میں ختم کر دے لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ کبھی ایک کتاب نکالتا تھا کبھی دوسری کی طرف

سوانحی خاکہ

نام: خلیل الرحمٰن
مشہور نام: خلیل الرحمٰن اعظمی
والد: مولانا محمد شفیع
تاریخ پیدائش: 9 اگست 1927ء
وطن: سیدھا سلطان پور، علی گڑھ
تعلیم گاہیں: سرائے میر، اعظم گڑھ، علی گڑھ یونیورسٹی
تعلیمی قابلیت: ایم اے اردو۔ پی ایچ ڈی
زوجہ: راشدہ خلیل
بیٹے: کامران، سلمان، عدنان
بیٹی: ہما فاطمہ
استاد شاعری: شاد عارفی
وفات: یکم جون 1978ء
تدفین: علی گڑھ

.....

شعری مجموعے

کاغذی پیرہن، نیا عہد نامہ، زندگی اے زندگی

تنقید

اردو میں ترقی پسند تحریک۔ فکر و فن۔ مقدمہ کلام آتش۔ زاویہ نگاہ۔ مضامین نو۔

لپکتا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس کتاب سے اپنے مطالعے کا آغاز کرے۔ لائبریرین بہت دیر سے اس کی یہ حالت دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے جانتا تھا اس لیے آرام سے بیٹھا تماشا دیکھ رہا تھا اور لائبریری کے کسی بھی گوشے میں جانے پر معترض نہیں ہو رہا تھا۔ اگر سمجھ رہا تھا تو یہ کہ بچہ ہے اس کو اس کے مطلب کی کوئی آسان کتاب نہیں مل رہی ہے۔ اس نے خلیل کو اپنے پاس بلایا۔

''خلیل میاں، تمہارے مطلب کی کتاب لائبریری کے دوسرے حصے میں ہو گی۔ بچوں کی کتابیں وہیں رکھی ہیں۔''

''مجھے بچوں کی نہیں بڑوں کی کتابوں سے مطلب ہے۔''

''کس مضمون سے دلچسپی ہے؟''

''شاعری۔''

''شاعری کی کتابیں یہ رکھی تو ہیں۔''

لائبریرین نے اقبال کی بانگ درا نکال کر اسے دی۔ وہ کچھ دیر ان نظموں کو پڑھتا رہا اور اپنی عادت کے مطابق پسندیدہ اشعار اپنی کاپی پر اتارتا رہا۔ لائبریرین اسے جانتا تھا اس لیے لائبریری سے باہر لے جانے کی اجازت بھی مل گئی۔

اس دور میں اس نے اقبال، چکبست، اکبر، جوش، سیماب، جگر وغیرہ کے مجموعے پڑھے۔ بہت سے ناول اور افسانے بھی پڑھ ڈالے۔

نثر کے اس مطالعہ کے نتیجے میں اسے خود بھی لکھنے کا شوق ہوا۔ لکھنے سے پہلے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اپنی تحریر کو اشاعت کے لیے کہاں بھیجے گا۔ وہ اس دور میں شائع ہونے والے رسائل سے ناواقف نہیں تھا۔ کئی رسائل بچوں کے لیے بھی شائع ہوتے تھے۔ ان میں بجنور سے نکلنے والا ''غنچہ'' بھی تھا۔ خلیل نے رات بھر جاگ کر ایک مضمون لکھا۔ اور غنچہ بجنور کو بھیج دیا۔ اسے اپنے قلم پر اعتماد تھا اور یقین تھا کہ یہ مضمون ضرور شائع ہوگا۔

اک دن اس کے نام ڈاک سے ''غنچہ'' کا شمارہ آیا۔ اس نے فہرست دیکھی تو خوشی سے جھوم اٹھا۔ اس کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اس کا مضمون تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ رسالے کے ساتھ ایک خط بھی آیا تھا جس میں استدعا کی تھی کہ وہ ایسے مضامین بھیجتا رہے۔ اس نے ایک مضمون ''نیا کھیل'' کے نام سے لکھا اور ''غنچہ بجنور'' کے نام روانہ کر دیا۔ اس کا یہ مضمون نہ صرف شائع ہوا بلکہ انعام کا حق دار بھی ٹھہرا۔

اس انعام نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور پوری طرح لکھنے کی طرف مائل ہو گیا۔ اس کی شہرت دیکھ کر کئی اور لڑکے اس کے قریب آ گئے۔ انہیں بھی مضمون نگاری کا شوق تھا۔ ان سب نے مل کر ایک قلمی رسالہ ''بیداری'' کے نام سے نکالا جس میں وہ خود بھی لکھتا تھا اور دوسرے ساتھیوں سے بھی مضامین لکھواتا تھا۔

اس کی ان ادبی سرگرمیوں نے اساتذہ کو بھی اس کا مداح بنا دیا۔ نصابی سرگرمیوں میں بھی اسے امتیازی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے اس کے والد کو بلایا اور انہیں مشورہ دیا کہ اگر وہ خلیل کو انگریزی اسکول میں بھیج دیں تو اس کی ذہانت ایسی ہے کہ مستقبل میں بڑا نام پیدا کرے گا۔

اس کے والد نے اس مشورے کی سخت مخالفت کی۔

''جناب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں اسے مدرسے کی بجائے اسکول تک لے آیا بس اتنا ہی بہت ہے۔ معاف کیجیے گا میں اسے انگریز نہیں بنا سکتا۔''

''جناب میں تو آپ کو وقت کی ضرورت کا احساس دلا رہا تھا۔ آگے آپ کی مرضی۔ ویسے اچھا ہے کہ آپ گھر میں مشورہ کر لیں۔'' ہیڈ ماسٹر نے کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں مشورہ کر کے آپ کو بتاؤں گا۔''

اس وقت تک انگریزی تعلیم کا آغاز ہو گیا تھا۔ علی گڑھ کالج قائم ہو چکا تھا لیکن اوسط درجے کے مسلمان اب بھی اپنے بچوں کو انگریزی پڑھانے سے گریزاں تھے اور مولانا شفیع تو عالم دین تھے۔ ان کا ایک مخصوص ذہنی پس منظر تھا، انہیں یہ رائے قبول کرنے میں تامل تھا لیکن جب خلیل کے چچا عبدالقادر تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے مولانا شفیع کو سمجھایا۔ وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ خلیل کی ذہانت اور شاندار مستقبل کے قصیدے پڑھے تو مولانا شفیع خلیل کو ہائی اسکول بھیجنے پر رضامند ہو گئے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ پہلے وہ ''مدرسۃ الاصلاح'' میں رہ کر عربی، فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کر لے۔

مدرسۃ الاصلاح میں چند ماہ کی تعلیم کے بعد خلیل کو شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں داخل کرا دیا گیا۔ وہ اپنے ادبی و مذہبی پس منظر کے ساتھ اعظم گڑھ چلا گیا۔

اس نے اپنی تعلیمی حیثیت یہاں بھی برقرار رکھی اور جلد ہی اساتذہ کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ تمام اساتذہ اس کی ذہانت اور لگن کے معترف ہو گئے۔ ایک واقعے نے تو اس کی قابلیت کے گویا جھنڈے ہی گاڑ دیے۔ واقعہ یوں ہوا کہ حساب کے استاد نے الجبرا کے کچھ سوالات حل کرنے کے لیے دیے۔ خلیل نے ان سوالوں کو بندھے ٹکے طریقے سے ہٹ کر حل کیا اور استاد کے سامنے پیش کر دیا۔

استاد نے دیکھا۔ جواب درست تھا۔ کوئی غلطی بھی نہیں رہ گئی تھی لیکن فارمولا وہ نہیں تھا جو کلاس میں بتایا گیا تھا۔ استاد نے خلیل سے پوچھا، تم نے یہ کیسے کیا؟ خلیل نے اپنا طریقہ انہیں سمجھایا اور بتایا کہ اسے یوں بھی حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کی اس جدت طرازی پر استاد کو حیرت بھی ہوئی اور اس پر فخر بھی ہوا۔ انہوں نے اس کا تذکرہ ہر استاد سے کیا اور یوں کئی دنوں تک اس کی علمیت کا چرچا ہوتا رہا۔

اس کے والدین نے اسے اعظم گڑھ بھیجتے ہوئے نصیحت کی تھی کہ وہ مطالعہ کی عادت ترک نہ کرے اور اس کے لیے دارالمصنفین، اعظم گڑھ کے کتب خانے سے استفادہ کرے۔

''وہاں تمہیں کئی عظیم شخصیات سے سابقہ پڑے گا۔ ان سے راہ و رسم رکھنا۔ کتابوں سے زیادہ فائدہ تمہیں ان کی صحبت سے ہوگا۔''

وہ اس کتب خانے کی سیر پابندی سے کرنے لگا۔

اس کی مضمون نگاری کا آغاز مڈل اسکول ہی میں ہو چکا تھا۔ ہائی اسکول میں آنے کے بعد اس شوق کو بریک لگ گئے۔ دارالمصنفین کے کتب خانے میں اس کی ملاقات مولانا عبدالباری آسی سے ہوئی۔ مولانا نے اس کی صلاحیتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کی حوصلہ افزائی فرمائی اور اسے لکھنے کی طرف مائل کیا۔

اس نے ''مولانا خلیل الرحمٰن مستقیمی'' کے نام سے بچوں کے پرچوں ''پیام'' دہلی ''پھول'' لاہور اور ''غنچہ'' بجنور میں بعض دلچسپ مضامین لکھے۔

''مستقیمی وہ اس مناسبت سے تھا کہ ضلع اعظم گڑھ میں قصبہ سرائے میر کے نزدیک واقع ان کے گاؤں کا نام ''سیدھا سلطان پور'' تھا۔ سیدھا کا ترجمہ عربی میں مستقیم ہوتا ہے اور اس طرح وہ اپنے نام کے ساتھ مستقیمی لکھتا تھا اور مولانا وہ اس مناسبت سے تھا کہ اس کا تعلق ایک عالم دین اور مذہبی گھرانے سے تھا۔

غزل

راستہ پر پیچ ہے اور ہم سفر کوئی نہیں
سب مرے ہم شکل ہیں مجھ سا مگر کوئی نہیں
ایک پرچھائیں نہ جانے کب سے میرے ساتھ ہے
جسم اس کے سیکڑوں ہیں اور سر کوئی نہیں
اس جہاں میں میرے ہونے کی گواہی کون دے
اک ہجوم اور اس میں چشمِ معتبر کوئی نہیں
شہر کی سڑکوں پہ آخر کس نے جادو کر دیا
سائے ہی سائے یہاں ہیں اور شجر کوئی نہیں
اپنے حصے میں رہا بس خود کلامی کا عذاب
اس جہاں سے اس جہاں کا نامہ بر کوئی نہیں
آ مری ویران آنکھوں میں سدا آباد رہ
اے مرے خوابِ جواں تیرا نگر کوئی نہیں

☆.....☆.....☆

کیا جانے کیا ہے جادو کیا اس میں دل کشی ہے
کہنے کو یوں تو وہ بھی ہم سا ہی آدمی ہے
پردے اٹھا دیے ہیں سب اس نے غیریت کے
بس درمیاں میں حائل دیوار دوستی ہے
گرد ملال کب سے پلکوں پہ جم رہی تھی
جی بھر کے رو لیے تو آنکھوں میں روشنی ہے
سب سوئے اپنی اپنی چادر میں منہ چھپا کر
اک بری بے کسی ہے جو اب بھی جاگتی ہے
ہم نے تو ہر قدم پر ٹھوکر لگائی اس کو
یہ نامراد دنیا کیا اور چاہتی ہے
اس جھوٹ سے بالآخر کب تک نباہ ہو گا
جب دل ہے زخم خوردہ ہونٹوں پہ کیوں ہنسی ہے

بعد میں اس کے نام کے ساتھ ''مولانا'' کا سابقہ اور ''مستقیمی'' کا لاحقہ ختم ہو گیا۔ مستقیمی کی بجائے ''اعظمی'' ہو گیا لیکن بے تکلف احباب اسے عرصہ تک مولانا کہتے رہے۔

وہ امتیازی نمبروں سے پاس ہوتا ہوا اگلی کلاسوں میں پہنچ گیا۔ اس کے باپ کو اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں لیکن اب ان کی صحت گرنے لگی تھی۔

وہ میٹرک میں تھا کہ اسے یہ روح فرسا خبر ملی کہ اس کے باپ پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ اس نے اسکول سے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

چھٹیاں لیں اور گاؤں پہنچ گیا۔ اس کا باپ بستر پر تھا۔ حالت ٹھیک نہیں تھی لیکن خلیل کو اس سنگینی کا احساس نہیں تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے بھی باور کرایا کہ والد صاحب بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے لہٰذا وہ چند دن گاؤں میں گزارنے کے بعد اعظم گڑھ لوٹ آیا۔

مولانا شفیع کی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ مولانا نے دو شادیاں کی تھیں اور دونوں سے اولادیں تھیں۔ جب مولانا کی بیماری نے طول پکڑا اور بچنے کی امید نہ رہی تو دونوں بیویوں کی اولادوں میں جائیداد کے معاملات پر جھگڑے ہونے لگے۔ سگے سوتیلے کے سوالات اٹھنے لگے۔ نوبت مقدمہ بازی تک پہنچ گئی۔ خاندان کے دیگر بڑوں کی وجہ سے معاملہ وقتی طور پر دب گیا لیکن دلوں میں دراڑیں ایسی پڑ گئیں کہ بھائیوں میں جو اتحاد تھا پارہ پارہ ہو کر رہ گیا۔

خلیل ان حالات سے بے خبر امتحان کی تیاری میں مصروف تھا کہ والد کے انتقال کا تار ملا۔ امتحان میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ وہ والد کی تدفین میں شریک نہ ہو سکا۔

اک جہنم کی طرح تھا یہ مرا گہوارہ
اس جہنم میں مرے باپ نے دم توڑ دیا
ٹوٹ کر رہ گئے بچپن کے سہانے سپنے
مجھ سے منہ پھیر لیا جیسے مری شوخی نے

☆☆☆

امتحان سے فارغ ہونے کے بعد وہ گاؤں گیا تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ وہ جس محبت و شفقت کا عادی ہو چکا تھا اس سے محروم ہو گیا۔ باپ کا بستر خالی تھا۔ خاندان میں نفسا نفسی تھی۔ آپس کے اختلافات نے گھر کو جہنم بنا دیا تھا۔ یہ جہنم اس وقت مزید گرم ہو گیا جب اس نے مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ جانے کا ارادہ کیا۔ اس فرسودہ خاندان میں علی گڑھ کا نام بھی آتش فشاں کی طرح پھٹا۔ سوتیلے بھائی تو اپنی جگہ اس کے اپنے بھائی بھی مخالفت پر اتر آئے۔ طرح طرح کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کسی نے کہا میٹرک سے آگے پڑھنے کی ضرورت کیا ہے۔ کسی نے علی گڑھ کالج کے بھاری اخراجات کی طرف توجہ دلائی۔ وہ ہر طرح کے طعنے برداشت کرتا رہا لیکن اپنی ضد سے باز نہ آیا۔

یہ تجویز بھی آئی کہ وہ شبلی کالج اعظم گڑھ میں داخلہ لے لے جہاں کم خرچ سے کام چل سکتا تھا لیکن اس پر علی گڑھ جانے کی دھن ایسی سوار تھی کہ اس نے اعلان کر دیا۔ ”میں علی گڑھ جاؤں گا یا پھر پڑھائی چھوڑ دوں گا۔“

اس کی ضد کے آگے سب کو ہتھیار پھینکنے پڑے۔ اسے کچھ رقم فراہم کی گئی اور اسے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔

علی گڑھ جانے سے پہلے وہ اعظم گڑھ گیا۔ عبدالباری آسی اسے سلیمان ندوی کے پاس لے گئے۔ سید صاحب یونیورسٹی کورٹ کے رکن تھے۔ انہوں نے خلیل کو نواب صدر یار جنگ کے نام سفارشی رقعہ دیا۔ ”حامل رقعہ ایک مذہبی گھرانے کے صاحب زادے ہیں۔ اب تک تمام امتحانات امتیازی نمبروں سے پاس کرتے چلے آئے ہیں۔ شعر و ادب سے بھی لگاؤ ہے۔ کئی مضامین رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے والد کا شمار ”مدرسۃ الاصلاح“ کے بانیوں میں ہوتا ہے مگر اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ مالی اعتبار سے بھی یہ گھرانا خوش حال نہیں۔ اگر انہیں ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے وظیفہ جاری کرا دیا جائے تو ان کا تعلیمی سفر آسان ہو جائے گا۔“

نواب صدر یار جنگ ایجوکیشنل کانفرنس کے روح رواں تھے۔ لہٰذا توقع تھی کانفرنس کی طرف سے عربی کا ایک وظیفہ مل جائے گا۔

خلیل یہ رقعہ لے کر علی گڑھ پہنچا اور نواب صاحب کے یہاں حاضر ہو گیا۔ نواب صاحب نے رقعہ دیکھا۔ خلیل سے دو چار سوالات کیے۔

نواب صاحب کی کرم نوازی سے یونیورسٹی میں داخلہ بھی مل گیا اور وظیفہ بھی منظور ہو گیا۔

اس قلیل وظیفے سے ان کے اخراجات پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ تھوڑے دنوں بعد ہی انہیں احساس ہو گیا کہ اس وظیفے میں اس کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ ایسے میں اسے وہ خط یاد آیا جو شبلی کالج کے پرنسپل بشیر احمد صدیقی نے رشید احمد صدیقی کے نام دیا تھا۔ اس زمانے میں ”ڈیوٹی سوسائٹی“ کی طرف سے قرض دیا جاتا تھا اس خط میں اسی ”قرض“ کی سفارش کی گئی تھی۔

اس نے یہ خط رشید احمد صدیقی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ انہوں نے خط ملاحظہ کیا اور حکم دیا۔

”میرے پاس اس وقت آیئے گا جب آپ کو ڈیوٹی سوسائٹی سے قرض کی ضرورت ہو۔“

یہ حوصلہ افزا جواب تھا لہٰذا اسے جب قرض کی ضرورت پڑتی رشید صاحب کی خدمت میں پہنچ جاتا۔

وظیفے، قرض کی رقم اور بھائیوں کی امداد کے طفیل اس کے تعلیمی سفر کا آغاز ہو گیا۔ یونیورسٹی کے تعلیمی ماحول اور

URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

ادبی سرگرمیوں نے اس کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔

اس ماحول میں رہتے ہوئے اس کی ادبی صلاحیتوں نے انگڑائی لی۔

وہ انٹرمیڈیٹ میں تھا کہ ایک دن اچانک اس نے اپنے دل میں ایک ایسی خلش محسوس کی جیسے اسے کسی سے محبت ہوگئی ہے۔ یہ سارا کھیل اس کی قوت متخیلہ کا تھا۔ ایک تصوراتی محبوبہ تھی جو اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔ نہ تو اس کی شکل وصورت تھی اور نہ کوئی نام اور پتا۔ اس محبوبہ کے بارے میں سوچنے کے لیے اسے گوشہ تنہائی درکار تھا لیکن ہاسٹل میں رہتے ہوئے تنہائی کا ملنا دشوار تھا۔ یہاں وہ کئی ساتھیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ رات گئے تک کمرے میں ہلہ گلا ہوتا رہتا۔ جب ذرا خاموشی ہوتی تو وہ بستر پر چلا جاتا۔ تصوراتی محبوبہ خیالوں میں آجاتی اور پچھلے پہر تک جاگتا رہتا۔

کئی بار وہ قلم ہاتھ میں لے کر بیٹھ گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی کے نام لمبا چوڑا خط لکھنا چاہتا ہے۔ پھر سوچتا رہا کہ کیا حماقت ہے۔ کس کو خط لکھوں اور کہاں بھیجوں؟

وہ اسی کیفیات سے گزر رہا تھا کہ ایک روز وہ کسی ارادے کے بغیر پچھلی بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے نوٹ بک نکالی اور کچھ لکھنے لگا۔ کلاس ختم ہوئی تو وہ ایک نظم لکھ چکا تھا۔ یہ اس کی پہلی باقاعدہ نظم تھی۔ اس کا آغاز یوں ہوتا تھا۔

پیکر حسن و حیا آہ یہ تصویر تیری
میری تخیل کا ہے ایک ادھورا شاہکار

اس نے اس نظم کا عنوان ''نقش ناتمام'' رکھا اور اشاعت کے لیے ''نیا دور'' بنگلور کی مدیرہ ممتاز شیریں کو بذریعہ ڈاک ارسال کردی۔

ممتاز شیریں نے یہ نظم پسند کی اور نیا دور میں شائع کر دی۔

وہ بچوں کے رسائل میں چھپتا رہا تھا لیکن کسی ادبی رسالے میں یہ پہلی نظم تھی جو شائع ہوئی تھی۔ اسے پہلی مرتبہ یقین ہوا کہ وہ ایسی شاعری کرسکتا ہے جو دوسروں کو متوجہ کر سکتی ہے۔ اب تو اس پر شاعری کا جیسے جنون سوار ہوگیا۔ چلتے پھرتے نظمیں نازل ہونے لگیں۔

اس زمانے میں عجیب عجیب نظمیں کہیں۔ ''زلیخا کی آنکھیں''..... ''آدرش''..... ''اجنبی سائے''..... ''تخیل کے دیوتا''..... ''خیام کے نام''..... ''حبس دوام'' وغیرہ۔

اس نے یہ نظمیں صرف لکھیں نہیں مختلف رسائل میں شائع بھی کرائیں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ عصر حاضر کے شعرا

''اقتباس''

تخلیقی ادب میں موضوع ادیب کے تخیل، اس کی قوت اختراع اس کے کائناتی مشاہدے اور اس کے شخصی ردعمل سے آمیز ہوکر ایک نئی کیفیت اختیار کرنا شروع کرتا ہے۔ اب وہ ایک سادہ موضوع سے ہٹ کر ادیب کا ذہنی اور حسی تجربہ بن جاتا ہے۔ اسی تجربے کو ہم ''مواد'' کہتے ہیں۔ مواد نشوونما کی ایک منزل سے گزرتا ہے جسے بعض لوگوں نے تخلیقی عمل سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں تک کہ تکمیل اور پختگی کا مقام آجاتا ہے اور مواد صورت پذیر ہوجاتا ہے۔ صورت پذیر ہونے سے پہلے مواد سیال شکل میں ہوتا ہے اور اس میں کوئی عضویاتی وحدت نہیں ہوتی۔ مگر ہیئت میں تبدیل ہونے کے بعد وہی مواد ایک زندہ وجود کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔

(اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک)

''خراج''

میں زندگی میں صرف دو آدمیوں کے وسیع مطالعے اور یادداشت سے متاثر بلکہ مرعوب ہوا ہوں۔ ایک تو قاضی عبدالودود اور دوسرے خلیل الرحمٰن خلیل اعظمی..... قاضی صاحب کی طرح خلیل کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ برسوں قبل پڑھی ہوئی کتاب کا حوالہ وہ اس طرح دیتے جیسے انہوں نے وہ کتاب کچھ دیر پہلے ہی پڑھی۔ کلاسیکی اور جدید ادب پر ان کی برابر نظر تھی۔

کس قسم کی نظمیں لکھ رہے ہیں اس نے ادبی دنیا، ہمایوں، نیا ادب، ساقی اور ادب لطیف وغیرہ کا مطالعہ شروع کردیا جن میں نئے ادیب جدت طرازیوں کا مظاہرہ کررہے تھے۔

اس کی یہ تمام نظمیں رومانوی تھیں۔ ایک ایسی ہستی کے گرد گھومتی تھیں جس کا مخاطب گوشت پوست کا زندہ وجود نہ تھا ایک خیالی محبوبہ تھی۔ ظاہر ہے ایسی شاعری خواب تو ہو سکتی تھی۔ زندہ تجربے کی حامل نہیں۔

اسے اس زندہ تجربے کی طرف لوٹنا تھا۔ وہ جلد ہی ترقی پسند تحریک سے منسلک ہوگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی نظموں میں رومان کے ساتھ انقلاب کا اضافہ ہوگیا۔

اس نے جب علی گڑھ میں قدم رکھا تھا تو علی گڑھ میں انجمن بطور تحریک ختم ہوچکی تھی۔ علی سردار جعفری وغیرہ گرفتار

کرتیں، گو کہ کچن کی پورے ذمے داری مجھ پر تھی لیکن میں اپنی مرضی سے کوئی چیز نہیں بنا سکتی تھی۔ گھر کا سارا خرچ ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ اپنی مرضی سے خریداری کیا کرتی تھیں۔ میرے معاملے میں ان کا دوہرا معیار تھا۔ تنہائی میں وہ مجھے خوب کچھ کہتی تھیں لیکن دوسرے لوگوں کے سامنے میری تعریف کرتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھکتی تھی۔ علی بھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ مجھے بہت چاہتی ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔ اس لیے اگر میں علی سے کوئی شکایت کرتی تو وہ اس پر بالکل بھی توجہ نہ دیتے بلکہ بعض اوقات تو مجھے ہی جھڑک دیتے۔

یہ صورت حال انتہائی تکلیف دہ تھی اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اس طرح ایک سال گزر گیا اور میں ایک پھول سے بچے کی ماں بن گی۔ عدنان کی پیدائش پر سب نے ہی خوشیاں منائیں۔ ساس صاحبہ تو اسے ایک پل کے لیے اپنے سے جدا نہیں کرتی تھیں۔ وہ میرے پاس صرف فیڈنگ اور سونے کے لیے آتا تھا۔ میں وہ ماں تھی جسے اپنے بچے کو گود میں لینے یا پیار کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ یہی بات میں نے علی سے کہی تھی تو وہ بولے۔ ''تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ امی اس کا اتنا خیال رکھتی ہیں اور تم با آسانی دوسرے کام کرسکتی ہو۔''

ایک دن مجھے مسز حسن کا خیال آیا۔ وہ سوشل ورکر تھیں اور ایک سماجی تنظیم چلاتی تھیں۔ ان سے میری ملاقات یونیورسٹی کے ایک سیمینار میں ہوئی تھی۔ انہیں نہ جانے میری کون سی بات پسند آگئی کہ تھوڑی دیر گفتگو کرنے کے بعد ہی انہوں نے مجھے اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا اور بولیں۔ ''اگر کبھی بھی میری ضرورت محسوس ہو تو بلا تکلف فون کرلینا۔'' اتفاق سے وہ کارڈ میرے پاس محفوظ تھا۔ میں نے ان کا نمبر ڈائل کر کے اپنا تعارف کروایا تو وہ فوراً مجھے پہچان گئیں۔

''کہو کیسے یاد کیا؟'' انہوں نے بڑی محبت سے پوچھا۔

''میڈم آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ ایک مشورہ کرنا ہے۔''

''ضرور تم جب چاہو میرے پاس آسکتی ہو۔''

''ٹھیک ہے میں ہفتے کے روز آؤں گی۔''

''آنے سے پہلے مجھے فون کر دینا تاکہ میں کہیں نہ جاؤں۔''

میں نے ہفتے کا دن بہت سوچ کر رکھا تھا۔ ویسے تو میرا گھر سے نکلنا نہیں ہوتا تھا لیکن ہفتے والے دن میں امی کے گھر جایا کرتی تھی۔ اتوار کی شام علی مجھے لے آیا کرتے تھے۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنی پابندیوں کے باوجود میری ساس نے میکے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دراصل یہ بھی ان کی ایک چال تھی۔ اس طرح وہ میرے میکے والوں کی نظر میں اچھی بننا چاہتی تھیں۔ ویسے بھی ہفتہ اتوار کو میری نندیں گھر پر ہوتی تھیں۔ اس لیے کام کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

ہفتے کی سہ پہر میں نے اپنے چھوٹے بھائی ارشد کو ساتھ لیا اور مسز حسن سے ملنے ان کے دفتر پہنچ گئی۔ وہ میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے ارشد کو واپس بھیج دیا اور کہا کہ وہ خود مجھے گھر چھوڑ دیں گی پھر انہوں نے میرے لیے چائے اور اسنیکس منگوائے اور بولیں۔ ''اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟''

میں نے انہیں شادی سے لے کر اس وقت تک کے تمام واقعات اور حالات سے آگاہ کیا۔ ساس، نندوں اور شوہر کے رویے کے بارے میں بتایا۔ اپنی بے بسی اور مظلومیت کا رونا رویا۔ وہ بڑے سکون اور توجہ سے میری داستان سنتی رہیں۔ بیچ بیچ میں کوئی سوال بھی کرلیتیں، جب میں نے اپنی بات ختم کی تو انہوں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگایا اور بولیں۔ ''تم نے اونٹ اور خیمے والی کہانی سنی ہے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''شاید یہ کورس کی کتابوں میں بھی ہے۔''

''بس تو تم بھی اونٹ بن جاؤ اور بدو کو خیمے سے نکال باہر کرو۔''

''آپ بھی کمال کر رہی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ اس وقت تو یہ حال ہے کہ میں گھر کی ایک چیز بھی اِدھر سے اُدھر اٹھا کر نہیں رکھ سکتی پھر پورے خیمے پر کس طرح قبضہ کرسکتی ہوں۔''

''میں اسی طرف آرہی ہوں۔ دیکھو یہ اقتدار کی جنگ ہے اور تمہیں اسے ہر حال میں جیتنا ہے۔''

''وہ کس طرح؟''

''وہی بتا رہی ہوں۔ تم نے بتایا کہ ساس نے گھر کی پوری ذمے داری تمہارے اوپر ڈال دی ہے لیکن تم بے اختیار ہو۔ اپنی مرضی سے سبزی بھی نہیں خرید سکتیں اور نہ ہی اپنی پسند کا کھانا بنا سکتی ہو۔ تمہارے بچے پر بھی انہوں نے قبضہ جما رکھا ہے۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

''جی بالکل ٹھیک ایسا ہی ہے۔''

''اب میری دو تین باتیں غور سے سنو۔ سب سے پہلے تو تمہیں اپنے دل سے سسرال والوں اور شوہر کا خوف نکالنا ہوگا۔ وہ بھی تمہاری طرح گوشت پوست کے انسان ہیں۔ کوئی شیر بھیڑیے نہیں جو تمہیں کھا جائیں گے۔ ڈھیٹ بن جاؤ۔ تمام چیزیں اپنے کنٹرول میں کرلو۔ سب سے پہلے تو اپنے بچے پر قبضہ جماؤ۔ بہانے بہانے سے اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ اور دیر تک اپنے پاس رکھو۔ وہ چاہے کتنی آوازیں دیتی رہیں۔ بچے کو لے کر ان کے پاس ہرگز نہ جاؤ اور اگر وہ خود لینے آئیں تو کسی بہانے انہیں ٹال دو۔ رفتہ رفتہ انہیں احساس ہوجائے گا کہ وہ بچے کی ماں نہیں بلکہ دادی ہیں اور اسے اپنی حقیقی ماں سے زیادہ دور نہیں رکھا جاسکتا۔

دوسرا مرحلہ شوہر کو قابو کرنے کا ہے۔ اس کے لیے تمہیں ان کا دل جیتنا ہوگا۔ یہ تو تم بتا ہی چکی ہو کہ وہ تمہیں بہت چاہتے ہیں لیکن جب عورت گھرداری میں مصروف ہو اور ایک بچے کی ماں بھی بن جائے تو اس کی توجہ اپنے آپ پر سے ہٹ جاتی ہے جب کہ شوہر اسے بنا سنورا دیکھنا چاہتے ہیں، تمہارے حلیہ سے ظاہر ہورہا ہے کہ تم نے بھی اپنے آپ پر توجہ دینا چھوڑ دی ہے۔ ایک بات یاد رکھو جن مردوں کو اپنی بیوی میں چارم نظر نہ آئے، وہ اِدھر اُدھر بھٹکنے لگتے ہیں۔ تمہیں اس خطرے کا سدباب کرنے کے لیے ابھی سے تیار ہوجانا چاہیے۔ تم یہ بتاؤ کہ علی کو کس لباس میں اچھی لگتی ہو یا وہ تم سے کون سا لباس بار بار پہننے کی فرمائش کرتے ہیں۔''

''انہیں ساڑی بہت پسند ہے۔ ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ میں ساڑی پہنا کروں۔'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''بس تو تم ساڑی کا استعمال زیادہ کرو۔ ان کے ساتھ کسی تقریب میں جاؤ تو ساڑی ہی پہنا کرو، وہ جب شام کو گھر آئیں تو کسی فلمی ہیروئن کی طرح بن سنور کر ان کا استقبال کرو۔ شام کی چائے کے ساتھ ان کی پسند کی کوئی چیز بنالیا کرو اور ان کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیا کرو۔''

''آپ بھول رہی ہیں کہ میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں بنا سکتی۔ ہر کام کے لیے ساس صاحبہ کی محتاج ہوں۔''

''اس معاملے میں تمہیں تھوڑا سا ڈھیٹ ہونا پڑے گا۔ اگر تم شوہر کے لیے کوئی چیز بناؤ گی تو وہ تمہیں منع نہیں کریں گی اور اگر وہ تمہیں ایسا کرنے سے روکیں تب بھی تم اپنا کام کرتی رہنا۔ تھک ہار کر خود ہی خاموش ہوجائیں گی۔''

''ایک اور اہم بات یہ ہے کہ تمہیں علی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا ہے۔ جب وہ گھر میں ہوں تو تم دوسرے لوگوں کو بالکل نظر انداز کر کے ان کے ساتھ چپک جاؤ۔ آئے دن کسی نہ کسی بہانے ان کے ساتھ باہر چلی جایا کرو۔ کبھی ڈاکٹر کے یہاں جانا ہے تو کبھی بازار۔ علی کے دوستوں اور اپنی سہیلیوں کے گھر جانا شروع کردو۔ ہوسکے تو کم از کم ہفتے میں ایک بار ان سے فرمائش کرو کہ وہ تمہیں کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلائیں۔ یقیناً تمہاری ساس کو یہ بہت ناگوار گزرے گا اور وہ اس پر اعتراض بھی کریں گی لیکن تم ڈھیٹ بن جانا اور اپنی روش جاری رکھنا۔ اس طرزِ عمل سے تم انہیں یہ باور کرا سکتی ہو کہ میرا شوہر صرف میرا ہے اور جس دن یہ بات ان کی سمجھ میں آگئی وہ خاموش ہو جائیں گی۔''

''یہ اتنا آسان نہیں جیسا آپ سمجھ رہی ہیں۔ وہ کبھی بھی یہ برداشت نہیں کریں گی کہ میں علی کے ساتھ باہر جاؤں۔''

''وہ کیا کرلیں گی۔ تمہارا ہاتھ تو نہیں پکڑ سکتیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ تمہیں دو چار باتیں سنا دیں گی یا ناراضگی کے اظہار کے لیے منہ لپیٹ کر لیٹ جائیں گی۔ ان باتوں سے تمہاری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ تم اپنی روش جاری رکھنا۔ اس طرح اپنی ساس کو یہ جتا سکو گی کہ تمہیں اپنی آزادی اور خودمختاری میں کسی کی مداخلت گوارہ نہیں۔''

''میں آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ اتنا آسان ہوگا۔''

''یہ اسی وقت آسان ہوسکتا ہے جب تم اپنے دل سے سسرال کا ڈر اور خوف نکال دو اور اس کا واحد حل یہی ہے کہ تم ڈھیٹ بن جاؤ، کوئی کچھ بھی کہتا رہے، کسی کی مت سنو۔ وہی کرو جو تمہارا دل چاہے آہستہ آہستہ سب کی زبانیں خاموش ہوجائیں گی۔''

یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکیں اور پھر مجھے غور سے دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''اب میں تمہیں سب سے اہم بات بتا رہی ہوں جس پر عمل کر کے تمہاری زندگی پُرسکون ہوسکتی ہے اور تم پورے گھر پر راج کرسکتی ہو۔''

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''سب کچھ ممکن ہے اگر تم ہمت کرو۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولیں۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ ساس نے گھر کی

ساری ذمے داری تمہارے اوپر ڈال دی ہے اور خود سب کاموں سے بری الذمہ ہوگئی ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ جو کام کرتا ہے۔ اسے اختیار بھی چاہیے اور بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اگر اختیارات مانگنے سے نہیں ملتے تو چھین لیے جاتے ہیں۔ تمہیں بھی یہی کرنا ہوگا۔ مثلاً کھانا تم پکاتی ہو لیکن ساس سے پوچھنا پڑتا ہے کہ آج کیا پکے گا۔ کبھی کبھی اپنی پسند اور مرضی کے مطابق بھی کھانا بنالیا کرو۔ پھر دیکھو وہ کیا کہتی ہیں اگر بولیں تو اسے نظر انداز کردو اور اگر خاموش رہیں تو انہیں مکمل طور پر اس ذمے داری سے سبکدوش کردو۔ اس طرح گھر کے معاملات آہستہ آہستہ اپنے کنٹرول میں کرلو پھر دیکھنا ایک وقت ایسا آئے گا کہ یہ سب لوگ ہر بات کے لیے تمہارے محتاج ہوکر رہ جائیں گے۔ انہیں زیرو بنادو اور خود ہیرو بلکہ ہیروئن بن جاؤ۔"

"آپ کی باتیں ناقابلِ یقین لگتی ہیں۔" میں نے الجھتے ہوئے کہا۔ "آپ میری ساس کو نہیں جانتیں۔ وہ کس قماش کی عورت ہیں۔ انہوں نے ہر چیز پر قبضہ کیا ہوا ہے۔"

"دیکھو منزل تک پہنچنے کے لیے پہلا قدم اٹھانا ضروری ہوتا ہے۔ جب تم یہ قدم اٹھاؤ گی تو وہ سمجھ جائیں گی کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ ان کی جگہ لینے کے لیے تم آگئی ہو اور انہیں ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ حکومت بھی ساٹھ سال کی عمر کو پہنچنے پر اپنے ملازمین کو ریٹائر کردیتی ہے پھر تمہاری ساس کو یہ حق کس نے دیا کہ وہ تاحیات گھر کی ملکہ بنی رہیں۔"

میں دم بخود ان کی باتیں سن رہی تھی۔ مجھے گومگو کے عالم میں دیکھ کر وہ بولیں۔ "یہ ایک ایسا جوا ہے جس میں تمہارے پاس ہارنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ جیتنے کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ اگر تمہیں کسی کی ناراضی کا ڈر ہے تو اسے دل سے نکال دو۔ یہ لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اس وقت وہ حاکم اور تم محکوم ہو اگر تم نے میرے مشوروں پر عمل کیا تو ایک دن اس کے الٹ ہو جائے گا۔ یعنی تم حاکم اور وہ محکوم ہوں گی۔"

"ناممکن۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"مجھے اس لفظ سے چڑ ہے۔ دنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں اور وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو ناممکن کو ممکن بنانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اگر تم صحیح معنوں میں آزادی اور خودمختاری چاہتی ہو تو میرے کہے پر فوراً عمل شروع کردو۔"

گھر آنے کے بعد میں بھی بہت دیر تک ان کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ بظاہر یہ ناممکن نظر آرہا تھا لیکن دل نے صلاح دی کہ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ مسز حسن نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ واقعی میرے پاس کھونے کے لیے کچھ نہیں ہے پھر مجھے کس بات کا ڈر، چنانچہ میں نے یہ جوا کھیلنے کا فیصلہ کرلیا۔ پہلا مرحلہ بچے کو ان سے دور کرنے کا تھا۔ میں نے یہی کیا۔ جتنی دیر کام کرتی۔ عدنان میری ساس کے پاس رہتا۔ اس کے بعد میں اسے سلانے کے بہانے اپنے کمرے میں لے جاتی اور پورے وقت ہی اپنے پاس رکھتی۔ اگر وہ کہتیں بھی تو کوئی بہانہ کرکے انہیں ٹال دیتی۔ رفتہ رفتہ وہ سمجھ گئیں کہ میں بچے کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی ہوں پھر انہوں نے اسے بلانا چھوڑ دیا۔ اب یہ میری مرضی پر منحصر تھا کہ عدنان کو کب اور کتنی دیر کے لیے ان کے پاس چھوڑتی ہوں۔ میں نے مسز حسن کو فون کرکے یہ بات بتائی تو وہ بولیں۔ "میں نے کہا تھا نا کہ وہ کچھ نہیں کرسکتیں۔ اسی طرح تم دوسرے مشوروں پر بھی عمل کرو۔ اللہ نے چاہا تو اچھا نتیجہ سامنے آئے گا۔"

دوسرا مرحلہ شوہر کو قابو کرنے کا تھا۔ مسز حسن کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے میں نے اپنے آپ پر توجہ دینا شروع کی۔ گھر کے قریب ہی ایک بیوٹی پارلر تھا۔ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوکر میں نے چھوٹی نند کو ساتھ لیا اور وہاں چلی گئی۔ یہ بھی میری ایک چال تھی۔ اگر اکیلے جاتی تو ساس کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا۔ لیکن بیٹی کے ساتھ جانے پر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ میں نے فیشل کروایا، بھنویں بنوائیں اور رشوت کے طور پر نند کی بھنویں بھی بنوادیں۔ وہ بے چاری بھی خوش ہو گئی۔ فیشل کرانے سے میرے چہرے پر نکھار آگیا۔ گھر آنے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا۔ علی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا میں ہلکا سا میک اپ کرکے ان کے انتظار میں بیٹھ گئی۔ جیسے ہی گاڑی کے ہارن کی آواز آئی میں تیزی سے چلتی ہوئی بیرونی دروازے پر گئی اور ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے مجھے حیرانی سے دیکھا اور بولے۔ "کہیں جانے کی تیاری ہے؟"

"کیوں؟ اپنے گھر میں بننے سنورنے پر پابندی ہے کیا؟"

"ارے نہیں، میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا۔" میں ان کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے میں آئی تو انہوں

نے مجھے اپنے قریب کرتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''آج تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔''

''اس سے پہلے بری لگتی تھی کیا؟'' میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

''ارے نہیں میری جان، بس تم اسی طرح بنی سنوری رہا کرو۔'' وہ بہت رومانٹک ہو رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کوئی پیش قدمی کرتے میں نے اپنے آپ کو الگ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ فریش ہو جائیں۔ میں چائے بناتی ہوں۔''

میں نے بیسن پہلے سے گھول کر رکھا ہوا تھا۔ جلدی جلدی پکوڑے تلے، چائے بنائی۔ ایک پلیٹ میں بسکٹ رکھے اور سارا سامان کھانے کی میز پر سجا دیا۔ جانتی تھی کہ علی کو پکوڑے بہت پسند ہیں لیکن ساس صاحبہ کی نظر میں تو شام کی چائے بھی ایک فضول خرچی تھی۔ پکوڑے کہاں سے بنتے۔ علی منہ ہاتھ دھو کر آئے تو چائے کے ساتھ پکوڑے اور بسکٹ دیکھ کر خوش ہو گئے اور بولے۔ ''آج تو تم نے بڑا اہتمام کر ڈالا۔ کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''نہیں کوئی خاص بات نہیں۔'' میں نے ساس صاحبہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو پکوڑے پسند ہیں اس لیے بنا لیے۔''

میری بڑی نند بولی۔ ''واہ بھابی! آج تو چائے پینے کا مزہ آ گیا۔''

ساس صاحبہ سے یہ کیسے برداشت ہوتا کہ کوئی میری تعریف کرے، فوراً بولیں۔ ''بہو ذرا دیکھ بھال کر خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ مہینا پورا ہونے سے پہلے ہی سامان ختم ہو جائے۔''

علی ہنستے ہوئے بولے۔ ''کوئی بات نہیں اور آ جائے گا۔''

''پھر تم ہی لانا، میری اتنی گنجائش نہیں کہ بار بار چیزیں منگواؤں۔''

علی نے کوئی جواب نہیں دیا اور مزے سے پکوڑے کھاتے رہے۔ گھر کے سبھی لوگوں کو یہ اہتمام پسند آیا تھا۔ اس لیے میں نے فیصلہ کر لیا کہ ساس کچھ بھی کہتی رہیں لیکن میں روزانہ شام کی چائے کے ساتھ کوئی نہ کوئی چیز ضرور بنایا کروں گی۔

اس روز علی بہت زیادہ رومانٹک ہو رہے تھے۔ رات سونے کے لیے لیٹے تو انہوں نے مجھے اپنے قریب کر لیا

حالانکہ ہمارا پروگرام ہفتے کی شب ہوا کرتا تھا لیکن اس رات وہ کچھ زیادہ ہی بے صبرے ہو رہے تھے۔ میں نے بھی کوئی مزاحمت نہیں کی کیونکہ شوہر کی خواہش کا احترام کرنا میرا فرض تھا۔ دوسرے ان کمزور لمحوں سے فائدہ اٹھا کر ان سے کچھ باتیں منوانا چاہتی تھی۔ جب وہ سونے لگے تو میں نے ان سے کہا۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ روزانہ چائے کے ساتھ کچھ بناؤں لیکن.....''

''ہاں ہاں بولو رک کیوں گئیں۔''

''گھر کا سارا خرچ امی کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ مجھے کچھ پیسے دے دیں تو تھوڑا سا سامان لا کر رکھ لوں تاکہ انہیں کوئی شکایت نہ ہو۔''

''ٹھیک ہے صبح دے دوں گا۔'' وہ کروٹ لیتے ہوئے بولے۔

''ایک بات اور۔'' میں نے ان کا کندھا پکڑتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے آج شیڈول کی خلاف ورزی کی ہے اس کا جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔''

''کیسا جرمانہ؟''

''ہفتے کی شب آپ مجھے کسی اچھے سے ریسٹورنٹ میں کھانا کھلائیں گے ورنہ.....''

''ورنہ کیا؟''

''پھر ٹائیں ٹائیں فش، پھر کوئی پروگرام نہیں ہوگا۔ میں امی کے گھر چلی جاؤں گی۔''

''ارے ایسا غضب مت کرنا۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔''

''صرف میں اور آپ جائیں گے۔ پورے گھر کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں۔''

''سوچ لو، میرا تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ تم کو ہی باتیں سننا ہوں گی۔''

''سن لوں گی۔ میرا بھی حق بنتا ہے کہ کچھ وقت آپ کے ساتھ گزاروں۔''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔''

دوسرے دن انہوں نے مجھے دفتر جانے سے پہلے پانچ ہزار روپے دیئے اور بولے۔ ''اس کی بھنک بھی امی کو نہیں پڑنی چاہیے ورنہ وہ میرا جینا عذاب کر دیں گی۔''

''جب میں سامان لے کر آؤں گی تو وہ پوچھیں گی نہیں کہ اس کے لیے پیسے کہاں سے آئے؟''

''کہہ دینا کہ تم نے جیب خرچ سے بچا کر کچھ پیسے جمع

کیے تھے۔"

میں بازار گئی اور مختلف چیزیں تیار کرنے کے لیے مچھلی، مرغی، آلو، بیسن، سموسے بنانے کی ورقیاں، ٹماٹو ساس اور مختلف قسم کی چٹنیاں لے کر آگئی۔ ساس نے جو یہ سامان دیکھا تو ان کا پارہ ایک دم ہائی ہوگیا اور بولیں۔ "یہ اتنا سارا سامان کس خوشی میں لائی ہو کیا کوئی دعوت ہو رہی ہے؟"

"علی چاہتے ہیں کہ روزانہ شام کی چائے کے ساتھ کوئی نہ کوئی چیز بنایا کروں۔ یہ سامان اسی لیے لے کر آئی ہوں۔"

"پیسے علی نے دیئے تھے؟" انہوں نے تفتیش کرنے کے انداز میں پوچھا۔

"جی نہیں، اپنے پاس سے لائی ہوں۔ میں نے اپنے جیب خرچ میں سے کچھ پیسے بچائے تھے اسی سے یہ سامان لائی ہوں۔"

"میری نظر میں یہ فضول خرچی ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تم اپنے لیے کوئی چیز لے آتیں۔"

میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ان سے بحث کرنا بے کار تھا۔ وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھیں اور اپنی بات اوپر رکھتی تھیں۔ اس روز بھی میں نے علی کے آنے سے پہلے لباس تبدیل کیا۔ کچن میں جا کر مرغی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنائے اور ان پر مصالحہ لگا دیا۔ آج میرا چکن نگٹس بنانے کا پروگرام تھا۔ اس کے ساتھ آلو کے چپس بھی رکھنے تھے۔ ان کاموں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آئی۔ منہ ہاتھ دھو کر ہلکا سا میک اپ کیا اور بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ علی کو یہی انداز پسند تھا۔

اس روز بھی میں نے دروازے پر جا کر ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ ان کا استقبال کیا اور ان کے ساتھ چلتی ہوئی کمرے میں آئی۔ انہوں نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولے۔ "آج تو تم قیامت ڈھا رہی ہو۔"

میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے کہ آپ کو بھی میری تعریف کرنے کا خیال آیا۔"

"اس سے پہلے تم نے موقع ہی کب دیا۔ بس تم اسی طرح رہا کرو۔ اچھی لگتی ہو۔"

"جو حکم سرکار کا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ فریش ہو کر آجائیں۔ آج میں نے آپ کے لیے ایک خاص چیز بنائی ہے۔"

میں نے جلدی جلدی نگٹس اور آلو کے چپس تلے۔ چائے بنائی۔ ٹماٹو ساس اور چٹنی کی بوتل پہلے ہی میز پر رکھ چکی تھی۔ سب لوگوں نے مزے لے لے کر کھایا۔ چھوٹی نند بولی۔ "بھابی! آپ کی بنائی ہوئی ہر چیز لاجواب ہوتی ہے۔ مجھے بھی سکھا دیں۔ میں کل سے کچن میں آپ کے ساتھ کام کروں گی۔"

"اور میں بھی۔" بڑی نند بولی۔ "مجھے تو کچھ بھی بنانا نہیں آتا۔"

"میرے ساتھ رہو گی تو بہت جلد سب کچھ سکھا دوں گی۔"

ساس کو یہ گفتگو پسند نہ آئی۔ انہوں نے دونوں لڑکیوں کو باری باری گھورا اور ترخ کر بولیں۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے وقت ضائع کرنے کی۔ تم دونوں اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔"

"پڑھائی تو رات کو ہوتی ہے۔ دن میں ہم فارغ ہوتے ہیں۔" چھوٹی نے جواب دیا۔

علی نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور بولے۔ "کیا حرج ہے اگر یہ کچھ سیکھ جائیں تو آگے چل کر انہی کے کام آئے گا۔"

اس کے بعد ساس صاحبہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا اور وہ خاموش ہوگئیں۔ میں نے بھی سوچا کہ یہ ایک اچھا موقع ہے۔ اگر میں دونوں نندوں کو ساتھ ملا لوں تو ساس صاحبہ تنہا ہو جائیں گی اور انہیں مجھ پر زبردستی کرنے کا حوصلہ نہیں ہوگا۔ میں جب رات کا کھانا بنانے لگی تو دونوں کو اپنے ساتھ لگا لیا اور ان سے کہا کہ وہ چند روز مجھے کھانا بناتے دیکھیں اور مختلف ترکیبیں اپنے پاس لکھتی جائیں۔ یہ میں نے اس لیے کیا کہ اگر ایک دم ان سے کام کرواؤں گی تو کہیں وہ گھبرا نہ جائیں۔

میرا اصل امتحان ہفتہ کی شام کو ہوا جب مجھے علی کے ساتھ کھانا کھانے باہر جانا تھا۔ اس روز میں نے گھر والوں کے لیے دوپہر میں ہی رات کا کھانا بنا دیا تھا۔ شام کو میں بن سنور کر علی کے ساتھ باہر جانے لگی تو ساس کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم ان سے اجازت لیے بغیر کہیں جا رہے تھے۔ ان سے برداشت نہ ہوا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بولیں۔ "اس وقت تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟"

ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر علی بولے۔ "ایک دوست نے دعوت پر بلایا ہے۔ وہیں جا رہے ہیں۔"

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''اور تم نے مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔'' وہ آنکھیں نکالتے ہوئے بولیں۔

''ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس کا فون آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جاتے وقت آپ کو بتا دوں گا۔'' علی نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

اب ساس صاحبہ کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ دانت پیس کر رہ گئیں۔ اس رات ہم نے خوب انجوائے کیا۔ کھانے کے بعد ہم لوگ ساحل سمندر چلے گئے۔ چاندنی رات میں سمندر بہت حسین لگ رہا تھا۔ ہم کافی دیر سمندر کے کنارے ٹہلتے رہے بارہ بجے کے قریب واپسی ہوئی۔ گھر میں سناٹے کا راج تھا۔ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ مجھے اسی ردِعمل کی توقع تھی لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی اور علی کا ہاتھ پکڑ کر سیدھی اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ جہاں ایک حسین رات ہماری منتظر تھی۔ میں نے علی کو پوری طرح اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔ سونے سے پہلے میں نے ان سے وعدہ لے لیا کہ اب ہم ہر ہفتہ کی شام باہر گزاریں گے۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ کچن میں گئی تو وہاں رات کے جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اتوار کو ماسی بھی نہیں آتی تھی۔ اس لیے وہ سب برتن مجھے ہی دھونا پڑے۔ اس کام سے فارغ ہو کر ناشتا بنایا۔ سسر صاحب کو ناشتے میں پراٹھے اور آملیٹ پسند تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی سب نے ہی اس کی فرمائش شروع کر دی لیکن اس روز میں نے مینو تبدیل کر دیا اور جاتے کے ساتھ ڈبل روٹی، مارجرین اور جیلی میز پر رکھ دی۔ ساس صاحبہ کیسے برداشت کر سکتی تھیں کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی تبدیلی کی جائے۔ یہ چیزیں دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئیں۔

''یہ کیا ہے بہو، انڈے پراٹھے کیوں نہیں بنائے؟''

''کیس کا پریشر ہی نہیں ہے۔ بڑی مشکل سے تو چائے بنی ہے۔'' میں نے معصومیت سے کہا۔ اس کے بعد وہ کچھ نہیں بولیں۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''ویسے آپ لوگوں کو انڈے پراٹھے نہیں کھانے چاہئیں۔ اس سے کولیسٹرول بڑھ جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں بلڈ پریشر اور دل کے امراض لاحق ہو سکتے ہیں۔''

''بات تو سولہ آنے صحیح ہے۔'' علی بولے۔ ''میں تو اب ڈبل روٹی سے ہی ناشتا کروں گا۔''

دونوں نندوں نے بھی ان کی تائید کی اور بولیں۔

''بھابی! ہمارے لیے بھی پراٹھے نہ بنایا کریں۔ ڈبل روٹی ہی ٹھیک ہے۔''

سسر صاحب بھی بول پڑے۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹی۔ واقعی یہ چیزیں مضرِ صحت ہیں۔''

ساس صاحبہ کہاں ہار ماننے والی تھیں۔ ''بھئی تم لوگ کچھ بھی کہو۔ مجھے تو پراٹھے کے بغیر ناشتا کرنے کا مزہ نہیں آتا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آپ کے لیے ایک پراٹھا بنا دیا کروں گی لیکن یہ آپ کی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔''

اس کے بعد وہ خاموش ہو گئیں اور انہوں نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ اس طرح میں نے بڑی ہوشیاری سے ناشتا بنانے کی مشقت سے اپنی جان چھڑا لی۔ پھر دوپہر کے کھانے پر بھی یہی ہوا۔ میں نے ساس سے نہیں پوچھا کہ کیا بناؤں بلکہ علی کو بازار بھیج کر سبزیاں منگوائیں اور چائنیز راشن کے ساتھ سبزیوں کا سوپ بنا کر میز پر رکھ دیا۔ گھر کے سب لوگوں نے مزے لے کر یہ کھانا کھایا۔ بڑی نند بولی۔

''اب ہمیں چائنیز جانے کی ضرورت نہیں۔ بھابی تو گھر میں ہی چائنیز کھانے بنا لیتی ہیں۔''

میں نے کن انکھیوں سے ساس کی طرف دیکھا۔ ان کا منہ سوجا ہوا تھا۔ میں ان کے غصے کی وجہ جانتی تھی کیونکہ میں نے ان سے پوچھے بغیر اپنی مرضی سے کھانا بنا لیا تھا۔ اس موقع پر مجھے شرارت سوجھی اور میں نے انہیں چھیڑنے کے لیے کہا۔

''امی آپ کچھ نہیں لے رہیں۔ کیا پسند نہیں آیا؟''

''بی بی! ہمیں تو دیسی کھانے ہی اچھے لگتے ہیں۔ ہم سے یہ الا بلا نہیں کھائی جاتی۔''

''آپ چکھ کر تو دیکھیں۔ اگر مزہ نہ آئے تو پیسے واپس۔'' یہ کہہ کر میں نے ان کی پلیٹ چاولوں سے بھر دی اور اس پر ڈھیر سارا سوپ ڈال دیا۔ انہوں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

''اب تم بھی مجھ سے مذاق کرو گی۔'' یہ کہہ کر انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پوری پلیٹ صاف کر دی۔ یہ میری پہلی کامیابی تھی جس پر میں خوشی سے پھولی نہ سماتی اور میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ شام کو میں نے فرائی فش، آلو کے چپس اور مرغی کا قورمہ بنایا۔ ان کھانوں کی بھی سب لوگوں نے دل کھول کر تعریف کی۔ ساس صاحبہ نے بھی کوئی خاص نکتہ چینی نہیں کی بس اتنا ہی کہا کہ کھانے میں ایک ہی ڈش ہونی چاہیے۔ ورنہ علی سے کہنا پڑے گا کہ گھر کے خرچ کے لیے زیادہ پیسے

دیا کرے۔

ان کا کہنا بھی صحیح تھا کیونکہ سب نے مچھلی ہی کھائی۔ قورمہ کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ میں نے وہ سالن دوسرے دن کے لیے محفوظ کرلیا۔ اس کے بعد میں اپنی مرضی سے کھانا بنانے لگی۔ البتہ جب میری سمجھ میں نہ آتا تو ان سے پوچھ لیتی کہ آج کیا پکاؤں۔ میں نے رسالوں اور نیٹ سے کھانوں کی مختلف ترکیبیں سیکھیں اور آئے دن انہیں آزمانے لگی۔ سب گھر والے خوش تھے کہ انہیں نت نئی چیزیں کھانے کو مل رہی تھیں۔ گو کہ خرچ کچھ بڑھ گیا تھا لیکن میں علی سے پیسے لے کر پورا کرلیا کرتی تھی۔

اس طرح آہستہ آہستہ میں نے بہت سی چیزیں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اب نہ صرف یہ کہ کچن کا پورا انتظام میں نے سنبھال لیا تھا بلکہ سودا سلف بھی خود ہی لانے لگی۔ میری ساس نے کبھی مہینے کا سودا اکٹھا نہیں منگوایا۔ جب کوئی چیز ختم ہو جاتی تو منگوالیتی تھیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ پیسے ختم ہو گئے تو ادھار سامان منگوانا پڑا۔ مجھے اس بات سے سخت چڑ تھی لہٰذا جب پہلی تاریخ آئی اور علی نے انہیں گھر کے خرچ کے لیے پیسے دیئے تو میں کاپی لے کر ساس کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔ ”امی جو چیزیں منگوانی ہیں۔ ان کی فہرست بنوالیں۔ میں پورے مہینے کا سودا لے آؤں گی۔“

یہ بات بھی میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے کہہ دی تھی۔ ورنہ مجھے اندازہ تھا کہ کون سی چیز کتنی مقدار میں آنی ہے۔ انہوں نے مجھے حیرت سے دیکھا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو جو ان کی سمجھ میں آگیا کہ تبدیلی آگئی ہے اور اب وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔ لہٰذا شکست خوردہ لہجے میں بولیں۔ ”تم خود ہی فہرست بنالو۔ کچن تو تم ہی چلا رہی ہو۔ اس لیے تمہیں اندازہ ہوگا کہ کن چیزوں کی ضرورت پڑسکتی ہے۔“

اس کے بعد میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ خود ہی فہرست بنائی۔ ان سے پیسے لیے اور علی کے ساتھ ایک بڑے سپر اسٹور میں چلی گئی۔ جس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہاں بازار سے دس فی صد کم قیمت پر خالص اور معیاری چیزیں ملتی ہیں۔ میں جب سامان سے لدی پھندی گھر واپس آئی اور ساس کو باقی پیسے واپس کیے تو وہ حیران رہ گئیں اور بولیں۔ ”میں نے تو حساب سے دیئے تھے پھر اتنے پیسے کیسے بچ گئے؟“

”اکٹھے سامان خریدنے میں یہی تو فائدہ ہے اور پھر میں نے جس اسٹور سے خریداری کی ہے وہاں بازار سے کم قیمت پر چیزیں ملتی ہیں۔“

اس کے بعد میں نے گھر کے دوسرے معاملات بھی اپنے ہاتھ میں لینا شروع کردیئے۔ مجھے کئی جگہ بے ترتیبی اور بدنظمی نظر آئی۔ صبح کے ناشتے میں انڈے پراٹھوں کا سلسلہ تو میں پہلے ہی ختم کرچکی تھی۔ اب میں نے کھانے کے نظام پر توجہ دینا شروع کی۔ ہمارے گھر میں دونوں وقت کھانا پکتا تھا اور عام طور پر دوپہر کے کھانے میں دو ڈشیں بنائی جاتیں۔ پہلے ساس صاحبہ نے حکم دیا کہ دال چاول بنالو پھر خیال آیا کہ چھوٹی چاول نہیں کھاتی۔ اس کے لیے تھوڑا سا آلو قیمہ بھی بنالو۔ شام کو دوبارہ کوئی ڈش بنائی جاتی اور بچا ہوا کھانا فریج میں رکھ دیا جاتا۔ عام طور پر یہ لوگ فریج میں گوشت، دودھ، پھل اور سبزیاں رکھتے ہیں۔ ہمارے گھر میں تین دن کے بچے ہوئے سالن، سبزی کی بھجیا اور بچی ہوئی سلاد رکھی ہوتی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس چیز کو ختم کیا۔ اب میں دوپہر کو ایک سالن بناتی جو دونوں وقت چلتا۔ اس کے دو فائدے ہوتے ایک تو میں دو دفعہ کھانا بنانے سے بچ جاتی اور دوسرے فریج میں بچا ہوا کھانا رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ میں ضرورت کے مطابق ہی کھانا بناتی تھی۔ اس لیے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اگر بچ جاتا تو وہ دوسرے وقت کام آجاتا۔

رفتہ رفتہ میں نے گھر کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ساس کی حیثیت ایک معزول حکمراں جیسی ہوگئی۔ پھر خدا کا کرنا یہ ہوا کہ وہ شدید بیمار ہوگئیں اور انہیں ایک ہفتے اسپتال میں رہنا پڑا۔ اسی دوران پہلی تاریخ آگئی۔ علی نے گھر کے خرچ کے پیسے مجھے پکڑا دیئے اور بولے۔ ”تمہیں گھر کے اخراجات کے لیے پیسوں کی ضرورت ہو گی۔ یہ رکھ لو جو بچ جائیں گے وہ امی کو دے دینا۔“

مجھے واقعی پیسوں کی ضرورت تھی کیونکہ پہلی تاریخ کو ہی میں مہینے کا سامان خریدنے اسٹور جایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ ماسی، دھوبی، کچرے والے اور چوکیدار کو تنخواہ دینے کے علاوہ بلوں کی ادائیگی بھی کرنا ہوتی تھی۔ لہٰذا میں نے وہ پیسے رکھ لیے اور جب ساس صاحبہ گھر واپس آئیں تو میں نے بقیہ پیسے انہیں دینا چاہے تو انہوں نے انکار کردیا اور بولیں۔ ”جب تم سب کچھ اپنے ہاتھ سے خرچ کرتی ہو تو یہ پیسے بھی اپنے پاس ہی رکھو اچھا نہیں لگتا کہ تم ہر بار میرے آگے ہاتھ پھیلاؤ۔“

اس طرح بالکل غیر محسوس طریقے سے گھر کا خرچ میرے ہاتھ میں آگیا جو ہر عورت کی دلی تمنا ہوتی ہے۔ اب میں مکمل طور پر گھر کی مالک و مختار تھی۔ جو چاہتی پکاتی جو چاہتی کھلاتی۔ گھر کے لیے اپنی مرضی اور پسند سے چیزیں خریدتی۔ گھر کی تزئین و آرائش اپنی مرضی سے کرتی لیکن اس تمام آزادی اور خودمختاری کے باوجود میں نے ساس کی عزت و احترام میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ کوئی بھی نیا کام کرنے سے پہلے ان سے مشورہ ضرور کرتی۔ وہ بھی خوش ہو جاتیں کہ میں انہیں اتنی اہمیت دیتی ہوں۔ انہیں باقاعدگی سے وقت پر دوائیں دیتی۔ اگر علی کی کوئی مصروفیت ہوتی تو چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس بھی میں ہی لے کر جاتی۔ جب کبھی شاپنگ کے لیے گئی تو ان کے لیے ایک دو سوٹ یا چپل ضرور خرید کر لاتی۔ اس طرح نندوں کو بھی کچھ نہ کچھ دیتی رہتی تھی اور وہ بھی میری بہت عزت کیا کرتی تھیں۔

ایک ایک کر کے دونوں کی شادیاں ہو گئیں۔ سسر کا انتقال ہو گیا۔ عدنان نے اسکول جانا شروع کر دیا تھا۔ اس کی پڑھائی کی ذمے داری بھی مجھ پر تھی۔ اسکول آنے جانے کے لیے تو وین لگوا دی تھی لیکن شام کو وہ قرآن ناظرہ کے لیے مدرسہ جایا کرتا تھا۔ میں ہی اسے چھوڑنے اور واپس لینے جاتی تھی۔ پھر اسکول کا ہوم ورک کرواتی۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ علی کے آنے سے پہلے پہلے یہ سارے کام نمٹ جائیں تاکہ میں پوری طرح انہیں وقت دے سکوں۔ میں نے ان کی عادتیں بگاڑ دی تھیں۔ شادی کے دس سال بعد بھی وہ یہی چاہتے تھے کہ میں پہلے کی طرح بن سنور کر ان کا استقبال کروں اور شام کی چائے کے ساتھ روزانہ کوئی نہ کوئی نئی چیز بنایا کروں۔

پھر اچانک ہی میری ہنستی کھیلتی زندگی میں بھونچال آگیا۔ نہ جانے علی کی خدمت اور ناز برداری میں کیا کمی رہ گئی تھی کہ ان کا دل مجھ سے بھر گیا اور وہ کسی دوسری عورت کی زلف کے اسیر ہو گئے۔ اس کا پتا مجھے بہت بعد میں چلا۔ ان دنوں وہ دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ بعض اوقات تو ان کی واپسی دس گیارہ بجے تک ہوتی۔ میں نے پوچھا تو دفتر میں کام کی زیادتی کا بہانہ بنا دیا۔ میں نے کوئی خاص توجہ نہیں دی حالانکہ مجھے چوکنا ہو جانا چاہیے تھا کیونکہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ ان کے کام کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ وہ ہمیشہ وقت پر گھر آجاتے تھے۔ کچھ دن تو میں نے برداشت کیا لیکن جب ہر دوسرے تیسرے روز یہ ہونے لگا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ ایک روز میں نے آٹھ بجے کے قریب ان کے دفتر کے نمبر پر فون کیا۔ کافی دیر گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا پھر میں نے ان کے موبائل پر کال کی۔ وہ بھی بند تھا۔ گیارہ بجے کے قریب وہ واپس آئے میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"آخر یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ میں بھی آپ کے انتظار میں بھوکی بیٹھی رہتی ہوں۔"

"کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی کافی کام باقی ہے۔" وہ مجھ

قارئین متوجہ ہوں

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

سے نظریں چراتے ہوئے بولے۔ ''تم کھانا کھالیا کرو۔ میرا کچھ پتا نہیں کہ کب واپسی ہو۔''

یہ تو میں سمجھ گئی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں پھر بھی میں نے انہیں کریدنے کی خاطر پوچھا۔

''پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کو دیر تک رکنا پڑا ہو۔ اب یہ کون سا کام نکل آیا؟''

''میری ذمے داریاں بدل گئی ہیں۔ ابھی نئی نئی بات ہے۔ اس لیے دیر ہو رہی ہے۔ کچھ دنوں میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

جب شوہر بیوی سے جھوٹ بولنے لگے تو اس سے الجھنے کی بجائے کسی دوسرے طریقے سے نمٹنا چاہیے۔ یہ بھی مسز حسن کا پڑھایا ہوا سبق تھا جو اس وقت مجھے یاد آ گیا۔ چنانچہ میں نے بھی خاموش رہنا مناسب سمجھا اور اس صورتِ حال سے نمٹنے کی تدبیر سوچنے لگی۔ دوسرے روز میں نے علی کے دفتر فون کیا۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کے اسسٹنٹ امین نے فون اٹھایا۔ وہ مجھے جانتا تھا میں نے اس کے ایک دو چھوٹے موٹے کام کرا دیے تھے..... ایک بار اسے قرض کی ضرورت پڑی جس کی وجہ سے وہ میرا احسان مند تھا اور میری بہت عزت کرتا تھا۔

''جی میڈم!'' اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''فرمائیے، کیسے یاد کیا؟''

''تم سے ایک ضروری کام ہے۔ کیا تھوڑی دیر کے لیے میرے پاس آ سکتے ہو لیکن تمہارے صاحب کو معلوم نہ ہو۔''

''میڈم آپ فکر نہ کریں۔ میں کوئی بہانہ بنا کر لنچ ٹائم میں آپ کے پاس آ جاؤں گا۔''

میں نے جلدی جلدی سارے کام نمٹائے اور امین کا انتظار کرنے لگی۔ وہ ڈیڑھ بجے کے قریب آیا تو میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ میری ساس اپنے کمرے میں تھیں۔ ویسے بھی وہ ہر معاملے سے لاتعلق ہو چکی تھیں اور انہیں کسی کے آنے جانے کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ میں نے امین کے سامنے چائے رکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں اُمید کروں کہ ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو صیغۂ راز میں رہے گی؟''

''آپ مجھ پر بھروسا کر سکتی ہیں میڈم۔''

''تمہارے صاحب ان دنوں تقریباً روزانہ ہی دیر سے گھر آ رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دفتر میں کام زیادہ ہونے کی وجہ سے دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے لیکن جب میں نے ایک دن دفتر فون کیا تو گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ چنانچہ میرے دل میں شک پیدا ہونا ایک فطری سی بات ہے۔ اب تم مجھے بتاؤ گے کہ حقیقت کیا ہے؟''

''میڈم! میں کئی دنوں سے یہ تماشا دیکھ رہا ہوں۔ ایک دو مرتبہ سوچا کہ آپ کو بتا دوں لیکن اس لیے خاموش رہا کہ آپ کو تکلیف ہو گی۔ دفتر سے تو وہ وقت پر اٹھ جاتے ہیں لیکن ان کی شامیں سمیرا کے ساتھ گزرتی ہیں جو ان کی سیکریٹری ہے۔ اسے طلاق ہو چکی ہے اور اس کا کیریکٹر بھی اچھا نہیں ہے۔ دفتر میں بھی کئی لوگوں سے فلرٹ کر چکی ہے اور اب صاحب پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ آپ کچھ کیجیے میڈم۔ اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے۔''

''جب مرد رسی تڑا کر بھاگنے لگے تو عورت کچھ نہیں کر سکتی۔'' میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال تمہارا شکریہ کہ تم نے مجھے اتنی مفید معلومات ہیں۔ ان کی روشنی میں میں اپنا لائحہ عمل تیار کر سکتی ہوں۔ کیا تم میرا ایک کام کر سکتے ہو؟''

''آپ حکم کیجیے۔ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔''

''تم کچھ روز تک ان دونوں کا تعاقب کرو اور دیکھو کہ یہ کہاں وقت گزارتے ہیں اور ہو سکے تو ان دونوں کی کچھ مشترکہ تصاویر بھی لے لو۔ اس کے علاوہ مجھے سمیرا کی تصویر، اس کے گھر کا پتا اور فون نمبر بھی چاہیے۔''

''یہ سب کام ہو جائیں گے اور میں روزانہ ان کی سرگرمیوں کی رپورٹ دیتا رہوں گا۔''

میں نے پرس کھول کر کچھ پیسے نکالے اور کہا۔ ''یہ رکھ لو۔ تمہیں ابتدائی اخراجات کے لیے ضرورت پڑے گی۔ بعد میں اور دے دوں گی۔''

اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا اور بولا۔ ''اس کام میں میرا کچھ خرچ نہیں ہو گا۔ موٹر سائیکل میں پیٹرول تو میں خود بھی ڈلوا سکتا ہوں۔''

اس وقت تک میرے ذہن میں کوئی پلاننگ نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں نے امین سے اس کام کے لیے کیوں کہا۔ میں کچھ دیر اس صورتِ حال پر غور کرتی رہی۔ اس پوری کہانی میں صرف ایک اُمید افزا بات تھی اور وہ یہ کہ سمیرا کا کیریکٹر اچھا نہیں تھا اور مردوں سے فلرٹ کرنا اس کا مشغلہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ علی کو بے وقوف بنانے کے بعد کسی

اور مرد کی طرف مائل ہو جائے کیونکہ ایسی عورتیں کبھی کسی ایک کی نہیں ہوتیں ورنہ وہ اپنے شوہر سے طلاق ہی کیوں لیتی۔

اچانک مجھے مسز حسن کا خیال آ گیا۔ میں نے فوراً ہی ان کا نمبر ملایا اور بولی۔ ''کیا آپ مجھے کچھ وقت دے سکتی ہیں؟''

''تمہارے لیے میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔ مسئلہ کیا ہے؟''

''یہ میں ملنے پر ہی بتاؤں گی۔ کب آ جاؤں؟''

''چاہو تو ابھی آ جاؤ۔ اس وقت میں فارغ ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آدھ گھنٹا میں آ رہی ہوں۔''

''میں نے عدنان کو مدرسہ چھوڑا۔ اس کی چھٹی پانچ بجے ہوتی تھی۔ گویا میرے پاس تین گھنٹے تھے۔ میں نے ساس صاحبہ کو بتا دیا تھا کہ میری ایک ملنے والی بہت بیمار ہیں۔ عدنان کو مدرسہ چھوڑ کر انہیں دیکھنے جاؤں گی۔ مسز حسن میرا ہی انتظار کر رہی تھیں۔ بڑے تپاک سے ملیں۔ میں نے انہیں پوری کہانی سنا دی۔ امین کے بارے میں بھی بتا دیا۔ سب کچھ سننے کے بعد وہ بولیں۔ ''یہ تم نے اچھا کیا کہ علی سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ فی الحال ان پر یہی ظاہر کرتی رہو کہ تمہیں کچھ پتا نہیں ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ انہیں یہ کھیل کھیلنے دوں اور خاموشی سے تماشا دیکھتی رہوں۔''

''اس کے علاوہ تم کر بھی کیا سکتی ہو۔ کیا تمہارے کہنے یا لڑنے جھگڑنے پر وہ اس لڑکی سے ملنا چھوڑ دیں گے۔ یاد رکھو مرد کی فطرت میں ضد کا عنصر بہت زیادہ ہوتا ہے تم جس کام سے انہیں روکو گی۔ وہ اتنا ہی زیادہ کریں گے۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں کچھ سوچتی ہوں۔ اس مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آئے گا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔ ''تم نے بتایا کہ اس لڑکی کا کیریکٹر ٹھیک نہیں اور مردوں سے فلرٹ کرنا اس کا مشغلہ ہے۔''

''جی ہاں مجھے اس کے بارے میں یہی رپورٹ ملی ہے۔''

''بس تو پھر میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ تمہارے میاں کو بھی بے وقوف بنا رہی ہے۔ جب اس کا دل بھر جائے گا تو وہ کسی اور سے تعلق استوار کر لے گی۔''

''مجھے ڈر ہے کہ علی اس سے شادی نہ کر لیں۔''

''اوّل تو ایسا نہیں ہوگا اور اگر شادی ہو بھی گئی تو زیادہ دن نہیں چلے گی۔''

''ایسی نوبت ہی کیوں آئے۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ وہ لڑکی علی کی زندگی سے نکل جائے۔''

''اس کے لیے ہمیں کوئی کرائے کا عاشق ڈھونڈنا پڑے گا۔''

''کرائے کا عاشق؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''کرائے کے قاتلوں کی طرح کرائے کے عاشق بھی مل جاتے ہیں۔ میری ایک جاننے والی رشتے کرواتی ہیں۔ انہوں نے تین چار ہینڈسم اور اسمارٹ لڑکے اپنے پینل پر رکھے ہوئے ہیں۔ اگر کسی لڑکی کا رشتہ ملنے میں تاخیر ہو رہی ہو تو وہ ان میں سے کسی ایک کو لڑکی کے والدین سے ملوا دیتے ہیں۔ اس طرح انہیں یہ تسلی ہو جاتی ہے کہ وہ ان کی لڑکی کے لیے سنجیدگی سے رشتہ تلاش کر رہی ہیں۔ ہم انہی لڑکوں میں سے کسی ایک کو سمیرا کے پیچھے لگا دیتے ہیں جو اپنے آپ کو ایک امیر کبیر شخص ظاہر کر کے اس کے ساتھ محبت کا ناٹک رچائے گا اور سمیرا اس کے جال میں پھنس کر تمہارے شوہر کو دھتکار دے گی اور اس طرح یہ باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔''

''کیا وہ اتنی آسانی سے اس کی باتوں میں آ جائے گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ایسی لڑکیاں کسی ایک مرد پر قناعت نہیں کرتیں اور ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتی ہیں۔ جب ایک اسمارٹ، ہینڈسم اور امیر لڑکا اس کی جانب بڑھے گا تو وہ بڑی آسانی سے اس کے جال میں پھنس جائے گی لیکن اس کے لیے تمہیں کچھ خرچ کرنا پڑے گا۔''

''وہ کیوں؟''

''یہ رقم دو تین مدوں میں خرچ ہو گی۔ مثلاً وہ لڑکا سمیرا کو گھمانے کے لیے کرائے پر ایک گاڑی لے گا۔ اپنے لیے چند قیمتی جوڑے بنوائے گا۔ سمیرا کو کھلانے پلانے اور تحفے وغیرہ دینے میں بھی کچھ خرچ ہو گا پھر اس کی فیس اگر تم یہ سب کر سکتی ہو تو میں میرج بیورو والی سے بات کروں۔''

''میں اپنے سہاگ کو بچانے کے لیے سب کچھ کرنے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کو تیار ہوں۔ آپ بات کرلیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم مجھے سمیرا کی تصویر، اس کے گھر کا پتا اور فون نمبر دے دو۔ انشاء اللہ ایک مہینے کے اندر تمہاری مرضی کے مطابق نتیجہ آجائے گا۔"

مجھے یہ سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ بالکل فلمی سچویشن تھی لیکن مسز حسن بہت پُراعتماد تھیں کہ اس کھیل کا نتیجہ ہمارے حق میں آئے گا چنانچہ میں نے ان پر یقین کرتے ہوئے..... امین سے مطلوبہ اعتماد لے کر انہیں رقم پہنچا دیں۔ مسز حسن نے بتایا کہ لڑکے کا بندوبست ہوگیا ہے اور وہ کل شام ان سے ملنے آئے گا۔ بہتر ہوگا کہ میں بھی تھوڑی دیر کے لیے آجاؤں اور اس سے بالمشافہ گفتگو کرلوں۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ اسے سہ پہر میں بلائیں تاکہ میں عدنان کو مدرسہ چھوڑ کر ان سے ملنے آجاؤں کیونکہ شام کے وقت میرے لیے گھر سے باہر نکلنا مشکل تھا۔

اس لڑکے کا نام فواد تھا۔ دیکھنے میں ہی وہ بے حد اسمارٹ اور ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اس کی عمر بمشکل پچیس چھبیس برس ہوگی۔ اس نے بتایا کہ وہ ایم بی اے کرچکا ہے اور ایک فرم میں ملازمت کررہا ہے۔ مسز عثمان (رشتے کرانے والی) سے اس کی دور کی رشتے داری ہے اور وہ کمیشن پر ان کے لیے کام کرتا ہے۔ گوکہ اسے یہ کام پسند نہیں لیکن پیسوں کی خاطر اسے یہ سب کرنا پڑ رہا ہے کیونکہ پورے گھر کی ذمے داری اس پر ہے اور صرف تنخواہ میں اس کا گزارہ نہیں ہوسکتا۔

مسز حسن نے سمیرا کی تصویر اور دیگر معلومات اس کے حوالے کیں اور اچھی طرح سمجھا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی پُرکشش شخصیت سے سمیرا کو متاثر کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ میں نے فواد سے کہا کہ جب سمیرا پوری طرح اس کے قابو میں آجائے تو وہ اسے مجبور کرے کہ وہ ملازمت چھوڑ دے اس طرح اس کا علی سے رابطہ ختم ہوجائے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں میڈم میں ایسا چکر چلاؤں گا کہ وہ ان سے ہمیشہ کے لیے دور ہوجائے گی۔"

"ایک بات اور۔" مسز حسن نے کہا۔ "تم مجھے روزانہ فون پر رپورٹ دو گے کہ معاملہ کہاں تک آگے بڑھا۔"

میں نے پرس کھولا اور اسے دس ہزار روپے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارا ایڈوانس ہے۔ باقی رقم کام مکمل ہونے پر دی جائے گی۔"

اس نے شکریہ ادا کرنے کے بعد مسز حسن سے کہا۔

"میڈم میں تین دن بعد آپ کو پروگریس بتاؤں گا۔"

اس نے جس اعتماد سے بات کی تھی۔ اس سے مجھے اُمید ہوگئی تھی کہ یہ شخص سمیرا اور علی کے درمیان فاصلہ پیدا کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ سمیرا دل پھینک لڑکی تھی اور وہ بھی اس میدان کا پرانا کھلاڑی معلوم ہورہا تھا اگر وہ سمیرا سے راہ و رسم بڑھانے میں کامیاب ہوگیا تو وہ یقیناً اس کی طرف متوجہ ہوجائے کیونکہ وہ علی سے کہیں زیادہ ہینڈسم، اسمارٹ اور کم عمر تھا۔

چوتھے روز مسز حسن نے جو کچھ مجھے بتایا۔ وہ بہت ہی حیران کن تھا۔ فواد ایک کلائنٹ کے روپ میں سمیرا سے ملا اور اس سے ایک خودساختہ پروڈکٹ کی کمپین کے بارے میں بات کی۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ علی ایک اشتہاری ایجنسی میں کام کرتے تھے اور کلائنٹ سے رابطے کا کام سمیرا ہی کرتی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں سمیرا، فواد کی پُرکشش شخصیت سے بہت متاثر ہوئی۔ اس کے علاوہ فواد نے اس نام نہاد کمپین کا نقشہ کچھ اس انداز میں کھینچا کہ وہ اس میں دلچسپی لینے پر مجبور ہوگئی اور اسے اس میں اپنا فائدہ نظر آنے لگا چنانچہ اس نے مزید تفصیلات طے کرنے کے لیے اسے دوسرے دن کا وقت دے دیا۔

فواد دوسرے دن مقررہ وقت پر اس سے ملنے پہنچ گیا۔ اس روز اس نے خاص اہتمام کیا تھا۔ تھری پیس سوٹ، شوخ رنگ کی ٹائی، ہاتھ میں بریف کیس اور آنکھوں پر قیمتی گاگلز۔ سمیرا تو اسے دیکھتے ہی دیوانی ہوگئی۔ فواد اس کی کیفیت کو محسوس کررہا تھا۔ چند رسمی باتوں کے بعد اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "میرے خیال میں یہ جگہ اس گفتگو کے لیے مناسب نہیں۔ کیوں نہ آج آپ میرے ساتھ لنچ کریں۔ باقی باتیں ہم وہیں کرلیں گے۔"

سمیرا تھوڑی سی حیران ہوئی کیونکہ اس سے پہلے کبھی کسی کلائنٹ نے ایسی پیشکش نہیں کی تھی۔ وہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ کیا جواب دے لیکن فواد نے اسے مزید سوچنے کا موقع نہیں دیا اور بولا۔ "اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔ تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے آپ میرے ساتھ لنچ کرنے کی ہامی تو بھریں۔"

سمیرا کی حالت ایسی ہوگئی جیسے کسی نے اس پر جادو کردیا ہو۔ وہ انکار نہ کرسکی اور اس نے مسکراتے ہوئے

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

اثبات میں سر ہلا دیا۔ فواد نے اسے ایک قریبی ریسٹورنٹ کا نام بتایا اور کہا کہ وہ ایک بجے اس کا وہاں انتظار کرے گا۔

اس کے جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک بے خودی کے عالم میں بیٹھی رہی۔ پھر جب انٹر کام پر علی نے اسے اپنے کمرے میں آنے کے لیے کہا تو وہ یوں ہڑبڑا کر اٹھی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔

لنچ پر جانے سے پہلے اس نے واش روم میں جا کر اپنا میک اپ ٹھیک کیا۔ بال سنوارے، اگر اس کے پاس تھوڑا سا وقت ہوتا تو وہ گھر جا کر لباس بھی تبدیل کر لیتی، اس نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا بغور جائزہ لیا۔ اس لباس میں بھی وہ خاصی پُرکشش لگ رہی تھی۔ باقی کسر وہ اپنی اداؤں سے پوری کر سکتی تھی اس نے دل ہی دل میں فواد اور علی کا موازنہ کیا تو فواد کا پلڑہ بھاری نظر آ گیا۔ وہ بے اختیار مسکرا اٹھی جیسے کسی فیصلہ پر پہنچ گئی ہو۔

وہ ریسٹورنٹ پہنچی تو فواد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے پہلے سے ہی ایک ٹیبل ریزرو کروا لیا تھا وہ دونوں وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ فواد نے مینو اس کے سامنے رکھ دیا اور کہا کہ وہ اپنی پسند سے جو چاہے منگوا لے۔ سمیرا یوں شرما رہی تھی جیسے پہلی بار فواد کے ساتھ ڈیٹ پر آئی ہو۔ اس نے ایک ادا سے دوپٹے کا پلو نیچے گرایا اور آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ”آپ جو منگوائیں گے وہی کھا لوں گی۔“

سمیرا کی اس حرکت سے فواد سمجھ گیا کہ وہ دو نمبر عورت ہے اور اسے اپنے جال میں پھنسانا کچھ زیادہ مشکل نہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے جارحانہ انداز اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بیرے کو کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔ ”مس سمیرا کام کی بات کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ میں اپنے بارے میں کچھ بتا دوں۔ اس کے بعد میں جو کہوں گا وہ آسانی سے آپ کی سمجھ میں آ جائے گا۔“

وہ خاموش رہی تو فواد نے اسے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایک مل اونر کا اکلوتا بیٹا ہے۔ دو بہنوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ ڈیفنس میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہے۔ والد چاہتے ہیں کہ وہ ان کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو جائے لیکن وہ سیلف میڈ بندہ ہے اور اپنی صلاحیت کے بل بوتے پر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے ایم بی اے کرنے کے بعد ایک کمپنی میں ملازمت کر لی اور ان دنوں ایک پروڈکٹ کی پروموشن کے سلسلے میں کام کر رہا ہے۔

اپنی بات ختم کرنے کے بعد اس نے کن اکھیوں سے سمیرا کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”میں نے پہلی ہی ملاقات میں اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بہت زیادہ باصلاحیت ہیں لیکن اس کا آپ کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا۔ ساری محنت آپ کرتی ہیں۔ منافع کسی اور کی جیب میں چلا جاتا ہے اور اس کا بہت تھوڑا حصہ آپ کو تنخواہ کی صورت میں ملتا ہے۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں۔“ سمیرا نے آہستہ سے کہا۔

”ہر جگہ ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”بالکل ہوتا ہے لیکن کبھی آپ نے سوچا کہ محنتی اور تجربہ کار لوگ جاب چھوڑ کر اپنا کام کیوں شروع کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ جتنی محنت وہ دوسروں کے لیے کرتے ہیں اگر اتنی اپنے کام پر کریں تو سارا منافع ان کی جیب میں آئے گا۔“

بیرا کھانا لے کر آیا تو فواد کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے اپنی بات دوبارہ شروع کی اور بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی انہی خطوط پر سوچیں۔“

سمیرا نے اپنے بالوں کو ایک خاص انداز سے جھٹکا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”ایک ہی ملاقات کے بعد آپ میرے بارے میں اتنی سنجیدگی سے کیوں سوچنے لگے؟“

”اس لیے کہ میں کسی کی محنت اور صلاحیت کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے اسی لیے آپ کو ریسٹورنٹ میں بلایا ہے تاکہ اس موضوع پر کھل کر بات کر سکوں۔“

”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ یہ کمپین آپ اپنے طور پر کریں۔ آپ کی ایجنسی کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔“

سمیرا اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے تو بہت بڑے سیٹ اپ کی ضرورت ہوگی اور میرے اتنے وسائل نہیں کہ میں اپنی کمپنی لانچ کر سکوں۔“

”وسائل کی آپ فکر نہ کریں۔ وہ میں مہیا کروں گا۔ یوں سمجھ لیں کہ آپ میری پارٹنر ہوں گی۔ سرمایہ میرا، محنت آپ کی۔ منافع آدھا آدھا۔“

”مجھے حیرت ہے کہ آپ دوسری ملاقات میں ہی اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہے ہیں جیسے ہماری برسوں کی جان پہچان ہو۔“

”دراصل میں کافی عرصے سے ایڈورٹائزنگ ایجنسی

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

شروع کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ کل آپ سے ملاقات ہوئی تو میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ آپ کے ساتھ مل کر کام کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کو اس تجویز سے اتفاق نہیں تو میں یہ کمپین آپ کی ایجنسی کو دے دوں گا۔"

"ایک منٹ۔" وہ شوخ لہجے میں بولی۔ "آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جمار ہے ہیں۔ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت تو دیں۔"

"آپ جتنا چاہیں وقت لے لیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے لیکن آپ مجھ سے رابطہ میں رہیں گی۔ کل کے ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

سمیرا خوشی سے نہال ہوگئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ فواد اتنی تیزی سے آگے بڑھے گا۔ ایک مل اونر کا بیٹا اسے ڈنر پر بلا رہا تھا۔ وہ کیسے انکار کرسکتی تھی لیکن اس نے تھوڑا سا نخرہ دکھانا ضروری سمجھا اور بولی۔ "ایک شرط پر آؤں گی۔"

"وہ کیا؟"

"اس کے بعد کا ڈنر میری طرف سے ہوگا۔"

"منظور۔" فواد نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

وہ روزانہ ہی علی کے ساتھ دفتر سے باہر نکلتی اور دونوں کہیں گھومنے چلے جاتے۔ کبھی سنیما، کبھی ڈنر تو کبھی لانگ ڈرائیو۔ لیکن دوسرے دن سمیرا چھٹی ہوتے ہی علی کو بتائے بغیر دفتر سے چلی گئی۔ گزشتہ پانچ چھ ماہ کے دوران ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ اس روز علی وقت پر گھر آگئے لیکن کافی پریشان اور مضطرب نظر آرہے تھے۔ مجھے اس پریشانی کی وجہ معلوم تھی۔ مسز حسن پہلے ہی بتا چکی تھیں کہ آج فواد اور سمیرا کا ڈنر پر جانے کا پروگرام ہے۔ علی نے دو تین بار سمیرا کا نمبر ملایا لیکن بات نہ ہوسکی۔ غالباً اس نے اپنا فون بند کررکھا تھا۔

قصہ مختصر چند روز میں ہی فواد نے سمیرا کو پوری طرح شیشے میں اتار لیا۔ وہ روزانہ اسے مختلف بہانوں سے اپنے ہمراہ لے جاتا۔ شروع شروع میں تو وہ سمیرا پر یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ اس کی ایجنسی کے لیے بھاگ دوڑ کررہا ہے لیکن چند روز بعد اسے یہ بہانا کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ سمیرا ویسے ہی اس کی قربت کے لیے بے چین ہوتی جارہی تھی۔ اب اس کی ہر شام فواد کے ساتھ گزرنے لگی۔ علی کچھ دن تو خاصے مضطرب رہے پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ سمیرا کو ایک نیا دوست مل گیا تو وہ خود ہی پیچھے ہٹ گئے اور پہلے کی طرح وقت پر گھر آنے لگے۔

ایک مہینے کے اندر ہی سمیرا نے علی سے قطع تعلق کرلیا اور تمام وقت فواد کے ساتھ گزارنے لگی۔ میں نے مسز حسن کے ذریعے فواد کو کہلوا بھیجا کہ وہ اپنی اور سمیرا کی مشترکہ تصویریں علی کو دفتر کے پتے پر پوسٹ کردے۔ ان میں اگر کچھ قابل اعتراض حالت میں ہوں تو اور بھی اچھا ہوگا تاکہ وہ علی کے دل سے پوری طرح اتر جائے اور وہ اس سے نفرت کرنے لگیں۔ فواد نے ایسا ہی کیا۔ وہ سمیرا کو اپنے ایک دوست کے فلیٹ میں لے گیا اور سمیرا کی کچھ ایسی تصویریں بنائیں جنہیں دیکھ کر علی غصے سے پاگل ہوگئے ہوں گے۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ علی مکمل طور پر سمیرا سے متنفر ہو چکے ہیں تو میں نے فواد سے کہہ دیا کہ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔ وہ چاہے تو یہ کھیل ختم کرسکتا ہے لیکن اس نے کہا کہ اسے سمیرا پسند آگئی ہے اور وہ اس کے ساتھ مزید کچھ وقت گزارنا چاہتا ہے۔ میرا کام ختم ہوچکا تھا۔ اس لیے میں نے فواد کے بقایاجات دے کر اسے فارغ کردیا پھر میری اس سے کبھی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی یہ معلوم ہوسکا کہ سمیرا سے تعلق کتنے عرصہ قائم رہا۔

کچھ دنوں بعد علی کو ایک دوسری کمپنی میں اس سے اچھی تنخواہ پر ملازمت مل گئی اور یوں سمیرا کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ میں سمجھ گئی تھی کہ انہوں نے صرف سمیرا کی وجہ سے کمپنی تبدیل کی ہے کیونکہ وہ اس سے شدید نفرت کرنے لگے تھے اور اس کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ میں نے انہیں بھرپور توجہ اور محبت دی تاکہ سمیرا کی بے رخی سے انہیں جو صدمہ پہنچا تھا اس کا اثر جلد زائل ہوجائے۔ خدا کا شکر ہے کہ چند دنوں میں ہی وہ نارمل ہوگئے اور میرے آنگن میں ایک بار پھر خوشیوں کا راج ہوگیا۔ اس کے لیے میں مسز حسن کے ساتھ ساتھ اپنی ساس کی بھی شکر گزار ہوں اگر وہ مجھ پر بے جا پابندیاں عائد نہ کرتیں اور میں مسز حسن کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ان کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کرتی تو مجھ میں اتنی خود اعتمادی کبھی نہ آتی جس کی بدولت میں نے سمیرا جیسی خطرناک عورت کا پتا صاف کردیا اور اپنے گھر کو برباد ہونے سے بچالیا۔ میری تمام بہنوں سے یہی گزارش ہے کہ وہ ہر حال میں اپنی خود اعتمادی برقرار رکھیں۔ یہی ان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جس کی بدولت وہ بڑی سے بڑی جنگ جیت سکتی ہیں۔

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

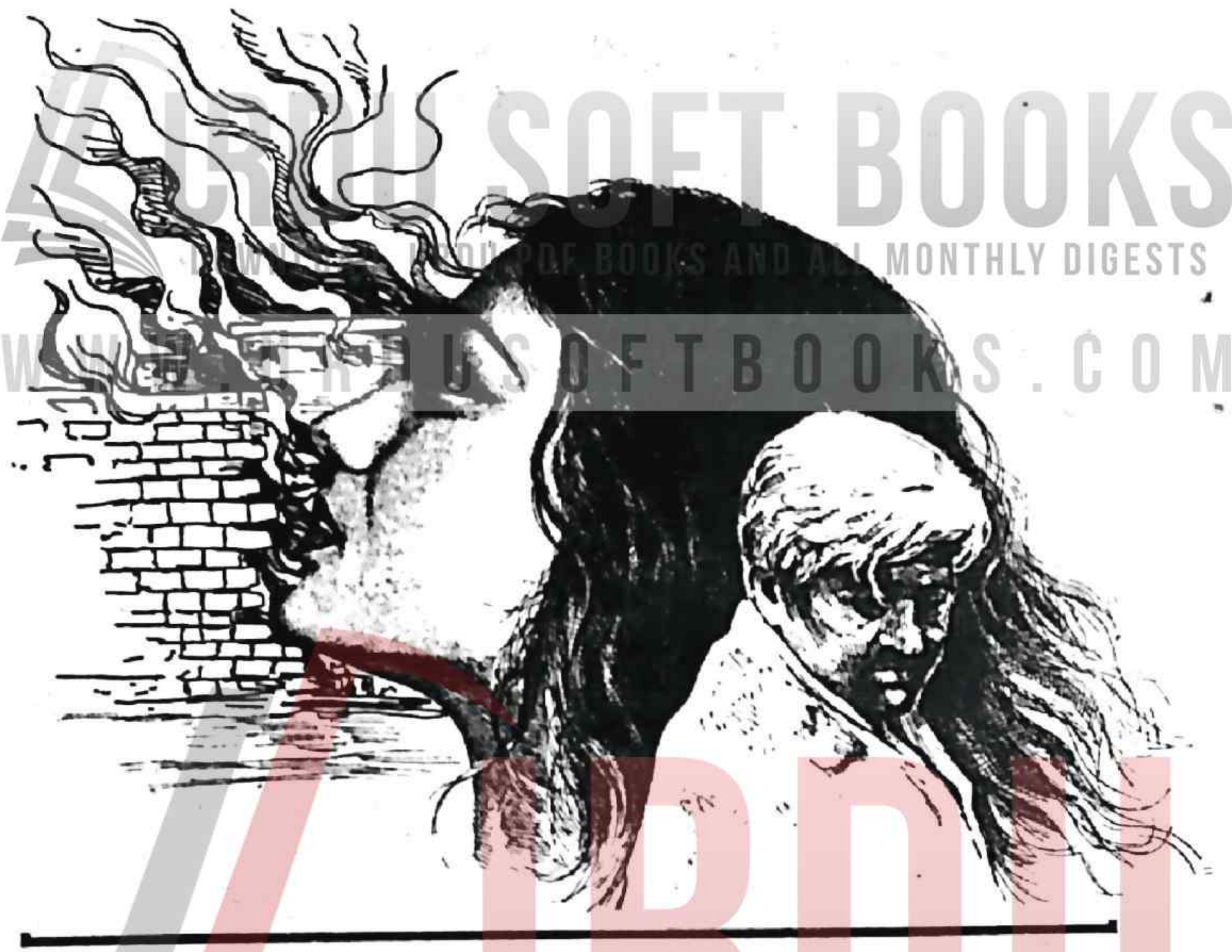

جنونی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ
سلام تہنیت

میں نے اس سے پہلے کبھی کوئی کہانی نہیں لکھی۔ پہلی بار کہانی تیارکی ہے۔ یہ کہانی اس وقت کی ہے جب میں زیرِ تعلیم تھی۔ کالج میں میری ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوئی جو اپنے آپ میں ایک بڑی کہانی تھا۔ وہ کتنا عجیب تھا اس بارے میںَ آپ خود فیصلہ کریں۔ پلیز یہ کہانی شائع ضرور کریں۔

شمائلہ
(کراچی)

وہ کالج میں میرا پہلا دن تھا۔

میں اپنی دوست شہلا کے ساتھ کالج کے احاطے میں گھومتی پھر رہی تھی کہ وہ اچانک میرے سامنے آگیا۔ ایک دلکش سا نوجوان، الجھے بالوں والا۔ جس کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس نے شہلا کو نظر انداز کرتے ہوئے میری طرف انگلی اٹھائی۔ ''شاید آج کالج میں تمہارا پہلا دن ہے، ہے نا؟''

''ہاں۔'' میں نے گردن ہلائی۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"میں تم سے ایک سال سینئر ہوں۔" اس نے بتایا۔
"میں تمہیں بہت دیر سے اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔"
"تو پھر؟" میں نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔ ویسے اس سے کچھ خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔
"پھر یہ کہ تم مجھے بہت اچھی لگی ہو اور میں تمہیں حاصل کرلوں گا۔" اس نے کہا۔
میں سن سی ہو کر رہ گئی۔ اس نے یہ کیسی بات کہہ دی تھی۔ میں تو اس کو جانتی بھی نہیں تھی۔ وہ اتنا کہہ کر تیزی سے ایک طرف چلا گیا تھا۔
"شائنہ۔" شہلا خوف زدہ ہو کر بولی۔ "یہ تو مجھے کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔"
"پتا نہیں کون ہے اور تم نے سنا کیا کہہ رہا تھا؟"
"آؤ چلو، واپس چلتے ہیں۔"
"وہ تو جا چکا ہے۔ ابھی ہم نے کالج بھی نہیں دیکھا۔ چلو کینٹین میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" میں نے باہر والی کینٹین کی طرف اشارہ کیا۔
کالج میں دو کینٹینز تھیں۔ ایک عمارت کے اندر۔ اور دوسری باہر احاطے کی دیوار کے ساتھ۔ درختوں کے درمیان جہاں میزیں اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ اس باہر والی کینٹین میں ہر وقت لڑکے لڑکیوں کا رش لگا رہتا اور سب دل کھول کر ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے۔
کالج میں گرچہ یہ پہلا دن تھا لیکن احساس ہو گیا تھا کہ یہاں کا ماحول اسکول سے کتنا مختلف ہے۔ جیسے ایک بڑے پنجرے سے نکل کر ایک وسیع و عریض پارک میں آ گئی ہوں۔
اگر شہلا کا ساتھ نہیں ہوتا تو بہت اجنبیت کا احساس ہوتا۔ شہلا اور میں اسکول میں بھی ساتھ تھے۔ محلہ بھی ایک تھا اور اتفاق سے کالج بھی ایک ہی ملا تھا۔
ہم نے وین لگوالی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کم از کم چار برسوں تک تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہی ہیں۔ اس کے بعد جو خدا کی مرضی۔ زندگی کہاں لے جائے۔
ہم کینٹین میں آ کر بیٹھ گئے۔
یہاں لڑکے اور لڑکیاں تو تھیں لیکن ہمارے لیے نا آشنا۔ ہم کسی کو نہیں جانتی تھیں۔ سوائے ایک دوسرے کے۔
ہم چائے لے کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ "شہلا، وہ بندہ کون تھا؟ اور کیسی دھمکی دے کر گیا ہے۔" میں نے کہا۔
"خدا جانے، اسے کہتے ہیں سر منڈاتے ہی اولے پڑنا۔ ویسے مجھے وہ کچھ غیر معمولی محسوس ہوا تھا۔"
"کیا مطلب؟ کیا غیر معمولی؟" میں نے پوچھا۔
"تم نے اس کی آنکھیں نہیں دیکھیں۔ کیسی چمک تھی اس کی آنکھوں میں۔" شہلا نے بتایا۔ "جنونی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔"
"ہاپ دے، تو پھر کیا کیا جائے؟"
"دیکھتی رہو، ہو سکتا ہے کہ اس نے بس یوں ہی پریشان کرنے کے لیے یہ سب کہہ دیا ہو۔" شہلا نے کہا۔ "سنا ہے فرسٹ ایئر کی لڑکیوں کے ساتھ اسی قسم کا مذاق کیا جاتا ہے۔"
ہم نے ابھی چائے ختم ہی کی تھی کہ وہ پھر نظر آ گیا۔ وہ بھی کاؤنٹر سے چائے لے کر کسی طرف بیٹھنے کے لیے جا رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو سہی لیکن نظر انداز کرتا ہوا آگے چلا گیا۔
"یار! میں تو ڈر ہی گئی تھی کہ یہ پاگل پھر ہماری طرف نہ آ جائے۔" شہلا نے کہا۔
"ہم نے چائے پی لی ہے، اب اٹھ جاؤ۔"
ہم وہاں سے اٹھ کر اپنی کلاس میں آ گئے۔ لیکچر کا وقت شروع ہونے والا تھا۔ ہم نے لیکچر اٹینڈ کیا اور اپنی اپنی ڈائریز میں ضروری پوائنٹس نوٹ کرتے چلے گئے۔
پہلے سال کی لڑکیاں اور لڑکے الگ سے پہچان لیے جاتے ہیں کیونکہ وہ کچھ پریشان پریشان سے گھبرائے گھبرائے سے رہتے ہیں جبکہ سینئرز ان کا مذاق اڑاتے پھرتے ہیں۔
دو چار دنوں تک پھر کچھ نہیں ہوا۔ وہ لڑکا ہمیں دکھائی نہیں دیا۔ اسی لیے میں نے بھی گھر میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ ورنہ خوامخواہ سب پریشان ہو جاتے۔
اور ویسے بھی ابھی کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ ایک لڑکے نے چلتے ہوئے ایک بات کہہ دی تھی۔ اس کے بعد وہ خود دکھائی نہیں دیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔
لیکن چار پانچ دنوں کے بعد وہ پھر ہمارے سامنے آ گیا۔ اس وقت بھی ہم اسی باہر والی کینٹین سے چائے لے کر ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے کہ وہ پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔
اس بار بھی وہ گرچہ معقول لباس میں تھا لیکن پہلے کی طرح بال الجھے ہوئے تھے۔
"ہیلو۔" اس نے بہت شائستگی کے ساتھ کہا۔ "مجھے شہرم کہتے ہیں۔" اس نے اپنا نام بتایا۔
اس نے چونکہ بہت سلیقے سے بات کی تھی۔ اسی لیے

اس کا وہ تاثر زائل ہونے لگا تھا جو پہلی بار ہوا تھا۔

"میرا نام شہلا ہے۔" شہلا نے ہمت کر کے اپنا نام بتا دیا۔

"اور تم؟" اس نے مجھے مخاطب کیا۔

"میں شائلہ ہوں۔" میں نے اپنا نام بتایا۔

"گڈ۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "تم دونوں شاید ایک ہی کلاس میں ہو۔"

"ہاں۔" شہلا نے کہا۔

"اب میں تم دونوں کو ایک نصیحت کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اس کالج میں بعض لڑکے بہت بدمعاش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت پریشان کریں۔ ان کا کام ہی یہی ہے۔ اس لیے اوّل تو یہ کوشش کرو کہ دونوں ایک ساتھ ہی دکھائی دو۔ پھر بھی اگر کوئی ایسی ویسی بات کرے تو مجھے ضرور بتا دینا۔ میں دو منٹ میں اس کو سیدھا کر دوں گا۔"

ہم حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔

وہ پھر ایک جھٹکے سے مڑا اور تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔ "مائی گاڈ، کیسا بندہ ہے یہ۔" شہلا نے حیرت ظاہر کی۔

"آج تو بالکل بدلا ہوا لگ رہا تھا۔"

"اور آج اس نے پریشان کرنے والی کوئی بات بھی نہیں کی۔" میں نے کہا۔ "بلکہ الٹا ہمیں دلاسے دے کر گیا ہے۔"

"اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہ جنونی ہے۔ ایسے لوگوں کی ذہنی رو بدلتی ہے۔ کبھی کچھ ہو جاتے ہیں۔ کبھی کچھ اور۔ ان کے کسی بھی موڈ پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔"

"خدا کرے، اس کا دوبارہ سامنا نہ ہو۔" میں نے کہا۔

لیکن ایسی دعائیں قبول کہاں ہوتی ہیں۔ دو چار دنوں کے بعد وہ پھر سامنے آ گیا۔ اس بار اتفاق سے میں اکیلی تھی۔ شہلا کالج نہیں آ سکی تھی۔

"ہیلو۔" اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "کیسی ہو؟"

میں اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھنا چاہتی تھی لیکن اس نے آگے بڑھ کر پھر میرا راستہ روک لیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے کہا۔ "تم اس طرح مجھے اگنور کیوں کر رہی ہو؟"

"دیکھو، میرا تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔" میں غصے سے بولی۔ "تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟"

"ابھی کہاں، ابھی پیچھے کہاں پڑا ہوں۔" وہ عجیب انداز سے ہنس دیا۔ "ابھی تو بس یوں ہی تمہیں دیکھ رہا ہوں اور ہاں تم نے کہا کہ تمہارا میرا کیا واسطہ؟ چلو ابھی نہ سہی، آگے چل کر تو ہو جائے گا۔"

دو چار لڑکے اور لڑکیاں ہماری طرف آتے دکھائی دے گئے۔ ان کو دیکھ کر میری کچھ ہمت بڑھ گئی تھی۔ "جاؤ، ورنہ میں تمہارے ساتھ بری طرح پیش آؤں گی۔"

"لیکن کیوں، میں نے ایسا کون سا گناہ کر دیا ہے۔" اس نے کہا۔ "صرف اتنی سی بات ہے کہ میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں اور تم ہو بھی اچھی۔ اور کسی کو پسند کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔"

کسی نے آواز دی۔ "شہرم۔"

اس نے چونک کر آواز دینے والے کی طرف دیکھا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کوئی بات نہیں۔ پھر ملاقات ہو گی اور ہاں، مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک بے ضرر انسان ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ آواز دینے والے لڑکے کی طرف چلا گیا۔

ایک لڑکی تیزی سے چلتی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ "ایکسکیوزمی، کیا یہ شہرم آپ کو پریشان کر رہا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"نفسیاتی مریض ہے کم بخت، جنونی۔" لڑکی نے برا سا منہ بنایا۔

"شاید تمہارے ساتھ بھی کوئی ایسی ویسی حرکت کر چکا ہے۔"

"ہاں، میرے پیچھے پڑ گیا تھا کہنے لگا کہ میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں۔ پھر میں نے جوتا اتار کر اس کی مرمت شروع کر دی۔ کچھ اور لڑکے بھی یہ دیکھ کر ہمارے پاس آ گئے اور یہ اس وقت بھی یہی کہتا رہا کہ وہ مجھے پسند کرنے لگا ہے اور اس کی جو توہین ہوئی ہے اس کا بدلہ ضرور لے گا۔"

"مائی گاڈ، پھر تو بہت خطرناک بات ہو گئی ہو گی۔"

"بہت زیادہ۔" اس لڑکی نے کہا۔ "آؤ کہیں بیٹھ کر بتاتی ہوں کہ اس جنونی نے اس کے بعد کیا کیا۔"

ہم ایک طرف گھاس پر آ کر بیٹھ گئے۔ ساتھ چلتے ہوئے اس لڑکی نے اپنا نام رعنا بتایا تھا۔ وہ اسی کلاس میں تھی جس میں وہ جنونی تھا۔

"ہاں اب بتاؤ۔" میں نے پوچھا۔ "کیا کیا تھا اس نے؟"

"اس نے کہا تھا کہ وہ مجھ سے اپنی توہین کا بدلہ لے

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

گا۔" اس نے بتایا۔ "اور اس نے بدلہ یہ لیا کہ اپنی ایک کلائی کاٹ لی۔"

"کیا؟" میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں، یار میرے سامنے۔ اوہ مائی گاڈ۔ ابھی بھی یاد کرتی ہوں تو کانپ کر رہ جاتی ہوں۔ وہ مجھے کالج کے احاطے ہی میں مل گیا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں اکیلی ہوں۔ اسی لیے وہ میرے پاس آ گیا۔ سچ یہ ہے کہ اسے دیکھ کر میں بری طرح سہم گئی تھی۔ اس نے کہا کہ میں آج اپنی توہین کا بدلہ لینے آیا ہوں اور یہ بدلہ لینے کے بعد میں بھول جاؤں گا تمہیں۔ اتنا کہہ کر اس نے اپنی جیب سے ایک چاقو نکال لیا۔ میرا تو برا حال ہو گیا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ میرا آخری دن آ چکا ہے۔ پھر اس نے وہ چاقو اپنی کلائی میں اتار لیا۔"

"اوہ گاڈ۔"

"ہاں یار، تم کو شاید اندازہ نہ ہو کہ اس وقت میری کیا حالت ہو رہی ہو گی۔ اس کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا۔ اتنا خون دیکھ کر میں تو بے ہوش ہونے لگی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آنے لگا تھا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "سنو، تم نے میری توہین کی۔ میں نے اس کا بدلہ اپنے آپ سے لے لیا۔ کیونکہ میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا جس سے میں پیار کرتا ہوں۔ میرے اندر کی آگ اس بدلے کے لیے ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ اب میں کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گا۔"

اس کی کلائی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بولے چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ ایک طرف چلا گیا۔ اور میں وہیں ایک درخت کا سہارا لے کر بیٹھ نہ جاتی تو شاید بے ہوش ہو جاتی۔

"اوہ خدا! یہ تو بہت خطرناک صورتِ حال ہے۔" میں نے کہا۔ "اس کے بعد اس کا کیا رویہ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اب تو وہ میری طرف دیکھتا بھی نہیں ہے۔ جیسے بھول گیا ہو مجھ کو۔" اس نے بتایا۔ "وہ ہر معاملے میں جنونی ہے۔ جانتی ہو اس نے انٹر کالج باکسنگ چیمپئن شپ بھی جیت رکھی ہے۔"

"نہیں، یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"یہ بھی اس کے جنون کی کہانی ہے۔" اس نے بتایا۔ "پچھلا چیمپئن بھی اسی کالج کا تھا۔ شہرم جب نیا نیا کالج آیا تھا تو کسی بات پر اس چیمپئن سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ چیمپئن نے اس کی بہت توہین ہی نہیں کی بلکہ اسے مارا بھی تھا۔ شہرم پٹتا رہا۔ وہ کچھ نہیں کر سکا۔ کیونکہ وہ چیمپئن کی طرح باکسر نہیں تھا۔"

"کیا نام تھا اس چیمپئن کا؟" میں نے پوچھا۔

"رؤف نامی۔" رعنا نے بتایا۔

"ہاں، میں نے یہ نام سنا ہے۔" میں نے تائید کی۔

"پھر شہرم نے کیا کیا؟"

"وہی، اپنے جنونی ہونے کا ثبوت..... رؤف سے مار کھانے کے بعد اس نے باکسنگ کی تربیت حاصل کرنی شروع کر دی۔ رات دن۔ صبح شام۔ اس کے ساتھی بتاتے ہیں کہ وہ پاگلوں کی طرح محنت کر رہا تھا۔ ٹریننگ لے رہا تھا۔ بس سنک سوار ہو گئی کہ ہر حال میں اپنی توہین کا بدلہ لینا ہے اور صرف چار مہینوں کے بعد اس نے چیمپئن کو دھنک کر رکھ دیا۔ بہت بری طرح مارا۔ اس کے بعد بے چارہ چیمپئن کالج چھوڑ کر ہی چلا گیا۔"

"تو یہ شہرم ایسا آدمی ہے۔"

"ہاں ایسا ہی ہے۔ بس جو بھی دھن سوار ہو جائے۔ میرے لیے دھن سوار ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو زخمی کر لیا۔ اب تمہاری دھن سوار ہوئی تو خدا جانے تمہارے ساتھ اس کا کیا رویہ ہو۔"

میں اب بری طرح گھبرا گئی تھی۔ "تو بتاؤ، کیا کروں؟"

"میرا خیال ہے کہ اس کے سامنے مت آیا کرو۔" رعنا نے کہا۔ "ادھر اُدھر ہو جایا کرو۔"

"لیکن کب تک۔ ہم ایک ہی کالج میں ہیں۔ ہمارا سامنا تو ہوتا رہتا ہے۔ کیوں نہ پرنسپل سے اس کی شکایت کر دی جائے۔"

"یہ اور بھی زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔" رعنا کچھ سوچ کر بولی۔ "اول تو ایسی شکایت کچھ ہوگی نہیں۔ اگر پرنسپل نے اسے کالج سے نکال بھی دیا تو وہ تمہارے لیے اور زیادہ خطرناک ہو جائے گا۔ تم کالج سے باہر تو نظر آ سکتی ہو۔"

"یار یہ میں کس چکر میں پھنس گئی۔" میں نے کہا۔ "میں تو یہاں سیدھی طرح اپنی پڑھائی کرنے آئی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں اس قسم کے بندے سے سابقہ ہوگا۔"

"ایسا کرو۔ تم کم از کم اپنے گھر والوں کو بتا دو۔" رعنا نے مشورہ دیا۔

"اس سے کیا ہوگا۔ وہ بے چارے تو پریشان ہو جائیں گے۔"

"پریشان تو ہوں گے لیکن کسی وقت تمہارا ساتھ بھی دے سکتے ہیں۔ اگر ان کے علم میں یہ سب ہوگا تو وہ احتیاطی

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تدابیر کریں گے۔ ہوسکتا ہے کہ تم کو اکیلا کالج آنے یا جانے نہ دیں۔ یا ان کے ذہن میں کوئی اور بات ہو۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ معاملہ واقعی سیریس ہے۔"

"ظاہر ہے۔ میں نے بھی اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ تم اگر چاہو تو کالج والوں سے معلوم کرسکتی ہو۔"

"مجھے معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو خود اس کی حرکتیں دیکھ چکی ہوں۔"

رعنا کا مشورہ بہت بہتر تھا۔ اسی لیے میں نے پہلی فرصت میں گھر والوں کو بتا دیا۔ امی تو یہ سنتے ہی واویلا کرنے لگی تھیں۔ "ارے لعنت بھیجو ایسے کالج پر۔ کم بخت پاگل آدمی ہے، وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔"

"ایسے لوگوں کا جنون بہت خطرناک بھی ہوتا ہے اور بہت فائدہ مند بھی۔" ابو نے کہا۔

"فائدہ مند کس طرح ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دیکھو، اس قسم کے لوگ یا تو اپنے آپ کو برباد کرلیتے ہیں یا پھر ان کا جنون انہیں بہت بڑا آدمی بنا دیتا ہے۔" ابو نے کہا۔ "یا تو یہ دنیا کو سنوار دیتے ہیں۔ یا بگاڑ دیتے ہیں۔"

"مجھے تو وہ بگاڑنے والا معلوم ہوتا ہے ابو۔" میں نے کہا۔ "مجھے اس سے خوف محسوس ہونے لگا ہے۔ کہیں کوئی پریشانی نہ کھڑی کردے۔"

"تم اپنے استادوں سے بات کرو۔" ابو نے مشورہ دیا۔ "اگر ان سے بھی بات نہیں بن سکی تو پھر کالج چھوڑنا پڑے گا۔"

"آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں۔"

"ہاں بیٹا۔" ابو نے ایک گہری سانس لی۔ "میں ایسے کئی جنونیوں کو دیکھ چکا ہوں۔ یہ بہت گھٹیا لوگ ہوتے ہیں اور بہت بڑے لوگ بھی ہوتے ہیں۔"

"ابو، یہ متضاد باتیں کیسے ہوسکتی ہیں؟"

"وہ اس طرح اگر جنونی گھٹیا پن پر اتر آئے تو وہ دوسروں کو اور خود کو برباد کرکے رکھ دیتا ہے۔ اس میں انتقامی جذبہ ہوتا ہے۔ قتل، تیزاب گردی وغیرہ کے واقعات اسی جنون کے نتیجے میں ہوتے ہیں۔ ایک بھیانک ضد اس کے اعصاب پر سوار ہوجاتی ہے۔"

"اور ایسا آدمی بڑا کس طرح ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اپنے جنون کا رخ کسی بڑے مقصد کی طرف موڑ دیتا ہے۔" ابو نے بتایا۔ "کسی ایجاد کی طرف۔ کسی فن پارے کی طرف۔ کسی ٹارگٹ کو حاصل کرنے کی طرف اور دنیا کو بہت کچھ دے جاتا ہے۔ اب میں یہ نہیں جانتا کہ وہ لڑکا کیسا ہے۔ ویسے وہ مجھے منفی جنون والا دکھائی دیتا ہے۔ یعنی انتقام لینے والا۔"

"جی ہاں ابو، وہ ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"پھر تو تمہیں بہت احتیاط کرنی ہوگی۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اس کالج سے نکالیں اس کو۔" امی پھٹ پڑیں۔ "خدا جانے کل کیا ہو۔ ایسے لوگوں کا کیا بھروسا؟"

"یہ تو ہے لیکن اتنی جلدی کالج سے نکالنا بھی مناسب نہیں ہے۔" ابو نے میری طرف دیکھا۔ "بیٹا، تم کوشش کرو کہ تمہاری سہیلی شہلا تمہارے ساتھ ہی رہے۔"

"ہاں، ابو وہ بے چاری تو میرے ساتھ ہی رہتی ہے۔" میں نے بتایا۔ "لیکن اب وہ بھی خوف زدہ رہنے لگی ہے۔"

"دیکھو، میں دو چار دنوں میں بھاگ دوڑ کرکے کسی اور جگہ ایڈمیشن کی کوشش کرلیتا ہوں۔"

دوسرے دن کالج پہنچی تو وہاں یہ خبر ملی کہ ہمیں ہاکس بے پکنک پر جانا ہے۔ صرف دو کلاسیں جارہی تھیں۔ یعنی ایک میری کلاس اور دوسری اس شہرم کی کلاس۔

"نہیں یار، میں تو نہیں جاؤں گی۔" میں نے شہلا سے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"تم کو تو معلوم ہے کہ وہ پاگل میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ کالج کے احاطے میں تو شاید اسے اتنا موقع نہ مل سکتا ہو۔ ہاکس بے جیسی جگہ جاکر تو وہ بہت کچھ کرسکتا ہے۔ سب اپنی اپنی تفریح میں لگے ہوں گے۔ ہماری طرف کون دھیان دے گا۔"

"میری جان، اب اس کے خوف سے تو تم زندگی بھر کچھ نہیں کرسکتیں۔" شہلا نے کہا۔ "ہمت کرو۔ وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بہت سے لوگ ہوں گے۔ پھر میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گی۔ دیکھتی ہوں وہ کیا کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اس کے ہمت دلانے پر ہامی بھرلی۔ "اوکے، میں بھی چل رہی ہوں۔"

دوسری صبح تین بسوں میں یہ ہنستا گاتا ہوا قافلہ ہاکس بے کی طرف روانہ ہوگیا۔ سب کے سب بہت خوش گوار موڈ میں تھے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

یہ اتفاق تھا کہ شہرم بھی ہماری بس میں تھا۔ اس نے ایک بار میری طرف دیکھا تو تھا۔ پھر مجھے نظرانداز کر کے اوروں سے بات کرنے لگا۔

کالج کی لائف بھی کیا ہوتی ہے۔ ہم پریکٹیکل لائف اور بے فکری کی لائف کے دوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک قدم کا فاصلہ ہوتا ہے۔ ایک قدم آگے بڑھا کر ہمیں عملی زندگی کا آغاز کر دینا ہوتا ہے۔ اسی لیے بے فکری کے جو لمحات مل جائیں وہ بہت غنیمت ہوتے ہیں۔

ہم ہنستے گاتے ہوئے ہاکس بے پہنچ گئے۔ لڑکے لڑکیوں نے پکنک کے لحاظ سے ڈریسنگ کر رکھی تھی۔ سب کچھ بہت خوش گوار اور خوب صورت تھا۔

کسی نے صلاح دی۔ ''چلو، پانی میں چلتے ہیں۔''

استاد روکتے رہ گئے۔ لیکن ایسے موقع پر کون سنتا ہے۔ ہم لڑکیوں نے شلوازوں کے پائنچے اوپر کیے اور پانی میں گھس پڑیں۔

سمندر کی اپنی الگ کشش ہوا کرتی ہے۔ اس کا پانی آگے بڑھتے رہنے کی تحریک دلاتا رہتا ہے۔ آگے اور آگے۔

میں اور شہلا دوسری لڑکیوں سے آگے نکل آئی تھیں۔ ذرا فاصلے پر لڑکوں کا گروپ تھا جو تیراکی کی مہارت دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم بہت آگے نکل آئے تھے اور اسی وقت ایک تیز لہر نے مجھے اور شہلا کو جدا کر دیا۔ میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

تبھی شہلا کی چیخ سنائی دی۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے۔ اس کے بعد میں جیسے پانی میں اترتی چلی گئی۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں کسی کو اپنی مدد کے لیے پکار سکتی۔

پانی نے مجھے اندر اتارنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ رہا تھا۔ میری سانسیں بند ہونے لگی تھیں۔ صرف اتنا احساس تھا کہ پانی اور بھی بپھر گیا ہے۔

اور اچانک صرف اتنا احساس ہوا کہ کسی کے مضبوط ہاتھوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر کھینچنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے بعد کوئی ہوش نہیں رہا۔

جب ہوش آیا تو میں کسی اسپتال کے بیڈ پر تھی۔ میرے گھر والے میرے پاس تھے۔ کالج کی پرنسپل تھیں۔ شہلا تھی۔ وہ سب رو رہے تھے۔

مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر سب خوش ہو کر چلا اٹھے۔ امی نے پیار کرنا شروع کر دیا۔

میں کچھ دیر تک سن پڑی رہی۔ ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ایک دھندلکا تھا جو آہستہ آہستہ صاف ہو رہا تھا۔ یاد آنے لگا کہ ہم سب ہاکس بے پکنک پر گئے تھے۔ سمندر ہمارے سامنے تھا۔ ہم اس کو دیکھ کر بے قابو ہو کر آگے بڑھتے چلے گئے۔

میں اور شہلا بہت آگے نکل آئے تھے۔ پھر اچانک کیا ہوا کہ میں ڈوبنے لگی۔ میں نے شہلا کی چیخ سنی۔ میں نے خود کو سمندر کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن سمندر مجھے اپنی آغوش میں لے چکا تھا۔ میں ڈوبنے لگی۔ ڈوبنے لگی اور اسی وقت کسی نے میرے بال پکڑ کر مجھے کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے اس کا ہوش نہیں رہا تھا اور اب ہوش آیا ہے تو میں شاید کسی اسپتال میں ہوں اور سب لوگ میرے گرد جمع ہیں۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر نے منع کر دیا۔ ''نہیں ابھی نہیں۔ ابھی آرام کرو۔ ابھی کمزور ہو۔ ایک آدھ دن میں یہ کمزوری ختم ہو جائے گی۔''

اس وقت میں نے دیکھا کہ مجھے ڈرپ بھی لگی ہوئی تھی۔

مجھے صرف یہ جاننا تھا کہ مجھے بچانے والا کون تھا۔ میں نے ان سبھوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''میں تو ڈوبتی جا رہی تھی۔ پھر کس نے میرے بال پکڑ کر کھینچا تھا؟''

''شہرم نے۔'' شہلا نے بتایا۔

''ہاں، وہی جنونی، اسی نے تمہیں ڈوبنے سے بچایا ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''اور وہ خود؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''افسوس کہ تمہیں بچاتے ہوئے وہ ڈوب گیا۔''

''ڈوب گیا۔ یعنی اس نے جان دے دی۔''

''بیٹا۔'' اس بار ابو مخاطب ہوئے۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ایسے لوگ اپنی دھن اپنی ضد کے پکے ہوتے ہیں۔ اس شخص پر تمہیں بچانے کی دھن سوار ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر تمہیں بچا لیا۔ یہ جنونی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹا۔ یا تو دوسروں کی زندگی ختم کر دیتے ہیں یا اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں۔ اس جنونی نے اپنی زندگی ختم کر لی۔''

برسوں گزر گئے ہیں۔ لیکن میں اس جنونی کو بھلا نہیں سکی۔ وہ ابھی بھی یاد آتا ہے اور میں جب سوچتی ہوں کہ ایسے لوگ کتنے عظیم ہوتے ہیں۔ کتنے بڑے ہوتے ہیں۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

قرض

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
عامر کی زندگی کے حالات ہر ایک کے لیے سبق آموز ہیں۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ عامر نے جوانی کے زعم میں یہ نہیں سوچا کہ وہ کس راستے پر بڑھ رہا ہے۔ اس تباہی کے راستے پر جب وہ بہت دور نکل گیا تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

زویا اعجاز
(لاہور)

وہ دونوں ایک بلند دیوار کے پاس کھڑے تھے۔ کھلے پائنچوں والی پتلون اور سہ رنگی شرٹ میں ملبوس وہ چہرے بشرے سے کسی اچھے گھر کے سپوت معلوم ہوتے تھے۔ چہرے پر پھیلے ہلکے روئیں عہد شباب کی آمد کا عندیہ دے رہے تھے۔ ان کی سانولی رنگت کسی اندرونی جوش سے تمتما رہی تھی اور تنفس بے ربط تھے۔

''ایک بار پھر سوچ لے یار! مجھے تو یہ کام بہت مشکل دکھائی دیتا ہے۔'' انور دیوار کی بلندی نظروں سے ناپ کر

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہو گئے تھے اور یونیورسٹی سے نکال دیے گئے تھے لیکن جب معین احسن جذبی لیکچرار ہو کر شعبہ اردو میں آئے تو انہوں نے اپنی شخصیت اور شاعری سے بہت سوں کو متاثر کیا اور نوجوان طلبہ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ خلیل بھی ان سے ملاقات کا خواہاں ہوا۔

خلیل نے اور جذبی کے گرد اکٹھے ہونے والے طلبہ نے جذبی کے ایما پر انجمن ترقی پسند تحریک کی ایک مرتبہ پھر داغ بیل ڈالی۔ انجمن کا دفتر بند ہو چکا تھا۔ سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں لیکن انجمن کے بعض حامی علی گڑھ میں موجود تھے۔ لہٰذا جب خلیل اور ساتھیوں نے انجمن کا احیا کیا تو انجمن بہت جلد علی گڑھ میں مقبول ہو گئی۔ انجمن کے باقاعدہ اجلاس ہونے لگے اور ان جلسوں کی روداد یں ''محاذ'' بمبئی میں اشاعت کے لیے بھیجی جاتیں۔ ان جلسوں میں باہر سے بھی ادیب بلائے جاتے۔

یہ خلیل کی زندگی کا سنہری دور تھا ایک ایسا دور جس میں اس پر مطالعہ کا جنون سوار تھا اور نظموں کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا۔ انقلاب اور رومان گھل مل گئے تھے بلکہ انقلاب کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ نظموں کا انداز خطیبانہ ہو گیا تھا۔

محفل غیر میں اب یہ تری یادوں کی کرن
مسکراتی ہوئی اس طرح بصد ناز آئی
جھنجنا اٹھے پھر اک بار مری روح کے تار
لیکن اے دوست ابھی مجھ کو طلوع نو کے
خیر مقدم کے لیے رات کے اس پچھلے پہر
اک نئے دور سے دوچار بھی تو ہونا ہے
سن تو لو غور سے وہ رات کہ دل کی دھڑکن
تیرگی اپنے لیے جیسے کفن بنتی ہو
جیسے اب وادی و صحرا کی رگیں ٹوٹتی ہوں
جیسے تھمتی ہوئی اب باد خزاں چلتی ہو
جب تلک راہ میں ہے قافلہ صبح بہار
ابھی صیاد سے بھی آنکھ ملانا ہے مجھے
جب تلک چاک نہیں ہوتا ہے یہ پردہ شب
گیت زنجیر کی جھنکار پہ گانا ہے مجھے

☆☆☆

اک طرف عظمت اسلاف کا ماتھے پہ غرور
اور اک سمت وہ افلاس کے پھیلے ہوئے جال
ناتواں باپ مرا جرم ضعیفی کا شکار
ماں کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے سارے ارمان
قرض کے بوجھ سے جینے کی امنگیں پامال
وقت کی دھندیں لپٹے ہوئے کچھ پیار کے گیت
مہر و اخلاص زمانے کی جفاؤں سے نڈھال
بھائی بھائی کی محبت میں نرالے سے شکوک
تنگ غیر میں جس طرح انوکھے سے سوال
ایک ہنگامے پہ موقوف تھی گھر کی رونق
مفلسی ساتھ لیے آئی تھی اک جنگ و جدال
فاقہ مستی میں بکھرتے ہوئے سارے رشتے
تنگ دستی کے سبب ساری فضائیں بے حال

☆☆☆

یہ نظم بھی بظاہر اس کے خاندان کی ایک کہانی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کے پس منظر میں اس کی ترقی پسندی موجود ہے۔ اک خاص سماجی شعور ہے جو اس کے ترقی پسند نظریات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اسی سماجی شعور نے فیض کو یہ کہنے پر مجبور کیا تھا۔

''مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ''

خلیل نے بھی ترقی پسندی کی دھن میں عشق پر سماج کو فوقیت دی۔

میں تمنا کے کھلونوں سے بہت کھیل چکا
اس محبت میں بھی اب جی نہیں لگتا میرا
مشورہ ہے مری وحشت کا کہیں بھاگ چلو
چل کے اس شہر سے اس گھر سے کہیں دور بسو
الوداع اے مرے خوابوں کی حسیں شہزادی
یوں سمجھنا یونہی جھوٹا سا کوئی قصہ تھا

☆☆☆

یا یہ نظم

وہ پھیلتی چلی جاتی ہے جیسے تاریکی
وہ ڈوبتا چلا جاتا ہے کائنات کا دل
وہ ایک ہاتھ بڑھا جیسے چھیننا چاہے
کوئی اڑان مرے عشق کے تخیل کی
یہاں تو شام اودھ بھی اسیر ہے جیسے
نہ جانے کیا ہے کہ بے کیف سی فضاؤں میں
ترا خیال بھی اب رنگ بھر نہیں سکتا
مری نگاہ میں ہیں اب بھی وہ ترے گیسو
مگر ابھی تو یہ منظر سنور نہیں سکتا

☆☆☆

جوانی کا جوش تھا۔ صرف نظموں پر گزارا نہیں ہو سکتا

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

Study 2 Years in Malaysia Transferable to
UK - USA - Australia - Canada
(Subject to meeting visa requirements)

STUDY IN
Malaysia

O & A Level, Matric, Inter, Bachelor & Master Students Apply Now in:
- Engineering
- Computing
- Business Management
- Law
- Marketing
- Art & Design
- Medicine

Obtain a
Foreign Degree
@
Affordable
Cost

Highly Transparent Services

ADMISSIONS
open for
September 2017
Intake

INTI International University & Colleges
A·P·U Asia Pacific University of Technology & Innovation
SEGi University
TAYLOR'S UNIVERSITY
SWINBURNE University of Technology
HERIOT WATT University
Curtin University
SUNWAY UNIVERSITY
QUEST INTERNATIONAL UNIVERSITY PERAK

Apply now

Better Education
Better Future

HR Consultants (Pvt) Ltd
Call: 0346-4747034 / 0346-4747004
Email: Malaysia@hrpakistan.com
www.hrpakistan.com

Islamabad 0346-4747004 | Rawalpindi 0346-4747052 | Peshawar 0346-4747003 | Lahore 0346-4747025 | Karachi 0346-4747027 | Faisalabad 0346-4747030 | Multan 0346-4747030

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بولا۔

"جب یہاں تک چلے آئے ہیں تو اس سے آگے کیا مشکل ہے بھلا؟ تو خوا مخواہ بزدل نہ بن!" عامر نے اسے گھرکا۔

"یہ اتنی بڑی دیوار تجھے نظر نہیں آرہی کیا؟ کہیں خود کو سپرمین تو نہیں سمجھ بیٹھا ہے؟" انور نے قہقہہ لگایا۔

"اس کا بھی حل موجود ہے میرے پاس۔ میں نے بچپن کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔" وہ اعتماد سے کہتا ہوا اس دیوار کی داہنی جانب بڑھ گیا۔

اس نے اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں اور داہنی جانب بڑھ گیا۔ انور کی نظریں اس پر ٹکی ہوئی تھیں..... عامر ایک ٹوٹی پھوٹی ریڑھی کے پاس رکا پھر وہ..... ریڑھی کو گھسیٹتے ہوئے واپس آگیا۔

"بیہ لے! ہوگیا ناں مسئلہ حل!" عامر نے اطمینان سے کہتے ہوئے اپنی دریافت کردہ ریڑھی بڑی مہارت سے دیوار کے ساتھ کھڑی کردی۔ اگلے ہی پل وہ اس پر پاؤں جما کر دیوار کی منڈیر پر پہنچ گیا۔

"اوئے ہوئے..... ہوئے..... جلدی کر انور! کیا کمال نظارے ہیں ادھر؟" وہ بمشکل اپنے جوش پر قابو پاتے بولا۔

اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے انور نے بھی اس کی تقلید کی اور منڈیر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

پہلے وہ دونوں مین گیٹ پر پہنچے تھے۔ وہاں ان جیسے ان گنت مریضانِ عشق پہلے سے موجود تھے۔

دھکم پیل اور ہڑبونگ کی اطلاع اسکول ہیڈ مسٹریس کو مل چکی تھی اسی لیے انہوں نے مقامی پولیس کی مدد لے لی تھی لیکن عامر نے ایسے موقع کے لیے ایک متبادل راہ پہلے ہی تلاش کر رکھی تھی۔ اس نے انور کا ہاتھ تھاما اور عقبی جانب سے اس 'بہشت' میں داخلے کے منصوبہ پر فوری عمل کر ڈالا۔

"صحیح کہہ رہا تھا تُو! یہاں تو واقعی کمال کے نظارے ہیں۔" انور نے دیوار پر پہنچ کر اس کے کندھے پر دھپ لگائی تھی۔

"لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔" عامر نے آنکھیں سکیڑ کر کہا۔

"کہیں اندر جانے کا خیال تو نہیں چل رہا تیرے دماغ میں؟" وہ رمز شناس تھا۔

"دریا کے کنارے پہنچ کر بھی پیاسے لوٹ جائیں تو کیا فائدہ اس محنت کا؟"

"اب یہاں سے کیسے اترے گا نیچے؟" انور نے نیم رضامندی سے استفسار کیا۔

"بس دیکھتا رہ۔" وہ چھپکلی کی طرح منڈیر سے چمٹ گیا اور رینگتے ہوئے دیوار کی بائیں جانب گھوم گیا۔

یہاں اسکول کا گراؤنڈ تھا اور گراؤنڈ میں لگے ہوئے پیڑ کی شاخیں دیوار تک پہنچ رہی تھیں۔ عامر نے درخت کی شاخوں کو تھام لیا اور احتیاط سے قدم جماتا اسکول کی سرزمین تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کی دلیری نے انور کے ارادوں کو بھی مہمیز کیا اور اگلے دس منٹ میں وہ بھی ہانپتا کانپتا اس پیڑ کے نزدیک موجود تھا۔

اپنے تنفس بحال کرتے ہوئے انھوں نے پتلون کی جیب میں موجود کنگھی نکال کر بال درست کیے اور شرٹ پتلونوں میں اڑستے ایک طرف چل دیئے۔

اب ان کے ذہن میں کوئی بھی خصوصی منصوبہ نہ تھا۔ صنفِ مخالف کی فطری کشش اور مہم جوئی سے مغلوب ہوکر وہ کشاں کشاں ان رنگینیوں کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ لڑکیوں کی نظروں میں حیرانی' ستائش کے ملے جلے جذبات انھیں ہواؤں میں اڑانے لگے۔

اسی بے دھیانی اور عالمِ مدہوشی میں وہ گراؤنڈ میں موجود اسٹالز کی طرف نکل آئے۔ ہر سُو ریشمی بال' گلابی عارض' متناسب الاعضاء وجود اور کٹارے نین والی موجود تھیں۔ وہ عالم حیرت میں کھڑے حسیناؤں کو دیکھ رہے تھے کہ کسی نے گدی پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔

"اوئے! تم لوگوں کی جرأت کیسے ہوئی اندر آنے کی؟" ایک پولیس اہلکار نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

"وہ..... ہم..... میں..... ادھر....." عامر اس اچانک افتاد پر بوکھلا گیا اور فرار کے لیے رستہ تلاشنے لگا۔ مگر ان اہلکاروں کی گرفت میں دونوں ہی مچل کر رہ گئے۔ انھیں علم ہی نہ ہوسکا تھا کہ ان کی آمد کی اطلاع پر ہیڈ مسٹریس نے فوری طور پر ایکشن لیتے ہوئے مرکزی گیٹ پر موجود پولیس کو اندر بلا لیا تھا۔

"عمر دیکھو ذرا ان کی اور حرکتیں دیکھو اوئے بے شرمو! تمھارے گھروں میں ماں بہنیں نہیں ہیں کیا؟" کرخت صورت سپاہی نے انور کو ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔

"غلطی ہوگئی جناب! اب چھوڑ دیجیے..... آئندہ کبھی ایسا کرتے نظر آئے تو جو چور کی سزا وہ ہماری۔" عامر نے التجا

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کی۔

''ناں پتر ناں! ایسے کیسے چھوڑ دیں۔ تمھاری اس ذہانت اور دلیری نے تو ہمارا دل موہ لیا ہے۔ اب ذرا ہمیں بھی مہمان نوازی کا موقع دو ناں۔'' فربہی مائل اہلکار چمکارتے ہوئے بولا۔

اس اسکول میں اس کی بیٹی بھی میٹرک کی طالبہ تھی۔ اس لیے وہ انھیں کوئی رعایت دینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ انور اور عامر کے بشرے سے اک ذرا بے چینی جھلکی لیکن شرمندگی یا خوف کا اب بھی کہیں شائبہ نہ تھا۔

''لے چلو انھیں باہر گاڑی میں۔ آج ان کی یہ ہیرو گیری ناک کے رستے نہ نکال دی تو نام نہیں میرا۔'' فربہی مائل کانسٹیبل نے اپنے ساتھی سے کہا۔

وہ انھیں کالر سے گھسیٹتے ہوئے گیٹ کے پاس موجود گاڑی میں لے گیا۔ ان کی ہیبت کدائی دیکھ کر وہاں موجود دیگر لڑکے کھسک گئے۔ کرخت صورت پولیس اہلکار نے ان دونوں کی کمر پر اپنے بھاری بھرکم بوٹ سے ٹھوکر رسید کی اور اپنی معیت میں قریبی تھانہ روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

''برے پھنسے ہیں اس بار تو!'' انور نے دھیرے سے کہا۔

''ارے تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ ہم نے کوئی قتل شتل تو نہیں کیا ناں کسی کا؟ یہ لوگ خوامخواہ اپنے نمبر بنانے کے لیے ہمیں لے آئے ہیں۔ چھوڑ دیں گے خود ہی تھوڑی دیر میں۔'' عامر بے نیازی سے بولا۔

''گھر والوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟ انھیں بھی خبر تو مل ہی گئی ہوگی۔ جب ہمیں گھسیٹ کر گاڑی میں ڈالا جارہا تھا تو میری نظر ظہور پر پڑی تھی۔ وہ بھی وہیں ہجوم میں موجود تھا؟''

''کون ظہور؟ وہ جنرل اسٹور والے کے بیٹے کی بات تو نہیں کررہا تو؟'' عامر کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔

''ہاں بالکل وہی، اس کے باپ کے اسٹور پر محلّہ کے سبھی افراد آتے ہیں۔ اب تک اس نے خوب ڈھنڈورا پیٹ دیا ہوگا ہماری گرفتاری کا۔'' انور نے دانت پیسے۔

''تو اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟ ہم یہی چال اس پر الٹ دیں گے کہ وہ گرلز اسکول کے باہر کیا کررہا تھا اس وقت؟'' وہ اطمینان سے بولا۔

''تیری بھی ذہانت کا جواب نہیں۔'' انور کی بات پر وہ بے ساختہ مسکرا اٹھا۔

''فکر نہ کر، یہ چھوٹے موٹے واقعات تو مرد کی زندگی کی شان ہوتے ہیں۔ مستقبل میں ایسے تجربات ہمیں سنبھل کر چلنا سکھائیں گے۔'' عامر نے دلاسہ دیا اور انور بے فکر ہوگیا۔

ان دونوں کی عمر سولہ سال تھی۔ چھریری جسامت، سانولی رنگت اور تیکھے و جاذبِ نظر نقوش پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی انھیں خوب تھا۔ جدید تراش خراش کے ملبوسات ان کی خوبروئی کے لیے ہمیشہ بونس ثابت ہوتے۔ پڑھائی لکھائی سے قطع تعلق کو ایک زمانہ بیت چکا تھا۔ آوارہ گردی میں خاصا ملکہ حاصل تھا۔

وہ دونوں بیک وقت چچازاد و خالہ زاد بھائی تھے۔ سوئے اتفاق گھر بھی ایک ہی محلّہ میں تھے۔ انور عامر سے محض ایک ماہ چھوٹا تھا لیکن عادات و اطوار میں وہ بالکل 'جڑواں بھائی' معلوم ہوتے تھے۔ ان کے تمام تر منصوبہ جات ہمیشہ کامیابی سے ہمکنار ہوتے تھے لیکن اس بار اونٹ پہاڑ تلے آگیا تھا۔

حوالات کے ٹھنڈے فرش پر پاؤں پسارے وہ اطمینان سے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ انھیں اسی کرخت صورت اہلکار کا چہرہ سلاخوں کے پار دکھائی دیا۔

''بہت ڈھیٹ اور عادی مجرم معلوم ہوتے ہو۔ ورنہ یہاں پہنچ کر تو بڑے بڑوں کا پتا پانی ہوجاتا ہے۔'' اس نے تنفر سے انھیں گھورتے ہوئے کہا۔

''نہیں جناب! ہم یہاں پہلی دفعہ ہی آئے ہیں۔ آپ کچھ کرم فرمائی کردیں ہم پہ آپ کے اس احسان کی ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں ہم۔'' عامر نے احتیاط سے چارا ڈالا۔

''اچھا! کیا قیمت ادا کرسکتے ہو؟''

''جو آپ چاہیں، ہم مہیا کردیں گے۔'' انور نے فوراً کہا۔

''فی الحال تو تمھیں ضیاء صاحب نے طلب کیا ہے۔ پہلے انھیں بھگت لو پھر بات کرنا مجھ سے۔'' وہ معنی خیزی سے بولا۔

''لو جی! ایک اور ضیاء، ابھی تو پہلے والے سے بڑی دقت سے رہائی ملی تھی۔'' عامر نے ہونٹ سکوڑے۔

اس اہلکار نے ان کی لن ترانیوں پر مزید دھیان دیے بغیر حوالات کا دروازہ کھولا اور ایک بار پھر کالر سے گھسیٹتا ہوا بغلی کمرے میں لے گیا جہاں ایک میز کے عقب میں بھاری بھرکم ضیاء چہرے پر خشونت اور رعونت لیے ان کا منتظر تھا۔

''بیٹھیے سر جی! آپ کے بھی انداز ے درست

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھے۔بہت ہی ڈھیٹ' بے حیا ہیں یہ۔" اس نے دونوں کی گدی پر دو ہاتھوں سے بیک وقت زوردار تھپڑ رسید کیے تو وہ بلبلا اُٹھے۔

"ہم نے کوئی قتل یا ڈکیتی تو نہیں کی ضیاء صاحب! جو ہم سے یہ سلوک ہو رہا ہے۔ یہ تو قانون کے خلاف ہے۔" انور سے برداشت نہ ہوا۔

ضیاء جھٹکے سے اُٹھا اور اس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔

"اب تُو ہمیں قانون سکھائے گا نطفہ ناتحقیق! لگتا ہے فلموں کا کچھ زیادہ ہی خمار چڑھا ہے اس ننھے سے دماغ پر، ابھی علاج کیے دیتا ہوں تیرا۔" وہ اس کے ہیئر اسٹائل اور حلیہ پر چوٹ کرتے ہوئے بولا۔

انور کے نقوش معروف بھارتی اداکار 'متھن' سے بہت مشابہ تھے اور اس شبیہ کو مزید پُراثر بنانے کے لیے وہ ہمیشہ اپنے بال بھی اسی کی طرح بنائے رکھتا۔

ضیاء کے اشارے پر مشتاق نے انھیں بالوں سے دبوچ کر فرش پر پھینکا اور ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیا۔ کچھ دیر بعد وہ بیرونی سمت سے درمیانی عمر کے ایک شخص کو لے آیا جس کے ہاتھ میں ایک مشین دیکھ کر وہ قدرے متوحش ہو گئے۔

اس نے آن کی آن میں مشین ان کے سروں پر پھیر کر انھیں صفاچٹ کر دیا۔ یہ سزا جسمانی تکلیف سے کہیں سوا تھی۔

"آیندہ کسی بھی لڑکی کے بارے میں منفی سوچ ذہن میں لانے سے پہلے مجھے اور اپنے اس انجام کو یاد کر لینا اور دعا کرنا کہ دوبارہ کبھی مجھ سے سامنا نہ ہو ورنہ تمھاری مردانگی کے نشان ہی نیست و نابود کر دوں گا۔" ضیاء نے پھنکارتے ہوئے انھیں مشتاق کے حوالے کر دیا۔

☆☆☆

عامر اور انور پر اگر پولیس کی جانب سے جسمانی تشدد ہوتا تو انھیں ایسی اذیت نہ ہوتی لیکن بالوں سے محرومی کا کرب حد سے سوا تھا۔ نیم شفاف سر ان کے لیے توہین اور رسوائی کی زندہ علامت بن گیا تھا۔

وہ بیسویں صدی کے ایسے نوجوان تھے جو نا محسوس طریقہ سے ہمسایہ ملک کے رنگوں میں ڈھل چکے تھے۔ نوّے کی دہائی ابھی نوزائیدگی میں تھی اور یہ وہ وقت تھا جب دو سال قبل ایک طرف تو سیاسی کینوس پر ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی تھی تو دوسری جانب عوام کی ذاتی زندگی میں بھی ماضی جیسا ٹھہراؤ نا رہ پانے لگا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے ٹیلی ویژن کی نشریات کا آغاز دوپہر تین بجے کے بعد ہوا کرتا تھا۔ انٹینا کا رخ تبدیل کیے وہ دور درشن ٹیون کر کے بھارتی فلموں اور چترہار کے خوب مزے لیا کرتے۔ عوام الناس میں سادگی و محبت کم ہی سہی لیکن ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ صنف مخالف کے لیے دلچسپی و کشش بڑھنے لگی تھی اور بڑھتی بھی کیوں؟ دلکشی، رعنائی کے وہ پیکر پہلے تو چلمن کی اوٹ میں، دریچوں کے جھروکے سے اپنی جھلک دکھاتے تھے مگر اب یہ تکلفات ختم ہو گئے تھے۔ پہلے پہل کزنز سے پردہ کا رواج ختم ہوا۔ نظریں اب باضابطہ طور پر چار ہوتیں، دل ایک میٹھی سی تال پر دھڑکتے اور روح و قلب میں سہانے نغمے چھڑ جاتے۔ بنت حوا اب پوشیدہ، سربستہ راز نہ رہی تھی۔ وہ تو ایک کھلا خزانہ بننے لگی تھی جس کی ایک جھلک سے اسے تسخیر کرنے کے جذبات مچل سے جاتے۔ اس تغیر کا اثر سب سے پہلے مڈل کلاس طبقہ نے قبول کیا۔

اس تبدیلی کا اصل آغاز عام فرد کے گھر میں وی۔ سی۔ آر کی آمد سے ہوا تھا۔ سینما کی بڑی اسکرینوں پر اپنے من پسند فلمی ستارے دیکھنے والوں کے لیے یہ بجوبہ روزگار مشین بہت پُرکشش تھی۔ ان کے لیے سب سے زیادہ حیران کن امر یہ ہوتا تھا کہ من پسند مناظر و گانے فارورڈ اور ریوائنڈ کر کے جتنی بار چاہے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس شیطانی چرخہ کا جو بھی مالک بنتا رشتہ دار و احباب بہت اہتمام سے مبارکباد دینے چلے آتے۔ مہمان نوازی کے تقاضے نبھاتے ہوئے انھیں کوئی نہ کوئی ویڈیو کیسٹ بھی دکھائی جاتی اور یہ کیسٹ اگر سپرہٹ بھارتی فلم ہوتی تو میزبان کی شان و وقار میں کئی چاند لگ جاتے۔

مادھوری، سری دیوی، ریکھا، امیتابھ، راجیش کھنا اور سنجے دت کو اسکرین پر اپنی امنگوں کا ترجمان بنے دیکھ کر وہ لاشعوری طور پر اپنی ذات کے لیے انھی امور کے متقاضی ہونے لگتے۔ اور پھر نظروں کا دائرہ اپنے کزنز، محلہ داروں سے وسیع تر ہوتا ہوا گرلز اسکول اور کالجز تک جا پہنچتا۔

لڑکیاں بھارتی ہیروئنز کی طرح رنگ برنگے لباس، چولی گھاگرے پہننے کی مجاز تو نہ تھیں لیکن وہ اپنا سنگھار، گیسو اور ناز و انداز میں انھی کی نقالی کرتیں۔ اور رہے لڑکے، وہ تو ازلی آزاد فطرت تھے۔ جینز کا استعمال بھی اسی دور میں مروج ہوا۔ کھلے رنگوں والی شرٹس، گردن سے نیچے جھولتے بال، گلے میں لٹکتی ایک آدھ چین صنف مخالف کی نظروں میں ستائش اور پسندیدگی کے جذبات عیاں کرنے لگتی۔ رومانس روٹی، سبزی، ترکاری جیسی ضرورت بننے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

لگا۔ مدھ بھرے نغموں کے رسیلے بول دلی جذبات کو گویائی دینے کا بہترین ذریعہ تھے اور خوشبوؤں میں بسے کاغذ پر حالِ دل بیان کر کے عہد و پیمان کے سبھی مراحل طے کر لیے جاتے۔

انور اور عامر بھی تغیر کی زد میں آئے ایسے ہی ایک گھرانے کے ہونہار سپوت تھے۔ تبدیلی کا زہر رگوں میں مکمل طور پر سرایت کر چکا تھا اور اب جذبات کو بھی اپنی تسکین بہر صورت درکار تھی۔

☆☆☆

''کر دی خوار اپنے باپ دادا کی عزت؟ لے آئے تمغہ اپنی بے حیائی کا!'' اس رات عامر کے گھر میں داخل ہوتے ہی ماں نے توپوں کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔ ''تھوڑی سی حیا کر لے عامر! اب تک تو میں تیری ان حرکتوں پر پردہ پوشی کرتی آئی ہوں مگر اب گھر میں تیری بھابی آنے والی ہے، میری ناک نہ کٹوا دینا برادری میں۔''

''اب میں نے کیا کر دیا ہے؟ خوا مخواہ ہی میرے پیچھے پڑی رہتی ہو۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''نہ میرا بیٹا! تُو نے تو کبھی کچھ کیا ہی نہیں، مکہ مدینہ سے حج کر کے آیا ہے ناں جو یہ بال کٹے پڑے ہیں۔''

''وہ تو بس میں کسی دوست سے ایک شرط ہار گیا تھا تو بالوں کی قربانی دینی پڑی۔ گھر کی کھیتی ہے پھر سے بڑھ جائیں گے۔'' اس نے بمشکل اپنا لہجہ متوازن رکھا۔

''اچھا! تیری دوستیاں تھانوں میں کب سے ہو گئیں؟ پٹھان کے لڑکے نے سارے محلے میں خبر نشر کر دی ہے۔'' وہ طیش میں آ گئی۔ ''محلوں میں ملنے والی شہرت ایک تمغہ کی طرح ساری عمر ماتھے کا جھومر بنی رہتی ہے۔ ہم پُرکھوں کے وقت سے یہاں رہتے چلے آئے ہیں۔ آئندہ بھی یہیں رہنا ہے۔ یہی چھن رہے تو کوئی نہیں آئے گا اس دہلیز پر رشتہ کے لیے۔ پڑھائی لکھائی میں بھی تیرا دماغ چلا نہیں، بس یہ شیطانیاں سوجھتی رہتی ہیں۔''

''اب بس بھی کر دیں امی! آپ کو تو بس بہانہ چاہیے ہوتا ہے مجھے لیکچر دینے کا۔'' وہ تن فن کرتا چھت پر چلا گیا۔

بلقیس تفکرات میں گھری صحن میں موجود چارپائی پر ڈھے گئی۔ ایک سال قبل بیوگی نے اسے بہت سی الجھنوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس کا شوہر شاکر بہت محنتی، ایماندار اور صاف گو انسان تھا جس کا روزگار مرکزی چوراہے پر ایک ذاتی چائے خانے سے وابستہ تھا۔ دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی کفالت بہت احسن طریقے سے ہوتی رہی۔ سب سے بڑی بیٹی جمیلہ کی شادی کا فریضہ اس نے اپنی زندگی میں ہی ادا کر دیا تھا۔ بڑے بیٹے جمیل کو بھی خاصی بھاگ دوڑ سے ابوظہبی میں سیٹل کروا دیا۔ جمیل طبعاً سنجیدہ مزاج، حساس انسان تھا جس کی زندگی کا محور والدین اور بہن بھائیوں کی خوشیاں تھیں۔

شاکر کو زندگی مہلت دیتی تو وہ عامر کو بھی کوئی معقول روزگار فراہم کر دیتا۔ اپنے اس بیٹے کے پڑھائی میں کچی ذہن، منفی سوچوں اور رجحانات کا اندازہ وہ بہت پہلے لگا چکا تھا۔ ایسی طرزِ فکر کا حامل انسان اپنے ساتھ خود سے وابستہ رشتوں کے لیے بھی تباہی و بربادی ہی پیدا کرتا ہے لیکن دل میں اٹھنے والا ہلکا پھلکا درد اس کے لیے ایک ہارٹ اٹیک کی صورت میں موت کا پیامبر بن گیا اور اولاد کی زندگی سنوارنے کی تمام تر ذمہ داری بلقیس کے کندھوں پر ڈالے وہ خاک اوڑھ کر سو گیا۔

شوہر کی کمی محسوس کرتی بلقیس اپنے خیالات کی رو سے کال بیل کی آواز سن کر چونکی۔ وہ نڈھال وجود سے اپنے چپل گھسیٹتی اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کے سامنے چھوٹی بہن اور دیورانی راشدہ، انور کے ہمراہ موجود تھی۔ ان دونوں بہنوں میں نقوش کی مماثلت کے علاوہ انور و عامر کا درد بھی مشترک تھا۔ راشدہ کا خاوند عرصہ دراز سے بسلسلہ روزگار مسقط میں مقیم تھا۔ سال بھر کے بعد اسے صرف ایک ماہ کی چھٹی ملتی۔ باپ کی غیر موجودگی میں انور کو سڑکیں ناپنے اور ویڈیو گیمز دیکھنے کے سوا کچھ بھی نہ سوجھتا تھا۔

''اس وقت خیر سے آنا ہوا راشدہ؟'' بہن کی آنکھوں میں ویرانی اور وحشت کے ڈیرے بلقیس کو مزید دکھی کر گئے اور وہ اسے لیے صحن میں چلی آئی۔

''آپا! میں تو بہت پریشان ہو گئی ہوں اس لڑکے کے ہاتھوں۔ آج یہ جو نیا کارنامہ سرانجام دے کر آئے ہیں اشفاق کو علم ہوا تو مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دیں گے۔''

''اشفاق تو پھر بھی اس کو سختی اور گرمی دکھا کر جامہ میں لا سکتا ہے، میں دکھیاری کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ جمیل کو دو سال بعد چھٹی ملتی ہے اور وہ بھی ایسا بھلا مانس ہے کہ بھائی کو اپنی کھال کی جوتیاں پہنانے کو تیار رہتا ہے۔ ماتھے پر کوئی شکن لائے بغیر اس کی فرمائش پوری کر دیتا ہے کہ اسے باپ کی کمی محسوس نہ ہو لیکن یہ ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔''

''میں نے تو سوچ لیا ہے آپا! اس کا شناختی کارڈ بنتے ہی اشفاق کے پاس بھجوا دوں گی اسے۔ میں مزید رکھوالی نہیں کر سکتی اب۔ آپ بھی جمیل سے بات کر کے دیکھنا۔''

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وہ دونوں سر جوڑے مختلف منصوبہ بندی میں مشغول تھیں اور ان کے تفکرات سے بے نیاز عامر اور انور چھت پر بیٹھے اپنا دکھتا بدن اور اندرونی چوٹوں سے اٹھتی ٹیسیں دباتے مشتاق اور ضیاء کو کوسنے میں مگن تھے۔

☆☆☆

راشدہ اور بلقیس نے از سر نو ہمت پیدا کی اور بیٹوں کو راہ راست پر لانے کے لیے انہیں نئی ذمہ داریوں میں الجھانے کی کوششیں شروع کردیں۔ شاکر کے چائے خانے کو اس کے ایک قریبی دوست ماجد نے بہت محنت سے سنبھال کر ایک چھوٹے سے ہوٹل کا درجہ دے دیا جہاں وہ گھر میں بنے سالن وغیرہ بھی رکھ لیتا۔ صبح اور دوپہر کے اوقات میں یہاں بہت رش رہتا۔ مزدور برادری سے تعلق رکھنے والے افراد ان ذائقہ دار کھانوں کے بہت رسیا تھے۔ وہ نہایت ایمانداری سے آمدن کا ایک مخصوص حصہ شاکر کے گھر پہنچا دیتا۔

بلقیس اس روز اپنی فریاد لیے ماجد کے پاس پہنچ گئی۔

''میں بیوہ عورت ہوں بھائی ماجد! سر کا سائبان چھن جائے تو بے امانی کی جھلستی دھوپ سب سے پہلے گھر میں موجود اولاد کا رنگ روپ اور کردار بگاڑتی ہے۔ عامر کو اپنے ساتھ مصروف کرلیں، مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔''

''مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے بہن! اس کاروبار میں محنت اور سرمایہ کاری شاکر ہی کی ہے۔ اس کی اولاد کا حق اوّل ہے۔ اگر زندگی بے وفائی نہ کرتی تو وہ جمیل کی طرح انہیں بھی کسی نہ کسی مقام پر پہنچا دیتا۔'' ماجد نے متانت سے کہا۔

''بس دو چار سال کی بات ہے بھائی! پھر اسے بھی جمیل کے پاس ہی بھجوا دوں گی۔ تب تک اس پر سختی کی بہت ضرورت ہے۔''

''تم بالکل فکر نہ کرو! اللہ بہتر کرے گا۔ اسے کل ہی سے بھیج دینا۔''

بلقیس مطمئن ہوگئی اور گھر واپسی سے قبل راشدہ کے پاس چلی گئی۔

''کوئی حل تلاش کیا انور کے لیے۔''

''جی آپا! اس کے ابا کا خط ملا تھا کل۔ انہوں نے اپنے واقف کار کا بتایا ہے۔ جو زنانہ و مردانہ کپڑوں کا بہت ماہر درزی ہے۔ انور کو اسی کی شاگردی میں دے آئی ہوں۔ کوئی ہنر تو سیکھ لے گا یہ۔''

وہ دونوں ہی اپنے اس دردِ سر سے نجات پر بہت مسرور تھیں اور اس سے بھی خوش آئند بات یہ تھی کہ عامر اور انور بلا چوں چرا اپنی اس نئی ڈیوٹی کے لیے راضی ہوگئے تھے۔ راشدہ اور بلقیس کو دعاؤں کی قبولیت کا یقین ہو چلا تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ تھانے میں ہونے والی مار پیٹ کے نتیجہ میں وہ محض وقتی دباؤ کا شکار تھے۔ انہوں نے ہمیشہ فلموں میں ہیرو حضرات کو ہنسی خوشی اور جسمانی طاقت کے زعم میں سخت ترین تشدد برداشت کرتے دیکھا تھا لیکن اب خود پہ پڑی اس افتاد کے ساتھ ہی انہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگیا تھا۔

وہ غمِ روزگار کی اس نئی مصروفیت میں الجھ تو گئے تھے لیکن دل و دماغ میں رچ بس چکی آوارگی کو بھی اپنے اخراج کا رستہ درکار تھا جو قدرے تعطل سے ہی سہی لیکن انہوں نے تلاش کر ہی لیا۔

☆☆☆

''میں نماز کے لیے جا رہا ہوں عامر بیٹا! جماعت کا وقت نکل جائے گا۔ تم بھی چلے چلو ساتھ ہی۔'' ماجد نے اپنا معمول کا فقرہ دہرایا۔

''نہیں چاچا جی! آپ چلے جائیں، میں یہاں سنبھالتا ہوں سب۔'' عامر نے بھی اپنا مخصوص جواب دیا۔

اسے ماجد کے ساتھ ہوٹل پر کام سنبھالے چھ ماہ ہو چکے تھے اور اپنے برتاؤ، سنجیدگی اور ذمہ داری سے اس نے بہت اچھا تاثر قائم کردیا۔ ماجد کی صحت اور تھکاوٹ کو دیکھتے ہوئے عامر نے اسے دوپہر کے بعد کچھ وقت آرام کی غرض سے گھر رہنے کا مشورہ دے دیا جو معمولی سی پس و پیش کے بعد اس نے تسلیم بھی کرلیا۔ اب صورتِ حال کچھ یوں ہوتی کہ ظہر کی نماز کے بعد ماجد دو گھنٹے گھر میں گزار لیتا۔ تاہم وہ عامر کو اپنے ساتھ مسجد چلنے کے لیے مدعو ضرور کرتا اور عامر ہمیشہ پہلو بچا لیتا۔

''نماز بھی تو ضروری ہے ناں بیٹا! دنیاوی کاروبار تو چلتے ہی رہتے ہیں۔''

''ہوگی ضروری...... مجھے کیا علم؟؟ مجھے نماز نہیں آتی۔'' عامر نے بھی کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

''کک...... کیوں؟ کیا شاکر نے کبھی نہیں کہا تم لوگوں سے؟'' ماجد ہکا بکا تھا۔

''ابا جی تو بس روزی روٹی کمانے میں الجھے رہتے تھے، امی جی پہلے سختی سے بھیج دیا کرتی تھیں لیکن میں اور انور ایک دو سیپاروں سے آگے نہیں بڑھ پائے تنگ آکر مولوی صاحب نے ہمیں پڑھانے سے انکار کردیا۔''

ماجد اس انکشاف پر تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا اور خاموشی سے رخصت ہوگیا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اس کی روانگی کے فوری بعد عامر ہوٹل کے عقبی جانب بڑھ گیا جہاں ایک گودام نما انتہائی مختصر کمرا موجود تھا۔ یہاں چائے بنانے کے لیے اضافی سامان وغیرہ رکھا جاتا تھا۔ اس نے فوراً ایک بدرنگ چوبی دروازہ کھول دیا۔ پانچ منٹ سے بھی کم دورانیہ میں اس کا گوہر مقصود اسی دروازے سے اندر داخل ہوتا دکھائی دیا۔

وہ ایک کمسن اور بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ کالج کے سفید یونیفارم میں ملبوس اس کی دلکشی و رعنائی آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ مذکورہ کالج اسی چوراہے سے بائیں جانب ایک مرکزی سڑک پر واقع تھا۔ صبح اور دوپہر کے اوقات کار میں وہاں لڑکیوں کا اکثر ہجوم رہتا جن میں سے اکثریت تو اپنے بھائیوں یا والد کی زیر نگرانی ہوتیں لیکن کچھ پری پیکر ایسی بھی نظر آتیں جو ٹولیوں کی صورت میں اکیلی اپنی درسگاہ جایا کرتیں۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عامر نے اپنی خوبرو شخصیت اور مستقل مزاجی کے ترکش کے چند تیر آزمائے اور 'عاصمہ' نامی اس لڑکی کو اپنا اسیر کرلیا۔

پہلے پہل معاملات تو محض نظروں کے تبادلے اور اشارے کنایوں تک ہی محدود رہے لیکن پھر ایک روز ہمت کر کے اس نے عاصمہ کو فلمی انداز سے لبریز خط پہنچا دیا۔ عاصمہ بھی جانے کب سے اپنے دل میں پروانوں جیسی چاہت کے جذبات لیے سرگرداں تھی۔ وہ مکمل طور پر عامر کے سحر میں جکڑتی چلی گئی۔

اس روز وہ عامر کے بے حد اصرار پر اس چھوٹے سے ہوٹل کے عقب میں واقع قدرے سنسان اور ویران گلی میں کھلنے والے گودام کے دروازے سے اندر چلی آئی۔ عامر کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ صنف نازک سے یوں بالمشافہ ملاقات اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا۔ عاصمہ کا بھی کم وبیش یہی حال تھا۔ تاہم دونوں ہی نے اپنے جذبات پر بند باندھے رکھے اور وعدوں 'دعوؤں' اقرار و پیمان کے ایک نئے سفر پر روانہ ہوگئے۔

☆☆☆

اب ذرا انور کا حال ملاحظہ ہو.....

اس نے بھی دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اپنے پیشے کے تمام تر اسرار و رموز سیکھنے کا آغاز کر دیا۔ چھ ماہ میں وہ کپڑوں کی کٹائی کا خاصا ماہر بن چکا تھا اور آثار یہی ظاہر کرتے تھے کہ وہ سلائی بھی بہت جلد سیکھ لے گا۔ یہ وہ وقت تھا جب یونیسکس کا رواج ابھی عام نہ ہوا تھا۔ خود نمائی کے زعم میں مبتلا بیگمات ماہر درزیوں سے سلوائے گئے کپڑے پہننے کو ہی ترجیح دیا کرتیں۔ اس ٹیلرنگ شاپ پر بھی ایسی ہی خواتین کی آمد ہوا کرتی تھی۔ انور کے نقوش' وجاہت اور بے خوف انداز انھیں بے حد بھا چکے تھے۔ وہ آئے روز ٹیلر ماسٹر سے الجھنے لگیں۔

''ماسٹر جی! مجھے گھر میں بہت سی مصروفیات گھیرے رہتی ہیں۔ میں باقاعدگی سے اپنے کپڑوں کا ناپ دینے نہیں آسکتی۔''

''تو ہم کوئی متبادل رستہ نکال لیتے ہیں بیگم صاحبہ! آپ فکر نہ کریں۔'' ادھیڑ عمر ٹیلر ماسٹر اپنی اس مستقل روزی میں خلل پڑتے دیکھ کر بوکھلا جاتا۔

''ایسا ہوسکتا ہے کیا ماسٹر جی؟'' وہ بھولپن سے استفسار کرتیں۔

''بالکل ہوسکتا ہے جی! آپ کو جب بھی ضرورت پیش آئے ڈرائیور کو بھجوا دیا کریں۔ میں اس نئے لڑکے کو روانہ کردوں گا۔ یہ ناپ وغیرہ لے لیا کرے گا۔''

''بہتر ہے! اگر متبادل راہ میسر آجائے تو ہمیں کیا اعتراض ہوسکتا ہے بھلا؟'' ان کی نیم رضامندی ماسٹر جی کی رکی ہوئی سانسیں بحال کردیتی۔

انور ان خواتین کے حیلے بہانوں اور سوچ و فکر سے لاعلم نہیں تھا۔ وہ اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوتے ہوئے جوش اور اعتماد سے اس نئی 'ڈیوٹی' پر روانہ ہوتا۔ اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔

مرد و زن کی قربت کے اسرار و رموز سے آشنا ہوتے ہی وہ وحشت کے جنگل میں سرپٹ دوڑتا چلا جارہا تھا۔

☆☆☆

عامر اور انور کی ملاقاتوں میں اب پہلے سی باقاعدگی نہیں رہی تھی لیکن ہفتہ وار چھٹی کی شام وہ جب بھی ملتے' اپنے اس نئے سفر کی داستانیں ایک دوسرے کے گوش گذار کرتے۔ انھی دنوں جمیل بھی ابوظہبی سے دو ماہ کے لیے پاکستان آگیا اور گھر میں اس کی شادی کے ہنگاموں نے ایک نئی مصروفیت پیدا کردی۔

جمیل کی بیوی ان کے دور کی رشتہ دار تھی اور مکمل طور پر ایک گھریلو عورت تھی۔ شوہر پرستی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ کم عمری کے باعث مزاج میں بے پروائی کا عنصر بھی شامل تھا۔ جمیل کے سامنے اس کا چہرہ گلنار بن جاتا۔ وہ شوہر کے گرد پروانہ وار گردش کرتی۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا

خیال رکھتی۔ جمیل بھی اپنی نئی نویلی بیوی کی محبت میں سرشار رہتا تھا۔ گھر میں ایک رونق اور چہل پہل کا سماں رہنے لگا۔ بلقیس اس صورتِ حال سے بہت خوش تھی لیکن وہیں ایک فرد ایسا بھی تھا جو اِن دونوں کے ناز و انداز دیکھ کر بے وجہ حسد میں مبتلا ہو رہا تھا۔

یہ عامر تھا۔ عورت اب اس کے لیے سربستہ راز تو رہی نہ تھی اس لیے بڑے بھائی اور بھابی کی نظروں میں جھلکتی محبت و ہم آہنگی اسے بیزاری میں مبتلا کرنے لگتی۔ تہمینہ کا وجود اپنے سامنے دیکھ کر اس کا ذہن بری طرح سلگنے لگتا۔ کچھ ہی عرصہ میں اس نے گھر کا کام کاج اپنے ذمہ لے لیا۔ عامر پہلے پہل تو صبر سے برداشت کرتا رہا لیکن پھر ایک روز وہ بے اختیار بول اٹھا!

"امی! مجھے کھانا آپ خود ہی دیا کریں۔ اسے مت بھیجا کریں۔"

"لیکن کیوں؟ میری بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنا دم نہیں رہا بیٹا!"

"تو پھر میری بھی شادی کر دیں۔ لیکن اس کو میری نظروں سے دور رکھا کریں۔" اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔

"تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں لگتے کس بل بوتے پر کر دوں شادی تمہاری؟ پہلے چار پیسے تو جوڑ لو۔" بلقیس بھی ضبط کھو بیٹھی۔ "اور بڑی بھاوج سے بات کرنے کا یہ کون سا انداز ہے؟"

اس نے ایک جلتی ہوئی نظر وہیں کھڑی تہمینہ پر ڈالی اور میز کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا۔

☆☆☆

عامر اپنے مطالبہ کے بودے پن سے خود بھی آگاہ تھا اور فی الوقت ماں اور بھائی کے اختیارات کے سامنے بے بس بھی۔ لیکن ایک در ایسا بھی تھا جہاں تمام تر اختیار اسی کے بس میں تھے۔ وہ لڑکیوں سے میل ملاقات کے سلسلے میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنے لگا۔ پہلے پہل تو صرف عاصمہ ہی اس سے ملنے آیا کرتی تھی مگر اب اس فہرست میں مدیحہ، سحرش اور نازنین کا اضافہ بھی ہو گیا۔ ہوٹل کا گودام نما کمرا ان ملاقاتوں کے لیے بہترین جائے پناہ تھی۔ عامر کی مثال اس وقت اس کبوتر کی مانند ہو چلی تھی جو خطرات کو اپنے سامنے دیکھ کر بھی آنکھیں میچے رہتا ہے۔ اس کا خفیہ میٹنگ پوائنٹ انھی بے احتیاطیوں کے سبب طشت از بام ہو گیا۔

اس گلی میں اکا دکا گھر ہی واقع تھے اور انھی دنوں ایک گھر میں کچھ تعمیراتی کام کا آغاز ہو گیا۔ مکان مالک بذاتِ خود مزدوروں کی نگرانی کے لیے چھت پر موجود رہتا اور اس کی عقابی نگاہوں سے عامر کی یہ سرگرمیاں پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ چند روز بعد وہ خاموشی سے دوپہر ہی کے وقت ماجد کے گھر جا پہنچا اور اس کے خوب لتے لیے۔

"تم نمازی پرہیزگار انسان ہو ماجد! لیکن اپنے اس ہوٹل کی آڑ میں یہ کیا غلاظت پھیلا رکھی ہے تم نے؟"

"کیسی نامعقول باتیں کر رہے ہو سفیان! میرے ہوٹل پر ہر چیز حفظانِ صحت کے اصولوں کے عین مطابق اور حلال ہوتی ہے۔" ماجد نے الجھ کر کہا۔

"میں اس بابت نہیں کہہ رہا، شاکر کا لڑکا اکثر ہوٹل کے پچھلے کمرے میں لڑکیوں کو گھسائے رکھتا ہے۔ جب سے میرے مکان کی تعمیر شروع ہوئی ہے، میں آئے روز یہی بے حیائی دیکھ رہا ہوں۔ اور تم کہتے ہو تمھیں علم ہی نہیں۔"

"مگر میں تو روزانہ اس وقت آرام کی غرض سے گھر آجاتا ہوں۔ وہاں صرف عامر ہی ہوتا ہے۔"

"عامر کے سابقہ کارنامے بھی کسی سے ڈھکے چھپے تو نہیں ہیں۔ پھر اس قدر اعتبار کی کیا وجہ ہے؟"

"مجھے اس کے مرحوم باپ کی دوستی اور مروت نے مجبور کر رکھا ہے سفیان! لیکن تم آئندہ جب بھی ایسا ہوتے دیکھو اپنے ساتھ کچھ اور محلہ داروں کو بھی لیے وہاں پہنچ جانا اور اسے خوب چار چوٹ لگانا اس کے گھر والوں کو میں خود ہی سنبھال لوں گا۔" ماجد نے سنجیدگی سے کہا۔

عامر کی بدقسمتی بھی ان دنوں غالباً عروج پر تھی۔ اس کی ملاقات اگلے ہی روز نازنین سے طے تھی۔ سفیان نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور چند بااثر افراد کے ساتھ اسے رنگے ہاتھوں پکڑ کر کسی بھی صفائی کا موقع دیے بغیر اس کی دھنائی شروع کر دی۔ سفیان ایک کونے میں چادر سے منہ چھپائے تھر تھر کانپتی نبیلہ کے پاس گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر دھیمے لیکن انتہائی سخت لہجہ میں گویا ہوا۔ "جب ایک لڑکی گھر سے باہر قدم نکالتی ہے تو وہ اکیلی نہیں ہوتی، اس کے ہمراہ والدین کی تربیت و اعتبار، بھائیوں کا مان اور بہنوں کی عزت بھی ہوتی ہے۔ یہاں اس کمرے میں تم نے ان سب کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ میں نہیں جانتا تم کس گھرانے سے تعلق رکھتی ہو لیکن آج یہاں تمھاری موجودگی ان سب کی زندہ درگور بن چکی ہے۔"

"م..... مجھے معاف کر دیں انکل! پلیز مجھے نکالیں

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

موسم گرما کی طویل دوپہروں کا ساتھی.....خوشگوار تحریروں سے سجا جون 2017ء کا دل خوش کُن پاکیزہ

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

رفعت سراج و شیریں حیدر کے خوب صورت ناول انوکھے موڑ پر

سحر ساجد کے قلم سے ایک اچھوتی تحریر **من جاں بازم**

سیما رضا ردا نے واکیے کچھ نئے باب اپنے نئی ناول **ہم کو عبث بدنام کیا** میں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کا پُرنور مضمون **اللہ اور اس کا نور**

شوبز کی دنیا سے **اجنبی، اجو بھائی** کرتے ہیں کچھ انکشافات **پاکیزہ کے مہمان** میں

ناہید سلطانہ اختر کی تحریر

رسانی نارسانی میں انوکھی محبت

کا قصہ بہت ہی پُراثر انداز بیاں کے ساتھ

اس کے علاوہ

نیلم احمد بشیر، بشریٰ سیال اور **غزالہ عزیز** کی خصوصی تحریریں

اور

عقیلہ حق، عذرا آفتاب، فرح طاہر قریشی، نسرین جمیل سیال،

سیما بنت عاصم و دیگر ہر دلعزیز لکھاریوں کی بے حد عمدہ کہانیاں

ماہ جون کی مناسبت سے دل پذیر سلسلے، دل گداز شاعری، پُرکشش کارنرز اور خوش ذائقہ تراکیب صرف آپ کے لیے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

یہاں سے۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

سفیان نے ایک دزدیدہ نظر عامر سے الجھے افراد کو دیکھا اور نبیلہ کو خاموشی سے باہر لے آیا۔ ''مرد و عورت کی عزت میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں مرد خواہ کچھ بھی کرے وہ پارسا ہی کہلائے گا لیکن عورت کی عزت کانچ سی ہوتی ہے اس پر لگنے والا معمولی دھبا بھی کبھی اوجھل یا فراموش نہیں ہو پاتا۔ آیندہ اپنے کردار کو کبھی ہلکا نہ کرنا۔ باعزت رہائی ہر بار مقدر نہیں بنتی۔'' نازنین ممنون نگاہوں سے اسے دیکھتی تیز رفتاری سے مڑ گئی۔

☆☆☆

بلقیس کے گھر میں اس وقت کسی موت کا سا سناٹا تھا۔ عامر کی 'عزت افزائی' کی خبر لیے ماجد بذات خود وہاں موجود تھا۔ جمیل اور بلقیس اس سے نظریں ہی نہ ملا پا رہے تھے۔

''میرے بیٹے پر غلط الزام لگایا گیا ہے بھائی ماجد! وہاں کوئی لڑکی برآمد نہیں ہوئی بعد میں۔''

''بس کرو بلقیس! اس کی حرکات تم سے پوشیدہ نہیں رہیں کبھی۔ اور رہا لڑکی کا سوال، اسے ہم نے خود ہی وہاں سے روانہ کر دیا تھا ورنہ نوبت خون خرابہ تک پہنچ جاتی۔'' ماجد نے بد لحاظی سے کہا اور پھر اپنا رخ جمیل کی جانب کر لیا۔ ''تمہارے بھائی کی نظروں میں شرم و حیا ختم ہو چکی ہے۔ اب بھی اگر تم نے چشم پوشی کی تو نتائج بہت سنگین ہوں گے۔ میری مانو تو اپنی بیوی کو بھی یہاں سے لے جانا ساتھ۔ بصورت دیگر خود ہی یہاں منتقل ہو جاؤ۔ میں شاکر کی تمام تر سرمایہ کاری تم لوگوں کو لوٹانے کے لیے تیار ہوں۔ ہوٹل اب مکمل طور پر میرے تصرف میں رہے گا۔''

آیندہ چند روز میں ضابطہ کی کارروائی کے بعد شاکر کی آخری نشانی بھی ماجد کی تحویل میں دے دی گئی۔ جمیل نے اس رقم اور اپنے دیگر اثاثہ جات سے ایک جنرل اسٹور کھولنے کا فیصلہ کر لیا۔ بلقیس نے اس فیصلہ پر بہت ناک بھوں چڑھائی۔ وہ اب بھی یہی چاہتی تھی کہ دونوں بیٹے بیرونِ ملک منتقل ہو جائیں لیکن جمیل اس بار ڈٹ گیا۔

''میں اسے کس بل بوتے پر لے جاؤں ساتھ۔ اس کے پاس تعلیم ہے نہ کوئی ہنر۔ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود اس میں ندامت کی کہیں کوئی رمق نہیں۔ اگر میں خود یہاں سے چلا جاؤں تو بھی ذہنی اذیت کا شکار رہوں گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ مزید خرابیاں پیدا ہونے سے قبل میں کچھ سخت فیصلے کر لوں۔''

''انور کے باپ نے اسے عمان بلوانے کا بندوبست کر لیا ہے۔ کچھ عرصہ بعد وہ راشدہ کو بھی ساتھ لے جائے گا اور یہاں میری اولاد اپنا جما جمایا کام خراب کرنے پر تلی ہے۔'' بلقیس سخت آزردہ تھی۔

''آپ جو مرضی کہہ لیں۔ میں اسے مزید گمراہی کا پروانہ نہیں تھما سکتا۔'' جمیل نے منظر سے ہٹنے میں عافیت جانی۔

عین اس پل ماں اور بھائی کے تحفظات سے بے نیاز عامر اپنی چوٹوں کی دہائی دیتا انور کے ساتھ گفتگو میں مگن تھا۔

''غلطی تیری بھی ہے عامر! کیا ضرورت تھی تجھے اس قدر بے احتیاطی کی۔''

''یہ سب اس ماجد کی پلاننگ تھی۔ وہ پہلے ہی ہوٹل پر قبضہ کرنے کا ذہن بنائے بیٹھا تھا۔''

''وہ سب تو ہو گیا یار! لیکن اب سوچو آگے کیا کرنا ہے؟'' عامر نے کراہتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔ پہلے مجھے جمیل بھائی اپنے پاس بلوانے کے بہلاوے دیتے رہے اور اب یہاں اسٹور کھول کر بیٹھ گئے ہیں۔''

''ہاں یہ تیرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ لیکن فکر کیوں کرتا ہے؟ میں ہوں ناں تیرے ساتھ..... میں بلواؤں گا تجھے اپنے پاس۔'' اس نے اپنا ہاتھ عامر کے بازو پر رکھا تو وہ چونک گیا۔

''یہ تیرے ہاتھوں کو کیا ہو گیا ہے انور؟ رگیں اس قدر ابھر آئی ہیں۔'' وہ تشویش سے بولا۔

''کچھ نہیں یار! بس ان بیگمات کے تقاضے پورے کرتے کرتے یہ حال ہو گیا ہے۔'' اس نے اپنا سگریٹ سلگا کر کہا۔ ''لیکن خیر! اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ تم بس کوئی چھوٹی موٹی مکینکی یا بجلی کے سامان کی مرمت کا کام سیکھ لے۔ پھر میں خود ہی تیرے کاغذات بھیج دوں گا۔''

عامر نے انور کا سمجھایا نکتہ خوب ذہن نشین کر لیا اور آٹو موبائل ورکشاپ میں سنجیدگی سے کام سیکھنے لگا۔ اس کی تبدیلی دیکھ کر بلقیس اور تہمینہ نے بھی سکھ کا سانس لیا۔

☆☆☆

اگلے دو سال میں عامر نے کافی حد تک گاڑیوں کی مرمت سیکھ لی اور اب انور ہی کے ارسال کردہ خط میں مشورے کے مطابق ڈینٹنگ اور پینٹنگ کی طرف بھی متوجہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

معزز قارئین آپ سے التماس ہے کہ ہم www.urdusoftbooks.com پر آپ حضرات کے لیے مسلسل اچھی اچھی کُتب فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں جس کے لیے وقت اور رقم دونوں صرف ہوتے ہیں جس کی غرض سے ہماری اِس ویب سائٹ کُچھ سپانسر اشتہارات لگائے گئے ہیں جب ویب سائٹ وزٹرز اُن اشتہارات میں سے کسی اشتہار پر کلک کرتے ہیں تو ویب سائٹ کو تھوڑی سی آمدن حاصل ہوتی ہے، یہ آمدن ویب سائٹ کے اخراجات کو برداشت کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے اس لیے آپ حضرات سے گزارش ہے کے اپنے Google Chrome یا Mozilla Firefox کی Adblocker Extension کو Pause کر دیں یا صرف ہماری ویب سائٹ کے لیے Pause کر دیں۔ نیچے نظر آنے والی تصویر میں دکھایا گیا ہے کے Adblocker کے Pause ہونے یا انسٹال نہ ہونے کی صورت میں اشتہارات Green Box والی جگہ پر ظاہر ہوں گے۔

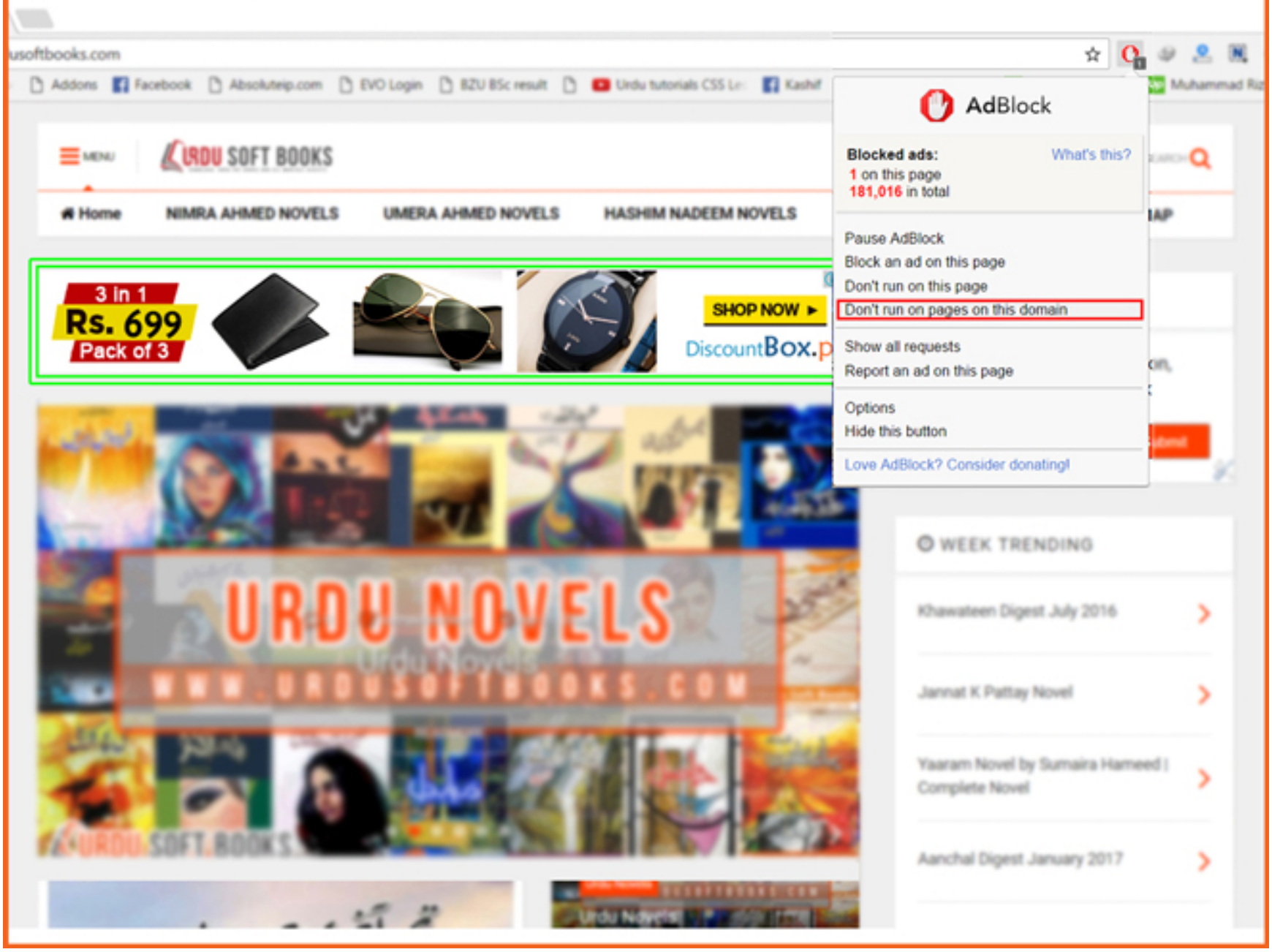

آزمائی شروع کردی۔ گھر کے حالات میں بھی بتدریج تبدیلی آنے لگی تھی۔ جمیل کی انتھک محنت سے اسٹور پھلنے پھولنے لگا تھا۔ ایک بیٹی اور بیٹے کی نعمت نے خاندان کی تکمیل بھی کر دی۔ وہ بہت مطمئن و سرشار رہتا۔ وقت شاید یونہی ہموار ی سے گذرتا چلا جاتا لیکن انور کی اچانک واپسی اور ملاقات نے ایک تلاطم برپا کردیا۔

اس قلیل عرصہ میں اس کی جسمانی حالت نا قابل شناخت ہو چکی تھی۔ سیاہی مائل رنگت اور ہونٹ' پکا ہوا چہرہ' آنکھوں کے گرد گہرے حلقے اور استخوانی جسم دیکھ کر وہ سبھی انگشت بدنداں تھے۔

''یہ تُو نے اپنی کیا حالت بنالی ہے انور؟ یہاں سے تو اچھا خاصا گیا تھا تُو۔'' بلقیس نے دکھ سے کہا۔

''سمجھ نہیں آتا آپا! میرا تو دل ہول رہا ہے اسے دیکھ کر۔ کچھ بتاتا بھی نہیں یہ۔'' راشدہ بے اختیار رونے لگی۔

''پردیس کی سختی جھیلنا آسان تھوڑی ہوتا ہے خالہ! اب کچھ عرصہ یہاں رہوں گا تو خود ہی بہتر ہو جاؤں گا۔'' وہ انھیں دلاسہ دیتا عامر سے ملنے چل دیا۔

''میرے کاغذات کا کچھ بنا؟'' اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

''ہاں! کوشش کر رہا ہوں میں۔'' اس کا انداز کھویا کھویا سا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے انور؟ تو اس قدر بجھا بجھا کیوں ہے؟ اور آج تیرے ہاتھ میں سگریٹ بھی نظر نہیں آرہی۔'' اسے اچنبھا ہوا۔

''میں نے اپنے لیے جو راہیں تلاش کی تھیں' ان کی مسافت نے اس حال تک پہنچا دیا ہے۔'' اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں پونچھیں اور جیب سے کچھ کاغذات نکال کر عامر کے سامنے رکھ دیے۔ ''یہ میری میڈیکل رپورٹ ہے اور اس میں واضح لکھا ہے کہ غیر متوازن زندگی اور سگریٹ نوشی میرا وجود دیمک کی طرح کھوکھلا کر چکی ہے۔''

''کک..... کیا مطلب ہے تیرا؟'' عامر ششدر تھا۔

''آخری درجے کا کینسر تشخیص ہوا ہے مجھے۔ اور ڈاکٹر کہتے ہیں کہ میرے پاس وقت اب بہت کم ہے لیکن تم کسی کو مت بتانا گھر میں ورنہ میری ماں یہ صدمہ برداشت نہیں کر پائے گی۔''

''لیکن اس کا کوئی تو علاج ہوگا یار!'' عامر کی آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔

''دوائیاں استعمال کر رہا ہوں۔ شاید اس سے موت کچھ آسان ہو جائے۔''

''کچھ نہیں ہوگا تجھے..... ٹھیک ہو جائے گا سب۔'' اس نے تڑپ کر اسے دلاسہ دیا۔

لیکن دلاسے' علاج' ادویات اور دعائیں اپنی تاثیر کھو چکی تھیں۔ تین ہی ہفتوں میں زندگی کی امنگوں' خواہشات سے لبریز کشت کے پیچھے سرپٹ بھاگتا انور ایک رات خاموشی سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا۔ راشدہ کی آہ و بکا اس روز آسمان کا کلیجہ شق کر رہی تھی لیکن بے رحم موت اس بائیس سالہ جوان کو اپنے شکنجے سے کسی صورت بھی رہائی دینے کی مجاز نہ تھی۔

انور کی جواں مرگی اس خاندان کے لیے بہت بڑا جھٹکا ثابت ہوئی۔ بیٹے کی جدائی نے والدین کو بھی کچھ بعد دیگرے اسی سفر پر روانہ کر دیا۔

☆☆☆

موت ازل سے ایک ایسا طاقتور جذبہ رہی ہے جو انسانی سرگرمیوں پر ایک واضح فل اسٹاپ لگا کر اسے اپنے اصل کی جانب متوجہ ہونے کے لیے کم از کم ایک بار ضرور مجبور کر دیتی ہے۔ اور یہی موت اگر کسی قریبی عزیز کی ہو تو اس ٹھہراؤ کی شدت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ عامر بھی اسی بے رحم احساس کے زیر اثر آچکا تھا۔ انور کے بعد چچا' چچی کی اموات نے اس جیسے بے حس اور اپنی ذات میں مقید شخص کے کس بل بھی نکال دیے۔ اپنے مستقبل کی بابت وہ حد درجہ بے یقینی کا شکار تھا۔ خواب نگری میں پرواز کی اب سکت تھی نہ وسائل۔ اسے اپنے تفکرات کی تسکین اور سابقہ طرز زندگی بحال رکھنے کے لیے بھی خود مختاری درکار تھی اس لیے وہ معاشی معاملات مستحکم کرنے کے لیے سنجیدہ ہونے لگا۔

اس کی سنجیدگی اور مزاج میں ٹھہراؤ دیکھ کر بلقیس شکر ادا کرتے نہ تھکتی۔ اس نے بیٹے کی شادی کرنے کے لیے کمر کس لی لیکن خوشی و سرشاری میں رقصاں مور کی طرح ایک بدصورت حقیقت فراموش کر بیٹھی۔ عامر کے لیے دیکھی جانے والی لڑکیوں کے والدین جب بات چیت بڑھانے کے لیے تفتیش کرواتے تو اس کے 'کردار' اور 'درخشاں ماضی' کے سنہری کارنامے سن کر معذرت کرنے میں ہی بہتری سمجھتے۔

یہ صورت حال بلقیس کے علاوہ جمیل کے لیے بھی بہت اذیت ناک تھی۔ محلے دار بھی اس مہینہ انگوٹھی سے باخبر ہو چکے تھے اس لیے اکثر اوقات انھیں چٹکیاں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

بھرتے۔ جمیل کا ضبط ختم ہونے لگا تھا اور ایک روز وہ بلقیس سے الجھ پڑا۔ ''میری مانیں تو عامر کے لیے کسی نچلے طبقہ یا ذرا کم رولڑ کی تلاش کریں! اب تک بیسیوں خاندان تو چھان چکی ہیں آپ۔ لیکن کوئی فائدہ ہوا کیا؟''

''کم رو کیوں تلاش کروں؟ میرا بیٹا شکل وصورت میں ہیرا ہے ہیرا..... میں اس کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گی۔''

''مرد کی شکل وصورت کون دیکھتا ہے ماں جی؟ کمائی اور کردار دیکھے جاتے ہیں اور ان دونوں ہی صورتوں میں وہ زیرو بٹا زیرو ہے۔ کمائی کے سلسلہ میں تھوڑی تبدیلی اب آئی ہے لیکن جن ماں باپ نے اپنے جگر کا ٹکڑا بیاہنا ہو وہ ہر طرح کی چھان پھٹک کے بعد ہی فیصلہ کرتے ہیں۔'' جمیل کی آواز بلند ہوگئی۔

''آپ تو ویسے بھی جانے کون سی خار کھائے بیٹھے ہیں مجھ سے۔ میری زندگی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی آپ نے۔'' عامر اس کی آواز سن کر وہیں چلا آیا۔

''میں نے تمھاری زندگی برباد کی یا خود تمھاری حرکات نے؟'' جمیل صدمہ بھرے لہجے میں بولا۔

''میں نے ایسا کیا انوکھا کر دیا ہے؟ ساری دنیا فلرٹ کرتی ہے۔ پہلے مجھے خوامخواہ اتنے سال بیرونِ ملک سیٹل کرنے کے بہلاوے میں رکھا آپ نے، اور اب امی کو یہ پٹیاں پڑھا رہے ہیں۔'' اس کے لہجہ میں کھولتی نفرت اور تپش پر تاسف سے سر ہلاتا جمیل خاموشی سے اٹھ گیا۔ بلقیس کے چہرے پر بھی بہت اذیت سمٹ آئی۔ اس نے کئی روز سے اپنے ذہن میں پنپنے والے ایک خیال کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

اگلے چند روز گھر میں رادی چین لکھتا رہا۔ بلقیس عامر کے لیے اپنے چچیرے بھائی کی بیٹی کا ہاتھ مانگنے کی خواہشمند تھی لیکن جمیل اس فیصلہ سے متفق نہ تھا۔

''غوثیہ ایک پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی ہے ماں جی! لیکن معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ عامر کسی بھی طرح اس کے لائق نہیں۔ آپ کا یہ قدم بنے بنائے رشتوں میں دراڑ پیدا کر دے گا۔'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''میرا بھائی مجھے انکار نہیں کرے گا اور شادی کے بعد تو اچھے اچھوں کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے عامر بھی سدھر جائے گا۔ میں آج شام ضرور جاؤں گی اکرم کے گھر اور رشتہ لے کر ہی اٹھوں گی۔'' بلقیس پُرامید تھی۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آسکی۔ اسی سہ پہر عامر جب اپنی ورکشاپ سے گھر آیا تو اس کے ساتھ ایک نسوانی وجود دیکھ کر سبھی ششدر رہ گئے۔

''یہ کسے اٹھا لائے ہو اپنے ساتھ تم؟'' جمیل نے گرج کر کہا۔

''یہ میری بیوی ہے، نسرین ابھی ابھی مسجد کے امام صاحب نے نکاح پڑھایا اور آج سے یہ اسی گھر کا فرد ہے۔'' عامر نے اطمینان سے جواب دیا۔

''شرفاء کا یہ طریقہ نہیں ہوتا عامر! کہ کسی بھی راہ چلتی لڑکی کو بیوی بنائے گھر لے آئیں۔ خاندان برادری والوں کو کیا جواب دیں گے ہم؟'' تہمینہ نے بے چینی سے ہاتھ مسلے۔

''نہیں ہوں میں شریف، یہ سند تو صرف آپ کے شوہر نامدار کے پاس ہے۔ خاندان' برادری کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ نسرین سے اگر کسی نے الجھنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' وہ بدلحاظی سے بولا۔

''یہ لڑکی تیرے لیے مناسب نہیں بیٹا! میں تو تیرا رشتہ غوثیہ.....'' بلقیس کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی جمیل نے اس کا ہاتھ دبا کر روک دیا۔ اس کی جہاندیدہ نظروں نے نسرین کے چہرے مہرے اور انداز واطوار سے اس کی فطرت کا اندازہ لگا لیا تھا۔

''میں تمھاری اس شادی کو کبھی تسلیم نہیں کروں گا۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ ورنہ آج میں ہر لحاظ بھول جاؤں گا۔'' جمیل کی تیوریوں پر بل دیکھ کر عامر نے ایک طنزیہ مسکراہٹ اچھالی اور نسرین کے ہمراہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ رات ان سبھی کے لیے بہت بھاری تھی۔ جمیل اس دیدہ دلیری اور ڈھٹائی پر بہت طیش میں اور عامر کو گھر سے بے دخل کرنے کے درپے تھا لیکن بلقیس نے اپنا دوپٹا اس کے قدموں میں بچھا دیا۔

''وہ نادان ہے، کم عقل ہے لیکن میرے جگر کا ٹکڑا ہے اس کی غلطی کی سزا مجھے مت دو۔'' وہ بلکنے لگی۔

''یہ کیا کر رہی ہیں ماں جی آپ!'' وہ تڑپ اٹھا۔ ''نسرین اس گھر کے لیے قطعی موزوں نہیں۔ اس کے انداز کا چلتر پن واضح بتاتا ہے کہ اس میں گھر جوڑ کر رکھنے والے کوئی گن نہیں۔ ایسی عورتیں فسلیں اجاڑ دیتی ہیں۔'' جمیل نے اپنے خدشات بیان کیے۔

''میں عامر کو سمجھالوں گی لیکن خدارا میرے بیٹے کو مجھ سے الگ مت کرنا۔''

''ٹھیک ہے ماں جی! لیکن ہم لوگ اس سے کوئی تعلق داری نہیں رکھنا چاہتے، اس سے کہہ دیجیے گا کہ اپنا باورچی خانہ الگ کرلے۔'' جمیل نے ایک گہری سانس بھری۔

حسبِ سابق ان سب کی پریشانی اور خدشات سے بے نیاز عامر اپنی نئی نویلی بیوی کی ناز برداری میں مگن تھا۔ اسے اپنے اس انتہائی قدم کا رتی بھر بھی افسوس نہ تھا۔ نسرین سے اس کی ملاقات ایک ماہ قبل ہی ہوئی تھی۔ وہ اس کی ورکشاپ کے مقابل واقع ایک میڈیکل اسٹور پر ادویات خریدنے کی غرض سے آتی تھی۔ اس کے نقوش میں جاذبیت اور سراپا میں بھرپور کشش تھی۔ اب تک عامر کی زندگی میں آنے والی لڑکیوں میں وہ سب سے منفرد تھی۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکی تھی۔

اس کا تعلق نچلے طبقہ کے ایک ایسے خاندان سے تھا جہاں جہالت اور کم ظرفی کا دور دورہ تھا۔ والدین بچپن میں ہی وفات پا چکے تھے اور اب وہ اپنے تین بھائیوں اور ان کے بچوں کی ایک فوج کے ساتھ رہتی تھی۔ تعلیم اور شعور سے وہ کوسوں دور تھی۔ ہاں، مگر سازشی جوڑ توڑ اور دو جمع دو پانچ کرنا اسے خوب آتا تھا۔ عامر کا رکھ رکھاؤ، بہترین لباس اور وجاہت اس کے لیے کسی نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے اہل وعیال اپنے طبقہ میں ہی رشتہ تلاش کریں گے اور پھر جلد ہی وہ بھی بچوں کی ایک فوج میں گھری کھانستی، ہانپتی کانپتی کسی تنگ و تاریک گھر میں خون تھوکتی مرجائے گی۔ عامر کی پیش قدمی کا اس نے بہت مہارت سے جواب دیا اور بالآخر شادی کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ سسرال میں آمد ہوتے ہی اسے بہت سازگار ماحول میسر آگیا وہ اس گراؤنڈ پر اپنی مرضی کے اسٹروکس کھیلنے کے لیے مکمل تیار تھی۔

''ہم جلد ہی الگ گھر لے لیں گے۔ بس کچھ عرصہ برداشت کرلو ان سب کو۔'' عامر کے الفاظ نے اسے اپنے خیالات سے چونکا دیا۔

''کوئی بات نہیں جی! وہ ہمارے بڑے ہیں، وقتی طور پر ناراض ہیں۔ میں انھیں ثابت کروں گی کہ آپ کا انتخاب غلط نہیں ہے۔ ہم یہیں رہیں گے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ اس کے ذہن میں پروردہ منصوبہ جات کی عامر کو بالکل بھنک نہ تھی۔ وہ اپنے سسرالیوں سے مکمل خراج وصول کرنے کے بعد ہی علیحدہ ہونا چاہتی تھی۔

☆☆☆

عورت اگر تعلیم یافتہ ہو تو ایک ماہتاب کی مانند اپنے گھر میں ٹھنڈک بھری چاندی ہر سُو بکھیر دیتی ہے لیکن یہی عورت جب علم کی روشنی سے محروم ہو تو اپنے گلشن کے لیے بادِ سموم ثابت ہوا کرتی ہے۔ اس کی جہالت سورج کی تپش کی مانند رشتوں کو جھلسا دیتی ہے۔ بلقیس کا خاندان بھی اسی تپش کی زد میں آگیا تھا۔

نسرین نے اپنی موروثی بے حسی اور کم ظرفی کا مظاہرہ بہت جلد شروع کر دیا۔ تہمینہ اور جمیل سے اسے خصوصی بیر تھا۔ ان کی گھر میں اہمیت سے حسد میں بھی ہر گزرتے دن کے ساتھ بے حد و بے حساب اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ دانستہ طور پر انھیں زچ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔ شوہر کا ذہن وہ پہلے ہی مکمل طور پر اپنے قابو میں کر چکی تھی۔ وہ اس کی ہر فرمائش پوری کر دیتا لیکن پھر اس نے ایسا مطالبہ کیا کہ گھر میں ایک مرتبہ پھر بے سکونی کی فضا پیدا ہوگئی۔ عامر نے بیوی کی خواہش پوری کرنے کے لیے ڈش انٹینا نصب کروا دیا۔ جمیل اور تہمینہ نے اس بات پر خاصی لے دے کی۔

''اس شیطانی چرخہ کی میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے عامر! ایسی بے احتیاطیوں کے نقصان ہم انور اور تمھاری صورت میں پہلے ہی اپنی استطاعت سے زیادہ بھگت چکے ہیں۔ اب میں اپنے بچوں کے لیے بھی وہی ماحول پیدا نہیں کرنا چاہتا۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں عامر! ذرا تحمل سے سوچو۔ گھر میں ایسی خرافات کی گنجائش نہیں۔ بچوں کے خام ذہن ان باتوں کے اثرات بہت جلد قبول کرتے ہیں۔'' تہمینہ نے بھی تحمل سے کہا۔

''اپنی اولاد کو سنبھالنا آپ کا دردِ سر ہے۔ یہ ڈش انٹینا اب کسی صورت نہیں لوٹایا جائے گا۔'' نسرین نے بھی ہٹ دھرمی دکھائی۔

طویل بحث و مباحثہ کے باوجود عامر اور نسرین اپنے مؤقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے۔ تھک ہار کر جمیل نے خاموشی اختیار کرلی۔ وقت اسی طرح گرد و پیش پر تلخ نقوش چھوڑتے گزرتا چلا گیا۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد نسرین کا کروفر اور طنطنہ مزید آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اولاد کی ذمہ داری کے باوجود ان کی سوچ و خیالات میں سرمو فرق نہ آیا۔

تہمینہ کے سمجھانے بجھانے پر جمیل نے اپنے پورشن میں

علیحدہ ٹی وی سیٹ کا بندوبست کر دیا جہاں صرف سرکاری چینل ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کامیابی کے بعد نسرین نے مزید کھل کر کھیلنا شروع کر دیا۔ عامر کی اسے کوئی پرواہ تھی نہ فکر۔ وہ جانتی تھی کہ کب اور کس موقع پر اس کی رگ دبا کر اپنے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے ہیں۔

اگلے پانچ سال کا عرصہ بھی گویا چشم زدن میں بیت گیا۔ حمزہ کے بعد ان دونوں کے یہاں مزید اولاد کی کوئی نوید نہ تھی۔ ڈش انٹینا کے بعد اب گھر میں کیبل بھی اپنی بہار دکھانے لگی۔ ٹی وی چینلز میں حمزہ کے سامنے کسی بھی قسم کی احتیاط کا مظاہرہ ناپید تھا۔ بھارتی فلمیں' گانے' ڈرامے اور انگریزی فلمیں بھی بہت ذوق و شوق سے دیکھی جاتیں۔ بلقیس اس ساری صورت حال پر کڑھ کر رہ جاتی لیکن بیٹا اور بہو اسے درخور اعتناء ہی نہ سمجھتے۔

عامر کی شادی کو چھ سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ انور اور چچا' چچی کی اموات کے بعد اس کی بھنور اصفت طبیعت پر آنے والا جمود اب دھیرے دھیرے پگھلنے لگا۔ معاشرتی ڈھانچا میں کیبل ٹی وی سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں نے صنف مخالف کو اس کی جانب مزید راغب کر دیا۔ وہ ایک بار پھر انھی رستوں کا مسافر بننے لگا۔

دوسری جانب نسرین کے بھائیوں نے بالآخر اس کی شادی قبول کر لی اور دونوں گھروں میں باہمی میل جول کا آغاز ہو گیا۔ اس آمد و رفت سے عامر کو چنداں اعتراض نہ تھا لیکن تہمینہ خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے بہت سوچ بچار کے بعد جمیل سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"اس گھر میں میرے لیے مزید کتنی آزمائشیں باقی ہیں جی؟ میری برداشت کا پیمانہ اب لبریز ہونے لگا ہے۔"

"اب کیا ہو گیا ایسا؟ کہیں تمھارے ذہن میں علیحدہ گھر خریدنے کا سودا تو نہیں سما رہا۔" جمیل نے سختی سے پوچھا۔

"آپ تو صبح سویرے اپنے اسٹور پر چلے جاتے ہیں۔ ماں جی اب بستر ہی کی ہو کر رہ گئی ہیں۔ عامر بھی صبح سے گیارات ہی کی خبر لاتا ہے۔ اس گھر میں آئے دن ایک نیا منظر نامہ تیار ہوتا ہے۔" وہ محتاط لفظوں میں بولی۔

"کیسا منظر نامہ؟"

"کچھ ماہ پہلے نسرین کے بھائی اور بھابیوں نے اس سے میل جول کا آغاز کر دیا ہے۔ اب بھائیوں کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن گھر میں نت نئے مردوں کی آمد مجھے پسند نہیں۔ میری بیٹی جوانی کی دہلیز پر کھڑی ہے۔ میں ایسا ماحول قطعی برداشت نہیں کر سکتی۔"

"کیسا ماحول کیسے مرد؟ مجھے کھل کر بتاؤ۔" جمیل الجھ گیا۔

"نسرین سے ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ میرے استفسار پر وہ انھیں کبھی چچازاد' کبھی ماموں زاد اور کبھی کسی نئے رشتہ سے متعارف کروا دیتی ہے۔ خدانخواستہ میں اس کے کردار پر شک نہیں کر رہی لیکن اس طرح کمرے میں بٹھا کر غیر مردوں سے ٹھٹھے لگانا بھی کہاں کی شرافت ہے؟ بچے اب جوان ہو رہے ہیں۔ ان پر کیا اثر پڑے گا؟"

"تم نے عامر یا ماں جی سے بات کی؟"

"ماں جی کو تو وہ کبھی خاطر میں نہیں لاتی۔ عامر سے دبے لفظوں میں احتجاج کیا تھا لیکن اس نے میری سوچ کو گھٹیا اور تنگ نظری کا خطاب دے ڈالا۔"

"تم اب ان سے کوئی بات مت کرنا..... میں اس معاملہ کو خود ہی دیکھ لوں گا۔ اب جو بھی اس سے ملاقات کے لیے آئے' تم حماد کے توسط مجھے گھر آنے کا فوری پیغام بھجوا دینا۔ اور مریم کو لیے اپنی امی کے گھر چلی جانا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے سامنے ایسا کوئی معاملہ کھڑا ہو۔ رشتوں کا بھرم قائم ہی رہنا چاہیے۔" جمیل موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے گہری سوچ میں تھا۔

☆☆☆

تین روز بعد نسرین کا ایک اور کزن اس سے ملنے کے لیے آیا۔ تہمینہ کو محسوس ہوا کہ اسے دیکھ کر نسرین کسی دباؤ کا شکار ہو گئی ہے۔ اس نے کسی بھی قسم کا استفسار مناسب نہ سمجھا اور شوہر کی ہدایت کے مطابق بیٹی کو لیے چل دی۔

"آپ کہیں جا رہی ہیں بھابی؟" نسرین نے بے یقینی اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے پوچھا۔

"ہاں! میری امی کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ میں شام تک آجاؤں گی۔" اس نے دانستہ بے نیازی سے کہا اور نسرین کے کمرے میں جاتے ہی خود بھی ڈیوڑھی پار کر کے باہر نکل گئی۔ مرکزی دروازہ اس نے مقفل نہ کیا۔ گلی عبور کرتے ہی اسے مخالف سمت سے جمیل آتا دکھائی دیا۔ اس کی پیشانی پر گہری تیوریاں اور آنکھوں میں طیش کی چمک تھی۔ "ذرا دھیان سے پلیز"۔ تہمینہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک التجائیہ نگاہ سے صرف ایک ہی بات کہہ سکی۔

"تم فکر نہ کرو۔ میں نے رکشا ڈرائیور سے بات کر لی

ہے۔ وہ تم لوگوں کو لے جائے گا۔ اسٹور کے پاس ہی کھڑا ہے وہ۔" وہ عجلت میں کہتا روانہ ہو گیا۔

گھر پہنچ کر اس نے خود کو بمشکل نارمل کیا اور عامر کے کمرے کے باہر کھڑا ہو گیا۔ نسرین اور نووارد کی آوازیں اسے بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔

"اب کس منہ سے میرے پاس واپس لوٹ کر آئے ہو شیراز! جب مجھے تمہاری ضرورت تھی' اس وقت تو پیٹھ دکھا کر بھاگ گئے تھے۔" نسرین غصہ سے بولی۔

"بس یہی تو غلطی ہوئی مجھ سے۔ میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ سمجھ ہی نہیں آتی تھی کہ سب کچھ کیسے سنبھالوں گا؟ نا سمجھ تھا میں۔ بس ایک بار معاف کر دو۔" مرد کی آواز میں مکاری نما معصومیت جمیل کا فشارِ خون مزید بلند کر گئی۔

"میرے ساتھ افیئر چلاتے ہوئے تمہیں کبھی خوف آیا' نہ اندھیری راتوں میں چھت پر ملنے کے لیے بلواتے۔ لیکن اپنے بچے کی خبر سنتے ہی تمہارا خوف جاگ گیا۔ جب میرے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی جرأت تھی تو اسے نبھانے کی ہمت بھی رکھتے۔ شادی ہو چکی ہے میری اب۔ ہماری محبت کی اس نشانی کو ضائع کرنے سے لے کر عامر سے شادی تک میں نے کتنے جوڑ توڑ کیے ہیں' تمہیں کیا خبر؟"

"وہی تعلقات دوبارہ استوار کرنے تو آیا ہوں۔ تم وہ سب کیسے بھول سکتی ہو نسرین؟ ہمارا ساتھ مل کر فلمیں دیکھنا' محبت کے سب وعدے اور دعوے..... میں تمہیں اپنا گھر خراب کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا۔ بس پہلے کی طرح کبھی کبھی مجھ سے مل لیا کرو۔"

"اور اگر اب بھی دھوکا دے گئے تو۔" نسرین کا نیم رضامند انداز جمیل سے مزید برداشت نہ ہوا اور وہ دروازے کو دھکا مارتا اندر داخل ہو گیا۔

"بے حیا عورت! تمہارے بارے میں میرا ہر اندازہ درست تھا۔ میں تمہیں اور تمہارے اس آشنا کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے کف اڑاتے ہوئے کہا۔ نسرین جیٹھ کو غیر متوقع طور پر سامنے دیکھ کر بوکھلائی لیکن اگلے ہی پل خود پر قابو پا کر بولی۔ "شیراز! تم ابھی جاؤ یہاں سے۔ میں اسے آج بتاتی ہوں کہ بے حیا ہوتی کیا ہے؟"

شیراز جمیل کے متوجہ ہونے سے قبل ہی وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ نسرین نے اپنے کندھے اور سینے سے قمیص پھاڑی' بال بکھیرے اور چیختی ہوئی بیرونی دروازہ عبور کر گئی۔ اس نیم گرم دوپہر کے بعد علاقہ میں ایک ہی بات زبان زدِ عام تھی: "جمیل نے اپنی بھاوج پر مجرمانہ حملہ کر دیا۔"

☆☆☆

مقامی علاقہ کے نمبردار کی بیٹھک کا تھا۔ محلے کے دانا افراد سر جوڑے بیٹھے تھے۔ عامر کی رنگت غیظ و غضب سے سیاہ پڑ رہی تھی۔ اس نے حاضرین پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائی اور بدقت تمام بولا!

"یہ میرا گھریلو اور ذاتی معاملہ ہے نمبردار جی! میں اسے گھر میں ہی سلجھا لوں گا۔"

"بیٹا! تمہاری بیوی نے خود میرے گھر میں پناہ لی اس وقت۔ وہ چاہتی تو اپنی عزت کی حفاظت کے لیے گھر کے کسی بھی کمرا میں مقید ہو جاتی' اپنی ساس کو جگا دیتی۔ لیکن وہ چاہتی ہے کہ مجرم کو یوں سزا ملے تو یونہی سہی۔" نمبردار نے نرمی سے کہا۔

نسرین ایک بڑی سی چادر میں لپٹی وہیں ایک کونے میں موجود تھی۔ اس نے ہاتھوں میں قرآن تھام رکھا تھا۔ وہ شوہر کے قدموں میں آ بیٹھی اور دایاں ہاتھ قرآن پر رکھ کر بلند آواز سے بولی: "میں اس مقدس کتاب کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جمیل مجھ پر بری نظر رکھتا تھا۔ اس لیے اپنی بیوی کے روانہ ہوتے ہی وہ گھر چلا آیا۔"

"ہم بچپن سے جمیل کو جانتے ہیں بیٹا! آج تک اس میں کوئی عیب نہیں دیکھا ہم نے۔" ایک بزرگ نے کہا۔

"لیکن مجھے اپنی بیوی کی بات پر اعتبار ہے۔ یہ جھوٹا قرآن کیوں اٹھائے گی بھلا؟" عامر کے الفاظ نے جمیل کی آنکھوں میں ہزاروں کرچیاں بکھیر دیں۔ وہ دکھی دل سے اپنے گھر روانہ ہو گیا اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"آپ کیوں ہلکان ہو رہے ہیں؟ سارا محلہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ ہم سبھی کو آپ پر بہت اعتبار ہے۔" تہمینہ نے اسے دلاسہ دیا۔

"میں نے کیا کچھ نہیں کیا اس گھر کے لیے، پردیس کی سختیاں جھیلیں۔ ان کی سبھی فرمائشیں پوری کرتا رہا۔ اور اس نے ایک ہی پل میں مجھے بے اعتبار کر دیا۔"

"نہ رو بیٹا! میں جانتی ہوں کہ اس ڈرامے کا کیا مقصد ہے؟ وہ آج تک صرف اس لیے علیحدہ نہیں ہوئی تھی کہ تمہاری محنت کی کمائی اور بچت مزید بڑھ جائے اور عامر اس مال و دولت سے یہ کہہ کر حصہ بٹور سکے کہ یہ سب کمائی ان پیسوں کے مرہون منت ہے جسے خرچ کر کے شاکر نے تمہیں ابوظہبی بھجوایا تھا۔" بلقیس نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

دوسری جانب نسرین عامر کے کندھے پر سر رکھے زار و قطار رو رہی تھی۔

"تمھیں وہ معاملہ محلہ کی کونسل میں نہیں لے کر جانا چاہیے تھا۔ کم از کم میرا انتظار تو کر لیتی۔ میری عزت دو کوڑی کی کر دی تم نے۔" وہ دکھ سے بولا۔

"تو کیا چپ چاپ آپ کے بھائی کے ہاتھوں لٹ جاتی۔ اور کیوں بھول رہے ہیں کہ آپ کی والدہ محترمہ نے بھی اسی مردود کا ساتھ دیا ہے۔ میں آخر کرتی تو کیا کرتی؟" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

"امی نے میرے ساتھ ہمیشہ یونہی ناانصافی کی۔ اگر انور آج زندہ ہوتا تو مجھے اس جہنم سے آزادی دلوا چکا ہوتا۔" عامر اب بھی اسی کسک میں مبتلا تھا۔ "خیر! ایک دمڑی بھی نہیں چھوڑوں گا میں۔"

بلقیس کا اندازہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔ عامر نے گھر اور جنرل اسٹور میں اپنے شرعی حصہ کا مطالبہ کر دیا۔ جمیل نے اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دی اور ایک ہفتہ بعد وہ اپنے سسرالیوں کی مدد سے اسی علاقہ میں ایک گھر خرید کر منتقل ہو گیا۔ روانگی سے قبل بلقیس نے ان دونوں کو اپنے پاس بلوایا اور نم آنکھوں سے صرف ایک ہی بات کہہ سکی۔ "تو نے ساری زندگی مجھے بہت ستایا عامر! لیکن میں ہمیشہ تیرا دم بھرتی رہی۔ اب بھی تیرے لیے کوئی برا خیال بھی ذہن میں لاتے میرا کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ کیا کروں؟ ماں ہوں ناں..... آج بھی یہی دعا کروں گی کہ کتاب الٰہی کی جو بے حرمتی تیری بیوی نے کی ہے' اس کے قرض کی ادائیگی سے قبل ہی تائب ہو جائے۔"

"آپ ہمیشہ سے جمیل ہی کی ماں تھیں۔ اور اب بھی اسی کا یقین کر کے بیٹھی ہیں۔ مجھے ان منافقانہ دعاؤں کی ضرورت نہیں۔" وہ بدلحاظی سے کہہ کر الٹے قدموں لوٹ گیا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے؟ آپ اتنے کم گو کیوں ہو گئے ہیں؟ کہیں گھر والوں سے علیحدہ ہو کر آپ پچھتا تو نہیں رہے؟" نسرین نے اس رات زچ ہو کر پوچھا۔ نئے گھر میں آمد کے بعد عامر کی مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں۔ اس کے اطوار میں بھی واضح رکھائی نظر آتی۔

"میں بھولنا بھی چاہوں سب تو تم مجھے کسی نہ کسی بہانے پھر سب کچھ یاد کروا دیتی ہو۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "میں اس وقت صرف حمزہ کے متعلق سوچ رہا ہوں۔"

"حمزہ کو کیا ہوا؟ وہ ٹھیک تو ہے۔"

"وہ ٹھیک نہیں ہے نسرین! کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور ہے اسے۔ تمھارے بھتیجوں سے بہت خار کھاتا ہے وہ۔ انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔" وہ تشویش سے بولا۔ "اسے ذرا پیار سے بات کرو کہ کیا خوف ہے اسے؟"

"کوئی خوف نہیں ہے اسے۔ بس اپنے تایا زاد رشتہ داروں کے اثرات ہیں اس کے دماغ پر۔ وہاں بھی سب مجھ سے استفسار کرتے ہیں کہ حمزہ ان سے گھلتا ملتا کیوں نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"خیر! اب میری مصروفیات بھی یونہی بڑھتی رہیں گی۔ پہلے تو گھر کا خرچ تقسیم ہوتا تھا' اب مجھے ہی دیکھنا ہے سب کچھ۔ اس لیے میری روٹین پر زیادہ جج جج کرنے کی ضرورت نہیں۔ حمزہ پر مزید توجہ دو اور فرصت ملے تو اپنے گھر چلی جایا کرو۔ میری طرف سے کوئی بندش نہیں لیکن مجھ سے آئندہ یوں باز پرس مت کرنا۔" اس نے متنبہ کیا۔

"ٹھیک ہے نہیں کروں گی۔ جیسے آپ خوش رہیں!" اس نے بے نیازی سے کہا۔ عامر کی ان مصروفیات سے اسے شیراز سے تعلقات میں استواری مزید آسان نظر آنے لگی۔

نسرین کو اب مکمل آزادی میسر آ چکی تھی۔ حمزہ کو ایک نیوشن سینٹر روانہ کرنے کے بعد وہ بھی کسی سہیلی سے ملنے یا بازار جانے کا بہانہ کر کے شیراز سے ملنے چل دیتی۔ وہ اس کی بھابی کا کزن تھا لیکن اس کی کم ہمتی اور بزدلی کے باعث یہ رشتہ کسی منطقی انجام تک نہ پہنچ سکا تھا۔ دوسری جانب عامر نے بھی مصروفیات کی آڑ میں اپنی سابقہ سرگرمیاں بحال کر دیں۔ وہ بھی ایک مکمل کھلاڑی بن چکا تھا۔ حمزہ کی پرورش کسی خود رو پودے کی طرح ہو رہی تھی۔ اسے والدین میں سے کسی کی بھی توجہ حاصل نہ تھی۔ انھوں نے اس کی تعلیمی ضروریات اور دیگر خواہشات پوری کرنے کو ہی تربیت گردان لیا تھا۔ نتیجتاً وہ اپنے خول میں سمٹتا چلا گیا۔ اسکول اور ٹیوشن سینٹر سے فراغت کے بعد وہ خالی گھر میں بولایا پھرتا۔ یہ تو ہونا ہی تھا اس نے پاک کتاب جو اٹھائی تھی۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

وقت بہت تیزی سے گزرتا رہا۔ حمزہ اب مڈل اسکول کا طالبعلم تھا لیکن اس کی شخصیت میں اعتماد کبھی بھی نہ پنپ سکا۔ اسے ہمیشہ اپنی دادی کی محبت اور تایا زاد بہن بھائی کے ساتھ

گزرا وقت یاد آتا مگر والدین نے انتہائی سختی سے اسے کسی بھی ملاقات سے روک رکھا تھا۔

زندگی ایک لگے بندھے معمول پر چل رہی تھی۔ پھر ایک روز ایک حادثے نے تلاطم پیدا کر دیا۔ نسرین پاؤں پھسلنے کے سبب سیڑھیوں سے گری اور ریڑھ کی ہڈی میں چوٹ کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے صاحب فراش ہو گئی۔ بلقیس کو جب اس حادثہ کا علم ہوا تو وہ بیٹے اور پوتے سے ملاقات کے لیے خود کو روک نہ پائی۔ گھر کی حالت تلپٹ ہو چکی تھی۔ عامر سرسری سلام دعا کے بعد ورکشاپ روانہ ہو گیا۔ اور حمزہ ماں کو دوائی کھلانے کے بعد باورچی خانہ میں جھوٹے برتن سمیٹنے کے لیے دادی کو بھی اپنے ساتھ وہیں لے آیا۔

"کیسے ہوا یہ سب بیٹا! علاج کہاں کروا رہے ہو؟"

"انسان جب اپنی استطاعت سے بڑھ کر بھاگ دوڑ کرنے لگے تو قدرت کا خودکار نظام یونہی حرکت میں آیا کرتا ہے دادی!" حمزہ خلاء میں کسی نادیدہ نکتے کو دیکھنے لگا۔

"میرا بیٹا اتنی بڑی باتیں کب سے سیکھ گیا؟" وہ اس کے ہاتھ بڑی محبت سے اپنے لبوں سے لگا کر بولی۔

"جب والدین کی بجائے تربیت کا بیڑہ زمانہ اٹھا لے تو یونہی سب کچھ سکھا دیتا ہے۔"

"حمزہ! کیا تو یہاں خوش نہیں ہے؟" بلقیس نے اس کے بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

"یہاں سب بہت گندے ہیں دادی! ماموں ان کے بچے، محلہ دار، یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ ہر وقت کیبل پر گندی فلمیں دیکھتے، تاش کھیلتے اور گالی گلوچ کرتے رہتے ہیں۔ خدا جانے اتنا اچھا علاقہ اور ماحول چھوڑ کر اس بدبودار جگہ پر کیوں آ گئے تھے پاپا۔ مجھے وہ گھر اور آپ سب بہت یاد آتے ہیں۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹا! اللہ سے اچھائی کی توقع رکھو۔ نسرین بھی ٹھیک ہو جائے گی جلد ہی۔"

"ڈاکٹرز اب کسی معجزہ کے منتظر ہیں۔ مما کا نچلا دھڑ گلنے سڑنے لگ گیا ہے۔ پاپا اور مما میں روز بحث ہوتی ہے۔ آپ ہمیں واپس بلوا لیں پلیز! میں یہاں نہیں رہنا چاہتا۔"

"جمیل اور تہمینہ کبھی راضی نہیں ہوں گے کہ تم ہمارے ہاں رہو لیکن تمہارا جب بھی دل چاہے ملنے آ جایا کرو ہم بھی تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اور میں تو صرف دعا ہی کر سکتی ہوں کہ پروردگار تم لوگوں پر آسانیاں فرمائے۔" وہ پوتے کی بگڑی حالت دیکھ کر خود بھی رونے لگی۔

نسرین اپنی معذوری کے بعد شوہر کی بے رخی دیکھ کر جینے کی ہر تمنا کھو چکی تھی۔ نفس کے پیچھے بھاگ دوڑ ختم ہوئی تو عامر کے بعد حمزہ کی منتشر ذہنیت اور خوفزدہ شخصیت دیکھ کر اسے اپنے ماضی کی کوتاہیوں کا شدت سے احساس ہونے لگتا۔

"حمزہ! مجھ پر ایک احسان کر دو۔ اپنی دادی اور تایا کے پاس لے چلو مجھے۔ میں ان سے معافی مانگنا چاہتی ہوں ورنہ موت بھی مجھ پر مہربان نہ ہو گی۔"

"میں کوشش کروں گا۔"

"تم اتنے کم گو کیوں ہو حمزہ؟ پہلے تو بہت خوش باش رہتے تھے۔"

"آپ دونوں کے یہاں منتقل ہونے کے فیصلے نے مجھے بہت تنہا کر دیا۔ کاش میرا کوئی بہن بھائی ہی ہوتا۔ لیکن چھوڑیں اب ان باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل؟" اس نے سیرپ کا ڈھکن بند کرتے کہا۔

"عامر بھی بہت مصروف ہو گئے ہیں۔ ہمارے پاس بیٹھتے ہی نہیں۔"

"وہ ہمیشہ سے ہی ایسے تھے۔ آپ نے نوٹس اب لیا ہے اور اپنی بیماری سے قبل آپ کا وقت بھی تو بازاروں اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ بیتتا تھا۔ گھر میں میرے ساتھ کیسا سلوک ماموں زاد کرتے ہیں آپ نے بھی توجہ دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔" وہ تلخی سے کہتا باہر چلا گیا اور نسرین اپنی اذیتناک سوچوں میں گھری بے بسی سے رونے لگی۔

☆☆☆

"کیا بات ہے عامر استاد! آج اتنے گم صم کیوں بیٹھے ہو؟" بائیس تیئس سالہ اس لڑکے نے اپنے ہاتھوں پر لگا گریس آئل ایک میلے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے بے تکلفی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں یار! بس وہی گھر کی پریشانیاں لاحق ہیں۔" عامر کے انداز میں تھکاوٹ نمایاں تھی۔ ولید نامی یہ لڑکا اس کی ورکشاپ پر نیا شاگرد تھا۔ جمیل سے حصہ حاصل کرنے کے بعد ہی اس نے ورکشاپ خرید لی تھی اور بعد ازاں اپنی سہولت کے لیے مددگار لڑکے بھی بھرتی کر لیے۔ وہ ہمیشہ ان لڑکوں سے ایک مخصوص فاصلہ قائم رکھتا تھا۔ بے تکلفی کی گنجائش تھی نہ ضرورت۔ لیکن ولید میں اسے اپنی جوانی منعکس دکھائی دیتی۔ اس کے مشاغل و فطرت بالکل عامر جیسے ہی تھے بلکہ کئی معاملات میں تو وہ شیطان

کے کان کترتا تھا۔

''ارے چھوڑو استاد! ٹھیک ہو جائیں گی بھابی۔ فکر کاہے کی کرتے ہو؟''

''ارے نہیں یار! اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ حمزہ اس کی بہت اچھی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ بہت فرماں بردار اور مثالی ہے میرا بیٹا! بس اس کی پڑھائی کی فکر رہتی ہے مجھے۔'' ولید نے کبھی اس کے اہلخانہ سے بالمشافہ ملاقات تو نہ کی تھی لیکن وہ حمزہ اور نسرین سے غائبانہ طور پر مکمل متعارف تھا۔

''کوئی بات نہیں استاد! وہ ایک سمجھدار لڑکا ہے۔ اپنے معاملات درست کر لے گا۔ ماں کی خدمت کرنے سے اجر کما رہا ہے وہ تو۔''

''ہاں! درست کہتے ہو۔ اس نے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا مجھے۔ بہت کم گو اور اپنے آپ میں مگن رہتا ہے۔'' عامر نے تکبر سے کہا۔

''استاد جی! مجھے آج جلدی جانا ہے گھر، بہت ضروری کام ہے، کل اوور ٹائم لگا دوں گا۔'' ولید نے کان کھجاتے ہوئے چاپلوسی کی۔

''معلوم ہیں مجھے تیرے سب ضروری کام، ایک شرط پر جلدی جانے دوں گا میرا بھی کوئی بھلا کرو آج۔'' عامر نے بائیں آنکھ دبائی۔

''ارے باس! اس میں کیا مشکل ہے بھلا؟ لیکن میری بھی ایک بات مانو۔ آپ ہمیشہ منن کڑاہی کھاتے ہیں آج ذرا بیف کھا کے دیکھیے۔ مارکیٹ میں ایک بہت زبردست اضافہ ہوا ہے اگر مرضی ہو تو اس کی بکنگ کروا دوں؟''

''پیس صاف ستھرا تو ہے ناں؟'' وہ نیم رضامند تھا۔

''خاندانی ہے، خوبصورت بھی ہے، بس ہماری خوش قسمتی سمجھیے کہ اس کی لانچنگ میں پہلی ہی مرتبہ ویڈیو بنالی اور تب سے اسے بلیک میل کر رہے ہیں۔''

''میرا اشتیاق بڑھا رہے ہو تم۔''

''ایک گھنٹے بعد اصغر کے ہوٹل میں پہنچ جایئے گا۔ میں اب چلتا ہوں۔'' وہ عامیانہ انداز میں کورنش بجالاتا روانہ ہو گیا۔

عامر نے منتشر سامان سمیٹا اور وہیں ایک بغلی کمرے میں موجود اپنا ایک صاف جوڑا نکال کر پہن لیا۔ ولید کی باتوں نے اسے بے حد سنسنی اور تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ مارکیٹ میں کسی بھی نئی لڑکی کی آمد کی اسے فوری خبر ہو جایا کرتی۔ اس بار غالباً نسرین کی بیماری میں الجھنے کے باعث وہ بے خبر رہ گیا تھا۔ اپنے انہی خیالات میں غلطاں وہ ہوٹل پہنچ گیا۔ یہ ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا جہاں منشیات اور جسم فروشی کے تمام مکروہ کام بہت منظم انداز میں ہوتے تھے۔ ہوٹل کا تمام اسٹاف بھی اس سے واقف تھا۔

''بڑے دنوں بعد درشن کروائے عامر میاں؟'' ریسیپشن پر موجود نیم شفاف سر والے ایک شخص نے اپنے گندے اور داغدار دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے تان لگائی۔

''ہاں بس کچھ مصروف تھا میں..... ولید نے بکنگ کروائی ہے میری یہاں۔''

''وہ تمہارے مخصوص کمرے میں موجود ہے۔''

عامر متوازن چال سے دوسرے فلور کی جانب بڑھ گیا۔

''حلق تر کرنے کے لیے کچھ لاؤں صاحب!'' کمرے کا دروازہ کھولتے ہی اسے ایک بیرے نے عقب سے صدا دی۔

''ہاں! کچھ دیر بعد لے آنا۔'' اس نے رخ موڑ کر اسے کچھ نوٹ تھمائے اور پھر کمرے میں موجود بستر کی طرف متوجہ ہوا جہاں قابلِ اعتراض حالت میں نیم دراز وجود دیکھ کر اس کے اعصاب پر ایک بجلی گری تھی۔ اسے اپنی بصارت پر اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس نے بارہا سر جھٹکا لیکن منظر اب بھی وہی تھا۔ ''حمزہ! تم یہاں ..... تم یہ سب..... کک..... کب..... کک..... کیوں۔'' عامر کو اپنی قوت گویائی سلب ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔

حمزہ کے چہرے پر بے بسی اور اذیت کھنڈی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت، دیوانگی، اذیت، بے یقینی کے کتنے ہی رنگ پل بھر میں بکھرے نظر آنے لگے۔

''میں بھی یہی سوچتا تھا..... کہ میں ہی کیوں؟ ماموں زاد بھائیوں کی طرف سے استحصال، بلیک میلنگ، یہ بدبودار زندگی میرے لیے ہی کیوں؟ لیکن آج مجھے اپنی سب الجھنوں اور اذیتوں کے جواب مل گئے ہیں..... میں آپ لوگوں کا قرض چکا رہا ہوں۔''

عامر سر پکڑے وہیں بیٹھتا چلا گیا۔ اسے احساس ہو چکا تھا اس کے گناہوں نے اس کے پورے گھر کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔

اسیرِ ذات

محترمہ عذرا رسول
سلام تہنیت
لوگ مجھے باغی کہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں نے دانستہ بغاوت کی ہے لیکن کوئی میرے دل میں جھانک کر نہیں دیکھتا کہ میں کتنی مجبور بنا دی گئی تھی۔ اپنے بھائی کے لیے اتنی بڑی قربانی دی مگر اس نے بدلے میں مجھے کیا دیا؟

عارفہ
(کراچی)

میں ان دنوں آٹھویں کلاس میں تھی کہ چچی کلثوم میرے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آگئیں۔ خالہ نے سنا تو جلدی سے بولیں۔ ”کلثوم بہن! آپ کو شاید معلوم نہیں کہ عارفہ کا رشتہ بلال سے طے ہو چکا ہے۔“

”معاف کرنا بہن!“ چچی کلثوم نے کہا۔ ”مجھ کو تو کوئی ایسی اطلاع نہیں ملی۔ میں بھی آخر اسی خاندان کی ہوں۔“

”اصل میں یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔“ خالہ نے کہا۔ ”عارفہ تو میری بھتیجی کی مانگ ہے۔“

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

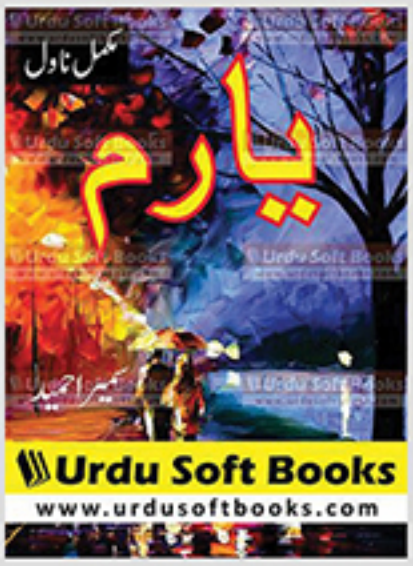

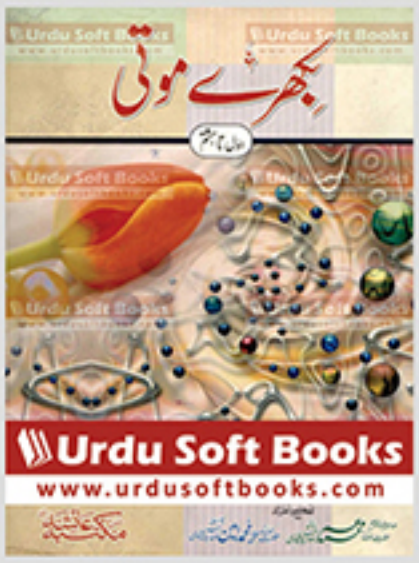

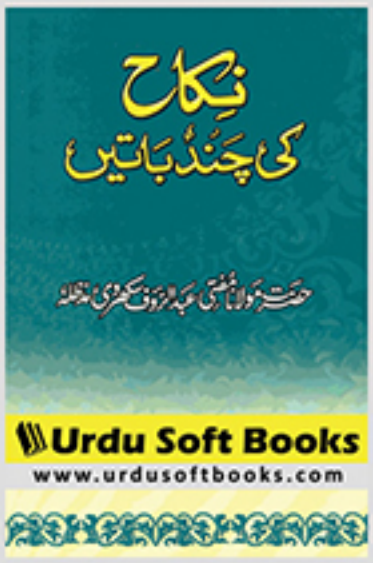

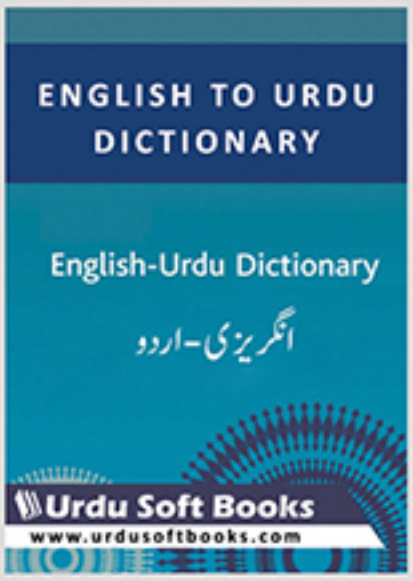

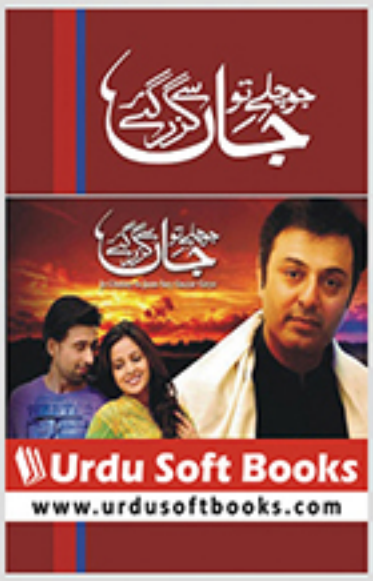

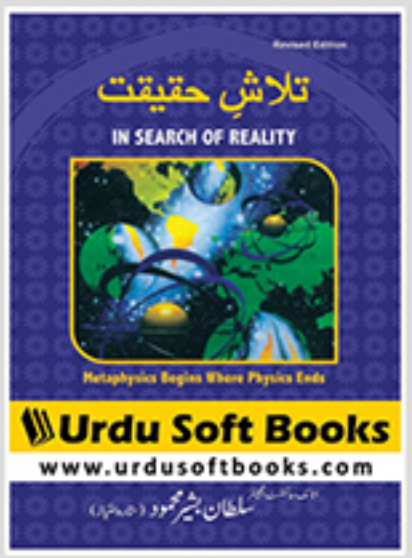

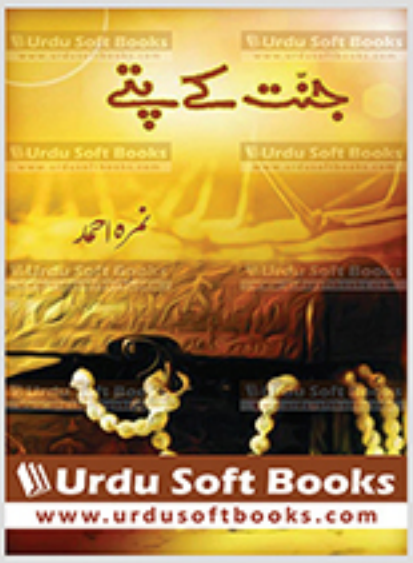

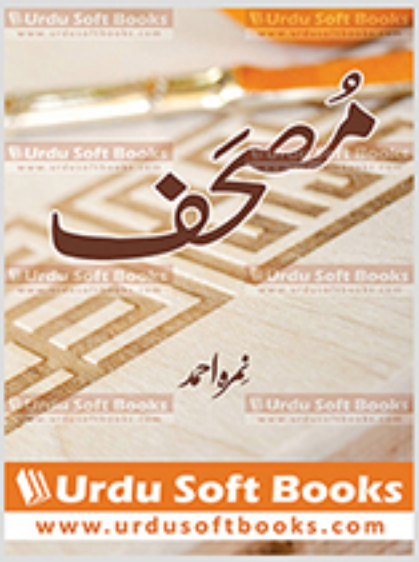

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

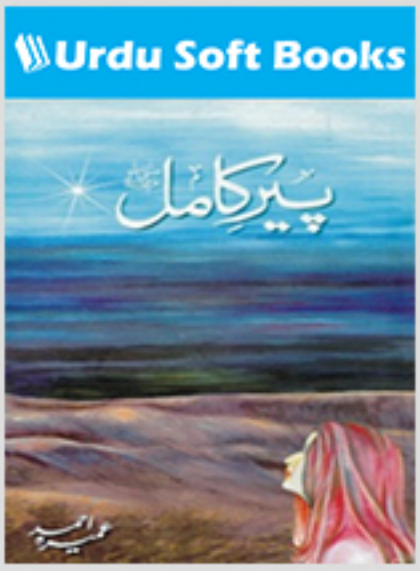

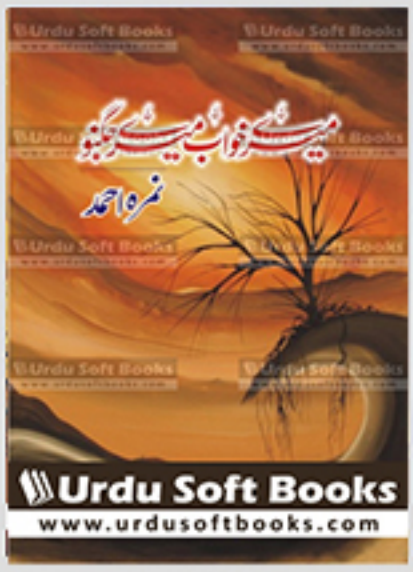

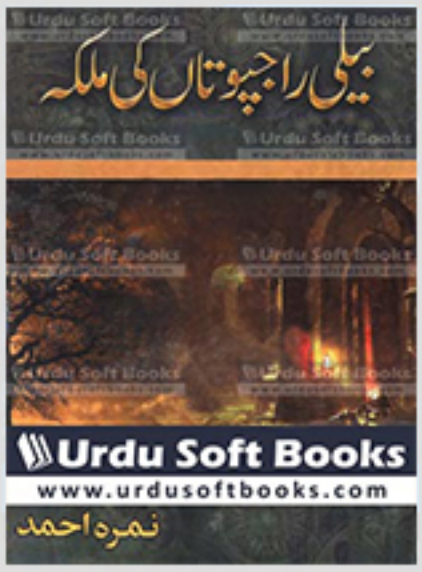

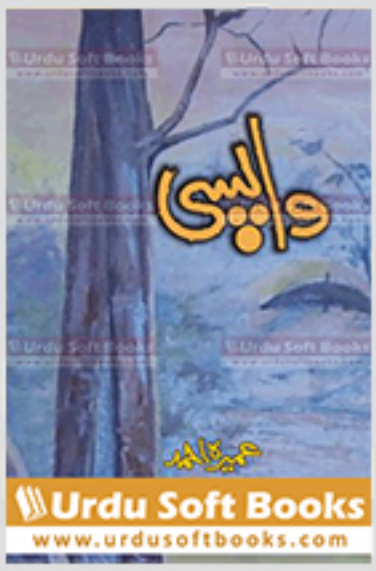

Download These Beautiful PDF Books

Click on Titles to Download

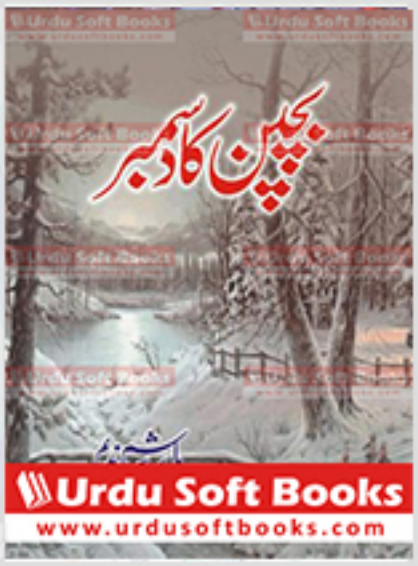

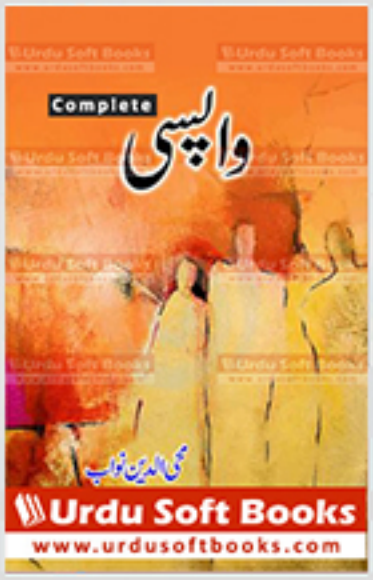

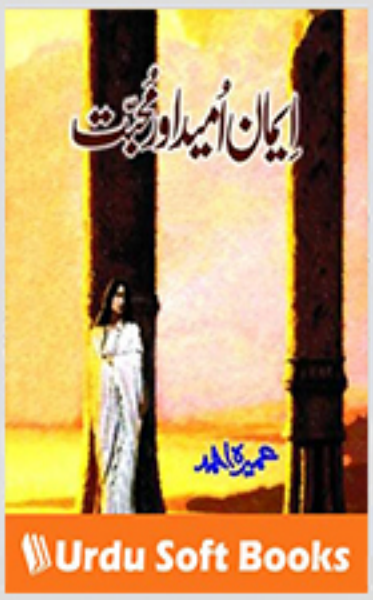

یہ تو میرے لیے بھی اطلاع تھی کہ میرا اور بلال کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔ اتنی بڑی بات خالہ نے اب تک مجھ سے کیوں چھپائی؟ مجھے بلال ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ مجھے ابو پر بھی غصہ آرہا تھا۔ اگر ایسی کوئی بات تھی تو مجھے بتانا چاہیے تھی۔ میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی تھی۔ اندر جانا ہی چاہتی تھی کہ چچی کلثوم اور خالہ کی باتیں سن کر رک گئی تھی۔

''اے بہن، تو ہمیں کیا علم غیب ہے۔'' چچی کلثوم نے کہا۔

''بیٹھیں تو سہی۔'' خالہ نے کہا۔ چچی کلثوم شاید جانے کو کھڑی ہو گئی تھیں۔ میں تیزی سے پیچھے ہٹ گئی۔ ''چائے پی کر جائیے گا۔''

''ارے، چائے کا کیا ہے۔'' چچی کلثوم نے کہا۔ ''کوئی تکلف تھوڑی ہے، اپنا گھر ہے۔ پھر پی لوں گی۔ اصل میں اشفاق کے ابا آنے والے ہوں گے۔ پھر کبھی فرصت سے آؤں گی۔'' چچی کلثوم نے کہا اور باہر نکل آئیں۔ وہ اپنی چادر سنبھالتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

مجھے چچی کلثوم بھی ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ ان کا بیٹا اشفاق البتہ سلجھا ہوا لڑکا تھا۔ وہ راشد بھائی اور بلال کا ہم عمر ہی تھا اور ان دنوں میٹرک میں پڑھ رہا تھا۔

میں بہت چھوٹی تھی جب امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت شاید میری عمر تین سال تھی۔ راشد بھائی مجھ سے تین سال بڑے تھے۔ امی کے انتقال کے بعد ہم دونوں کی دیکھ بھال خالہ ہی نے کی تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی کی وجہ سے ابو نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ خالہ کا گھر نزدیک ہی تھا۔ اسکول سے واپسی کے بعد ہم دونوں خالہ کے گھر چلے جاتے۔ وہاں کھانا وغیرہ کھاتے، پھر اپنے گھر آجاتے۔ خالہ ہم دونوں بہن بھائی کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ وہ مجھے اپنی بیٹی صائمہ سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔ راشد بھیا سے بھی وہ بہت محبت کرتی تھیں۔ ہمیں انہوں نے کبھی ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

اب اچانک مجھے علم ہوا کہ میری منگنی بلال سے ہو چکی ہے تو اس خبر سے مجھے دھچکا پہنچا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ میں ابو سے بات کروں گی۔ میں جانتی تھی کہ ابو میرے ساتھ زبردستی نہیں کریں گے۔ بلال خاصا وجیہہ تھا۔ خوش لباس بھی تھا اور باتیں بھی بہت کرتا تھا۔ اسی وجہ سے محلے کی کئی لڑکیاں اس پر مرتی تھیں اور وہ کسی کو مایوس نہیں کرتا تھا۔ اس کی یہ ہی عادت مجھے ناپسند تھی۔ اس کے علاوہ اس میں اور بھی بہت سی خامیاں تھیں۔ وہ سگریٹ تو خیر پیتا ہی تھا، جوا بھی کھیلتا تھا اور میں نے اڑتی اڑتی خبر سنی تھی کہ وہ شراب بھی پینے لگا ہے۔

خالہ کے لاڈ پیار اور خالو کی عدم توجہی سے وہ بالکل بگڑ گیا تھا۔

شام کو ابو آئے تو میری یہ پریشانی خود بہ خود ختم ہو گئی۔ ابو کو کھانا دینے کے بعد خالہ ہنس کر بولیں۔ ''آج بہن کلثوم آئی تھیں اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر۔''

''پھر؟'' ابو... کھانا کھاتے رک گئے۔ میں اس وقت کچن میں تھی۔ کچن کی ایک کھڑکی لاؤنج میں بھی کھلتی تھی اس لیے مجھے ان کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

''پھر کیا۔'' خالہ ہنس کر بولیں۔ ''میں نے کہہ دیا کہ عارفہ کا رشتہ تو برسوں پہلے بلال کے ساتھ طے ہو چکا ہے۔''

''لیکن آپا تم نے اتنا بڑا جھوٹ کیوں بولا؟'' ابو نے کہا۔

''جھوٹ نہ بولتی تو کیا کرتی؟'' خالہ نے جواب دیا۔ ''وہ تو پنجے جھاڑ کر عارفہ کے پیچھے پڑی ہیں۔''

جواب میں ابو نے کیا کہا، میں نے یہ سننے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ جو ہٹ چکا تھا۔ میں اپنے کمرے میں پہنچی تو میرا ذہن بہت ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔

دوسرے دن میں اسکول سے واپسی پر خالہ کے گھر پہنچی تو بلال گھر پر تھا۔ میرے ساتھ بھیا بھی تھے۔ خالہ نے ہم دونوں کو کھانا دیا تو بلال بھی وہیں آگیا۔

''یار! تم بھی اپنا کھانا لے آؤ۔'' بھیا نے اس سے کہا۔ ''کیا یہاں بیٹھ کر ہمارے نوالے گنو گے؟''

''فکر مت کرو، میں تمہارے نوالے نہیں گنوں گا۔'' بلال ہنس کر بولا۔ ''صائمہ میرا کھانا لا رہی ہے۔''

''یار یہ میرا تیرا کیا ہوتا ہے۔ تمہیں کھانا ہے تو ہمارے ساتھ ہی کھالو۔''

اس وقت صائمہ کھانے کی ٹرے لے کر آگئی۔ وہ ٹرے بلال کو دے کر جانے لگی تو بھیا نے کہا۔ ''صائمہ تم بھی کھانا کھا لو۔''

''میں کھانا کھا چکی ہوں۔'' صائمہ نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

میں جانتی تھی کہ وہ بھیا کو پسند کرتی ہے لیکن بھیا اس پر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ وہ تو بس ہر وقت پڑھنے ہی میں مگن ہوتے تھے۔ وہ مجھے جنون کی حد تک چاہتے تھے اپنے جیب خرچ سے میرے لیے چیزیں لے کر آیا کرتے تھے۔

ہم لوگ کھانا کھا کر گھر پہنچے ہی تھے کہ چچی کلثوم آگئیں۔

بھیا نے انہیں سلام کیا تو وہ بولیں۔ ''جیتے رہو، خوش رہو۔''

''آپ کیسی ہیں چچی؟'' بھیا نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' پھر شکایتی انداز میں بولیں۔ ''بیٹا میں تو اپنی محبت سے مجبور ہو کر تمہارے گھر چلی آتی ہوں۔ تم تو کبھی ہمارے گھر آ کر جھانکتے بھی نہیں۔''

''چچی، آپ تو جانتی ہیں کہ امتحان سر پر ہیں۔ سارا وقت تو پڑھائی میں لگ جاتا ہے۔''

''اے بھائی بس رہنے دو۔'' چچی نے کہا۔ ''اشفاق بھی ہر وقت کتابی کیڑا بنا رہتا ہے۔ پڑھائی کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ انسان اپنے خونی رشتوں سے ہی آنکھیں پھیر لے مگر تم لوگ ہمیں اپنا سمجھتے ہی کب ہو۔ تمہارے ابا تو بڑے بڑے فیصلے خاموشی سے کر لیتے ہیں۔''

''ارے چچی غصہ مت کریں۔ میں آپ کے گھر ضرور آؤں گا۔'' بھیا نے کہا۔ پھر مجھ سے بولے۔ ''جا عارفہ، چچی کے لیے شربت بنا کر لا۔'' پھر وہ ہنس کر چچی سے بولے۔ ''چچی یہ بتائیے کہ ابو نے کون سا ایسا فیصلہ کر لیا جو آپ کو بھی معلوم نہیں ہے۔''

میں تیزی سے کچن کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں جانتی تھی کہ چچی اب کیا کہنے والی ہیں۔

''اے میاں، بیٹے یا بیٹی کی شادی کوئی چھوٹی بات تو نہیں ہوتی۔ تمہارے ابا نے عارفہ کی منگنی چھپ چھپاتے بلال کے ساتھ کر دی۔ میاں ہم تو خوش ہونے والوں میں سے ہیں۔ ماجد بھائی نے ہمیں اس قابل ہی نہیں.....''

''چچی یہ آپ سے کس نے کہا کہ عارفہ اور بلال کی منگنی ہو چکی ہے؟'' بھیا اچانک سنجیدہ ہو گئے۔

''ارے بیٹا یہ بات تو مجھے تمہاری خالہ نے خود بتائی ہے۔''

''خالہ نے بتائی۔ ہے؟'' بھیا کی آواز میں حیرت تھی۔ ''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ عارفہ کی منگنی ہو چکی ہے۔ میں ابو سے پوچھوں گا کہ یہ منگنی کب اور کہاں ہوئی؟''

''ضرور پوچھنا بیٹا۔'' چچی نے کہا۔ ''میں جھوٹ تو نہیں بول رہی ہوں۔''

ان کے جانے کے بعد بھیا بھی گھر سے نکل گئے۔ مجھے ان سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا ورنہ میں انہیں سمجھاتی کہ خالہ نے ان سے جھوٹ بولا تھا۔

ابو شام کو گھر آئے تو بہت تھکے تھکے سے تھے۔ انہوں نے آتے ہی پوچھا۔ ''راشد کہاں ہے؟''

''بھیا اپنے کسی دوست کے گھر گئے ہیں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

اسی وقت بھیا آ گئے۔ وہ چند لمحے تک ابو کو دیکھتے رہے، پھر بولے۔ ''ابو! عارفہ کی منگنی آپ نے بلال سے طے کر دی اور مجھے اس کی اطلاع بھی نہیں ہے۔''

ابو نے چونک کر بھیا کی طرف دیکھا اور بولے۔ ''تم سے کس نے کہا؟''

''اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے کہاں سے معلوم ہوا۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟'' بھیا نے تلخ لہجے میں کہا۔

''راشد!'' ابو نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اپنا لہجہ درست کرو۔ تم کس انداز میں بات کر رہے ہو؟ اوّل تو ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ اس نکمے، آوارہ گرد بلال کے ساتھ عارفہ کی شادی کر دیں گے۔ اس لیے کہ آپ اس کے باپ ہیں لیکن.....''

''راشد!'' ابو چیخ کر بولے۔ ''اپنی زبان کو لگام دو۔ تمہاری اتنی جرأت ہو گئی کہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے جواب طلب کر سکو۔''

''عارفہ میری بہن ہے اور.....''

''بس اب بکواس بند کرو۔'' ابو نے ان کی بات کاٹ دی۔ ''اور عارفہ کی فکر چھوڑ دو۔ وہ میری بیٹی ہے۔ تم سے زیادہ مجھے اس کا خیال ہے۔''

''آپ کو خیال ہوتا تو آپ بلال جیسے آوارہ اور بدمعاش سے اس کا رشتہ طے کرتے؟'' یہ کہہ کر بھیا اپنے کمرے میں چلے گئے۔

پھر کئی روز اسی کشیدگی میں گزر گئے۔ ابو نے بھیا سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ انہیں اس بات کا صدمہ تھا کہ بھیا نے ان سے اتنی گستاخی کی تھی۔ مجھے خود بھی افسوس تھا کہ میری وجہ سے بات اتنی بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ بات تو کچھ تھی ہی نہیں۔

بھیا نے اب خالہ کے گھر جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ مجھے بھی وہاں نہیں جانے دیتے تھے۔ خالہ نے کئی دفعہ بھیا سے پوچھا بھی کہ تم نے آنا کیوں چھوڑ دیا ہے لیکن بھیا نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اس دن بھیا گھر میں داخل ہوئے تو خلافِ معمول بہت خوش تھے۔

تھا۔ وہ عملی طور پر سیاست میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ اور باقر مہدی کے ساتھ طلبہ کے ایک جتھے کے ہمراہ ایک جلوس میں شرکت کے لیے دہلی گیا حالانکہ حکومت نے اسے بلیک لسٹ کر رکھا تھا۔

وہ اور باقر مہدی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے نعرے لگاتے سڑکوں پر سے گزر رہے تھے۔ شام کو مشاعرہ تھا گاندھی جی اور محمد علی جوہر پلیٹ فارم پر اکٹھے بیٹھے تھے۔

وہ ایف اے کا امتحان دے چکا تھا۔ اس وقت اسے دو مسائل کا سامنا تھا۔ پہلا مسئلہ قرض کی ادائیگی کا تھا جو امتحان کے زمانے میں اس پر چڑھ گیا تھا۔ دوسرا مسئلہ بی اے میں داخلے کا تھا۔ ان مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اس نے دہلی کا رخ کیا اور ذاکر حسین سے مل کر جامعہ ملیہ دہلی میں ملازمت کر لی۔ یہ ادارہ ایک چھوٹی سی برادری تھی۔ وہ بھی اس برادری میں شامل ہو گیا۔ اسے چھٹیوں تک یہ ملازمت کرنی تھی اس کے بعد اسے بی اے میں داخلے کے لیے علی گڑھ جانا تھا۔

اسی دوران ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ آزادی آئی مگر خون میں نہائی ہوئی۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ بڑے پیمانے پر ہجرت کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ مسلمان آبادیوں کی آبادیاں پاکستان کی طرف ہجرت کر رہی تھیں۔ دہلی میں ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ دہلی چھوڑ کر علی گڑھ چلا جائے۔ وہ اور باقر مہدی ٹرین میں سوار ہوئے۔ گاڑی نے دہلی اسٹیشن چھوڑا ہی تھا کہ ٹرین ہندو بلوائیوں کے حملے کا شکار ہو گئی۔ ہندو غنڈے دندناتے ہوئے ڈبے میں داخل ہوئے اور خلیل کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"تم مسلمان ہو؟"

خلیل اس وقت اپنی جان بچانے کے لیے جھوٹ بول سکتا تھا لیکن اس کی غیرت ایمانی نے یہ گوارا نہیں کیا۔ اس نے کڑک کر جواب دیا۔ "ہاں میں مسلمان ہوں۔"

یہ سننا تھا کہ بلوائیوں نے ایک ساتھ کئی چھرے اس کے جسم میں پیوست کر دیے۔ دوستی ہو تو ایسی۔ یہ دیکھتے ہی باقر آگے بڑھا۔

"میرے دوست کو تم نے مار دیا۔ اگر وہ مر گیا تو پھر میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ اب دیکھتے کیا ہو، لو مجھے بھی مار ڈالو۔"

کسی نے آگے بڑھ کر اس پر بھی خنجر کا وار کر دیا۔

ٹرین رک چکی تھی۔ بلوائیوں نے ان دونوں کو اٹھا کر جمنا پل کے پاس پھینک دیا۔

دونوں کی خوش قسمتی تھی کہ ریلوے کا ایک ملازم ماتھر، ریلوے پٹریوں کا معائنہ کرتے کرتے وہاں پہنچ گیا۔ دیکھا کہ دو نوجوان زخمی حالت میں پٹری کے پاس پڑے ہیں۔ اس نے فوراً ٹھیلا منگوایا اور از راہ انسانیت دونوں کو اٹھا کر جامع مسجد دہلی پہنچا دیا۔

باقر مہدی کو کچھ ہوش تھا۔ اس نے ماتھر سے کہا کہ ان کے زخمی ہونے کی اطلاع جامعہ ملیہ پہنچا دی جائے۔ خلیل کے پھوپی زاد بھائی اصغر احسن اصلاحی جامعہ میں مدرس تھے۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی مدد سے خلیل کو پولیس کی گاڑی میں جامعہ لائے اور ان کا علاج معالجہ کرایا۔ خوش قسمتی سے دونوں کو کاری ضربیں نہیں آئی تھیں۔ دونوں کی حالت کچھ سنبھلی تو رفیع احمد قدوائی کے ہمراہ انہیں علی گڑھ روانہ کر دیا۔

اس نے صحت یاب ہوتے ہی بی اے میں داخلہ لے لیا اور ہاسٹل میں رہنے لگا۔ ان دنوں اس کی سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی علی گڑھ شاخ کا جنرل سیکریٹری ہو گیا تھا۔ اس کی رہنمائی میں انجمن نے فضا کے جمود کو توڑا اور وقت کے ساکن تالاب میں کئی لہریں پیدا کیں۔ خلیل کی سرگرمیاں گوناگوں تھیں۔

یہی زمانہ اس کی شاعری کے عروج کا بھی تھا۔

گلی گلی مری رسوائیوں کے چرچے ہیں
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے بوئے آوارہ

وہ ان دنوں مہ وشوں، نازنینوں میں بے انتہا مقبول ہو رہا تھا۔ باذوق گھرانوں کے دروازے اس پر کھلے ہوئے تھے جہاں خواتین اس کا کلام سننے کے لیے چشم براہ رہتی تھیں۔ وہ نغمے بکھیر رہا تھا اور سماعتیں گوش برآواز تھیں۔

کچھ ان کی باتیں کچھ اپنی باتیں
کٹتی ہیں یونہی اب غم کی راتیں
جانے یہ دن پھر آئیں نہ آئیں
کچھ اور اشارے کچھ اور گھاتیں

.....

بارہا تیرے نامرادوں کو
موت آواز دے کے پچھتائی
سنا رہا ہوں انہیں جھوٹ موٹ کا قصہ
کہ ایک شخص محبت میں کامیاب رہا

ایسی راتیں بھی ہم پہ گزری ہیں
تیرے پہلو میں تیری یاد آئی

.....

تجھ سے کم کم واقف تھے تو روز کا ملنا ہوتا تھا
تجھ کو جانا تجھ کو چاہا وقف شب دیجور ہوئے

.....

جرم محبت مجھ تک ہی رہتا
ان کا بھی دامن الجھا ہوا ہے

.....

اگرچہ اور بھی فتنے اٹھے قیامت کے
ترا شباب ہی عالم میں انتخاب رہا

اس کی یہ مقبولیت اپنی جگہ لیکن ٹرین میں ہونے والے قاتلانہ حملے نے اس کی شخصیت کو اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ راتوں کو گہری نیند سے چیخ چیخ کر اٹھ جاتا تھا۔ اس کے بہت سے پرانے ساتھی علی گڑھ سے جا چکے تھے۔ اس کیفیت نے اسے تنہائی کے خوف میں مبتلا کر دیا۔ بھائیوں کے رویے اور گھر کے حالات نے اسے باغی کر دیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اب گاؤں کے گھر میں اس کا کوئی نہیں حالانکہ گاؤں میں اس کی ماں تھی۔ اس نے گاؤں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

تنہائی کے اس اندھیرے سفر میں وہ شاید اتنی دور نکل جاتا کہ واپسی ممکن نہ ہوتی۔ اس اندھے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے کلیات میر اس کے ہاتھ لگ گئی۔ اس نے مطالعہ میر شروع کیا تو اس پر داخلی دنیا کے کئی دریچے کھل گئے۔ میر کا مطالعہ میر سے ملاقات سا بن گیا۔ گویا میر تقی میر اس کے غم گسار بن گئے۔ وہ ان کی صحبت میں بیٹھ کر تنہائی کے عذاب سے نجات حاصل کرنے لگا۔

اس دور میں اس نے جو غزلیں کہیں ان میں بھی میر کا رنگ نظر آنے لگا۔

جن گلیوں میں اعظمی صاحب آپ بہت بدنام ہوئے
پھر بھی آپ وہیں جاتے ہیں اس میں کیا دانائی ہے

اسے میر کا طرز اپنانے پر فخر ہے۔

میر کا طرز اپنایا سب نے لیکن یہ انداز کہاں
اعظمی صاحب آپ کی غزلیں سن سن کر سب حیراں ہیں

میر کی عظمت کو خراج عقیدت پیش کرنا بھی اس کا فرض تھا۔

میر کے رنگ میں شعر کہے ہے تجھ کو یہ کیا سودا ہے
اعظمی اس سورج کے آگے کتنے دیے بے نور ہوئے

وہ ابھی میر کی شاعری سے بہل ہی رہا تھا کہ اس کی تنہائی کے تالاب میں ایک لہر کا اور اضافہ ہوا۔ وہ پرانی کتابوں کی تلاش میں اکثر رسل گنج کی طرف نکل جاتا تھا اور کباڑیوں کی دکانوں کو چھانتا تھا۔ اسی چھان بین میں اسے آتش کا دیوان مل گیا۔ اس نے بے دلی سے اسے خرید لیا۔ بے دلی سے اس لیے کہ اس کے دل میں قدیم شاعری کی طرف سے تعصب تھا لیکن ''آتش'' زیادہ قدیم نہیں تھا اور اس سے پہلے میر تقی میر کی کلیات پڑھ چکا تھا۔ اس لیے آتش کا دیوان خرید لیا اور جھاڑ پونچھ کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اچھے اشعار پر نشان لگاتا گیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آتش پر کچھ لکھنا چاہتا ہے یا ان شعروں کے جواب میں غزلیں کہنا چاہتا ہے۔ وجہ کوئی بھی ہو لیکن یہ ضرور تھا کہ وہ آتش سے متاثر ہو رہا تھا۔

اس کے دوستوں کو انتظار تھا کہ دیکھیے وہ کب آتش کے رنگ میں غزلیں کہنے کا آغاز کرتا ہے لیکن اس مرتبہ اس کا میدان زیادہ وسیع نظر آیا۔ اس مرتبہ اس آتش کی کسی زمین میں غزل کہنے کی بجائے ''آتش کی شخصیت'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھ ڈالا۔ ڈرتے ڈرتے کچھ دوستوں کو سنایا بھی اور پھر یہ طے ہوا کہ اسے ''نگار'' میں اشاعت کے لیے نیاز فتح پوری کے پاس بھیج دیا جائے۔ یہ کوئی معمولی مشورہ نہیں تھا۔ علامہ نیاز فتح پوری کے مقام و مرتبہ کی دنیائے ادب قائل تھی۔ ان کے پرچے ''نگار'' میں نہایت اعلیٰ شخصیات کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ خلیل اعظمی کو امید بھی نہیں تھی کہ اس کی یہ طالب علمانہ کاوش کسی قابل سمجھی جائے گی لیکن جب اگلے ہی شمارے میں اس کا یہ مضمون شاملِ اشاعت کر لیا گیا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اس نے رسالہ بغل میں دبایا اور باقر مہدی کے پاس پہنچ گیا۔ ''تم نے نگار دیکھا۔''

''دیکھنا کیا ہے۔ تمہارا مضمون شائع ہوا ہوگا۔''

''تمہیں کیسے معلوم؟''

''تمہارے چہرے کی خوشی بتا رہی ہے اور پھر میرے ہی مشورے سے تو تم نے اپنا مضمون نگار کے لیے بھیجا تھا۔''

''یار، مجھے یقین نہیں تھا کہ میرا مضمون شائع ہو جائے گا۔''

''تمہیں اپنی صلاحیتوں کا علم ہی نہیں۔'' باقر مہدی

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

"کیا بات ہے بھیا؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔ "آج آپ بہت خوش نظر آرہے ہیں؟"

"ہاں عارفہ بات ہی کچھ ایسی ہے، بات نہیں بلکہ باتیں۔" وہ مسکرا کر بولے۔

میں ان کی بات پر الجھ کر رہ گئی۔ میں نے کہا۔ "بھیا آپ کیا کہہ رہے ہیں، میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آرہا ہے۔"

"عارفہ، میں نے لندن کے ایک کالج میں داخلے کی درخواست بھیجی تھی۔ وہاں میرا داخلہ ہوگیا ہے۔ میں اگلے ہفتے لندن جارہا ہوں۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ "دوسری بات یہ کہ تیری منگنی کی اطلاع غلط تھی۔ ابو نے تیری منگنی بلال کے ساتھ نہیں کی ہے۔"

"میں نے تو کئی مرتبہ آپ کو بتانے کی کوشش کی لیکن آپ تو کوئی بات سنتے ہی نہیں تھے۔" میں نے کہا۔

"عارفہ تو مجھے جان سے زیادہ پیاری ہے۔ میں یہ بات برداشت نہیں کرسکا۔" پھر وہ چونک کر بولے۔ "ابو کہاں ہیں مجھے ان سے بھی معافی مانگنی ہے۔ تو بھی ابو سے میری سفارش کردینا۔"

ابو برآمدے میں بیٹھے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ اچانک اٹھ کر ہمارے سامنے آگئے۔

ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر بھیا بھی رونے لگے اور میں بھی آنسو بہانے لگی۔ پھر بھیا دوڑ کر ان سے لپٹ گئے اور بولے۔ "ابو میں نے آپ کا بہت دل دکھایا ہے۔ پلیز مجھے معاف کردیں۔"

"اتنا بڑا ہو کر روتا ہے۔" ابو نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "مجھے تو اس بات کی بہت خوشی ہے کہ تو عارفہ کے سلسلے میں اتنا جذباتی ہے۔" پھر وہ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "چل! یہ آنسو پونچھ لے اور مجھے یہ بتا کہ تجھے لندن کب جانا ہے؟"

بھیا روتے روتے مسکرانے لگے۔

اس دن ہم تینوں نے بہت دنوں بعد اکٹھے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھیا نے بتایا کہ وہ اکیس تاریخ کو لندن جائیں گے۔ ان کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔

آخر ایک دن بھیا لندن روانہ ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں انہیں کتنا چاہتی تھی۔ ابو بھی کئی دن تک اداس رہے۔

بھیا ہر دوسرے تیسرے دن لندن سے فون کرتے تھے اور گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ بہت زیادہ مصروف ہوگئے۔ اب انہیں روزانہ فون کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ پندرہ بیس دن میں ایک مرتبہ کال کرلیا کرتے تھے۔

ان دنوں موبائل فون نہیں تھا اور لینڈ لائن کے فون بھی بہت کم گھروں میں ہوا کرتے تھے۔ شروع میں تو بھیا سے بات کرنے کے لیے شیخ صاحب کے گھر جانا پڑتا تھا۔ ابو سے ان کی دوستی تھی اس لیے وہ ہمیں اپنا ٹیلی فون کرنے کی اجازت دے دیتے تھے۔

شیخ صاحب سرکاری ٹھیکے دار تھے اور خاصے خوش حال تھے۔ ان کی ایک بیٹی شبانہ میری ہم عمر تھی، بیٹا مسعود بھیا سے ایک دو سال بڑا ہوگا۔ ان کے دو بیٹے بہت چھوٹے تھے اور پرائمری میں پڑھتے تھے۔

بھیا سے فون پر بات کرنے اکثر میں ہی جاتی تھی۔ ابو تو بہت کم ان کے گھر جایا کرتے۔ میں شیخ صاحب کے گھر جاتی تو مسعود بہانے بہانے سے وہیں منڈلاتا رہتا۔ مجھے دیکھ کر بے وجہ مسکراتا اور شبانہ کو اکثر گھسے پٹے لطیفے سنایا کرتا۔ شبانہ کی آڑ میں دراصل وہ مجھے لطیفے سنایا کرتا تھا۔ اس کے لطیفوں اور چھچھورے مذاق پر مجھے ہنسی کی بجائے غصہ آیا کرتا تھا۔ کبھی وہ شبانہ کے لیے کولڈ ڈرنک لے آتا، کبھی آئس کریم لاتا تھا۔ گویا میری وجہ سے شبانہ پر عنایتیں ہوتی تھیں۔

ایک دن شبانہ نے کہہ ہی دیا۔ "کیا بات ہے مسعود بھائی آج کل آپ مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں۔"

"کیا اس سے پہلے میں تجھے آئس کریم نہیں کھلاتا تھا یا سموسے لے کر نہیں آتا تھا؟" مسعود منہ بنا کر بولا۔

میں نے مسعود سے کہا۔ "مسعود بھائی! مجھے اس چٹورپن کا کوئی شوق نہیں ہے اس لیے میرے لیے کچھ مت لایا کریں۔"

مسعود کھسیانا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

مجھے اب اس چھچھورے لڑکے سے چڑ ہوگئی تھی۔ میرے آنے کا وقت ہوتا تو وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر میرے سر پر مسلط ہوجاتا۔ مجھ سے ٹھیک طرح فون پر بات بھی نہیں ہوتی تھی۔

پھر ابو نے بھاگ دوڑ کر کے گھر میں فون لگوالیا تو میری جان اس عذاب سے چھوٹ گئی۔ اس کے بعد مسعود ایک دو دفعہ بہانے بہانے سے ہمارے گھر بھی آیا لیکن میں اس کے سامنے نہ آئی۔ ایک دفعہ میں اسکول سے واپس آرہی تھی کہ بس اسٹاپ کے نزدیک مجھے مسعود نظر آیا۔ وہ موٹر سائیکل پر تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے پیچھے لپکا اور میرے نزدیک آکر بولا۔

"عارفہ! میری ایک بات.....

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''مسعود بھائی پلیز۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''لوگ دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تماشا مت بنائیں۔'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گئی۔

وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا۔ موٹر سائیکل لے کر وہ میرے سامنے آگیا اور بولا۔ ''عارفہ، صرف ایک منٹ میری ایک بات سنتی جاؤ۔''

''مسعود بھائی!'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میرا راستہ چھوڑیں۔''

''عارفہ، میں.....''

''کیا بات ہے؟'' پشت سے مجھے کسی کی آواز سنائی تھی۔ ''کیوں انہیں تنگ کر رہا ہے؟''

میں نے گھوم کر دیکھا وہ محلے کا ایک بدنام لڑکا منیر تھا۔ مجھے مسعود پر بے تحاشا غصہ آیا۔ کم بخت خود تو بے عزت ہو ہی رہا تھا مجھے بھی سرعام تماشا بنا دیا تھا۔

منیر نے دوسری مرتبہ بلند آواز میں کہا۔ ''راستہ چھوڑ دے ان کا ورنہ ابھی تیرا دماغ درست کر دوں گا۔''

مسعود نے جلدی سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور وہاں سے چلا گیا۔

''آپ شاید اسی محلے میں رہتی ہیں؟'' منیر نے یوں کہا جیسے پہلی دفعہ مجھے دیکھ رہا ہو۔ حالانکہ وہ بھی آتے جاتے مجھے گھورتا تھا۔ آج اس کم بخت مسعود کی وجہ سے منیر کو بات کرنے کا موقع بھی مل گیا تھا۔

''آپ پریشان نہ ہوں، آیئے میں آپ کو گھر چھوڑ دوں۔'' منیر نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''میں چلی جاؤں گی۔ آپ زحمت نہ کریں روزانہ اکیلی ہی جاتی ہوں۔''

''آیندہ اگر کوئی بھی آپ کو پریشان کرے تو مجھے بتایئے گا۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے چلتی رہی۔

منیر کچھ دور تو میرے ساتھ چلا لیکن جب میں نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تو واپس چلا گیا۔ مجھے رہ رہ کر مسعود پر غصہ آرہا تھا۔ میرا دل تو یہ چاہا تھا کہ چپل اتار کر اس کے سر پر اسی بے بھاؤ کی برساؤں کہ سارا عشق ہوا ہو جائے لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں خود تو تماشا بنتی ہی لیکن محلے والے مار مار کے مسعود کا بھرکس نکال دیتے۔ لڑکیوں کے طرف دار تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں جوان کی خوشنودی کے لیے ہر وقت مرنے مارنے کو تیار رہتے ہیں۔ پھر میری دبنی رو بھیا کی طرف چلی گئی۔ بھیا کو ٹیلی فون کرنے ہی کے لیے تو میں شیخ صاحب کے گھر جاتی تھی۔

وہ تو غنیمت ہوا کہ ابو نے فون لگوا لیا۔

اب جب سے فون لگا تھا بھیا کے فون آنا کم ہو گئے تھے۔ مجھے ان پر کبھی جھنجلاہٹ ہوتی تھی کہ انہیں میرا اور ابو کا خیال ہی نہیں ہے۔ ایسی بھی کیا مصروفیت کہ آدمی بات کرنے کو پانچ منٹ بھی نہ نکال سکے۔

ابو مجھے سمجھاتے تھے کہ راشد اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگا تم تو جانتی ہی ہو کہ پڑھائی میں مصروف ہو کر وہ کھانا پینا بھی بھول جاتا ہے۔

پھر رفتہ رفتہ بھیا کی کالز آنا مزید کم ہو گئیں۔ اب وہ ایک ڈیڑھ مہینے بعد دو چار منٹ بات کر لیا کرتے تھے۔ ان کے اس رویے سے ابو بھی پریشان تھے لیکن وہ مجھ پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔

میں دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی لیکن کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ دو چار دفعہ میں نے خود بھی ان سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ان سے بات نہ ہو پاتی۔ کبھی وہ کمرے میں نہیں ہوتے تھے۔ کبھی فون ریسیو کرنے والا مجھے ہولڈ کرا کے خود غائب ہو جاتا تھا اور میں پاگلوں کی طرح ریسیور کان سے لگا کر بیٹھی رہتی تھی۔

آخر میری بھی انا آڑے آئی اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں انہیں خود کال نہیں کروں گی۔ نہ ان کا فون آنے پر کسی قسم کی کوئی شکایت کروں گی۔

دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال بیت گئے۔ میں نے اس دوران میں بی ایس سی کر لیا۔ اب میں ایم ایس سی کی تیاری کر رہی تھی۔

ایک دن ابو کو ڈاک کے ذریعے ایک خط موصول ہوا۔ وہ خط بھیا کا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ میں نے انجینئرنگ کا ڈپلوما کرنے کے بعد یہاں ملازمت کر لی ہے۔ پہلی تنخواہ ملنے پر ڈرافٹ بھیج رہا ہوں۔ اس میں سے پانچ ہزار عارفہ کے لیے ہیں۔

ابو تو خط پا کر نہال ہو گئے۔ مجھے بھی بہت خوشی ہو رہی تھی کہ بھیا نے نہ صرف اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی بلکہ وہ جاب بھی کرنے لگے تھے۔ ان کی جاب بہت اچھی تھی کیوں کہ پہلی تنخواہ پر انہوں نے ابو کو بیس ہزار روپے بھیجے تھے۔ بیس ہزار کی رقم اس وقت خاصی ہوتی تھی۔ بھیا کا فون مہینے میں ایک آدھ

بار ہی آتا تھا۔ میں ان سے کہتی کہ آپ کی تعلیم مکمل ہوگئی ہے تو پاکستان لوٹ آئیں۔ یہاں بھی آپ کو اچھی ملازمت مل جائے گی۔

وہ جواب میں کہتے تھے کہ بس کچھ عرصہ جاب کر کے پیسے جمع کرلوں، پھر پاکستان آکر ملازمت کی بجائے کاروبار کروں گا۔

مجھے یوں ہی باتوں میں بہلا پھسلا کر انہوں نے دو سال مزید گزار دیے۔

میں نے ایم ایس سی کرلیا اور جاب کے لیے مختلف جگہ درخواستیں بھیج دیں۔ مجھے ملازمت کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن میں گھر میں پڑے پڑے بور ہوگئی تھی اس لیے خود کو مصروف رکھنے کے لیے ملازمت کرنا چاہتی تھی۔

جلد ہی مجھے ایک کالج میں لیکچرر شپ کی آفر ہوئی تو میں نے وہ آفر قبول کرلی۔

مجھے ملازمت کرتے شاید تین مہینے ہوئے تھے کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف سے بھیا کی آواز سن کر میں خوش ہوگئی۔

میری بات سن کر ابو بھی لاؤنج میں نکل آئے۔

''کیسی ہے موٹی؟'' بھیا نے ہنس کر کہا۔ میں بچپن میں بہت موٹی تھی اس لیے بھیا اکثر چڑانے کے لیے مجھے موٹی کہا کرتے تھے۔

''میں اب اتنی موٹی نہیں ہوں بھیا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اب تو میں بہت سلم اور اسمارٹ ہوگئی ہوں۔''

''اچھا سن۔'' بھیا نے کہا۔ ''تو میرے کمرے کی صفائی تو کرتی ہے ناں؟''

''آپ کو اپنا کمرا کیوں یاد آگیا بھیا؟'' میں نے کہا۔ ''آپ کے کمرے کی صفائی تو میں روزانہ کرتی ہوں اور آپ کی چیزیں جوں کی توں رکھی ہوئی ہیں۔''

''تو پھر تیار ہو جا، میں پرسوں رات کی فلائٹ سے پاکستان آرہا ہوں۔'' بھیا نے کہا۔

''کک...... کیا کہا آپ نے؟'' میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ میرا دل مارے خوشی کے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

''میں نے کہا ہے کہ میں پرسوں پاکستان آرہا ہوں، کیا تو اب بہری بھی ہوگئی ہے؟'' بھیا نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''اچھا کس وقت آئیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''میری فلائٹ رات کو بلکہ صبح چار بجے کراچی پہنچے گی۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔ ''ابو کہاں ہیں؟ اگر گھر پر ہیں تو میری بات کرا ان سے۔''

میں نے ریسیور ابو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ابو بھیا کا فون ہے، بات کریں۔''

ابو، بھیا سے بات کرنے لگے اور میں بھیا کے کمرے کی طرف بھاگی۔ میں نے ایک ہفتے سے کمرے کی صفائی نہیں کی تھی۔ کمرے کی صفائی کر کے میں ڈرائنگ روم اور لاؤنج کی صفائی میں لگ گئی۔

ابو مسکرا کر بولے۔ ''عارفہ بیٹی، ایسی بھی کیا بدحواسی، راشد آج تو نہیں آرہا ہے؟''

''ابو پرسوں میں وقت ہی کتنا ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ بھیا کو گندگی سے چڑ ہے۔''

میں نے بھیا کے کمرے کے ساتھ ساتھ پورے گھر کو آئینے کی طرح چمکا دیا۔ بھیا کا پسندیدہ مٹر پلاؤ، قورمہ اور گاجر کا حلوا تیار کرنے میں آدھا دن لگ گیا۔ پھر میں ایئرپورٹ جانے کو تیار ہونے لگی۔ میں یوں تیاری کررہی تھی جیسے کسی شادی میں جارہی ہوں۔ ابو نے ایک وین والے سے کہہ دیا تھا۔ وہ وقت سے پہلے آگیا۔

اس دن سردی بہت شدید تھی۔ ابو کو ہلکا سا بخار بھی ہوگیا تھا اس لیے میں نے اصرار کر کے ابو کو گھر پر آرام کرنے کو کہا اور خود خالہ، بلال اور ان کی بیٹی کے ساتھ ایئرپورٹ روانہ ہوگئی۔

ایئرپورٹ پر بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ جانے والوں کو ان کے عزیز و اقارب الوداع کہہ رہے تھے اور آنے والوں کے استقبال کے لیے لاؤنج کی ریلنگ کے ساتھ سراپا انتظار بنے کھڑے تھے۔

بھیا کی فلائٹ آچکی تھی اور مسافر باہر آرہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد مجھے بھیا نظر آگئے۔ وہ پہلے سے زیادہ صحت مند، خوش لباس اور وجیہہ لگ رہے تھے۔ وہ سامان سے لدی پھندی ٹرالی دھکیلتے ہوئے باہر آرہے تھے۔

پھر بلال کی نظر ان پر پڑی تو وہ مجھ سے بولا۔ ''عارفہ وہ دیکھو راشد۔''

میں نے بھیا کو آواز دی۔ ''بھیا۔''

بھیا نے مجھے دیکھا اور بے اختیار مجھے گلے لگاتے ہوئے بولے۔ ''ارے موٹی تو تو واقعی بہت اسمارٹ ہوگئی ہے۔'' پھر وہ خالہ اور بلال سے ملے، پھر ان کی نظر خالہ کی بیٹی صائمہ پر پڑی۔ وہ سہمی سمٹی ایک طرف کھڑی تھی۔ بھیا مسکرا کر بولے۔ ''صائمہ کیسی ہو تم؟''

''میں...... ٹھیک ہوں۔'' صائمہ نے نظریں جھکائے

جھکائے جواب دیا۔

اچانک میری نظر بھیا کے پیچھے کھڑی ایک انگریز لڑکی پر پڑی۔ وہ بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ایئرپورٹ پر کئی غیر ملکی لڑکیاں اور مرد بھی تھے اس لیے میں نے اس لڑکی کو نظر انداز کردیا۔

اچانک بھیا بولے۔ ''عارفہ یہ ''میری'' ہے۔ تمہاری بھابی۔''

بھیا کے الفاظ سن کر میرے کانوں میں ایسا چھناکا ہوا جیسے کوئی شیشہ زوردار آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا ہو۔ میں نے بھیا کی طرف بے یقینی سے دیکھا اور بڑبڑائی۔ ''بھابی!''

بھیا اس انگریز لڑکی سے مخاطب ہوئے۔ ''میری، یہ میری پیاری بہن عارفہ ہے۔''

''ہیلو!'' میری نے میری طرف ہاتھ بڑھایا تو میں نے بے دلی سے تھام لیا۔

مجھ سے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دوبھر ہو رہا تھا۔ میری حالت دیکھ کر بھیا نے مجھے سہارا دیا اور بولے۔ ''ارے تیرا جسم تو برف کی طرح سرد ہو رہا ہے۔ چل گھر چل..... یہاں بھی بہت سردی ہے۔'' وہ مجھے سہارا دے کر ایئرپورٹ سے باہر آئے۔

واپسی میں میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟ میں جانتی تھی کہ ابو کو بھی اس بات کا شدید صدمہ ہوگا۔ وہ تو بھیا سے نہ جانے کیا کیا امیدیں لگائے بیٹھے تھے۔

میں راستے بھر خاموش رہی۔ خالہ اور صائمہ بھی بت بنی بیٹھی تھیں۔ صرف بھیا اپنی بیوی سے کچھ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ وہ ان کی کسی بات پر ہنس بھی دیتی تھی۔

ہم گھر پہنچے تو ابو سراپا انتظار بنے دروازے کے نزدیک ہی کھڑے تھے۔ اطلاعی گھنٹی سنتے ہی انہوں نے دروازہ کھول دیا۔

بھیا وین سے اتر کے ان سے لپٹ گئے۔ فرطِ خوشی سے ابو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بھیا کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔ ''بہت دن لگا دیے بیٹا۔ لیکن مجھے خوشی ہے کہ تو وہاں سے انجینئرنگ کی ڈگری لے کر واپس آیا ہے۔'' بولتے بولتے معاً ان کی نظر میری پر پڑی تو وہ خاموش ہوگئے۔

بھیا نے بھی ان کی خاموشی کو محسوس کرلیا اور آہستگی سے بولے۔ ''ابو یہ میری ہے، آپ کی بہو۔''

''بہو؟'' ابو نے حیرت سے دہرایا۔

''جی ابو، آپ کی بہو۔'' بھیا نے کہا۔ ''میں نے ایک سال پہلے میری سے شادی کرلی تھی۔ میں آپ کو بتانا چاہتا تھا لیکن موقع ہی نہ ملا۔''

ابو تو یوں گم صم کھڑے تھے جیسے ان کے جسم میں جان ہی نہ ہو۔ پھر وہ اچانک فرش پر گر پڑے۔

میں نے لپک کر ابو کو سہارا دینے کی کوشش کی لیکن وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ پھر بلال اور بھیا نے مل کر ابو کو اٹھایا اور اسی وین میں لٹا دیا جس میں ہم ایئرپورٹ سے آئے تھے۔

ابو یہ صدمہ برداشت نہ کرسکے تھے اور انہیں دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔

انہیں آئی سی یو میں منتقل کردیا گیا اور ہم اس یخ بستہ رات میں اسپتال کے کوریڈور میں کھڑے تھے۔ اسپتال میں اس وقت میرے علاوہ بلال اور بھیا بھی تھے۔ ان کی انگریز بیوی نے اسپتال آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

ڈاکٹرز نے کہہ دیا تھا کہ آئندہ چوبیس گھنٹے ابو پر بھاری ہیں۔ اگر انہیں ہوش آگیا تو ان کی زندگی کی امید کی جاسکتی ہے۔

میں رو رو کر ابو کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگ رہی تھی لیکن بھیا کچھ شرمندہ شرمندہ نظر آرہے تھے۔

''ابو کو دل کی بیماری کب سے تھی عارفہ؟'' بھیا نے مجھ سے پوچھا۔

''ابو کو کبھی دل کی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''انہیں آج پہلی دفعہ دل کا دورہ پڑا ہے۔'' پھر میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آپ جانا چاہیں تو چلے جائیں۔ آپ لمبا سفر کرکے آئے ہیں تھکے ہوئے ہوں گے۔ یوں بھی یہاں رہ کے آپ ابو کے لیے کیا کرسکتے ہیں بھیا؟''

''تو کہنا کیا چاہتی ہے؟'' بھیا نے جھنجلا کر کہا۔ ''کیا ابو کا رشتہ تجھ سے ہی ہے، میرا ان سے کوئی رشتہ نہیں ہے؟''

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' میں نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ کی نظروں میں رشتوں کی کوئی اہمیت ہوتی تو یوں خاموشی سے شادی نہ کرلیتے۔'' میری آواز کچھ بلند ہوگئی تھی۔

''عارفہ تیرا مطلب ہے کہ ابو میری وجہ.....''

''میرا کوئی مطلب نہیں ہے بھیا۔'' میں نے کہا۔ ''میں صرف یہ کہہ رہی تھی کہ آپ لمبا سفر کرکے آئے ہیں گھر جاکر آرام کریں۔''

وہ یخ بستہ رات میں نے اسپتال کے لاؤنج میں گزار دی۔ صبح ڈاکٹر نے ہمیں خوش خبری سنائی کہ مریض کی حالت

اب خطرے سے باہر ہے۔

صبح صبح خالہ اور صائمہ ہمارے لیے ناشتا لے کر آگئی تھیں۔ ہم نے اسپتال کے لان میں بیٹھ کر ناشتا کیا۔ پھر خالہ نے مجھ سے کہا۔ ''عارفہ بیٹا، بھائی صاحب کی حالت اب ماشاء اللہ خطرے سے باہر ہے تو بھی گھر جا کر کچھ دیر آرام کر لے۔''

میں نے انکار کرنا چاہا لیکن خالہ نے اصرار کر کے مجھے گھر بھیج دیا اور بولیں کہ تو بھائی صاحب کی فکر مت کر، میں اور صائمہ یہاں موجود ہیں۔ بھیا اور بلال صبح صبح واپس چلے گئے تھے۔

میں گھر پہنچی تو گھر میں بالکل سناٹا تھا۔ شاید بھیا اور ان کی چہیتی بیوی ابھی تک سو رہی تھی۔ میرا بھی جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ میں نے پہلے اپنے کالج فون کر کے اپنی غیر حاضری کی اطلاع دی۔ پھر بستر میں گھس گئی۔

میری آنکھ کھلی تو وال کلاک گیارہ بجا رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھی منہ پر پانی کا چھینٹا مارا، کپڑے بدلے اور اسپتال کے لیے روانہ ہو گئی۔

خالہ اور صائمہ وہیں تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بیٹا، بھائی صاحب کو ہوش آ گیا۔ ان کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن وہ ابھی آئی سی یو میں ہیں۔ ڈاکٹر کسی کو اندر نہیں جانے دے رہے۔''

''میں ڈاکٹر سے بات کرتی ہوں۔'' میں وارڈ کی طرف بھاگی۔ میری خوشامدیں کرنے پر ڈاکٹر نے صرف اتنا کیا کہ مجھے شیشے کے دروازے سے ابو کو دیکھنے کی اجازت دے دی۔ ابو کی حالت قدرے بہتر تھی اور وہ اس وقت سو رہے تھے یا ممکن ہے غنودگی میں ہوں۔

پھر پانچ دن تک میرا زیادہ وقت اسپتال میں گزرا۔ ابو کی حالت بہت بہتر تھی۔ اس دوران بھیا بھی اسپتال میں رہے لیکن میں نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔ ان کی بیوی نے اس وقت بھی اسپتال آنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

پانچویں دن ابو گھر آ گئے۔ وہ بھیا سے بات نہیں کر رہے تھے۔

اس دن شام کو بھیا نے مجھ سے کہا۔ ''عارفہ میں واپس لندن جا رہا ہوں۔''

''مجھ سے کیا کہہ رہے ہیں؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو روک تو نہیں سکتی نا۔''

''میں یہاں آ کر پچھتا رہا ہوں۔'' بھیا نے یوں کہا جیسے انہوں نے واپس آ کر میری سات پشتوں پر احسان کیا ہے۔

''آپ یہاں نہ ہی آتے تو اچھا تھا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آپ کو تو اس گوری چمڑی والی سے شادی کرنے کی پڑی تھی۔ اگر آپ ابو سے شادی کی اجازت لیتے تو ابو آپ کو منع تو نہیں کرتے نا۔''

''ایسی کیا آفت آ گئی ہے میری شادی سے؟'' بھیا کو ایک دم غصہ آ گیا۔

''آفت آ گئی ہے۔'' میں نے بھی چیخ کر کہا۔ ''آپ کی وجہ سے ابو کی یہ حالت ہوئی ہے ورنہ انہیں تو کبھی دل کی تکلیف تھی ہی نہیں اور...... آپ کی میری کو اتنی بھی تمیز نہیں ہے کہ وہ ابو کی مزاج پرسی ہی کر لیتی۔ نہ جانے کس خاندان کی ہے۔''

''عارفہ!'' بھیا چیخ کر بولے۔ ''تمیز سے بات کرو۔ میری تمہاری بھابی ہے۔''

''اونہہ بھابی ہے، اس کی حرکتیں تو بھابیوں والی نہیں ہیں۔''

اچانک میری اوپر سے نیچے آ گئی اور بولی۔ ''عارفہ تم کیا بکواس کر رہی ہو، اتنی اردو تو میں بھی سمجھ لیتی ہوں تم مجھے گالیاں دے رہی ہو۔'' وہ چیخ کر انگریزی میں بولی۔

''شٹ اپ!'' میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ ''بکواس تو تم کر رہی ہو۔''

''راشد یہاں سے ابھی چلو، میں اب اور زیادہ ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔''

''عارفہ۔'' بھیا نے درشت انداز میں کہا۔ ''میری سے معافی مانگو۔''

''میں اس سے معافی مانگوں گی، اس سے۔ معافی تو آج تک میں نے کبھی آپ سے بھی نہیں مانگی۔'' میں نے میری کو سنانے کے لیے انگلش میں کہا۔ ''اور میں نے کیا کیا ہے جس کی معافی مانگوں، جتنی بات ہوئی ہے آپ کے سامنے ہی ہوئی ہے، کیا اپنی بیوی کی طرح آپ کو بھی اردو نہیں آتی؟'' میں نے پھر انگریزی میں کہا۔

''راشد!'' میری چیخ کر بولی۔ ''یہاں سے ابھی اور اسی وقت واپس چلو۔ میں اب یہاں ایک لمحے کو نہیں ٹھہر سکتی۔''

''کیا تم پاگل ہو گئی ہو میری۔'' بھیا اس پر الٹ پڑے۔ ''میرا باپ شدید بیمار ہے اور تمہیں جانے کی پڑی ہے۔''

''باپ بیمار ہے؟'' میری گلا پھاڑ کر بولی۔ ''اس کی دیکھ بھال کے لیے یہاں ڈاکٹرز ہیں، تمہارے رشتے دار ہیں اور یہ تمہاری لاڈلی بہن ہے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات
دنیا بھر میں
خدمات
اور مصنوعات
کی موثر تشہیر کے لیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
عالمی ادب سے شاہکار کہانیوں، افسانوں اور معلومات کے خزانوں کا انتخاب
جنہیں ہر براعظم کے لاکھوں قارئین ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں
جہاں جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں یہ رسائل باقاعدگی سے پہنچتے ہیں
63-C فیز ٹو ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون نمبر: 35804200, 35802552 (92-21) فیکس: 35802551 (92-21) ای میل: group@hotmail.com

"میری پلیز!" بھیا نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں یہاں موجود ہوں تو باپ کی دیکھ بھال کرنا میرا فرض ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ۔"

"تمہیں اتنی ہی فکر ہے راشد تو اپنے باپ کو کسی نرسنگ ہوم میں داخل کرادو۔ ہر مہینے اخراجات کے پیسے بھیجتے رہنا۔ میں یہاں....."

"میری!" بھیا چیخ کر بولے۔ "اپنی بکواس بند کرو اور اوپر جاؤ۔"

"تم یہاں رکنا چاہتے ہو تو ضرور رکو۔ میں آج ہی واپس جاؤں گی۔ تم بڈھے کے مرنے کا انتظار کرتے رہو۔"

"میری، اپنی زبان کو لگام دو۔ یہ برطانیہ نہیں پاکستان ہے، سمجھیں ناؤ گیٹ لاسٹ۔"

میری چیخنے لگی۔ "اس بڈھے کی خاطر تم میری انسلٹ کررہے ہو راشد۔ یہ بڈھا اب تک زندہ کیوں ہے؟"

اچانک بھیا کا ہاتھ گھوما اور زناٹے سے میری کے منہ پر پڑا۔ میری ہکا بکا سی کبھی بھیا کو دیکھ رہی تھی کبھی مجھے۔ پھر وہ جنونی انداز میں بھیا کی طرف بڑھی اور ان کا گریبان پکڑ لیا۔

"یو بلڈی انڈین..... یو بلیکی! تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا باسٹرڈ!" اس نے بھیا کی شرٹ تار تار کردی۔

بھیا نے طیش میں آکر میری کو چند تھپڑ مزید رسید کردیے۔ پھر اسے لاتوں اور گھونسوں سے مارنا شروع کردیا۔

مجھ سے برداشت نہ ہوسکا اور میں آگے بڑھ کے بھیا اور میری کے درمیان آگئی اور بھیا کے ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔

"میرے سامنے سے ہٹ جا عارفہ۔" بھیا نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ "میرے سامنے اس نے میرے باپ کو برا بھلا کہا۔"

"اسے چھوڑیں بھیا۔" میں نے کہا۔ "کسی کمزور عورت پر ہاتھ اٹھانا بہادری نہیں ہے۔"

بھیا پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے میری کو فرش سے اٹھایا اور سہارا دے کر اوپر لے جانے لگی۔

وہ مسلسل بک بک کررہی تھی۔ "میں تم سب کو جھگڑی لگوادوں گی۔ تم کالے لوگ کیا سمجھتے ہو، میں بے بس ہوں، میرا سفارت خانہ تمہاری حکومت کی ایسی کی تیسی کردے گا۔"

میری کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ اس کے گالوں پر تھپڑوں کے نشان تھے۔ اس کے چہرے کی جلد بعض جگہ سے پھٹ گئی تھی اور اس میں سے خون چھلک رہا تھا۔ میں اسے کمرے میں لے گئی اور بیڈ پر بٹھانے کے بعد ٹشو پیپر سے اس کے چہرے اور ہونٹوں سے بہتا ہوا خون صاف کرنے لگی۔

میری کو اچانک پھر غصہ آگیا۔ وہ چیخ کر بولی۔ "میں تم سب کو سلاخوں کے پیچھے بھجواؤں گی۔" وہ مجھے قہر آلود نظروں سے گھور کر بولی۔ "دفع ہوجا یہاں سے کتیا۔" اس نے بیڈ سے اٹھ کر اچانک مجھے دھکا دیا۔

میں اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی اس لیے لڑکھڑا کر کمرے سے باہر جا گری۔ میری جنون کی حالت میں کمرے سے باہر نکل آئی اور لاتوں سے مجھے مارنے لگی۔ میں سنبھل کر اٹھی تو اس نے اچانک پوری قوت سے مجھے دھکا دیا۔ میں اچھل کر زینے پر گری اور سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آگری۔ میری کمر اور سر میں زبردست چوٹ آئی تھی۔

پھر بھیا چیختے ہوئے میری کی طرف بڑھے۔ "عارفہ!"

اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر تھی۔ میرے نزدیک صائمہ اور خالہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ گھر میں عجیب طرح کا سناٹا تھا۔

میں نے نقاہت زدہ لہجے میں خالہ سے پوچھا۔ "مجھے کیا ہوا ہے خالہ؟"

"تو پھسل کر سیڑھیوں سے گر گئی تھی بیٹا۔" خالہ نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ مجھے یاد آگیا کہ میں میری کے کمرے میں تھی، پھر اس نے مجھے مارنا شروع کردیا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے دھکا دے دیا۔ میں سیڑھیوں پر گری تھی اور لڑھکتی ہوئی نیچے آگئی تھی۔ پھر بھیا میری طرف لپکے تھے اور.....اور.....

میں اچانک اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میرے سر میں شدید دھمک ہورہی تھی۔ مجھے زور کا چکر آیا اور میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"لیٹی رہو عارفہ۔" خالہ نے کہا۔

"بھیا کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"راشد اپنے کمرے میں ہے۔" خالہ نے جواب دیا۔

وہ مسلسل مجھ سے نظریں چرا رہی تھیں۔

"آپ مجھ سے کیا چھپا رہی ہیں خالہ؟" میں نے کہا۔

"تم بتاؤ صائمہ۔" میں نے صائمہ سے پوچھا۔

اس نے کچھ کہنا چاہا پھر نظریں جھکا لیں۔

میں گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر زوردار چکر

آیا۔ میں نے دیوار کا سہارا لے لیا ورنہ میں فرش پر گر جاتی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے عارفہ تم آرام کرو۔" خالہ نے کہا۔

میں نے اسے سامنے سے ایک طرف دھکیلا اور ابو کے کمرے میں پہنچی۔ ابو بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر رونے لگے۔

میں بری طرح گھبرا گئی اور بولی۔ "کیا ہوا ابو؟" ابو نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے اس مرتبہ بلند لہجے میں پوچھا۔ "بتائیے نا ابو کیا ہوا ہے۔ آپ رو کیوں رہے ہیں؟"

"عارفہ بیٹی۔" ابو نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "وہ..... راشد....."

"کیا ہوا بھیا کو؟" میں نے تڑپ کر پوچھا۔

میں اس وقت یہ بھی بھول گئی تھی کہ بھیا نے ابو کی مرضی کے بغیر شادی کر کے ہمارا دل دکھایا ہے اور یہ کہ میں ان سے کبھی بات نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ میں یہ بھی بھول گئی کہ ان کی چہیتی نے مجھے بے دردی سے مارا ہے اور سیڑھیوں سے دھکا دے کر میری جان لینے کی کوشش کی ہے۔

میں نے چیخ کر کہا۔ "بتائیے نا ابو بھیا کو کیا ہوا ہے؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔" اچانک بھیا کمرے میں داخل ہوئے۔ "ابو، میں پولیس کو اطلاع دے رہا ہوں۔"

"پولیس!" میں نے الجھ کر کہا۔ "کیا بتائیں گے آپ پولیس کو؟"

"یہی کہ میں نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا۔" بھیا نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

"کک..... کیا..... قتل....."

"ہاں بیٹا!" ابو ایک مرتبہ پھر رونے لگے۔ "رشو نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے الجھ کر پوچھا۔

"اس نے جب تجھے سیڑھیوں سے دھکا دیا تو راشد جنون کے عالم میں اوپر پہنچا اور....." ابو پھر رونے لگے۔

"ابو پلیز آپ روئیں مت ورنہ آپ کی طبیعت پھر بگڑ جائے گی۔" یہ کہہ کر میں اٹھی اور بہ وقت تمام اوپر پہنچی۔ میرے سر کی تکلیف اچانک بڑھ گئی تھی۔

کمرے میں میری غیر فطری انداز میں فرش پر پڑی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ کر فرش پر پھیل گیا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ خون بھیا نے میری وجہ سے کیا ہے۔ وہ آج بھی میری تکلیف برداشت نہیں کر سکتے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا بھیا دروازے کے درمیان ہی کھڑے تھے۔

معاً میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ بھیا کو بچانے کا فیصلہ۔ "بھیا آپ نے کیسے مارا ہے میری کو؟"

بھیا نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر کچھ سوچ کر بولے۔

"ماربل کی اس ایش ٹرے سے۔ فرش پر بھاری بھرکم ایش ٹرے پڑی تھی۔"

میں نے لپک کر وہ ایش ٹرے اٹھا لی۔ اسے اپنے دوپٹے سے اچھی طرح صاف کیا اور بولی۔ "یہ قتل آپ نے نہیں بلکہ میں نے کیا ہے۔"

"عا..... رف..... قہ!" بھیا نے رک رک کر بے چینی سے پوچھا۔ "یہ..... تو کیا..... کہہ رہی ہے..... گڑیا؟"

"میں وہی کہہ رہی ہوں جو مجھے کہنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "مجھے آپ کی زندگی بہت عزیز ہے بھیا، بس اب کچھ مت کہیے گا۔ یہ قتل میں نے کیا ہے۔ میرا اور میری کا جھگڑا ہوا۔ اس نے طیش میں آ کر مجھے مارا پیٹا، ابو کو گالیاں دیں، انہیں خوب برا بھلا کہا۔ وہ آپ کو بھی گالیاں دے رہی تھی۔ وہ مجھے بہت بے رحمی سے مار رہی تھی۔ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے ماربل کی یہ ایش ٹرے اٹھائی اور میری کے سر پر دے ماری۔ میری تیورا کر فرش پر گری تو میں خوف زدہ ہو کر کمرے سے بھاگی۔ مجھے یہ خوف تھا کہ میری مجھے دوبارہ مارنا شروع کر دے گی۔ گھبراہٹ میں سیڑھیوں پر میرا پاؤں پھسلا اور میں لڑھکتی ہوئی نیچے آ گری، پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میری ضرب سے میری مر چکی تھی۔"

"لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" بھیا جذباتی ہو گئے۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں تیری جان داؤ پر نہیں لگا سکتا۔"

"بھیا پلیز۔" میں نے کہا۔ "اب اس بات کا فیصلہ ہو چکا ہے کہ قتل میں نے کیا ہے۔" میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "آپ پولیس کو ٹیلی فون کر دیں۔"

"نہیں میں نہیں کر سکتا۔"

"بھیا آپ کو میری قسم، اپنی مری ہوئی ماں کی قسم، زیادہ بحث مت کریں اور پولیس کو بلا لیں ورنہ میں یہی ایش ٹرے اپنے سر پر مار کے اپنی جان دے دوں گی۔"

ابو اس وقت تک اپنے کمرے میں بیٹھے رہے۔ وہ اوپر آنا چاہتے تھے لیکن خالہ اور صائمہ نے بہ مشکل تمام انہیں روکا۔

ڈاکٹر نے تیز تیز چلنے اور سیڑھیاں چڑھنے سے بہت سختی کے ساتھ منع کیا تھا۔

اس وقت تک خالہ بھی اوپر آچکی تھیں۔ ابو کے پاس صائمہ تھی۔

جب انہیں میرے فیصلے کا علم ہوا تو وہ بوکھلا کر بولیں۔

"عارفہ! تو اپنی جان کیوں مشکل میں ڈال رہی ہے راشد تو....."

"خالہ آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنی جان بچالوں اور بھیا کی جان داؤ پر لگادوں؟"

بھیا اس دوران میں پتھر کے بت کی طرح ساکت اور جامد کھڑے تھے۔

"خالہ آپ ابو کو ذہنی طور پر تیار کریں ورنہ پولیس کو دیکھ کر انہیں شاک لگے گا۔"

بھیا نے پولیس کو ٹیلی فون کردیا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس آگئی اور مجھے گرفتار کرلیا گیا۔ پولیس نے آلہ قتل یعنی وہ ایش ٹرے بھی قبضے میں لے لی۔

پھر سات مہینے تک مقدمہ چلتا رہا اور کورٹ نے اس قتل کو حادثہ قرار دے کر مجھے صرف پانچ سال کی سزا سنادی۔

دوسرے ہی مہینے مجھے ابو کے انتقال کی خبر ملی۔ ابو کی موت پر مجھے ایک دن کے لیے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

میں بھیا سے لپٹ کر اس بری طرح روئی کہ وہاں موجود لوگوں کے بھی آنسو بہہ نکلے۔ بلال تو یوں بلک بلک کر رو رہا تھا کہ جیسے اس کے سگے باپ کا انتقال ہوا ہو۔ بھیا بہت ضبط سے کام لے رہے تھے۔

ایک دن وہاں گزارنے کے بعد میں دوبارہ جیل پہنچ گئی۔

جیل میں سوائے بلال کے مجھ سے ملنے کوئی نہیں آتا تھا۔ میں نے خود ہی سب لوگوں کو منع کردیا تھا۔

میں چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اس لیے مجھے قیدی عورتوں کو پڑھانے کی ذمے داری سونپی گئی۔ دوسرا سال ہی گزرا تھا کہ اچھے چال چلن کے باعث میری سزا میں چھ مہینے کی تخفیف کردی گئی۔

اس شام بلال مجھ سے ملنے آیا۔ وہ بہت اداس اور دل گرفتہ لگ رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بھیا مکان بیچ کر دوبارہ لندن چلے گئے۔

میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ جس بھائی کی خاطر میں نے اتنی بڑی قربانی دی، اپنی زندگی تباہ کرلی اس نے میری واپسی کا انتظار بھی نہ کیا۔ وہ جاتے وقت مجھ سے مل تو سکتا تھا لیکن وہ نہیں آیا۔

اس دن مجھے پھر بھیا سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ وہ خودغرض انسان میرا سائبان بننے کی بجائے میرے سر کی چھت تک بیچ گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی جیل سے نکلوں اور راشد کو ہلاک کردوں۔

ایک سال بعد نیک چال چلن کے باعث میری سزا میں پھر چھ مہینے کی تخفیف کردی گئی۔

مزید چھ مہینے گزرے تھے کہ حکومت بدل گئی۔ نئے وزیراعظم نے ان لوگوں کی سزا معاف کردی جن کی قید کی مدت دو سال یا اس سے کم تھی۔

یوں مجھے جیل سے رہائی کا پروانہ مل گیا۔

میں خالہ کے گھر پہنچی تو وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"عارفہ بیٹا تم..... لیکن تمہاری سزا تو....."

"ابھی باقی تھی۔" میں نے ان کا جملہ پورا کردیا۔ "لیکن مجھے رہائی مل گئی ہے۔" میں خالہ سے لپٹ کر رونے لگی لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔

"میری خواہش تھی کہ اب اس شخص کو جو میرا بھائی کہلاتا ہے اپنے ہاتھوں سے قتل کردوں، چاہے مجھے اس کے لیے لندن ہی کیوں نہ جانا پڑے۔"

بلال ہر قدم پر میرے ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ میں کسی نہ کسی طریقے سے راشد کو یہاں بلانے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہ یہاں نہ آیا تو پھر ہم لندن چلیں گے۔ اسے زندہ تو میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔"

میں نے ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کرلی۔ سرکاری ملازمت تو اب مجھے مل نہیں سکتی تھی۔

کچھ دن کے بعد میں نے بلال سے شادی کرلی۔ مجھے حالات کی ستم ظریفی پر ہنسی آتی تھی۔ اس بلال کی خاطر راشد نے ابا سے گستاخی کی تھی۔ وہ بلال کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ اب میں ہر وہ کام کرنا چاہتی تھی جو راشد کو ناپسند ہو۔

بلال کی شخصیت تو بالکل ہی بدل گئی تھی۔ اس نے سارے برے کام چھوڑ دیے تھے اور اب ایک مل میں ملازمت کررہا ہے۔

میں بھی ان دنیا کے جھمیلوں سے اکتا چکی ہوں اور سکون قلب کے لیے اللہ سے لو لگالی ہے۔ میں ہر دم ایک ہی دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی لڑکی کا مقدر مجھ جیسا نہ بنائے، کسی کو مجھ جیسا بے غیرت، خودغرض اور کمینہ بھائی نہ ملے۔

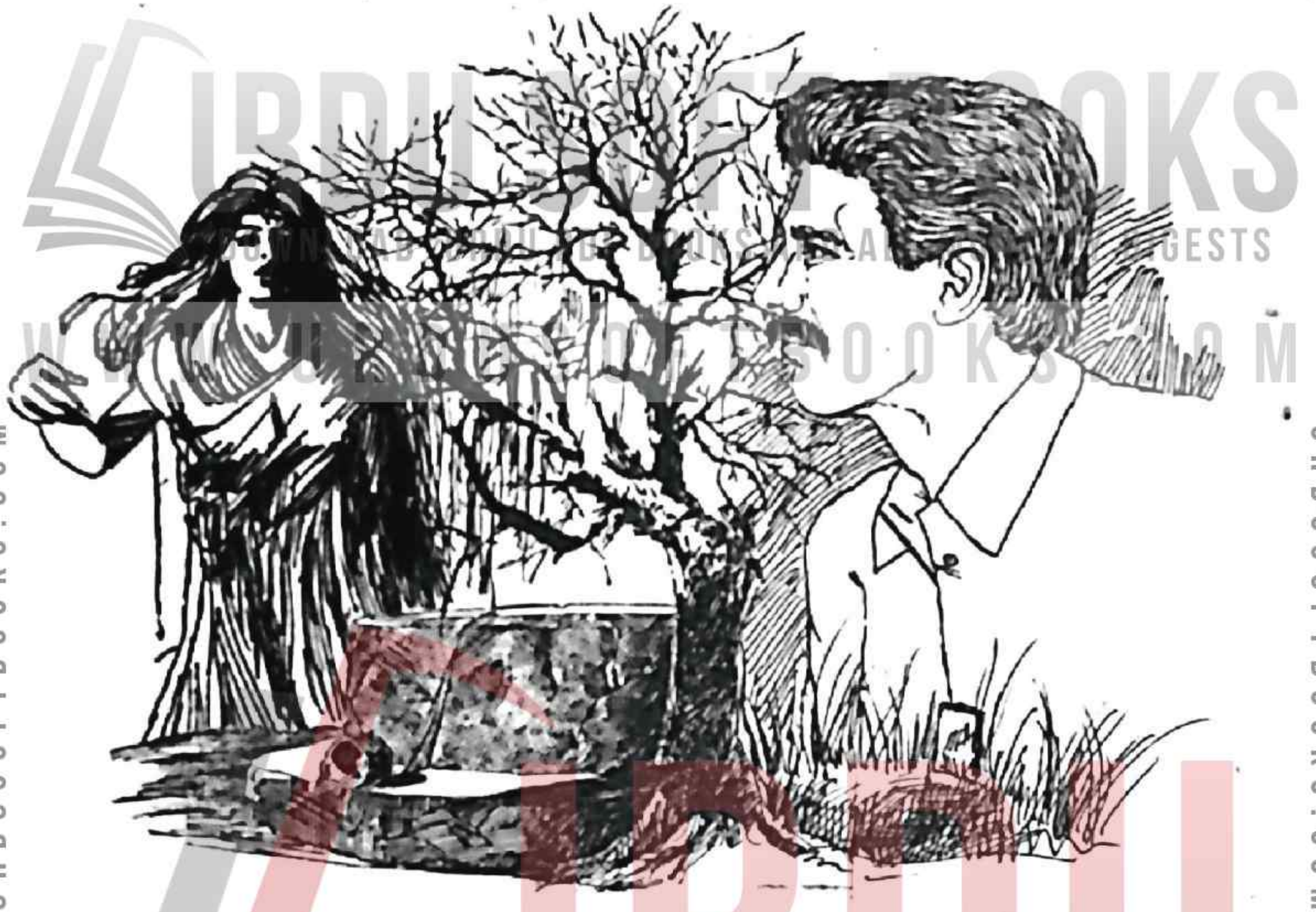

گمشدہ

محترم معراج رسول

السلام علیکم

ارسال کردہ سچ بیانی میں کہیں بھی میں نے اپنی طرف سے کچھ بھی شامل نہیں کیا ہے۔ یقین کریں یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔

اجمل

(پارا چنار، کے پی کے)

میں یہ کہانی یقین اور بے یقینی کے درمیان لکھ رہا ہوں۔

کیا کسی کے ساتھ ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ لیکن میرے ساتھ ایسا ہوا اور سب کچھ گزر جانے کے بعد بھی مجھے احساس نہیں ہوسکا کہ کیا واقعی کچھ ایسا ہی تھا۔

میں اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں۔ جہاں سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ وہیں سے ایک اور سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں نے محبتوں کا سفر کیا ہے۔ جی ہاں۔ محبت کبھی کبھی تیز رفتار سواری کی طرح ہو جاتی ہے جو اپنے ساتھ ساتھ بہائے لیے جاتی ہے۔ راستے میں طرح طرح کے مناظر آتے ہیں لیکن محبت کی گاڑی پر سوار مسافر کو یہ مناظر اپنی طرف متوجہ نہیں کر پاتے۔

میں محبت نگر کے جنگلات میں لکڑیوں کا ٹھیکیدار تھا۔ باقاعدہ لائسنس یافتہ۔ ایک بات بتا دوں، میں نے کبھی کوئی کام غیر قانونی نہیں کیا۔

ہر ٹھیکیدار کے لیے ایک خاص حد مقرر تھی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ مجھے خود جنگلات میں جا کر کام کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ ورنہ عام طور پر میرے کارندے ہی یہ کام کیا کرتے تھے۔

اچھا خاصا کام تھا۔ اچھی خاصی زندگی گزر رہی تھی۔ شہر میں اپنا ایک فلیٹ تھا۔ ایک گاڑی تھی۔ بینک بیلنس تھا۔ شادی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ میرے ساتھ میری ماں اور چھوٹا بھائی اکمل رہتے تھے۔ میرا نام اجمل ہے۔ بس ہم دو ہی بھائی ہیں۔

زندگی میں محبت نام کی ایک چیز آئی تو تھی لیکن بہت مختصر عرصے کے لیے۔ اس لیے یہاں اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ اس کہانی کی ابتدا اس دن سے ہوتی ہے جب میں اپنے کام کی نگرانی کے لیے جنگلات کی طرف گیا تھا۔

میں نے شاید یہ نہیں بتایا ہے کہ اس جنگل میں ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس بھی تھا جو ٹھیکیداروں اور جنگلات کے عہدیداروں کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔

اس ریسٹ ہاؤس میں محمد حسین نام کا ایک چوکیدار بھی تھا جس کا کوارٹر ریسٹ ہاؤس کے عقب میں بنا ہوا تھا۔ میں جب بھی جاتا محمد حسین خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا تھا۔

بارش کے دن تھے۔ میں عام طور پر ایسے موسم میں جنگل کی طرف جانے سے گریز کرتا ہوں لیکن ان دنوں کچھ ایسا کام آپڑا کہ مجھے جانا پڑ گیا تھا۔

محمد حسین کو میں نے پہلے سے اطلاع دے رکھی تھی۔ اس لیے اس نے میرے لیے میرا پسندیدہ کمرا صاف کرا دیا تھا۔ اس شام بھی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ محمد حسین نے بہت خوش دلی سے استقبال کیا تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو محمد حسین۔" میں نے پوچھا۔ میں اس کے لیے شہر سے مٹھائیاں لیتا گیا تھا۔ وہ بہت شوق سے مٹھائیاں کھاتا تھا۔ اسی لیے میں جب بھی جنگلات کی طرف جاتا اس کے لیے ضرور لے لیتا تھا۔

"ہاں صاحب، سب ٹھیک ہے۔ مہربانی آپ کی۔" میں نے مٹھائی کا ڈبا اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو، اپنا تحفہ۔"

وہ مٹھائی لے کر خوش ہو گیا تھا۔ "آپ کی بڑی مہربانی جی۔"

"یہ بتاؤ، یہاں کے حالات تو ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں ویسے تو سب ٹھیک ہیں۔ لیکن کچھ دنوں سے ایک بھیڑیا اس طرف آنے لگا ہے۔" اس نے بتایا۔

"بھیڑیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔ "لیکن محمد حسین، ان علاقوں میں تو بھیڑیے نہیں ہوتے۔"

"یہی تو حیرانی کی بات ہے صاحب، ہر دوسرے تیسرے دن میرا مطلب ہے رات کے وقت سامنے آ کر روتا رہتا ہے۔"

"کوئی نقصان تو نہیں پہنچاتا؟"

"نہیں صاحب، اس سے ابھی تک کوئی نقصان تو نہیں پہنچا ہے۔ ویسے بھی رات کے وقت ہم دروازے بند رکھتے ہیں۔"

"ریسٹ ہاؤس میں تو لوگ رکتے ہوں گے۔"

"ہاں، صاحب آپ تو جانتے ہیں، کوئی نہ کوئی آتا ہی رہتا ہے۔ لیکن کسی کو بھی اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔"

"تو پھر چھوڑو اس کو۔ بس اپنی جگہ محتاط رہو۔"

محمد حسین کے ساتھ اس کی ایک بیوہ جوان بیٹی بھی رہا کرتی تھی۔ اس کے شوہر کا کسی حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ کھانا اور ناشتا وغیرہ وہی بنایا کرتی تھی لیکن میں نے اسے آج تک نہیں دیکھا تھا۔

جنگل میں کام ہی کیا تھا۔ کام صبح سے شروع کرنا تھا۔ اسی لیے جلدی کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ رات دس بجے کے قریب بارش تیز ہو گئی۔

شہروں میں اپنے گھروں میں بیٹھ کر بارش کا لطف اٹھانے والے یہ نہیں جانتے کہ ویرانوں، جنگلوں اور پہاڑوں پر ہونے والی بارشیں کیسی ہوتی ہیں۔

برستی، گرجتی ہوئی اور لگاتار۔ دن کے وقت یہ بارش بہت خوب صورت لگتی ہے۔ لیکن رات کے وقت ایسا لگتا ہے جیسے ہزاروں روحیں مل کر چیخ رہی ہوں۔

نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے کروٹیں لیتا رہا پھر کمرے کے دروازے پر ہونے والی دستک نے چونکا دیا۔

محمد حسین کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ وہ شاید مجھے کچھ

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دینے آیا تھا یا بتانے آیا ہوگا۔ میں نے دروازہ کھول دیا۔ ایک لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔

ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ اتنی رات گئے۔ اس جنگل اور اتنی تیز بارش میں کسی اجنبی لڑکی کی آمد حیران کن ہی ہو سکتی تھی۔

وہ بھیگی ہوئی تھی۔ خوب صورت لڑکی تھی۔ بارش کے قطرے اس کے خوب صورت بالوں اور گالوں سے ہوتے ہوئے اس کے لباس پر گر رہے تھے۔ اس کے جسم پر لباس بھی مقامی تھا۔

"کون ہو تم؟" میں نے پوچھا۔

"میں بھیگی ہوئی ہوں۔" اس نے کہا۔ اس کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی۔

نہ جانے کیا معاملہ تھا اتنی رات گئے کسی اجنبی لڑکی کا کمرے میں آجانا حیرت کی بات تھی۔ ایک لمحہ ہچکچانے کے بعد میں نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔

وہ اندر آگئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ اس روشنی میں اس کا سراپا اب واضح طور پر سامنے آگیا تھا۔ احساس ہوا کہ وہ ایک دلکش لڑکی ہے۔ سفید لباس میں اس کا بھیگا ہوا جسم بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون تھی اور کیوں آئی تھی میرے پاس۔

میں نے ایک طرف رکھا ہوا تولیا اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو، اپنے آپ کو خشک کر لو۔ ورنہ بیمار پڑ جاؤ گی۔"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کہا۔ "میں تمہارے پاس ایک کام سے آئی ہوں۔"

اسی وقت ایک آواز سنائی دی۔ بین کرتی ہوئی بھیڑیے کی آواز۔ شاید یہ وہی بھیڑیا تھا جس کے بارے میں محمد حسین نے بتایا تھا۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ "صاحب، صاحب۔"

محمد حسین کی آواز سن کر وہ لڑکی چونکی ہوگی۔ "بابا آرہا ہے۔" اس نے کہا۔ "اس کو میرے بارے میں کچھ مت بتانا۔"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ کمرے سے باہر اندھیرا تھا۔ وہ اسی اندھیرے کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد محمد حسین ایک ٹارچ لیے ہوئے داخل ہوا۔

"کیا ہوا صاحب، دروازہ کیوں کھلا ہے۔ روشنی کیوں ہو رہی ہے؟"

میں نے بتانا چاہا کہ کیا ہوا تھا کہ پھر اس لڑکی کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ بابا کو مت بتانا۔ وہ یقیناً چھپ کر آئی ہوگی اسی لیے میں نے کہا۔ "بابا، بھیڑیے کی آواز آرہی تھی تو میں نے سوچا کہ دروازہ کھول کر دیکھ لوں۔"

"نہیں صاحب، ایسا کبھی مت کرنا۔ یہ جنگلی جانور ہوتے ہیں۔ ان کا کیا بھروسا ہوتا ہے۔ وہ بھیڑیا بہت دنوں کے بعد رویا ہے صاحب۔ آپ دروازہ بند کر لیں۔ میں جا رہا ہوں۔"

وہ مجھے کچھ ہدایات دے کر چلا گیا۔ بھیڑیا بھی اب نہیں رو رہا تھا۔ میں نے دروازہ بند کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ بہت دیر تک میں اس کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔

محمد حسین کی بیٹی کے ساتھ ایسی کون سی پرابلم آگئی تھی کہ وہ اس طرح رات کو اٹھ کر میرے پاس چلی آئی تھی جبکہ وہ مجھے جانتی بھی نہیں تھی۔

ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے باپ سے میرا تذکرہ سن رکھا ہو۔ اس کے علاوہ تو اس سے اور کوئی تعلق نہیں تھا۔ خیر کسی نہ کسی طرح نیند آ ہی گئی۔

صبح دروازے پر دستک سے آنکھ کھلی۔ محمد حسین میرے لیے ناشتا لے آیا تھا۔ اس کے ساتھ چائے بھی تھی۔ فارغ ہو کر میں باہر آیا۔ بارش رک گئی تھی۔ جنگل بہت نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔

پرندوں کی چہکاریں ہر طرف گونج رہی تھیں۔ ذرا سی دیر میں ساری کوفت جیسے ختم ہو گئی تھی۔ مزدور آگئے تھے۔ ان کے ساتھ دن بھر کی مصروفیت رہی تھی۔

اندھیرا ہونے کے بعد ریسٹ ہاؤس واپس آگیا۔ محمد حسین نے میرے لیے چائے کے ساتھ ساتھ پراٹھے بھی تیار کر رکھے تھے۔

ہم بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس وقت بھی یہی سوچا کہ اس کی بیٹی کے بارے میں معلوم کر لوں۔ پھر اس لڑکی کی بات یاد آگئی۔ اسی لیے کچھ نہیں پوچھ سکا۔

اس رات بھی ایسا ہی ہوا۔ اس رات بارش نہیں ہوئی تھی۔ لیکن بارہ ساڑھے بارہ بجے بھیڑیے کے رونے کی آواز نے مجھے جگا دیا تھا۔

میں نے اٹھ کر کمرے میں روشنی کم کر دی۔ بھیڑیے کی آواز نے نیند غائب کر دی تھی۔ اس رات بھی دروازے پر دستک ہونے لگی کل رات کی طرح۔

میں نے جا کر دروازہ کھول دیا۔ محمد حسین کی بیٹی دروازے پر کھڑی تھی۔ آج وہ مجھے کل سے بھی زیادہ خوب صورت دکھائی دی۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیا معاملہ تھا کہ وہ

گزشتہ دو راتوں سے میرے پاس آرہی تھی۔

''میں اندر آجاؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''دیکھو، تمہارا اس طرح آنا اچھا نہیں لگتا۔'' میں نے کہا۔

''کیوں؟''

''تم محمد حسین کی بیٹی ہو۔ وہ ایک شریف آدمی ہے۔ اسے یہ دیکھ کر دکھ ہوگا کہ اس کی بیٹی رات کے وقت کسی اجنبی کے کمرے میں ہے۔''

''تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں محمد حسین کی بیٹی ہوں؟'' وہ ایک عجیب لہجے میں بولی۔

''کیوں؟ کیا تم اس کی بیٹی نہیں ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

اس دوران وہ میری اجازت کے بغیر نہ صرف اندر آچکی تھی۔ بلکہ اس نے دروازہ بھی بند کر دیا تھا۔

''تو پھر تم کون ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک مظلوم۔'' وہ کمرے میں آکر ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ ''مظلوم ہوں میں۔ اور تم سے مدد مانگنے آئی ہوں۔''

''بتاؤ، میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''پہلے یہ بتاؤ، میں کیسی ہوں؟''

وہ کھڑی ہوگئی۔ اس وقت وہ کسی خوب صورت پینٹنگ کی طرح دل کش دکھائی دے رہی تھی۔ آج وہ پوری طرح میرے سامنے تھی۔ اپنی رعنائیوں کے ساتھ۔

''بتاؤ نا، میں کیسی ہوں؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''تم بہت خوب صورت اور دل کش ہو۔'' میں نے اس کی تعریف کی۔

''کیا میں اس لیے ہوں کہ کوئی مجھے ٹکڑے کر کے پھینک دے؟'' اس نے کہا۔ ''کوئی بہت بے رحمی سے مار دے مجھے؟''

''نہیں تو۔ تمہارے ساتھ ایسا سلوک نہیں ہونا چاہیے۔''

''تو پھر وہ لوگ مجھے کیوں مارنا چاہتے ہیں؟'' اس نے کہا۔ ''میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرنا چاہتے ہیں۔''

''تم کن لوگوں کی بات کر رہی ہو؟''

''وہی جو میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں اسی لیے تو تم سے مدد مانگ رہی ہوں۔''

''کون لوگ ہیں وہ۔ کہاں رہتے ہیں اور خود تم کون ہو؟''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ اسی منحوس بھیڑیے کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اب شاید وہ روزانہ آنے لگا تھا۔ اس آواز کو سن کر وہ سہم گئی تھی۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے اس سے۔'' اس نے کہا۔ ''میں جا رہی ہوں۔''

''ٹھہرو، کہاں جا رہی ہو۔ وہ تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''نہیں، میں دوسری طرف سے نکل جاؤں گی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ مجھ تک پہنچ نہیں سکے گا۔''

وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ محمد حسین کی بیٹی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اتنی خاموشی سے میرے کمرے میں آنا، پھر تیزی سے باہر نکل جانا، ظاہر ہے کہ وہ بھیڑیے کی نگاہوں سے بچ کر اپنے کوارٹر میں گئی ہوگی۔

شاید اسے یہ اندیشہ ہوگا کہ اس کا بابا بھیڑیے کی آواز سن کر کوارٹر سے باہر نہ نکل آئے۔ اسی لیے وہ فوراً چلی گئی تھی۔

لیکن کیوں؟ وہ یہ کھیل کیوں کھیل رہی تھی؟ اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ کچھ لوگ اسے مار دینا چاہتے ہیں۔ اس کے ٹکڑے کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر یہ کسی قسم کا مذاق تھا تو وہ پھر ایسا مذاق میرے ساتھ کیوں کر رہی تھی۔

میں نے کمرے کی لائٹ بند کی اور بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر کے بعد نیند آگئی۔ صبح دستک کی آواز سے آنکھ کھل گئی تھی۔ دروازہ کھولا تو ایک لڑکی ہاتھ میں ٹرے لیے کھڑی تھی۔

''آج بابا کچھ بیمار ہیں صاحب، اس لیے میں ناشتا لے کر آئی ہوں۔''

''لیکن تم کون ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''چوکیدار محمد حسین کی بیٹی ہوں جی۔'' اس نے بتایا۔

میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ وہ لڑکی تو ہرگز نہیں تھی جو رات کے وقت میرے پاس آیا کرتی تھی۔ وہ تو کوئی اور تھی۔

محمد حسین کی بیٹی گرچہ جوان ہی تھی لیکن وہ ایک عام سی عورت تھی۔ اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جبکہ رات کو آنے والی لڑکی ہر لحاظ سے مختلف تھی۔

خدا جانے کیا چکر تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ محمد حسین کی اور بھی بیٹیاں ہوں۔ اس نے صرف ایک بیوہ بیٹی کا ذکر کیا تھا جو اس وقت ناشتے کی ٹرے لے کر میرے سامنے کھڑی تھی۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے اس سے ٹرے لے لی۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر میں محمد حسین کے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ تاکہ اس کی خیریت دریافت کر سکوں۔

اس کو ہلکا سا بخار ہو گیا تھا اس نے پوچھا۔ ''صاحب! آپ کو ناشتا تو وقت پر مل گیا تھا نا؟''

''ہاں ہاں، وقت پر مل گیا تھا۔ محمد حسین یہ بتاؤ تمہاری کتنی بیٹیاں ہیں؟''

''صرف ایک ہے صاحب۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کو بتایا تھا نا، وہ جو بیوہ ہے۔ جو آپ کا ناشتا لے کر گئی تھی۔ لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں صاحب؟''

''یوں ہی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں، شام تک واپسی ہو گی۔''

شام کو واپس آ کر نہا کر جب فارغ ہوا تو اس وقت تک اندھیرا ہو گیا تھا۔ یہاں کرنے کے لیے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اسی لیے کھانے سے فارغ ہو کر کچھ دیر تک محمد حسین سے گپ شپ کرتا۔ اس کے بعد سو جاتا۔

رات کا کھانا محمد حسین خود ہی لے کر آیا تھا۔

''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں صاحب، اسی لیے تو آ گیا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ پھر کچھ رک کر بولا۔ ''صاحب، آپ نے یہ کیوں پوچھا تھا کہ میری کتنی بیٹیاں ہیں۔ کیا کوئی بات ہو گئی ہے صاحب؟''

''نہیں تو۔'' میں نے محمد حسین کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ ''بس یوں ہی پوچھ لیا تھا۔''

''صاحب! دو چار دنوں سے وہ بھیڑیا روزانہ آنے لگا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''پہلے بھی آتا تھا لیکن روزانہ نہیں۔ دوسرے تیسرے دن۔ لیکن اب تو روزانہ آتا ہے۔ خدا خیر کرے۔ خطرناک جانور ہے صاحب، ڈر ہی لگا رہتا ہے۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔ خیر، سوچتا ہوں اس کا کیا بندوبست کیا جائے۔''

کچھ دیر بعد وہ برتن وغیرہ لے کر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد میں بھی بستر پر لیٹ گیا تھا۔ وہ محمد حسین کی بیٹی نہیں تھی تو پھر کون تھی۔ اس جنگل میں تو آس پاس کوئی آبادی بھی نہیں پھر وہ کہاں سے آئی تھی؟ اور کیوں آئی تھی؟

اس رات وہ پھر آ گئی۔

وہ بارہ کے بعد ہی آیا کرتی تھی لیکن اس رات خلاف معمول بھیڑیے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ صرف دستک ہوئی تھی۔ وہ دروازے پر کھڑی تھی۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطے کا پتہ (فون نمبر 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون 021-35895313 فیکس 021-35802551

اسی لباس میں۔اسی پوری دل کشی کے ساتھ۔

میں نے ایک طرف ہٹ کر اندر اسے راستہ دے دیا۔ وہ کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس رات میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اس کا راز معلوم کر کے رہوں گا۔ آنکھ مچولی کے اس کھیل کو ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

''سنو، آج تم اپنے بارے میں بتاؤ گی۔'' میں نے کہا۔ ''سب کچھ۔''

''میں اسی لیے تو آئی ہوں۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''اور آج تمہیں میری مدد بھی کرنی ہے۔''

''وہی تو پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں کیسی مدد چاہیے۔''

''تم مجھے دفن کردو۔'' اس نے کہا۔

''کیا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا کہہ رہی ہو، تمہیں دفن کردوں؟''

''ہاں دفن کردو۔'' اس نے کہا۔ ''تمہیں خدا کا واسطہ۔ مجھے دفن کردو۔ مجھے کوئی دفن نہیں کرتا۔ تم ہی کردو۔ تمہاری مہربانی ہوگی۔''

''سنو، تم شاید اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر جاؤ۔''

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میرا گھر وہی قبر ہوگی جس میں تم مجھے دفن کرو گے۔''

''دیکھو، تم ایسی باتیں کرو گی تو میں ڈر کر بے ہوش ہو جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، خدا کے لیے نہیں۔'' اس نے اپنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ''پہلے بھی کچھ لوگ اسی طرح ڈر کر بھاگ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے دفن نہیں کیا۔ بہت دنوں بعد تم آئے ہو۔ اگر تم نے بھی میری بات نہیں مانی تو نہ جانے کب تک بھٹکتی رہوں گی۔''

''واہ۔'' میں ہنس پڑا۔ ''تم تو اس طرح کہہ رہی ہو جیسے تم ..... کوئی روح ہو۔ جو بھٹکتی پھر رہی ہے۔ بالکل فلموں کی طرح۔''

''ہاں، میں مر چکی ہوں اور بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ یقین نہیں آتا نا۔'' اس نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ ''لو، اسے چھو کر دیکھ لو۔''

میں نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو چھوا اور ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ اتنا ٹھنڈا کہ غیر فطری محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی ٹھنڈک کا احساس مجھے پہلے کبھی نہیں ہوا ہوگا۔

میں سن ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کیسی کہانی تھی۔ کون تھی یہ لڑکی۔ شاید لاش ہی تھی۔ زندہ انسان کا جسم اتنا غیر فطری طور پر ٹھنڈا ہو ہی نہیں سکتا۔

میں بری طرح خوف زدہ تھا۔ ریڑھ کی ہڈی تک میں خوف کی لہر نے اتر کر پورے جسم کو سن کر دیا تھا۔

''تم بھی خوف زدہ ہو گئے۔'' اس نے کہا۔ ''تم بھی میرا کام نہیں کرو گے؟ کیا مجھے کبھی سکون نہیں ملے گا؟''

بہت مشکل سے میں نے اپنے اوسان کو قابو میں کیا۔ وہ چاہے جو بھی ہو، اس نے اب تک مجھے نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ بلکہ مجھ سے مدد کی درخواست کر رہی تھی۔

''بتاؤ، میں کس طرح تمہیں دفن کر سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس وقت میری آواز کانپ رہی تھی۔

اسی جنگل میں ایک پرانا کنواں ہے۔ صدیوں پرانا۔ اس کے پاس برگد کا ایک بہت بڑا درخت ہے۔ میری لاش اسی درخت کے پاس پڑی ہوئی ہے۔ اس کو دفن کردو۔ بس میں تم سے یہی چاہتی ہوں۔''

مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ ''دیکھو، اگر تم واقعی مر چکی ہو۔ ایک بھٹکتی ہوئی روح ہو تو پھر یہاں کے چوکیدار کو بابا کیوں کہا تھا؟''

''اس لیے کہ میں یہاں مدد مانگنے کئی بار آ چکی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''پہچانتی ہوں اس کو۔''

''لیکن تمہارا نام کیا ہے؟''

''اب تو کوئی نام نہیں ہے، جب زندہ تھی اس وقت صفیہ کہلاتی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''اب بتاؤ، کیا میرا کام کرو گے؟''

''کیا میں کسی اور کی بھی مدد لے سکتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''یا یہ کام مجھے اکیلے کرنا پڑے گا؟''

''تم جس کی بھی مدد لے سکتے ہو لے لینا۔ مجھے تو بس سکون چاہیے۔ بہت بے حرمتی ہو رہی ہے میری لاش کی۔ جنگلی جانور اسے نوچتے رہتے ہیں۔ حالانکہ اب کچھ بھی نہیں بچا، پھر بھی۔''

''ٹھیک ہے، میں تمہارا یہ کام کردوں گا۔'' میں نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

''پھر مجھے سکون مل جائے گا، اب میں چلتی ہوں۔''

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلی اور اندھیرے میں کہیں غائب ہو گئی۔ پتا نہیں میں کوئی خواب

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

دیکھ رہا تھا یا یہ سب کچھ حقیقت تھی۔

کبھی کبھی حقیقت اور واہمے کی سرحدیں ایک دوسرے کے اتنی قریب آجاتی ہیں کہ کچھ بھی پتا نہیں چلتا۔ اس رات جو کچھ اس لڑکی نے بتایا تھا اگر وہ سچ تھا تو پھر واقعی بہت حیرت انگیز تھا۔

ظاہر ہے اس رات بہت دیر تک مجھے نیند نہیں آسکی تھی۔

دوسری صبح محمد حسین ہی میرے لیے ناشتا لے کر آیا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے محمد حسین سے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ، کیا اس جنگل میں کوئی پرانا کنواں بھی ہے؟''

''ہاں صاحب، وہ جدھر جھاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کی دوسری طرف ایک میدان ہے۔ وہ کنواں اس میدان میں ہے لیکن اس طرف کوئی جاتا نہیں ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''صاحب کہتے ہیں کہ اس طرف ایک روح بھٹکتی رہتی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت سے لوگوں نے دیکھا ہے اس کو۔''

''کس کی روح؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا بتاؤں صاحب، بہت پرانی کہانی ہے۔ کچھ لوگوں نے ایک لڑکی کا خون کر کے اس کی لاش کنویں میں پھینک دی تھی۔ بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ شاید اس وقت میں بچہ تھا۔''

''کیا نام تھا اس بے چاری کا؟'' میں نے پوچھا۔

''صفیہ نام تھا صاحب، میں نے اپنے بچپن ہی سے یہ کہانی سن رکھی ہے۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔''

میں الجھی ہوئی نگاہوں سے محمد حسین کی طرف دیکھتا رہا۔ صفیہ، یہی نام اس لڑکی نے بھی بتایا تھا۔ میرے خدا، یہ سب کیسا بھید تھا۔ کیا وہ واقعی اپنی قبر کے لیے بھٹکتی پھر رہی تھی۔

''بات کیا ہے صاحب، آپ اس کے لیے کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''محمد حسین، میں جو کچھ کہوں کیا تمہیں اس پر یقین آجائے گا؟''

''کیوں نہیں آئے گا صاحب۔''

''محمد حسین، اس لڑکی کی روح میرے پاس آتی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''کیا؟'' محمد حسین کا تو رنگ ہی اڑ گیا تھا۔ ''یہ آپ کیا

سچ کی تلاش

حبیب اللہ کلکانی کابل کے نزدیک ''شمالی'' کے رہنے والے تھے۔ وہ تاجک برادری سے تعلق رکھنے والے اور اپنے علاقے کی بااثر شخصیت تھے۔ اس وقت (1929ء) میں افغانستان پر امان اللہ کی بادشاہت تھی۔ امان اللہ مغربی ثقافت سے بہت متاثر تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب ترکی میں اتاترک مغربی اصلاحات و ثقافت نافذ کر چکے تھے۔ امان اللہ نے بھی انہیں نافذ کرنا چاہا۔ ترک عوام نے چار و ناچار حکومتی اقدام قبول کر لیے لیکن افغان عوام اپنی اسلامی اقدار کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ کابل میں افغانی ردِعمل کی لہر اٹھی اور آناً فاناً تمام ملک اس کی لپیٹ میں آگیا۔ امان اللہ کی فوج کا ایک بڑا حصہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ جلد ہی یہ طوفان ''شمالی'' تک پہنچ گیا۔ افغانی ہمیشہ سے قبائل اور گروہوں کی صورت میں رہے اور اپنے سردار یا جرگہ کا فیصلہ مانتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اب تک برقرار ہے۔ شمالی میں حبیب کلکانی اپنے قبیلے کا ایک مضبوط اور بہادر سردار تھا۔ تمام متحارب گروپ اپنے سرداروں کی سرکردگی میں بادشاہ امان اللہ کے خلاف متحد ہو گئے۔ جب حالات قابو سے باہر ہونے لگے تو امان اللہ اپنا تخت اپنے بھائی عنایت اللہ کے سپرد کر کے کابل سے فرار ہو گیا۔ کچھ روایات کے مطابق ان متحارب گروہوں کے سرداروں کی طرف سے نئے بادشاہ عنایت اللہ کو خط بھیجا گیا کہ یا تو وہ امان اللہ کی نافذ کردہ نام نہاد اصلاحات واپس لے لے یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ خط کے جواب میں تخت ہی سے دست بردار ہو گیا۔ ان متحارب گروپوں میں سب سے مضبوط سردار حبیب اللہ تھے لہٰذا متفقہ طور پر انہیں حکومت کے لیے منتخب کیا گیا۔ حبیب اللہ بادشاہت کے نظام کے خلاف تھا اس لیے اس نے خادم دین رسول اللہ غازی حبیب اللہ کہلوانا پسند کیا۔ بعد ازاں نادر شاہ نے طاقت اکٹھی کر کے حبیب اللہ اور ان کے ساتھیوں سے حکومت چھین لی۔ ان پر بغاوت اور لوٹ مار کے الزامات لگا کر پھانسی دے دی اور تمام ساتھیوں سمیت ایک گڑھے میں پھینکوا دیا۔

مرسلہ: طیب اللہ۔ پشاور

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

کہہ رہے ہیں صاحب؟"

پھر میں نے محمد حسین کو ساری کہانی سنادی۔ وہ بے چارہ بہت دیر تک اپنے کانوں کو ہاتھ لگا کر اللہ، اللہ کرتا رہا تھا۔

"محمد حسین، اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس کی باقیات کنویں کے پاس ایک درخت کے نیچے بکھری ہوئی ہیں۔ وہ ایک مسلمان اور مظلوم لڑکی تھی محمد حسین۔ اس کی روح بے چین ہو رہی ہے۔ اس نے ہم سے مدد مانگی ہے۔ اب یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس کو اس کی قبر دے دیں۔ یہ ثواب کا کام ہوگا۔"

"ہاں صاحب یہ واقعی ثواب کا کام ہوگا۔ اللہ اس کی مغفرت کرے اور اس کی روح کو سکون مل جائے۔ ہم چلیں گے صاحب۔ میں گیتی اور پھاوڑا بھی لے لوں گا۔"

"لیکن اپنی بیٹی کو کچھ مت بتانا۔ وہ ڈر جائے گی۔"

"ہاں، صاحب، اس کو نہیں بتاؤں گا۔ اچھا ہے صاحب یہ نیکی کا کام جتنی جلدی ہو جائے۔ آپ تیار ہو جائیں صاحب، میں ابھی آتا ہوں۔"

محمد حسین پندرہ منٹ ہی میں واپس آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ قبر کھودنے کے لیے گیتی اور کدال وغیرہ بھی لیتا آیا تھا۔

میں نے وہ دن اس لڑکی کی بے چین روح کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آج مجھے اپنے کام پر نہیں جانا تھا۔ راستہ واقعی بہت دشوار تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے بھرا ہوا۔ محمد حسین نے بیلچہ لے رکھا تھا جبکہ کدال میرے پاس تھا۔ ہم ان ہی دو اوزاروں سے جھاڑیاں صاف کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔

پھر ایک ایسی جگہ آ گئے جہاں وہ پرانا کنواں موجود تھا۔ وہ تو نجانے کب کا خشک ہو چکا ہوگا۔ اس کے آس پاس بھی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور دیگر پودے تھے۔

بہت ہی پر ہول مقام تھا۔ جیسے ہم بھوتوں کی نگری میں آ نکلے ہوں۔ اس دور کے کسی پڑھنے والے کو یہ سب بہت عجیب لگ رہا ہو کہ میں کن چکروں میں پڑ گیا تھا۔ آج کل ایسی باتیں کہاں ہوتی ہیں۔ لیکن آج کل بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سوں کو ان واقعات کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔

جس درخت کی نشاندہی اس لڑکی کی روح نے کی تھی، وہ اس کنویں سے ذرا فاصلے پر تھا۔

برگد کا ایک پرانا اور عظیم الشان درخت جس کی مہیب داڑھیاں نیچے کی طرف لٹک آئی تھیں اور اس درخت کے آس پاس کچھ چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

سونے کی دو عدد چوڑیاں تھیں۔ اس لباس کے ٹکڑے تھے جن کو اس نے کبھی پہن رکھا ہوگا۔ ایک ڈھانچا تھا۔ جس کے بازو اور پیروں کی ہڈیاں شاید جنگلی جانور چبا گئے تھے۔

محمد حسین نے بلند آواز میں کلمے کا ورد شروع کر دیا۔ عبرت کا مقام تھا۔ انسان بھی کیا ہوتا ہے۔ جب وہ زندہ ہوگی تو کتنی امنگوں سے بھری ہوئی ہوگی۔ کیسی کیسی خوب صورت خواہشات اس کے ساتھ ہوں گی۔ لیکن اب وہ کہانی کچھ بھی نہیں۔

اس کا کاسۂ سر چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔ "میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا۔"

ہم نے جلدی جلدی اپنا کام شروع کر دیا۔ پہلی بار ایسا معاملہ درپیش ہوا تھا۔ پہلی بار کسی کی قبر کھودنی پڑ رہی تھی۔ اور وہ بھی اس کی جس کو اس دنیا سے گزرے برسوں ہو چکے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی۔

مٹی زیادہ سخت نہیں تھی۔ اسی لیے ہم نے ایک گھنٹے میں ایک قبر کھود لی تھی۔ محمد حسین کام کے دوران کلمے کا ورد کیے جا رہا تھا۔

قبر مکمل ہو گئی تو ہم نے اس کی باقیات مع چوڑیوں کے اس قبر میں ڈال کر اس کو پتھروں سے اور مٹی سے بھر دیا۔

نشانی کیا ہونی تھی۔ وہ بے چاری تو بے نشان ہو گئی تھی۔ ہم بہت دیر تک وہاں کھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کرتے رہے۔ اس کی روح کے سکون کے لیے دعائیں مانگتے رہے، پھر واپس چلے آئے۔

وہ رات بہت بے چینی کی تھی۔ ایک خدشہ لگا ہوا تھا کہ شاید وہ آ جائے۔ شاید آ جائے۔ لیکن وہ نہیں آئی۔ میں مزید چار دن اسی ریسٹ ہاؤس میں رہا تھا۔ لیکن وہ دوبارہ نہیں آئی۔ شاید اس کی روح کو سکون مل چکا تھا۔ وہ اپنی منزل تک پہنچ چکی تھی۔

کئی برس گزر گئے۔ لیکن یہ سب کچھ یاد ہے مجھے۔ اور میں یہ کہانی لکھتے ہوئے سوچ رہا ہوں کہ اس زندگی میں بھی کیسے کیسے بھید ہوا کرتے ہیں۔

میرا تو اب اس طرف جانا نہیں ہوتا۔ محمد حسین کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ لیکن اگر آپ میں سے کوئی اس طرف جا نکلے اور پرانے کنویں کے پاس برگد کے سائے تلے اسے کوئی قبر دکھائی دے جائے تو ایک بار وہ فاتحہ ضرور پڑھ لے۔

خدا ہم سب کو ایسی آزمائشوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU SOFT BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ایک موقع

جناب مدیر اعلیٰ

آداب عرض

میں سرگزشت بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ پڑھتے ہوئے ہی مجھے یہ خیال آیا کہ مجھے بھی لکھنا چاہیے۔ اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا تو اسے میں نے لکھ لیا اگر آپ کو پسند آجائے تو اسے بھی شاملِ اشاعت کرلیں۔

محمد محسن

(لاہور)

متین نے مجھ سے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ”محسن .. ہمیں پانچ سو روپے کی اشد ضرورت ہے۔“

”ہمیں؟..... یعنی تمہیں؟“ میں نے تصحیح کی۔

متین نے خفگی سے مجھے دیکھا۔ ”یہ دوستی میں میرا تیرا کہاں سے آگیا۔ یاد کرو ہم نے کیا طے کیا تھا۔ ہماری ہر چیز مشترک ہوگی۔“

مجھے یاد تھا جب میں نے ذرا ہوش سنبھالا تو متین کو یہ کام کیے کئی سال ہوگئے تھے۔ محلے والوں اور خاندان والوں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کی متین کے بارے میں مشترکہ رائے تھی کہ انہوں نے اتنا ہوشیار بچہ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اس کی ہوشیاری کا ایک ثبوت یہ بھی تھا کہ اس نے دوستی کے لیے مجھے منتخب کیا جس کے بارے میں محلے اور خاندان والوں کی مشترکہ رائے تھی کہ انہوں نے مجھ سا سادہ بچہ نہیں دیکھا۔ جب میں دوسری کلاس میں تھا تو ہماری ہائی جین کی ٹیچر نے ہمیں پڑھاتے ہوئے کہا۔ ”بعض بیماریاں موروثی ہوتی ہیں کیونکہ ان بیماریوں کے جین ہمارے اندر ہوتے ہیں۔ جیسے شوگر اور دل کے امراض۔ کچھ بیماریاں بچپن میں لاحق ہو جاتی ہیں جیسے پولیو اور چھوٹوں کا دائرس۔“

تو مجھے جو بیماری بچپن میں لاحق ہو گئی تھی اس کا نام متین تھا۔ نام سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی بھاری بھرکم آدمی ہو جس کی دونوں طرف لٹکتی ہوئی لمبی مونچھیں ہوں۔ لیکن حقیقت میں متین دبلا سا اور کسی قدر لمبا لڑکا تھا جو صرف تیرہ سال کا تھا لیکن اس کے سر میں بڑے آدمیوں کی سی چالاکی بھری ہوئی تھی اور یہ چالاکی ابلنے کو بے تاب رہا کرتی تھی اس لیے ہمہ وقت کسی نہ کسی فکر میں رہا کرتا تھا۔ میں اس سے صرف ایک سال چھوٹا تھا لیکن چالاکی کے معاملے میں خاصا چھوٹا تھا۔ اس کا مطلب یہ نہ لیا جائے کہ میں کوئی احمق لڑکا تھا۔ اس کے برعکس میں اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں سے ہوشیار تھا۔ ہاں متین کے سامنے طفل مکتب تھا۔

متین مجھ سے ایک سال بڑا تھا لیکن اسکول میں وہ مجھ سے دو درجے آگے تھا اور وہ آٹھویں کلاس میں پہنچ گیا تھا جب کہ میں ابھی چھٹی کلاس میں تھا۔ وہ پڑھنے میں بہت تیز تھا اور اس وجہ سے اساتذہ کا منظور نظر تھا۔ میں اوسط درجے کا طالب علم تھا جو مشکل سے کسی کی نظر میں آتا ہے۔ یہی حال بچوں میں مقبولیت کا تھا۔ متین کی چالاکیوں کی وجہ سے اسے اسکول کے سارے بچے اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ وہ کبھی نہ کبھی اس کی چالاکی کا نشانہ بن چکے تھے۔ جب کہ مجھے بیس فی صد بچے بھی نہیں جانتے تھے اور بیس فی صد بھی اس لیے جانتے تھے کہ میں متین کا دوست مشہور تھا۔

متین ہمارے گھر کی پیچھے والی گلی میں رہتا تھا لیکن اس کے مکان کی پشت ہمارے مکان کی پشت سے ملی ہوئی تھی اس لیے ہم آسانی سے ایک دوسرے سے مل سکتے تھے بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ دوستی کے بعد میں ہمہ وقت متین کو دستیاب رہتا تھا اسے صرف بیک یارڈ میں آ کر مجھے پکارنا پڑتا تھا۔ متین میں ایک خوبی اور تھی۔ اسے اپنے امیج کی بہت فکر رہا کرتی تھی۔ اس کی ذات پر کسی وجہ سے حرف آئے یہ اسے کسی صورت گوارا نہیں تھا چاہے اس کے لیے اسے کوئی بھی قربانی کیوں نہ دینی پڑے اور عام طور سے یہ قربانی میری صورت میں ہوتی تھی۔

جب متین نے مجھے دوستی کے لیے منتخب کیا تو اس نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ ہمارا نفع نقصان مشترک ہو گا۔ اس نے وضاحت کی۔ ”آدمی کو دوستی میں نفع نقصان نہیں دیکھنا چاہیے صرف دوست کو دیکھنا چاہیے۔“

اس کی بات عملی طور پر یوں درست ثابت ہوئی تھی کہ اسے کبھی نقصان کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا اور جیسے مجھے اس کی دوستی میں نفع کم نصیب ہوا تھا۔ بہرحال بعض بیماریوں کی طرح دوستی بھی ایک ہمیشہ رہنے والی چیز ہے چاہے آپ اسے ناپسند ہی کیوں نہ کرتے ہوں۔ جیسے لوگ تلخ کافی کے عادی ہو جاتے ہیں یا شرابی ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں یہ ان کو نقصان کرتی ہے۔

میں اور متین متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا باپ کار پینٹر تھا اور میرا باپ ایک کارخانے میں مشین مین تھا۔ ہماری مائیں گھریلو عورتیں تھیں۔ میری دو چھوٹی بہنیں اور ایک بڑا بھائی تھا۔ متین کا ایک چھوٹا بھائی اور دو بڑی بہنیں تھیں۔ ہم متوسط سے علاقے میں رہتے تھے جہاں بچوں کے لیے کھیل کے میدان کم تھے اس لیے ہم اپنے گھروں کے سامنے بڑی سڑکوں پر کھیلتے تھے۔ البتہ جیسے ہی کوئی پولیس کار نظر آتی ہم سڑک سے ہٹ کر فٹ پاتھ یا گھر کے لان میں آ جاتے۔ سڑک پر کھیلنا جرم تھا اور پولیس ان بچوں کے ماں باپ کو پکڑ کر لے جاتی تھی جو سڑکوں پر کھیلتے تھے۔ ہم صبح اسکول جاتے، دوپہر تک واپس آتے، کھانا کھاتے اور ہوم ورک کر کے کھیلنے کے لیے باہر نکل جاتے اس وقت ہماری مائیں صبح سے کام کر کے تھکنے کے بعد اپنے بیڈ رومز میں بے خبر سو رہی ہوتی تھیں اور بہن بھائی اپنے مشاغل میں مصروف ہوتے تھے اس لیے ہمیں روکنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

مجھے اور متین دونوں کو روزانہ ایک روپیا جیب خرچ ملتا تھا جو دو سال پہلے تک ہمارے لیے کافی ہوتا تھا لیکن اس کے بعد بالکل ناکافی ہو گیا تھا اس لیے ہم نے اپنے اپنے گھروں میں گزارش کی کہ ہمارے جیب خرچ میں اضافہ کیا جائے لیکن یہ درخواست بعض دلائل کے ساتھ رد کر دی گئی۔ اول تو ایک روپیا بالکل کافی ہوتا ہے۔ دوسرے اگر ہمارے جیب خرچ میں اضافہ کیا گیا تو دوسرے بہن بھائیوں کے جیب خرچ میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

اضافہ کرنا پڑے گا یوں ڈیڈی پر روزانہ کم سے کم چار روپے کا اضافی خرچ پڑ جائے گا جو مہینے میں ایک سو بیس روپے بنتا ہے اور یہ خاصی موٹی رقم ہوتی ہے۔ تیسرے ہم دونوں دس سال سے اوپر ہو چکے تھے اس لیے ہمیں اضافی اخراجات پورے کرنے کے لیے خود بھی کچھ ہاتھ پاؤں ہلانے چاہییں۔

درخواست کی نامنظوری کے بعد ہم باہر ملے تو ہم نے متبادلہ خیال کیا تھا کہ اضافی اخراجات کس طرح پورے کیے جائیں۔ یہ بتانا تو میں بھول گیا کہ ہم اپنا جیب خرچ ملا کر خرچ کرتے تھے۔ یعنی اس سے کوئی ایک ہی چیز لیتے تھے اور اسے آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ جیسی میکس چاکلیٹ ایک روپے میں نہیں آتی تھی۔ جو مجھے خاص پسند نہیں ہے لیکن متین کو بہت پسند ہے اس لیے ہم یہ چاکلیٹ لیتے ہیں اور بچ جانے والے پیسوں سے میری پسند کی کوئی چیز لی جاتی ہے۔ اب اتنے کم پیسوں میں بھلا کیا آتا ہے؟ اس لیے مجبوراً مجھے پاپ کورن یا معمولی چیزوں پر گزارا کرنا پڑتا تھا۔ ہاں چاکلیٹ میں سے مجھے تیس فی صد مل جاتا تھا۔

اس طرح متین کو چیز برگر اور کولڈ ڈرنک پسند تھی لیکن یہ دونوں چیزیں مہنگی آتی تھیں۔ اسکول میں یہی چیز اچھی ملتی تھی۔ مجھے چیز برگر پسند نہیں ہے البتہ مجھے کولڈ ڈرنک اچھی لگتی ہے۔ یوں مجھے برگر کا کچھ حصہ ملتا تھا لیکن کولڈ ڈرنک میں آدھی مجھے متین کو دینا پڑتی تھی۔ اس وقت اسے مساوات کا اصول یاد آجاتا تھا۔ ان دو مثالوں سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ متین ہماری دوستی کو کس طرح اپنے حق میں استعمال کرتا تھا۔ بہرحال مجھے اس سے اتفاق کرنا پڑا تھا کہ ایک روپے روزانہ میں اب ہمارا گزارا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ہمیں مزید رقم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

خاصے غور و فکر کے بعد بھی ہمارے ذہن میں کوئی ایسی ترکیب نہیں آئی جس سے اضافی آمدنی بنا کسی محنت کے حاصل کی جائے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ہم دونوں ہی اعلیٰ درجے کے کام چور تھے۔ ورنہ ایسی مثالیں موجود تھیں کہ ہماری عمر کے لڑکے گھروں میں اخبار ڈال کر روزانہ پندرہ بیس روپے کما لیا کرتے تھے۔ لیکن ہمارے معمولات میں جز وقتی ملازمت کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اخبار ڈالنے کے لیے ہمیں روز صبح پانچ بجے اٹھ کر جانا ہوتا اور اس کے بعد اسکول بھی جانا ہوتا۔ جب کہ ہم دونوں ہی رات دیر سے سونے والے تھے۔ اتنی صبح اٹھنا ہمارے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ پھر اسکول سے آکر ہم آرام کرتے تھے۔ ہوم ورک کرتے تھے اور شام کو کھیلنے جاتے تھے۔ یہ کام بھی لازمی تھا۔ اگر کہیں جز وقتی ملازمت کر لیتے تو ہمارا کھیل کا وقت ختم ہو جاتا۔ سورج غروب ہونے کے بعد ہمیں گھر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے اس لیے ہم زیادہ سے زیادہ بیک یارڈ میں مل سکتے ہیں۔ اور یہاں ہمارے لیے سوائے باتیں کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے اپنی مرضی سے گزارنے کے لیے ہمارے پاس شام کے یہی اوقات ہوتے تھے اور ہم ان کی قربانی دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ فیصلہ ان چند فیصلوں میں سے تھا جو میں نے اور متین نے مل کر کیے ورنہ عام طور سے فیصلہ سازی متین کا کام تھا اور مجھے صرف اس کے کیے فیصلے پر عمل کرنا ہوتا تھا۔

اس لیے اضافی آمدنی حاصل کرنے کا مسئلہ بدستور موجود رہا تھا۔ آخر ہم نے چند چھوٹے موٹے کاموں سے اضافی آمدنی حاصل کرنا شروع کی۔ یہ ایسے کام تھے جو ہمیں ہفتے میں ایک دو بار کرنے پڑتے تھے اور ان سے ہماری سرگرمیوں پر اثر نہیں پڑتا تھا۔ جیسے سامنے والے علاقے میں جا کر کسی کے باغ کی صفائی کر دینا یا کسی کی گاڑی دھونا۔ یہ ایسے کام تھے جو مستقل نہیں کرنا پڑتے تھے اور ان سے ہمیں ہفتے میں دس پندرہ روپے اضافی مل جاتے تھے۔ ویسے ہمارے اخراجات صحت مندانہ تھے یعنی ہمیں نوعمر لڑکوں کی طرح سگریٹ پان، گٹکا استعمال کرنے کا شوق نہیں تھا۔ ایک بار متین نے سگریٹ کا تجربہ کیا تھا اور ایک کش لینے کے بعد اس کی جو حالت ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کر لیا کہ ہم کبھی سگریٹ استعمال نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے اس میں میں بھی شامل تھا۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں کوئی بری علت نہیں تھی۔ ہمارے زیادہ تر اخراجات کھانے پینے سے متعلق ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمیں ٹرین میں سفر کا شوق تھا۔ کیونکہ کسی بھی اسٹیشن پر اترتے وقت ہم وہاں سے ایسی بہت ساری چیزیں جمع کر لیتے تھے جو پہلے سفر کرنے والے مسافر چھوڑ کر جا چکے ہوتے تھے۔ ان میں اخبارات، رسالے، کتابیں، چپس کے کچھ کھائے پیکٹ اور اسی طرح کی چیزیں ہوتی تھیں۔

کچھ دن پہلے ہمیں ایک قیمتی چھتری ملی تھی اس کا مالک یقیناً اسے ٹرین میں بھول گیا تھا۔ آبنوس سے بنی یہ چھتری خاصی قیمتی تھی اور ہم چاہتے تو کسی کو آسانی سے اسے بیس پچیس روپے میں بیچ سکتے تھے۔

عجیب بات تھی ہم نے آج تک کبھی کوئی چیز بے ایمانی

نے کہا۔ ''اب تم ایسا کرو کہ اس سلسلے کو ٹوٹنے نہ دو۔ لوہا گرم ہے ایک چوٹ اور مارو۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی مطلب یہ کہ کوئی تنقیدی مضمون اور لکھو اور نیاز صاحب کی خدمت میں ارسال کر دو۔''

''تمہیں معلوم ہے میں تنقید کا آدمی نہیں۔''

''تم ثابت کر چکے ہو کہ تم ہو۔ نیاز جیسے بزرگ تمہیں تسلیم کر چکے ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہیں بھول جائیں ایک مضمون اور لکھو۔''

''سوچ رہا ہوں اب کیا لکھوں۔''

''آتش کی شاعری کے اور پہلو بھی ہوں گے۔ ایک ایک کر کے اٹھاتے جاؤ اور لکھتے جاؤ۔ ایک ہی شخصیت پر چند مضامین جمع ہو جائیں گے تو باقاعدہ کتاب بھی بن سکتی ہے اور تم ماہر خواجہ حیدر علی آتش کہلا سکتے ہو۔''

خلیل نے اس وقت اس مشورے کو مذاق ہی سمجھا ہو گا لیکن ہاسٹل کے کمرے میں آ کر وہ آتش کی شاعری کا جائزہ لینے لگا۔ کئی دن تک وہ نشان زدہ اشعار کا جائزہ لیتا رہا اور چھوٹے چھوٹے نوٹس لیتا رہا اور پھر مضمون لکھنے بیٹھ گیا جب مضمون مکمل ہو گیا تو اس نے مضمون کی پیشانی پر سرخی جما دی۔ ''آتش کے بنیادی تصورات۔''

اس کا یہ مضمون نیاز فتح پوری کے اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا۔

''اس حقیقت کا اظہار کرنا ہی پڑے گا کہ جناب اعظمی جس وقت نگاہ وا۔ معانِ نظر سے کام لے رہے ہیں وہ آتش کے باب میں اس وقت تک کسی صاحب قلم کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی تھی اور ان کا یہ جوش حد درجہ لائق تحسین و ستائش ہے۔''

اس مضمون کی اشاعت کے بعد اور تعریفی پس منظر کے ساتھ اسے یقین ہو گیا کہ وہ تنقیدی ذہن رکھتا ہے اور اس نے اس سلسلے کو آگے بڑھایا۔

آتش سے متعلق اس نے کئی مضامین تواتر کے ساتھ سلسلہ وار شائع کرائے۔

آتش کے کلام کا نفسیاتی پس منظر
آتش کی عشقیہ شاعری
آتش کا فن
آتش کا تصوف

اس کے سلسلہ وار مضامین کی اشاعت ہوئی تو کئی بزرگ نقادوں نے اس کی کاوش کو سراہا۔ فراق گورکھپوری نے خلیل کو ایک خط بھی لکھا۔

''پچھلے دس سال میں آتش کے بارے میں جو کچھ سوچ رہا تھا۔ ان خیالات کو آپ کے مضمون میں پا کر عجیب و غریب مسرت ہوئی۔''

آتش پر اس کے مضامین جب ایک کے بعد ایک شائع ہونے لگے تو بابائے اردو مولوی عبدالحق، مولانا سلیمان ندوی، اثر لکھنوی جیسے بزرگوں نے اس کی تعریف میں خطوط لکھے اور اسے داد دی۔ خود نیاز فتح پوری نے رشید احمد صدیقی کو لکھا کہ علی گڑھ کے یہ کون صاحب ہیں جن کے مضامین آتش پر ہیں۔

اس خط کے ملتے ہی رشید احمد صدیقی کو اس کی جستجو ہوئی اور یہ جان کر اسے بڑا تعجب ہوا کہ یہ وہی طالب علم ہے جو ڈیوٹی سوسائٹی سے قرض لینے کے لیے انہیں گھیرتا ہے۔ پھر تو وہ ایسے مہربان ہوئے کہ اپنے گھر کے دروازے اس پر کھول دیے اور صاف کہہ دیا کہ تم ہر وقت میرے گھر آ سکتے ہو بس اپنا نام بتا دیا کرو میں فوراً تمہیں بلا لوں گا۔

اس نے اپنے مضامین کو نظر ثانی کے بعد اشاعت کے لیے پیش کر دیا مگر اس کی اشاعت 1959ء میں ممکن ہو سکی۔ یہ کتاب (مقدمہ کلام آتش) انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ نے شائع کی۔

مقدمہ کلام آتش کے پہلے باب میں آتش کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے تھے اور مختلف ماخذ کی مدد سے ان کی زندگی ابھارنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے آتش کی زندگی کو اس کی تمام جزئیات سمیت پیش نہیں کیا بلکہ آتش کی زندگی کی صرف ان جزئیات کو مدِ نظر رکھا جو اس کے کلام کے مطالعے میں اہمیت رکھتی تھی۔

''آتش کا فن'' کے عنوان سے تینوں ابواب میں اس نے آتش کی شاعری کو ترقی پسند اقدار اور نئی اقدار کے حوالے سے جانچنے کی کوشش کی۔

اس کتاب کا پیش لفظ آل احمد سرور نے تحریر کیا۔

''یہ مقالہ حرف آخر کی اہمیت نہیں رکھتا مگر آتش کے فکر و فن کی خصوصیات کو پرکھنے کی پہلی بڑی کوشش ہے۔''

ان مضامین کی پذیرائی نے اسے تنقید نگاری کی طرف راغب کیا اور وہ آتش کی شاعری سے نکل کر دوسرے شعرا کی طرف متوجہ ہوا۔

اس نے فراق کی کتاب ''اندازے'' پڑھی تو قدیم

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

English®

CLEANS AND PURIFIES SKIN, NATURALLY

IN SUMMERS, RELIEFS FROM PRICKLY HEAT
IN WINTERS, PREVENTS DRYNESS.

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
SnScares @SnScare

یادھو کے بازی سے حاصل نہیں کی تھی۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ہم دونوں ہی مذہبی سوچ رکھنے والے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ خاص طور سے متین اس معاملے میں بہت جذباتی تھا اور اسے صحیح و غلط کی بہت فکر لگی رہتی تھی۔ اس لیے جب ہمیں اضافی آمدنی کی ضرورت ہوتی تھی تب بھی ہم کبھی غلط طریقے سے کمانے کے بارے میں نہیں سوچتے تھے۔ اس معاملے میں متین کا فیصلہ بالکل واضح تھا۔

''جو رقم ہمارے لیے جائز نہیں ہے وہ ہمارے لیے نہیں ہے۔''

''اس کا فیصلہ کس طرح ہوگا کہ فلاں رقم ہمارے لیے جائز ہے یا نہیں۔''

''بہت آسانی سے۔'' اس نے کہا۔ ''جو رقم کسی کا حق مار کر اور کسی کی مرضی کے بغیر حاصل کی جائے وہ حرام ہے۔''

یوں یہ طے ہو گیا تھا کہ ہم کوئی رقم غلط طریقے سے حاصل نہیں کریں گے چاہے ہمیں اس کی کتنی ہی ضرورت کیوں نہ ہو۔ متین کا کہنا تھا کہ اگر خدا نے ہمارے مقدر میں کوئی رقم لکھ دی ہے تو اسے غلط طریقے سے کمانے کے بجائے ہمیں صبر سے کام لینا چاہیے اور انتظار کرنا چاہیے کہ وہ رقم درست طریقے سے ہمارے پاس آئے۔ اگر وہ ہمارے مقدر میں ہے تو ضرور آئے گی۔ خدا کے معاملے میں متین کا اعتقاد بہت پختہ تھا۔ اس کا یقین کبھی متزلزل نہیں ہوتا تھا۔

اس روز وہ بہت ضرورت مند تھا حالانکہ اس نے مجھے بھی شامل کر لیا تھا لیکن اصل میں تو مجھے علم ہی نہیں تھا کہ اسے کس چیز کے لیے پانچ سو روپے درکار ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ''تم نے کبھی میکی شاپ پزا کھایا ہے؟''

میکی شاپ ہمارے گھر سے کچھ دور تھی۔ وہ پزا بنانے کا ماہر تھا۔ لیکن اس کے بنائے بڑے بڑے مہنگے ہوتے ہیں اور ہم نے ایک بار بھی اس کی دکان سے پزا لینے کی ہمت نہیں کی۔ البتہ ہمیں حسرت ضرور تھی کہ ہم یہاں سے ایک بار پزا لے کر کھائیں۔ میں نے خفگی سے اسے دیکھا۔

''جب تم کو معلوم ہے کہ میں نے کبھی پزا نہیں کھایا تو پھر پوچھ کیوں رہے ہو؟''

''کیونکہ دو دن کے لیے صرف پانچ سو میں مل رہا ہے۔''

میں یہ سن کر اچھل پڑا تھا کیونکہ میکی پزا آٹھ سو سے کم کا نہیں ہوتا ہے اور پانچ سو کا مطلب تھا وہ مفت ہی مل رہا ہے۔ میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''واقعی؟''

''اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو میرے ساتھ چلو میں تم کو اس کی دکان پر لکھا دکھا دیتا ہوں۔''

''نہیں مجھے تمہارا یقین ہے لیکن ایسا تو نہیں ہے کسی نے شرارت کی ہو یا تم پندرہ کو پانچ سو سمجھے ہو؟''

''میں نے خوب غور سے پورے دس منٹ تک اس اشتہار کا معائنہ کیا تھا اور پھر بھی یقین نہیں آیا تو اندر جا کر پوچھا تھا اس نے بتایا کہ پزا پانچ سو کا ہے لیکن صرف دو دن کے لیے اس کے بعد یہی پزا آٹھ سو میں دستیاب ہوگا۔''

''یہ تو زبردست پیش کش ہے۔'' میں نے جوش و خروش سے کہا۔

''اسی کے لیے پانچ سو درکار ہیں۔''

میرا منہ لٹک گیا۔ ''اور یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔''

''دیکھو ہمارے پاس دو دن ہیں۔ ہم دونوں دو دو سو جمع کر لیں تو یہ ہو جائیں گے چار سو اور پھر صرف ایک سو کا مسئلہ رہ جائے گا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مسئلہ ایک کا نہیں بلکہ تین سو کا ہوگا کیونکہ ایک ہفتے کے لیے میرا جیب خرچ بند ہے۔''

''جیب خرچ بند ہے۔'' متین نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''لیکن کیوں؟''

''کیونکہ میں ایک بار پھر میتھس کے ٹیسٹ میں فیل ہو گیا ہوں۔'' میں نے متانت سے جواب دیا۔ ''تم جانتے ہو اگر دس میں سے سات سوالوں کا جواب نہ دیا جائے تو اسے فیل شمار کرتے ہیں۔ میں نے صرف چھ کے درست جواب دیے تھے۔''

متین نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''اسی وجہ سے تم سے کہا ہے دھیان لگا کر پڑھا کرو۔''

''اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔''

''تم اپنی امی سے اپیل....''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ جیب خرچ ابو دیتے ہیں امی نہیں دیتی ہیں۔''

متین سوچ میں پڑ گیا اور اس نے خاصی دیر کے بعد کہا۔ ''ہمیں بہرصورت پانچ سو حاصل کرنے ہیں۔''

''لیکن کیسے؟''

''دیکھو کل اتوار ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہم دونوں کل صبح صبح گھر سے نکلیں گے اور پانچ سو کمانے کی کوشش کریں گے۔''

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"وہ کیسے؟" میں نے اعتراض کیا۔ کیونکہ ایک اتوار والا دن ہی ہوتا تھا جب مجھے صبح جی بھر کر سونے کا موقع ملتا تھا۔

"بس مجھے یقین ہے خدا نے کہیں نہ کہیں سے ہمارے لیے پانچ سو کا بندوبست کیا ہوگا۔"

مجھے معلوم تھا کہ میں انکار نہیں کر سکتا تھا اور ایسے ہی مواقعوں پر مجھے متین سے دوستی کھلتی تھی۔ مجھے بھی پان پزا پسند تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ میں اس کے لیے اپنی اتوار کی نیند قربان کرنے کے لیے تیار ہو جاؤں۔ اگر مجھے متین کے علاوہ کوئی یہ بات کہتا تو میں ہرگز نہ مانتا۔ بادل ناخواستہ میں نے اس سے کہا۔ "صبح کب نکلنا ہے؟"

"ناشتا کرتے ہی۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے سکون کا سانس لیا۔ متین نے وقت نہیں دیا تھا اور ناشتا میں گیارہ بجے سے پہلے نہیں کرتا تھا اس لیے سونے کا موقع موجود تھا میں نے دل میں دعا بھی کی کہ متین کا دھیان اس طرف نہ جائے لیکن وہ متین ہی کیا جس کا دھیان ان باتوں کی طرف نہ جائے جن کا تعلق میرے سکون اور چین سے ہوتا ہے اس نے کہا۔ "اور ہاں ناشتا تم سات بجے کر لینا۔"

"سات بجے۔" میں کراہا۔ "اتوار والے دن ہمارے ہاں ناشتا اتنی جلدی بنتا ہی نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں تم آٹھ بجے آجانا۔" متین نے گویا وقت طے کر دیا۔ "ممکن ہے ہمیں اتنی جلدی کوئی کام مل جائے کہ ہم پزا سے اصل ناشتہ کریں۔"

اتوار کی صبح میں آٹھ بجے ناشتے کے لیے آیا تو امی حیرت سے بے ہوش ہونے لگی تھیں۔ "یہ سچ مچ تم ہو؟"

"جی امی اور جلدی ناشتا دیں مجھے ابھی جانا ہے۔"

"کہاں؟" امی نے میز پر ناشتا لگاتے ہوئے کہا۔

"میرا اور متین کا کہیں جانے کا ارادہ ہے۔" میں نے کہا اور جلدی جلدی توس نگلنا شروع کر دیئے اور کھڑا ہو گیا۔ حسب توقع متین سخت بے تابی اور کسی قدر غصے میں میرا انتظار کر رہا تھا اس نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔

"تم پورے آدھا گھنٹا دیر سے آئے ہو۔"

"سوری۔" میں نے بات بڑھنے سے پہلے ختم کر دی۔ "اب بولو کیا کرنا؟"

"پہلے ہم سامنے والے محلے کی طرف جائیں گے ممکن ہے مسز ذوالفقار کو آج اپنا باغ صاف کرانا ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "کل میرا اس کی طرف سے گزر ہوا تھا وہ خود باغ کی صفائی کر رہی تھی۔"

"اچھا مسز منیر... اس کا باغ تو بہت گندا ہو رہا ہے اس میں سوکھے پتوں کا ڈھیر لگ گیا۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ مسز منیر کا دو ہفتے سے ان کا گھر بند ہے۔ ان کا پڑوسی ان کے باغ کو پانی دیتا ہے لیکن وہ یقیناً صفائی کے عوض ہمیں کوئی معاوضہ نہیں دے گا۔"

"تب ممکن ہے آصف کو اپنی کار دھلوانی ہو؟"

آصف ایک شوقین مزاج اور نازک اندام نوجوان تھا اس کا باپ کیونکہ ایک کامیاب انشورنس ایجنٹ تھا اس لیے اس نے آصف کو ایک بہترین اسپورٹس کار دلوا دی تھی۔ اسے چلانا جتنا مشکل کام تھا اس کی صفائی اس سے بھی زیادہ مشکل کام تھا کیونکہ اس کا ڈیزائن کچھ زیادہ ہی ایرو ڈائنامک تھا۔ میں نے متین سے اتفاق کیا اور ہم آصف کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو ڈیوڈ خود ہی اپنی کار دھو رہا تھا اور اس نے ہمیں کہا۔

"دفع ہو جاؤ تم نے پچھلی بار اس کے الیکٹرونک سسٹم کو گیلا کر دیا تھا۔ اس کا مرکزی نظام ہی جام ہو گیا تھا اور اسے کھلوانے میں میرے دو سو روپے خرچ ہو گئے۔"

باتوں کا تو ہم پر اتنا اثر نہیں ہوا تھا لیکن جب وہ پائپ لے کر جارحانہ انداز میں ہماری طرف بڑھا تو ہم نے وہاں سے بھاگ نکلنے میں عافیت سمجھی تھی۔ اس کے بعد ہم ایک گھنٹے میں ان تمام جگہوں پر گئے جہاں ہمیں کام اور اس کے بدلے کم سے کم پانچ سو ڈالرز ملنے کا امکان تھا۔ لیکن ہر جگہ ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تھک ہار کر ہم ایک پارک میں آبیٹھے تھے۔ متین نے مایوسی سے کہا۔

"لگتا ہے آج ہمارے نصیب میں کہیں سے بھی رقم نہیں ہے۔"

"اور کیا بلاوجہ صبح کی نیند غارت کی۔" میں نے منہ لٹکا کر کہا۔ "اس وقت میں گرم بستر کے مزے لے رہا ہوتا۔"

"خیر اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم بالکل ہی ناکام رہے ہیں۔" متین نے جلدی سے کہا۔ "ابھی صرف گیارہ بجے ہیں اور ابھی ہمارے پاس سارا دن ہے۔"

یہ سن کر میری جان نکل گئی تھی کہ متین کا ارادہ سارا دن کام تلاش کرنے کا تھا۔ "اب کام کہاں ملے گا جہاں جہاں سے مل سکتا تھا ہم نے کوشش کر لی ہے۔"

"نہیں بعض اوقات انسان کو وہاں سے کام مل جاتا

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

ہے جہاں کے بارے میں اس نے سوچا ہی نہیں ہوتا ہے۔"

"لیکن اکثر اوقات انسان کو وہاں سے بھی کام نہیں ملتا جہاں کا اس نے سوچا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہمیں نہیں ملا۔ اس لیے ہمیں مزید وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے گھروں کا رخ کرنا چاہیے۔ کم سے کم میں اتنی دیر کے لیے گھر سے غائب نہیں رہ سکتا تم جانتے ہو آج کل میں ویسے ہی زیر عتاب ہوں۔"

"اچھا ایک بجے تک کوشش کرتے ہیں۔" متین نے جلدی سے کہا۔ "اگر اس وقت تک کام نہیں بنا تو بے شک ہم واپس گھروں کو چلیں گے۔"

میں نے سوچا اور مان گیا۔ "لیکن اب کیا کیا جائے؟"

"میرا خیال ہے ہمیں الگ الگ کوشش کرنی چاہیے ممکن ہے اس میں کسی کی قسمت کھل جائے۔ تم اسی جگہ کام تلاش کرو میں سڑک پار جاتا ہوں وہاں کام مل سکتا ہے۔" متین نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا لیکن پھر بیٹھا رہا۔ مجھے کسل مندی آ رہی تھی جو صبح جلدی اٹھنے کا فطری نتیجہ تھی۔ پھر دھوپ بھی مزے دار تھی اس لیے میں نے سوچا کچھ دیر اور ستا لیا جائے۔ اگرچہ میں متین کی طرح مذہبی نہیں ہوں لیکن میں نے اس وقت اس بات پر یقین کر لیا کہ اگر آپ کے نصیب میں کوئی چیز لکھی ہے تو وہ آپ کو ضرور ملے گی چاہے آپ اس کے لیے کوشش کریں یا نہ کریں۔ یہ سوچ کر میں پارک کی بنچ پر بیٹھا رہا۔

میں دھوپ کے مزے لے رہا تھا اور میری آنکھیں بند تھیں کہ اچانک کوئی چیز مجھ سے ٹکرائی میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو ایک بڑی پیاری سی اور بالکل برف کی طرح سفید پھولے بالوں والا بلا میرے پیروں کے پاس بیٹھا تھا اور بڑے پیار سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ مجھ سے فری ہو رہا تھا۔ مجھے اچھا لگا تو میں نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ وہ یوں سکون سے میری گود میں بیٹھ گیا جیسے میرا پالتو بلا ہو اور میں اس کے نرم ملائم بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ یہ یقیناً کسی کا پالتو تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس علاقے میں خالہ زبیدہ بلیوں کی شوقین ہے اور وہ اسی پارک کے پاس رہتی ہے۔ مجھے لگا کہ یہ اسی کا بلا تھا۔ جو گھر سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ بلا اصل میں کسی اور کا ہو۔ میں کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ بلے کا مالک خود آ جائے، مگر جب خاصی دیر گزرنے کے بعد بھی کوئی نہیں آیا تو میں نے مایوسی سے اسے نیچے اتارنے کا ارادہ کیا۔ اسی لمحے میں نے خالہ زبیدہ کو پارک میں داخل ہوتے دیکھا۔

"لو بیر خوردار۔" میں نے بلے سے کہا۔ "تمہارا اصل مالک آ گیا ہے۔"

خالہ زبیدہ آس پاس دیکھ رہی تھی یقیناً اسے اپنے بلے کی تلاش تھی۔ لیکن میں نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انجان بنا بیٹھا رہا۔ پھر خالہ زبیدہ نے بلے کو دیکھ لیا اور لپک کر آئی۔ اس نے پاس آ کر پُرشوق نظروں سے بلے کو دیکھا اور بولی۔ "واہ کتنا خوب صورت اور اچھی نسل کا بلا ہے۔"

میں حیران ہوا یعنی یہ بلا اس کا نہیں تھا تو پھر وہ کسے تلاش کرتی آئی ہے۔ اس نے خود ہی وضاحت کر دی۔ "میری ایک چھوٹی پوتی نسل کی بلی گھر سے غائب ہے میں اسے تلاش کر رہی ہوں۔ سرمئی رنگ ہے اور آنکھیں سرخ رنگ کی ہیں۔ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے اسے نہیں دیکھا ہے۔"

"اچھا۔" اس نے مایوسی سے کہا۔ "اگر تمہیں کہیں نظر آئے تو مجھے بتانا میں سامنے والے گھر میں رہتی ہوں۔" اس نے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

"میں جانتا ہوں آپ بے فکر رہیں میں نے اگر آپ کی بلی کو دیکھا تو آپ کو ضرور بتاؤں گا۔"

وہ جانے کے لیے مڑی لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گی۔ "بیٹے کیا تمہارا اس بلے کو فروخت کرنے کا ارادہ ہے؟"

"کیا آپ اسے لینا چاہتی ہیں؟"

"ہاں میں اسے لینا چاہتی ہوں۔" اس نے بے تابی سے کہا۔ "اس کے بدلے تم کیا لو گے؟"

"پانچ سو۔" میں نے کہا۔

اس کا منہ کھل گیا تھا۔ "کیا پانچ سو؟ لگتا ہے تم اس کی اصل قیمت سے نا آشنا ہو۔ یہ کم سے کم پچاس ہزار کا بلا ہے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں جناب... مجھے صرف پانچ سو درکار ہیں۔"

"تم شاید سمجھ نہیں رہے ہو اس کی اصل قیمت پانچ ہزار سے کہیں زیادہ ہے۔"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔"

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"تب تم اس کے کتنے لو گے؟"

"پانچ سو۔" میں نے پھر کہا۔ "میں اس سے زیادہ نہیں لوں گا۔"

خالہ نے پرس نکالا اور اس میں سے گن کر ایک ایک سو کے پانچ نوٹ میرے حوالے کیے اور بلا لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔ یہ شریف بلا جتنی آسانی سے میرے پاس چلا آیا تھا اتنی ہی آسانی سے اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے بازوؤں میں لے کر مسرور انداز میں اسے سہلایا اور خوش خوش وہاں سے چلی گئی۔ اب میرے پاس پانچ سو تھے یعنی جتنی رقم ہمیں درکار تھی وہ مل گئی تھی۔ اب مجھے یہاں سے چل دینا چاہیے تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ میں نے ایک کام کر لیا تھا اور اب مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے ٹھیک نہیں کیا تھا۔

متین اکثر مسجد جاتا تھا۔ اور وہاں جو خطبے میں سنتا تھا وہ آکر میرے گوش گزار بھی کر دیا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے وعظ میں سنا کہ انسان جب کوئی غلط کام کرتا ہے تو خدا کی طرف سے اسے تلافی کا ایک موقع دیا جاتا ہے۔ یہ موقع لازمی ملتا ہے بہ شرط کہ انسان ذرا صبر سے کام لے اور انتظار کرے۔ مجھے متین کی یہ بات یاد آگئی اور میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اسی جگہ بیٹھ کر موقع کا انتظار کرنا چاہیے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا اور ایک بج گیا۔ یعنی متین کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر متین آگیا تو اس کا مطلب ہے اس معاملے میں میری کوئی خطا نہیں ہے۔

لیکن متین کی آمد سے پہلے ایک جوان عورت پارک میں آئی۔ اس نے لباس بھی ایسا پہن رکھا تھا جس میں وہ زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ وہ بے قراری سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ کسی کو تلاش کر رہی ہو اور جب اس سے صبر نہیں ہو سکا تو اس نے بلند آواز سے پکارنا شروع کر دیا۔

"پوسی.... پوسی.... تم کہاں ہو.... میں پہلے ہی پریشان ہوں مجھے اور پریشان مت کرو۔"

میں نے سوچا کہ یہ پوسی کون ہے اس کا بچہ ہے۔ وہ شاید ستائیس اٹھائیس برس کی تھی اور اس کا اتنا بڑا بچہ بالکل ہو سکتا تھا جو پارک میں آکر گم ہو جائے۔ وہ پکارتی ہوئی میری طرف آئی اور پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "لڑکے تم نے پوسی کو کہیں دیکھا ہے؟"

"یہ پوسی کون ہے؟" میں نے ادب سے پوچھا۔

"پوسی میرا بلا ہے سفید رنگ کا اور سرخ آنکھوں والا۔ وہ بہت خوب صورت ہے۔"

"یقیناً ہو گا۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ یقیناً وہ اس بلے کی مالکہ تھی جسے میں نے خالہ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ "کیا وہ گم گیا ہے؟"

"ہاں کئی گھنٹے سے غائب ہے اور میں پاگلوں کی طرح اسے تلاش کر رہی ہوں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"میڈم آپ کی حالت دیکھ کر افسوس ہو رہا ہے اگر آپ کہیں تو میں اسے آپ کے لیے تلاش کروں۔"

"کیوں نہیں تم میری مدد کر کے مجھے اپنا شکر گزار پاؤ گے۔" وہ میرے برابر میں بنچ پر بیٹھ گئی۔

"میڈم میں اسے تلاش میں بھاگ دوڑ کروں گا اور میرا وقت اور محنت لگے گی کیا مجھے اس کا کوئی معاوضہ ملے گا؟"

"کیوں نہیں تم جو مانگو گے میں تمہیں دوں گی۔" اس نے زور و شور سے یقین دلایا۔

"جو میں مانگوں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں جو تم مانگو۔"

"تب میں آپ کا بلا تلاش کرنے کے عوض پانچ سو لوں گا۔"

"صرف پانچ سو..... اپنے پیارے پوسی کو تلاش کر کے لانے پر میں تم کو ایک ہزار دوں گی۔"

یہ سنتے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ "تب آپ یہاں آرام سے بیٹھیں میں اسے آس پاس کی گلیوں میں تلاش کرتا ہوں۔"

عورت وہیں بیٹھی رہی اور میں سیدھا خالہ کے گھر آیا۔ کال بیل بجانے پر خالہ نے خود دروازہ کھولا۔ میں نے ان کو دیکھتے ہی کہا۔ "خالہ میں آپ سے بلا لینے آیا ہوں۔ یہ اپنے پانچ لیں اور بلا میرے حوالے کر دیں۔"

"کیا؟" وہ چلا اٹھی۔ "میں کیوں بلا تمہارے حوالے کر دوں میں اسے تم سے خرید چکی ہوں۔"

"آپ کو وہ بلا دینا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"ہرگز نہیں.... میں نے تمہاری منہ مانگی قیمت تمہیں ادا کر دی تھی اور اب وہ بلا میرا ہے اور اگر اب تم پچھتا رہے ہو کہ تم نے کم قیمت لی ہے تو یہ تمہارا قصور ہے میں نے تم کو خبردار کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ قیمت کا ہے جو تم طلب کر رہے ہو لیکن تمہارے اصرار پر میں نے پانچ سو میں اسے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خرید لیا اور اب اس کے لیے تم مجھے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے۔ یہ میرا ہو چکا ہے۔ میں اس کے بدلے اب تم کو مزید ایک روپیا بھی نہیں دوں گی۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اصل بات یہ ہے بلا میرا نہیں ہے اس کا مالک کوئی اور ہے۔"

خالہ کا منہ لٹک گیا تھا۔ "مالک کوئی اور ہے تب تم نے اسے کیسے بیچ دیا؟"

"میں نے بیچا نہیں تھا اسے آپ نے خریدا تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ اچھل پڑی۔

"بکواس کرتے ہو تم.... تم نے اسے بیچا تھا جب کہ یہ تمہارا بلا نہیں ہے۔"

"یہ درست ہے لیکن اسے آپ نے خود خریدنا چاہا تھا۔ یاد ہے میں نے ایک بار بھی اسے بیچنے کی بات نہیں کی تھی۔ آپ نے خود پاس آ کر اسے خریدنے کی بات کی تھی اور پھر میرے پانچ سو طلب کرنے پر مجھے رقم دے کر اسے لے لیا تھا۔"

خالہ نے غور کیا اور بات اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ "پھر یہ تمہارے پاس کیسے آیا اور کیا اسے بیچ کر تم نے بد دیانتی نہیں کی؟"

"یہ پارک میں خود میرے پاس آ گیا تھا اور میں نے غلط حرکت کی ہے لیکن اسے بد دیانتی نہیں کہہ سکتے کیونکہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا اس کا مالک کون ہے اور کوئی ہے بھی یا نہیں۔ اس لیے پانچ سو لے کر میں نے اسے آپ کے حوالے کر دیا۔"

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا حالانکہ میں نے آتے ہی اسے بتا دیا تھا کہ میں بلا واپس لینے آیا ہوں۔

"اس کا اصل مالک آ گیا ہے اور مجھے بلا اس کے حوالے کرنا ہے۔"

"میں اسے خرید چکی ہوں اور اب اسے تمہارے حوالے کیوں کروں؟"

"اگر آپ نے اسے میرے حوالے نہیں کیا تو میں واپس جا کر مالک کو لے آؤں گا اور اسے بتاؤں گا کہ اس کا بلا آپ کے پاس ہے۔ آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔"

خالہ نے کچھ دیر سوچا اور سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں بلا تمہیں لا دیتی ہوں لیکن اس معاملے میں کسی طرح بھی میرا نام نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم نے مجھے ملوث کرنا چاہا تو میں صاف انکار کر دوں گی۔"

"آپ بے فکر رہیں میں آپ کا نام نہیں لوں گا۔" میں نے اس کے پانچ سو اسے واپس کیے۔ "اس صورت میں خود میں بھی پھنس جاؤں گا۔"

میں بلا لے کر پارک میں داخل ہوا تھا کہ وہ عورت بلے کو میری گود میں دیکھتے ہی اچھل کر کھڑی ہو گئی اور پھر اس نے جھپٹ کر بلا لے لیا اور اسے بے تحاشہ پیار کرنے لگی۔ وہ اسے بار بار سینے اور اپنے گالوں سے لگاتی تھی۔ "اوہ..... مائی پوسی مائی ڈیئر۔"

مجھے اس وقت بلے پر بہت رشک آیا تھا۔ اپنی خوشی پر قابو پاتے ہوئے عورت نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ "میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

"یہ احسان نہیں ہے میڈم۔" میں نے متانت سے کہا۔ "میں نے معاوضے کے لیے یہ کام کیا ہے۔"

"اوہ ہاں تمہارا انعام۔" اس نے جلدی سے اپنے پرس سے مجھے دس نوٹ سو سو کے نکال کر دیے۔ "اس کے باوجود میں تمہاری شکر گزار ہوں۔" اس نے کہا اور میرے گال پر پیار کر کے لہراتی ہوئی اپنے بلے سمیت وہاں سے چلی گئی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اگر وہ مجھے ہزار نہ بھی دیتی تب بھی میں دس بار پوسی کو تلاش کر کے لانے کو تیار ہو جاتا۔

اسی لمحے متین پارک میں داخل ہوا اور اس کی صورت بتا رہی تھی کہ اسے نہ تو کہیں کام ملا ہے اور نہ ہی پانچ سو۔ جب کہ میری جیب میں پورے ہزار تھے جس سے دو عدد پزا آ سکتے تھے۔ جس طرح میں نے جان لیا تھا کہ متین ناکام رہا ہے اسی طرح اس نے میری صورت دیکھ کر جان لیا کہ میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ لپک کر میرے پاس آیا۔

"تو تم نے پانچ سو حاصل کر لیے۔"

"ہاں اور اب ہم پزا لے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم پان پزا کے مزے اڑا رہے تھے اگرچہ پزا میں سے بڑا ٹکڑا متین کے حصے میں آیا تھا لیکن میں نے اس کا بالکل برا نہیں مانا تھا۔ ایک تو اس لیے کہ میری جیب میں مزید پانچ سو موجود تھے اور میں ایک پورا پزا اکیلے کھا سکتا تھا۔ دوسرے میں متین کی اس بات کا قائل ہو گیا تھا کہ اگر آپ کے نصیب میں کچھ ہے تو خدا اسے درست طریقے سے حاصل کرنے کا ایک موقع ضرور دیتا ہے۔

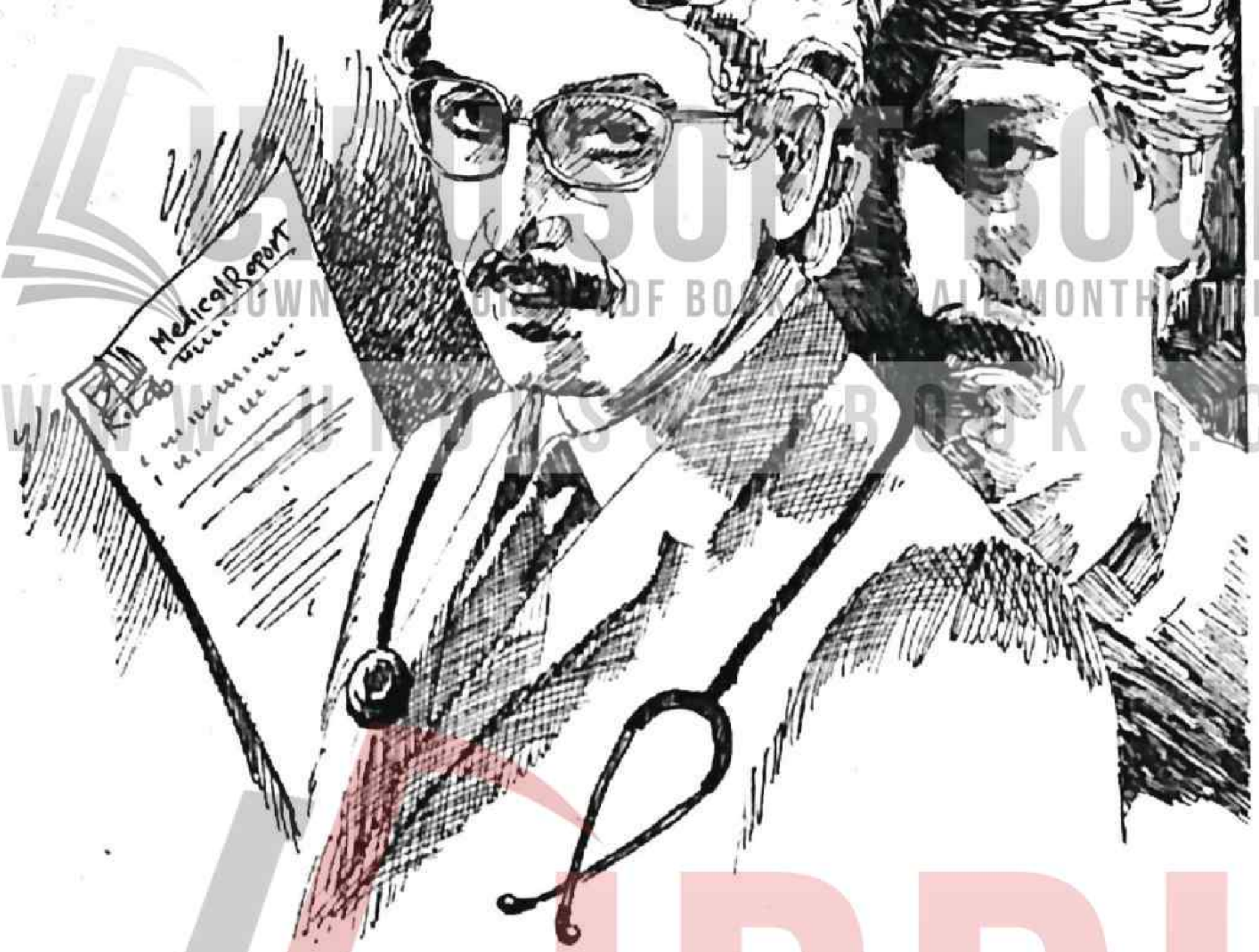

تیرا بھائی

جناب ایڈیٹر سرگزشت
سلام مسنون

میں اس بار جو روداد بیان کرنے جارہا ہوں یہ بھی سو فیصد سچ ہے۔ سولجر بازار کے پرانے رہائشی اس کہانی سے واقف ہوں گے پھر بھی میں صرف اس لیے اپنے الفاظ میں بیان کررہا ہوں کہ بڑبولا پن کیسے خندق میں گرا دیتا ہے۔

محمد امجد
(کراچی)

ولی دادا ہمارے محلے کے ایک دلچسپ کردار ہیں۔ انہوں نے زندگی کے اتنے نشیب و فراز دیکھے ہیں کہ ان پر پورا ناول لکھا جا سکتا ہے۔ میں کبھی کبھی ان کے پاس بیٹھ جاتا ہوں اور ان کے تجربات سنتا رہتا ہوں۔

مجھے بہت کچھ حاصل ہوا ہے۔ اس کردار کے بارے میں بھی ولی دادا ہی نے بتایا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کردار کے بارے میں آپ خود ولی دادا کی زبانی سن لیں۔

”میاں کیا بتاؤں کیا بندہ تھا وہ۔ دبلا پتلا دھان پان

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سا۔لیکن پورے سولجر بازار میں اپنے بھائی کے بل پر اکڑتا پھرتا تھا۔"

اس کا نام راشد سمجھ لیں۔اس کا بڑا بھائی خالد محلے کا بدمعاش تھا۔ اوّل درجے کا چھری باز۔ کئی بار جیل جا چکا تھا۔ محلے بھر میں اس کی دھاک تھی۔

جبکہ راشد اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ صرف خالد کے بل پر دادا گیری کیا کرتا۔ اور دادا گیری ہی کیا بس کسی ہوٹل سے چائے پی لی، کسی حلوائی سے دو چار سموسے لے لیے۔ بس اس سے زیادہ اس میں نہ صلاحیت تھی اور نہ ہی ہمت تھی۔

لیکن اس کے کردار کی سب سے دلچسپ بات اس کی شیخی تھی۔

میں بھی اس زمانے میں اپنے ہاتھ پیر نکالنے لگا تھا۔ ایکسر سائز کرنے جایا کرتا۔ اچھی خاصی جان بنی ہوئی تھی لیکن مجھ میں بزرگوں کی سکھائی ہوئی تہذیب موجود تھی۔

کسی محفل میں جاتا تو سر جھکا کر بڑوں کی باتیں سنتا۔ اسی لیے لوگ مجھے پسند بھی کرتے تھے اور مجھ سے شفقت کا اظہار بھی کرتے۔

راشد بھی ایسا ہی تھا۔اس کی بیٹھک اچھے کے ہوٹل میں ہوا کرتی۔ اچھے خود کسی زمانے میں بدمعاش رہ چکا تھا لیکن اب ہوٹل چلا رہا تھا۔

راشد کے اردگرد اس کی باتیں سننے والے بیٹھا کرتے۔جن کے لیے راشد کی باتیں حیرت انگیز تھیں۔ میں نے پہلی بار راشد کی لن ترانی اسی محفل میں سنی تھی۔

کوئی بتا رہا تھا۔ راشد دادا (یاد رہے کہ راشد کو بھی دادا ہی کہا جاتا تھا) کل جوڑیا بازار کا ایک سنار لٹ گیا۔ پورے دو لاکھ چلے گئے اس کے۔ (اس زمانے کے دو لاکھ بہت ہوا کرتے تھے)۔

"ہاں معلوم ہے مجھے۔" راشد دادا نے کہا۔ "اب تم لوگ تو کل کے لونڈے ہو، تمہیں کیا بتاؤں بس یہ سمجھ لو کہ اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو دادا؟"

"ہاں، بہت سمجھایا تھا اس کو کہ دیکھ سونے میں ملاوٹ مت کیا کر اور یہ جو مجبور عورتیں مجبوری میں اپنے گہنے لے کر تیرے پاس آتی ہیں، ان کی مجبوری سے فائدہ مت اٹھا۔ان کو پورے پیسے دیا کر لیکن وہ کہاں سننے والا۔"

"لیکن دادا اس کو تو ڈاکوؤں نے لوٹا ہے۔"

"ابے بتایا نا کہ اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔" راشد بولا۔ "اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے ہوں گے۔"

اس وقت مجھے بھی یقین ہو گیا تھا کہ شاید ایسا ہی ہوا ہو۔اس سنار کی دکان راشد دادا ہی نے لٹوا دی ہو۔لیکن بعد میں پتا چلا کہ یہ تو اس کی عادت تھی۔

ایک دن کسی نے اس سے کہا۔ "راشد دادا، ملیر میں دو گروپوں میں گولیاں چل گئی ہیں۔دو آدمی مر گئے ہیں۔"

"ہاں، ہاں، جانتا ہوں میں۔" راشد دادا نے کہا۔ "اور یہ بھی سن لو کہ اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔"

"لیکن دادا، دونوں میں فساد کرانے سے تمہیں کیا ملا؟"

"ابے دونوں بدمعاش ہیں۔ محلے کے غریبوں پر ظلم کرتے ہیں۔ پولیس کے قابو میں بھی نہیں آ رہے تھے۔ابھی اتنا سمجھ لو کہ دونوں کے درمیان جھگڑا کرانے میں تیرے بھائی کا ہی ہاتھ ہے۔ اب ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔ دونوں طرف کا ایک ایک بندہ ٹپک گیا ہے۔اب مہینوں تک اس علاقے میں سکون رہے گا۔"

تو ایسے تھے۔راشد دادا۔

شادی نہیں ہوئی تھی۔ ماں باپ تھے۔ جو راشد اور خالد دونوں کی جان کو رویا کرتے۔ یوں سمجھ لیں کہ راشد اگر زبانی بدمعاش تھا تو خالد عملی بدمعاش۔ اس نے واقعی کئی وارداتیں کی تھیں۔ محلے میں بھی اور محلے سے باہر بھی۔

جبکہ راشد کا کام صرف اتنا تھا کہ شام ہوتے ہی اچھے کے ہوٹل میں آ کر بیٹھ جاتا اور اپنے دوستوں کو اپنی کہانیاں سنایا کرتا۔

اس کے بیان کے مطابق دنیا کے بڑے بڑے واقعات میں اسی کا ہاتھ ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنے سر کو جھٹک کر کہا کرتا۔ "اب تمہیں کیا بتاؤں۔ وہ جو چین کے صدر کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے۔ اس میں بھی تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔"

"لیکن راشد دادا چین کے صدر سے تمہارا کیا تعلق؟" کوئی کہتا۔

"یہی تو تم لوگوں کو نہیں معلوم۔" اس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ نمودار ہو جاتی۔ "یہ خفیہ معاملات ہیں اور ایسے معاملات ہر جگہ نہیں بتائے جاتے۔"

ایک بار کراچی میں فٹ بال میچ کے دوران جھگڑا ہو گیا۔اس جھگڑے نے جب شدت اختیار کر لی تو کئی دکانیں

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اور ایک بس بھی جلادی گئی تھی۔

اس وقت بھی راشد دادا نے یہی فرمایا۔ ''ابے، اب تم لوگوں کو کیا بتایا جائے۔ ہر طرف جاسوس پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے کچھ بتاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے لیکن بس اتنا سمجھ لو کہ اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔''

''لیکن دادا، اگر تمہارا ہاتھ ہے تو پھر دکانوں کو جلانا تو کوئی اچھی بات نہیں ہوئی نا۔''

''ابے اس پر تو میں بھی بہت ناراض ہوا تھا۔'' راشد دادا نے کہا۔ ''سمجھایا بھی تھا لیکن لوگ جب سڑکوں پر آجاتے ہیں تو پھر کسی کی نہیں سنتے۔''

کبھی کبھی اس کی باتوں میں بہت گہرائی بھی ہوا کرتی۔ وہ کہا کرتا۔ ''ابے تم لوگ ایک بات جان لو۔ یہ جو انسان ہوتا ہے نا، اس کی دوغلی پالیسی ہوتی ہے۔''

''وہ کیسے راشد دادا۔''

''تم کسی سے بات کرو تو ایسا لگے گا جیسے اس سے زیادہ شریف آدمی آج تک پیدا ہی نہیں ہوا لیکن وہ ہی بندہ جب سڑک پر اپنے آدمیوں کے ساتھ نکلتا ہے نا تو اس کی فطرت ہی بدل جاتی ہے۔ وہ پتھر بھی مارتا ہے۔ دکانیں بھی جلاتا ہے اور گولیاں بھی چلاتا ہے۔''

(راشد دادا نے کتنی گہری بات کہہ دی تھی کہ انفرادی نفسیات کچھ اور ہوا کرتی ہے اور اجتماعی نفسیات کچھ اور ہوتی ہے۔ اپنے ریوڑ سے بچھڑ کر انسان بھیڑ بن جاتا ہے اور ریوڑ میں شامل ہو کر شیر ہو جاتا ہے)

اس وقت تک میں بھی راشد دادا سے بے تکلف ہو چکا تھا۔ فٹ بال والے واقعے کے بعد مجھے ایک شرارت سوجھی۔

شام کا وقت تھا۔ راشد دادا وقت سے پہلے ہوٹل میں آکر بیٹھ گیا تھا جبکہ میں اپنے پلان کے تحت پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔

راشد دادا مجھے دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ ''کیا بات ہے ولی، آج تو بہت جلدی آگیا۔''

''ہاں دادا۔'' میں اس کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ ''بات ہی کچھ ایسی ہے کہ میں نے سوچا تمہیں بتا دوں۔''

''ہاں بتا کیا بات ہے؟''

''دادا! وہ جو روڈ پار پان کا کھوکھا ہے نا۔ میں وہاں کھڑا تھا۔ مجھ سے کچھ دور تین آدمی کھڑے تھے۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتیں میں نے سن لیں۔''

''اچھا، کیا کہہ رہے تھے؟''

اردو تنقید کی بات کریں تو یہ سوال لازمی ہو جاتا ہے کہ شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی کے بعد کی نسل کہاں ہے؟ ابوالکلام قاسمی سے مولا بخش تک کچھ اور نام شامل کر لیں تو یہ نسل بھی بزرگ ہو چکی ہے۔ افسانے میں اقبال مجید سے لے کر حسین الحق، سلام بن رزاق اور ابرار مجیب، صغیر رحمانی تک، یہاں زیادہ تر پچاس کی عمر سے آگے کے افسانہ نگار ہیں، یہ کارواں بھی گزر گیا تو کیا اردو ادب کا سفر تھم جائے گا؟ اس سوال پر غور کرنا ضروری ہے۔ شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، شمیم حنفی کے معیار اور قد کا کوئی نام ہمارے سامنے نہیں۔ ہمارے بعد دور تک لمبی خاموشی کا بسیرا ہے۔ میں فکشن کا آدمی ہوں اس لئے ذرا فکشن کی بات کر لوں، پاکستان میں کئی نام ہیں جو متاثر کرتے ہیں۔ منیزہ احتشام، سیمیں علی، اقبال خورشید، رابعہ الربا، فیس بک پر بھی کہانیاں لکھنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ ہندوستان میں نئی نسل سے ہاشم خان کا نام احترام سے لے سکتا ہوں۔ ہاشم کی دو کہانیوں نے متاثر کیا، ایک کہانی کشمیر کے بیک گراؤنڈ میں تھی۔ ہاشم کی خوبی ہے کہ وہ بیانیہ کے درمیان سے زیریں لہروں کو برآمد کرتے ہیں۔ یہ جو زیریں لہریں ہیں۔ یہ کہیں علامت بن جاتی ہیں، کہیں فنتاسی کی شکل میں ہوتی ہیں۔ فارس مغل، راجا یوسف، شہناز رحمٰن، فائق احمد، آدم شیر، ہما فلک، کئی نام ایسے ہیں جو تیزی سے راستہ بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر یہ سوال اہم ہے کہ ان کی شناخت کب بنے گی؟ دراصل نقاد غائب ہو گئے۔ ان پر لکھنے والے نہیں رہے، یہ المیہ ہے۔ فیس بک کی کہانیوں کو شامل کریں تو ہمارے پاس ناموں کی کمی نہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نام ایسا نہیں جسے مستند، بڑے ناموں میں شمار کیا جا سکے؟ ایسا اس لیے بھی ہے کہ نئے فکشن کا مطالعہ کرنے والے گنتی کے چند نام ہیں۔ ہمارے یونیورسٹی کے پروفیسر اور نقاد ان میں سے بیشتر ناموں سے واقف نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب ان ناموں کو بھی سامنے لانا جائے ابرار مجیب، صفدر زیدی، ثمین کرن، سیمیں علی، منیزہ احتشام، جمیل حیات، اقبال خورشید، صائمہ شاہ وغیرہ کی ایسے نام ہیں جن میں زبردست تنقیدی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب ایسے لوگوں پر گفتگو کرنے کا وقت آچکا ہے۔

اقتباس: یہ آخری کارواں نہیں ہے، از مشرف عالم ذوقی

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''وہ فٹ بال میچ والے جھگڑے کی بات کررہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ بندہ سامنے والے ہوٹل میں آکر بیٹھتا ہے۔ اس سے زیادہ میں ان کی باتیں نہیں سن سکا تھا۔''

راشد دادا ایک خاص انداز میں مسکرادیا۔ ''جانتا ہے ولی، اس جھگڑے میں کیا ہوا تھا۔''

''ہاں دادا، سنا ہے وہ سات آٹھ آدمی بری طرح زخمی ہوئے ہیں۔''

''ابے وہ تو ہونا ہی تھا۔ اب تجھ سے کیا چھپانا، اس جھگڑے میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔''

مجھے اندازہ تھا کہ وہ کچھ اسی قسم کی بات کرے گا۔

میں نے یونہی چھیڑنے کے لیے پوچھا۔ ''لیکن دادا فٹ بال والے جھگڑے سے تمہارا کیا لینا دینا؟''

''ابے یہ اپنے اپنے ضمیر کی بات ہے۔'' راشد دادا نے ایک درویشانہ شان سے کہا۔ ''میں فٹ بال کھیلنے سے کبھی منع نہیں کرتا، ضرور کھیلو، اچھا گیم ہے لیکن بھائی، اب اس میں جوا تو نہیں ہونا چاہیے۔''

''اوہو، تو اس میں جوا بھی ہوتا ہے؟''

''بہت لمبا، ابے انڈیا کے شہر بنگلور کا نام سنا ہے؟''

''ہاں دادا سنا تو ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہاں بھی فٹ بال میں جوا چلتا تھا پھر یہ ہوا کہ ایک بار چھاپا پڑا اور ایک درجن جواری پکڑے گئے۔ لاکھوں روپے بھی ہاتھ آئے تھے۔''

''دادا، میں نے شاید یہ خبر پڑھی تھی۔''

''تو اس میں بھی تیرے بھائی کا ہاتھ تھا۔'' راشد دادا نے اتنا بول کر انکساری سے گردن جھکالی۔

تو ایسے تھے راشد دادا۔ معاملہ چاہے کہیں کا بھی ہو، فرض کریں۔ آپ راشد دادا کو یہ بتائیں دادا امریکا نے مریخ پر اپنے بندے اتار دیے ہیں تو وہ یہی کہے گا۔ ''ابے، تجھے کیا معلوم۔ اس میں بھی تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔''

ولی دادا اس کردار کی کہانی سنا رہے تھے اور راشد دادا کا ایک خاکہ سا میرے ذہن میں بنتا جارہا تھا۔

کیونکہ خود میں نے بھی اس قسم کے کئی کردار دیکھے ہیں۔ اسی قسم کی باتیں کرنے والے۔ یہ لوگ سائیکک ہوتے ہیں۔ دوسروں سے الگ۔ اپنی دنیا میں مگن رہنے والے۔ یہ عام طور پر جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

فرائڈ نے کہا تھا کہ انسان اپنے خوابوں میں اپنی ناآسودہ خواہشوں کی تکمیل کرلیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ راشد دادا کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو۔

اس کا بڑا بھائی محلے کا بدمعاش تھا اور کئی عدد حقیقی وارداتیں اس کے نام سے منسوب تھیں جبکہ بے چارے راشد دادا کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ ایک کمزور جسامت کا خوف زدہ رہنے والا انسان تھا۔ لہٰذا وہ اپنی ناآسودہ خواہشات کو تیرے بھائی کا ہاتھ ہے کہہ کر مطمئن کرلیا کرتا تھا۔

محلے کے لوگ اس سے مزے لیا کرتے۔

خاص طور پر میں۔ ہاں ایک بات اور۔ راشد دادا جب کوئی بات کہہ دیتے تو اس کے حق میں مکالمہ کرایسا جواز پیش کیا کرتے کہ لگتا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ ٹھیک ہی ہوگا۔ خاص طور پر پہلی بار ان کی باتیں سننے والا کوئی نیا آدمی ان سے ضرور مرعوب ہوجاتا۔

ایک بار میں نے ان سے کہا۔ ''راشد دادا! کل رات تو بہت گڑبڑ ہوگئی۔''

''ارے ولی، اس قسم کی گڑبڑ ہوتی رہتی ہے۔ اب میں سب پر دھیان دینے لگوں تو بیمار ہی پڑ جاؤں۔ ویسے ہوا کیا ہے؟ کون سی نئی آفت آئی ہے؟''

''راشد دادا، بات یہ ہے کہ کل رات ایک بڑے پولیس آفیسر کا بیٹا پکڑا گیا ہے۔ اس کی گاڑی میں شراب کی بوتلیں بھی تھیں۔ اسلحہ بھی تھا اور دو لڑکیاں بھی تھیں۔''

''کس نے پکڑا ہے، پولیس تو اس پر ہاتھ ڈالنے سے رہی۔''

''آرمی والوں نے پکڑا ہے دادا۔''

''یہ بات ہوئی نا۔'' راشد دادا چہک اٹھے۔ ''بہرحال اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا۔ اس کے لیے تمہیں زیادہ شور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خوامخواہ پولیس والوں سے دشمنی ہوجائے گی۔''

''وہ کیوں دادا؟''

''ابے اتنی سی بات سمجھ نہیں رہے۔ اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔''

''کیوں دادا، اس میں تمہارا ہاتھ کیسے ہوگیا؟''

''ابے، اس نے میرے ہی کہنے پر اپنی گاڑی میں شراب کی بوتلیں رکھی تھیں اور دو لڑکیوں کو اپنے ساتھ بٹھالیا تھا۔''

''لیکن کیوں دادا، اس میں تمہارا کیا فائدہ تھا؟''

''یار، مجھ سے بدمعاشی برداشت نہیں ہوتی۔'' راشد

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دادا نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ میں خود بہت بڑا بدمعاش ہوں لیکن میری نیچر دوسری ہے۔''

''وہ کون سی نیچر ہے دادا؟''

''ابے پوری دنیا کے سامنے ہے۔ میں کبھی کمزور پر ظلم نہیں کرتا۔ ہر ایک پر اپنا زور نہیں دکھاتا۔ اسی لیے مجھے اس لونڈے کے چھچھورے پنے سے چڑ ہوگئی تھی۔ پھر میں نے وہی کیا جو کرنا تھا۔ میں نے پولیس ہی کے ہاتھوں اس کی عزت برباد کروادی۔''

''لیکن یہ سب کس طرح ہوا دادا؟''

''ابے یہ راز کی باتیں ہیں۔ سیکرٹ معاملہ ہے۔ اب میں ہر جگہ تو نہیں بتا سکتا نا۔''

ولی دادا جو کچھ بتا رہے تھے۔ وہ بہت دلچسپ تھا۔ ایک بات اور بھی ہے کہ ایسے کردار پوش علاقوں میں نہیں پائے جاتے۔

کیونکہ ایسے علاقوں میں مصنوعی لوگ رہا کرتے ہیں۔ مخصوص مسکراہٹوں والے، مصنوعی گفتگو والے اور مصنوعی پیار اور مصنوعی نفرت اور غصہ کرنے والے۔

جبکہ ایسے دلچسپ کردار سچے لوگ ہوتے ہیں۔ کم از کم ان میں منافقت نہیں ہوتی۔ جیسے ہی ہیں ویسے ہی ہیں۔ ان کا پیار بھی دکھاوے کا نہیں ہوتا اور ان کی نفرت بھی جعلی نہیں ہوتی۔

ولی دادا بتا رہے تھے۔ ایک بار ایسا ہوا بھائی کہ دوسرے محلے کے ایک بدمعاش کا قتل ہوگیا۔ اس کے قتل پر بہت ہاہا کار مچی تھی کیونکہ وہ ایک مشہور آدمی تھا اور اس نے دشمنیاں بھی بہت سی پال رکھی تھیں۔

مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس دن ایسا کچھ ہو جائے گا۔ اس شام میں نے ہوٹل میں بیٹھ کر راشد دادا کو چھیڑا۔ ''راشد دادا! حمید لنگڑے کے قتل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ابے اس میں خیال کیا ہونا ہے۔'' راشد دادا نے کہا۔ ''اس میں تیرے بھائی کا ہاتھ ہے۔''

''کیا کہہ رہے ہو دادا؟''

''ابے بہت سمجھایا اس کو کہ اپنی حرکتوں سے باز آجا۔ لیکن وہ کہاں سننے والا تھا۔ پھر اس کے ساتھ وہی کرنا پڑا جو اب ہوا ہے۔''

راشد دادا نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تین آدمی بجلی کی طرح اپنی کرسیوں سے اٹھے۔

کسی ٹانگے والے سے ایک بار مجاز نے کہا۔

''کچہری جاؤ گے؟''

اس نے کہا۔ ''جائیں گے۔''

مجاز نے کہا۔ اچھا جاؤ۔'' وہ بے چارہ سمجھا تھا کہ سواری ملی مجاز کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

مرسلہ: فصیح الدین۔ کراچی

ایک محفل میں ایک نہایت پستہ قد شاعر (روش صدیقی) اپنی شاعرانہ عظمت کا سکہ کچھ اس طرح بٹھانا چاہتے تھے کہ لوگ حیران تھے کہ آخر ان سے کیا کہیں۔ آخر وہ خود ہی کہہ اٹھے۔ ''اپنے منہ سے کہنا تو نہیں چاہیے مگر میں اس عہد کا شاعر اعظم ہوں۔''

مجاز سے اب ضبط نہ ہوسکا۔ اس نے برجستگی سے کہا۔ ''حضرت! پہلے قد آدم تو بن جایئے اس کے بعد شاعر اعظم بنیے گا۔''

مرسلہ: محمد فاروق۔ کراچی

فراق گورکھپوری اپنی رباعیات کا دوسرے شاعروں کی رباعیوں سے موازنہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''کہنے کو تو رباعیاں جوش صاحب بھی کہتے ہیں لیکن وہ اس صنفِ سخن کا باقاعدہ فن کی حیثیت سے استعمال نہیں کرتے۔ دراصل وہ اپنی شاعری کے منہ کا مزہ بدلنے کے لیے دوسری چیزیں لکھتے لکھتے کبھی کبھی رباعیاں بھی لکھ دیتے ہیں۔ ان کی رباعیاں ایک طرح سے ''چٹنی'' ہیں اور میری رباعیاں.....'' مجاز نے فراق کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ایک طرح سے مربا!''

مرسلہ: محمد فاروق۔ کراچی

ایک نوجوان شاعر نے کسی خاتون کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''مجاز صاحب مجھے اس سے نہایت شدید قسم کی محبت ہوگئی ہے۔ اس محبت نے میرے دل و دماغ کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ خدا کی قسم جب تک اس حسینہ کے متعلق چھ نظمیں نہیں کہہ لوں گا، مجھے چین نہیں آئے گا۔''

مجاز نے فوراً فقرہ کسا۔ ''اور ان نظموں کے بعد واللہ بے چاری کو چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔''

مرسلہ: احسان اللہ۔ کوئٹہ

انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے راشد دادا کو قابو میں کرلیا۔

وہ پولیس کے آدمی تھے اور حمید لنگڑے کے قتل کی سن گن لیتے پھر رہے تھے کہ بدقسمتی سے انہوں نے راشد دادا کی لن ترانیاں سن لیں اور اسے اٹھا کر لے گئے۔

ہم لوگ تو راشد دادا کو یوں پکڑتے ہوئے دیکھ کر اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ ایک آدمی دوڑا ہوا راشد دادا کے بھائی خالد کو بتانے چلا گیا تھا۔

وہ بھی راشد دادا کی ایسی باتوں سے ناراض ہوا کرتا۔ ''ابے دیکھ لینا تیری یہ بکواس کسی دن تجھے اندر کروا دے گی۔''

لیکن راشد دادا کہاں ماننے والا تھا۔

خالد نے راشد دادا کو چھڑوانے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کردی۔ پولیس والوں نے انہیں جی بھر کر مارا تھا۔

پورا محلہ اس بات کی گواہی دینے کو تیار تھا کہ راشد دادا تو ایک چڑیا بھی نہیں مار سکتا۔ آدمی کا قتل تو بہت دور کی بات ہے۔ لیکن پولیس کہاں سنتی ہے۔ اس نے مار مار کر راشد دادا کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ میں کسی کام سے لاہور چلا گیا۔ کسی کی شادی تھی۔ گھر والے بھی گئے تھے۔ ہماری واپسی ایک مہینے کے بعد ہوئی تھی۔

مجھے راشد دادا کی فکر تھی کہ اس بے چارے کے ساتھ کیا گزری ہوگی۔ میں نے شام کو ہوٹل کا رخ کیا۔ جہاں ہم سب بیٹھا کرتے تھے۔

مجھے دیکھ کر سب چہک اٹھے تھے۔ سب باری باری گلے ملنے لگے۔

''ابے لاہور میں اتنے دن لگا دیے۔'' شاکر نے شکوہ کیا۔

''بس یار، مہمان داری کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھی۔''

اتنی دیر میں پڑوس کی مسجد سے مغرب کی اذان ہونے لگی۔ ہم سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ہماری روایتوں میں کم از کم اتنا تو ہے کہ جب اذان سنائی دیتی ہے تو ہم سنبھل کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چاہے مسجد جائیں یا نہ جائیں۔

اذان ختم ہوئی تو میں نے راشد دادا کا پوچھا۔ ''یار، ہمارے راشد دادا کا کیا حال ہے۔ چھوٹے یا نہیں چھوٹے؟''

''ولی! تم نے ابھی اذان سنی یا نہیں سنی؟''

''ہاں سنی تو ہے تو پھر؟''

''یہ اذان راشد دادا ہی دے رہا تھا۔''

''کیا؟'' میں یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔

''ہاں، یار! پولیس والوں سے چھوٹ کر راشد دادا کی تو دنیا ہی بدل گئی۔ تم کو تو معلوم ہے کہ مسجد کا وضو خانہ خراب ہوگیا تھا۔ تو راشد دادا نے اپنے پیسوں سے وضو خانہ بنوا دیا ہے۔ بالکل فرسٹ کلاس۔ اس کے بعد مسجد کا مؤذن گاؤں چلا گیا تو راشد دادا نے اپنی خدمات پیش کردیں۔ اب وہی اذان دیا کرتا ہے۔''

''یارو، میں تو ہل کر رہ گیا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''راشد دادا سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔''

''تو چلو، وہ مسجد میں ہی ہوگا۔ ہم بھی وضو کر کے نماز میں شامل ہو جائیں گے۔''

''ہم چاروں مسجد کی طرف چل دیے۔ سب سے پہلے ہم نے وضو خانے کا رخ کیا تھا۔ وضو خانے کی تو اب صورت ہی بدل گئی تھی۔

پورے وضو خانے میں چمکتی ہوئی ٹائلز لگی ہوئی تھیں۔ نلکے بھی سب نئے ہو رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وضو خانے کو دیکھ کر ہی دل خوش ہوگیا تھا۔

وضو کر کے ہم نے بھی نماز پڑھ لی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو شاکر نے کہا۔ ''آ تجھے راشد دادا سے ملواتا ہوں۔''

راشد دادا کو دیکھ کر میں حیران ہی رہ گیا۔ اب اس کے چہرے پر ہلکی داڑھی تھی جو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ پڑا تھا۔

ڈھیری باتیں تھیں۔ جو اس سے کرنی تھیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا کہوں، پھر میں اس سے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ''راشد دادا، مسجد کا وضو خانہ تو بہت زبردست ہوگیا ہے۔''

''ہاں یار۔'' راشد دادا مسکرا دیا۔ ''ابے اس میں بھی تیرے بھائی کا.....'' وہ بولتے بولتے رک گیا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''رک کیوں گئے دادا، تم شاید پہلی بار سچ کہہ رہے تھے کہ اس میں تمہارا ہاتھ ہے۔ اب یہ ہاتھ ان ہی کاموں کے لیے سلامت رہیں گے دادا، میرا دل کہہ رہا ہے۔''

ولی دادا نے اپنی کہانی ختم کردی۔ اور میں ایک بار پھر معاشرے کے کرداروں میں الجھ گیا تھا۔ ایسے اور نہ جانے کتنے ہوں گے۔

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جیسی کرنی

محترم مدیر
السلام علیکم
عرصہ بعد ایک سچ بیانی بھیج رہا ہوں۔ یہ سچ بیانی ثمینہ کی ہے جس کی زندگی جہنم بن چکی ہے۔ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کے سامنے آگیا ہے اور اب وہ دن رات رو رو کر اپنی غلطی کو یاد کر کے اپنی عقل کو کوس رہی ہے۔

محمد عارف قریشی
(کوئٹہ)

شادی سے پہلے مجھے یہ تو بتایا گیا تھا کہ میرے ہونے والے شوہر کا ایک بچہ بھی ہے جس کی ماں زچگی کے دوران انتقال کر گئی تھی لیکن یہ انکشاف میرے لیے یقیناً نیا تھا جو خود انہوں نے بتایا۔

''ثمینہ! تمہیں شاید اس کا علم نہ ہو کہ میں نے صرف اس بچے کے لیے دوسری شادی کی ہے۔ مجھے اپنے لیے بیوی سے زیادہ اس کے لیے ماں کی ضرورت تھی۔ سو اگر تم میرے دل کی ملکہ بننا چاہتی ہو تو اس کی ماں بن کر دکھاؤ۔''

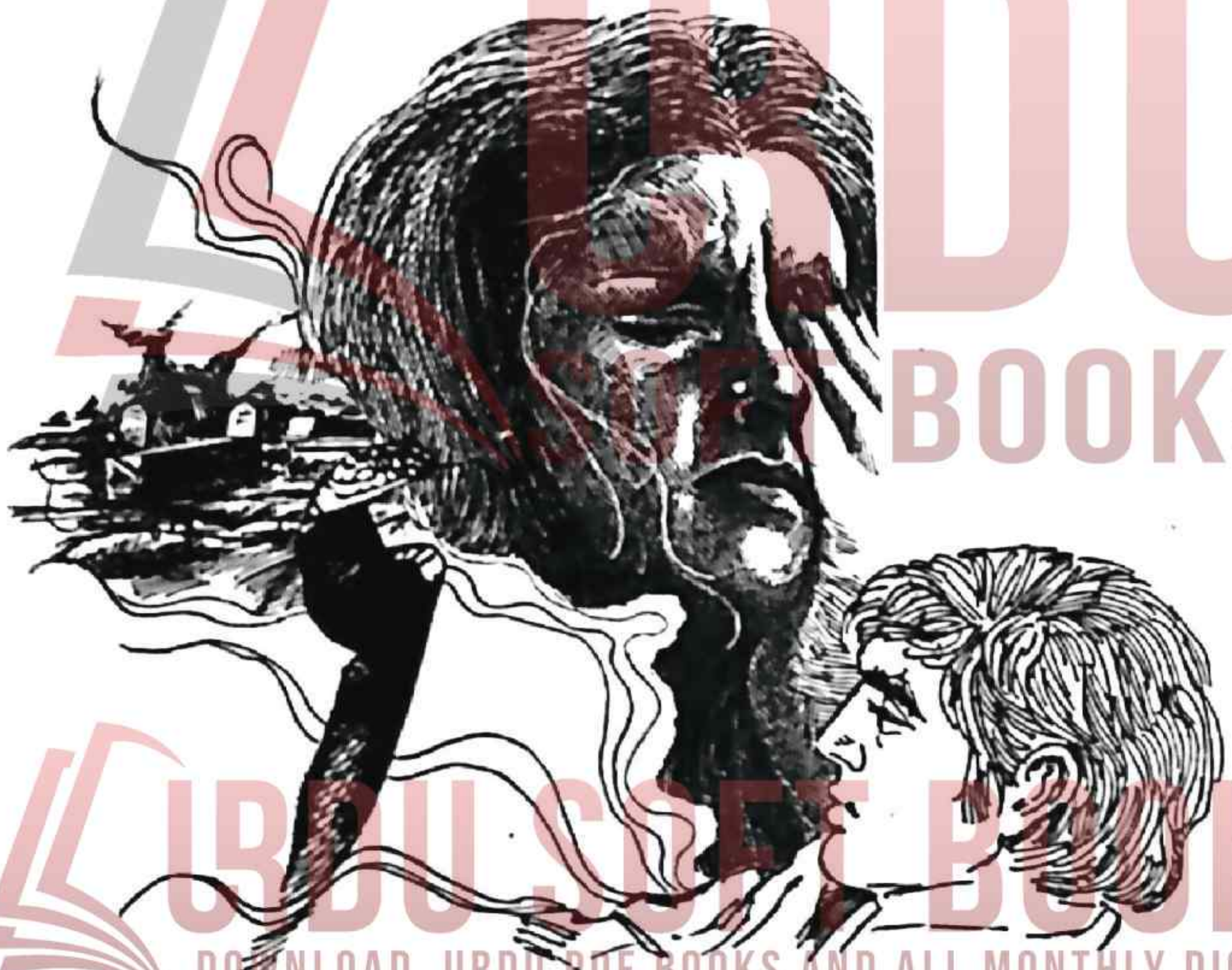

اس وقت میں حجلۂ عروسی میں بیٹھی ہوئی ان کا انتظار کررہی تھی کہ سلیم اسے اٹھائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور یہ کہتے ہوئے اسے میری جھولی میں ڈال دیا تھا۔ مجھے اس وقت ان کی یہ حرکت بہت بری لگی اور یہی وہ پہلی وجہ تھی جو میرے دل میں سلیم کی نفرت کا بیج بوگئی۔

''تو کیا اس گھر میں میری کوئی حیثیت نہ ہوگی؟ جب تک اس بلونگڑے کی ماں بن کر نہ رہوں میں جو اس گھر کی مالکن بن کر آئی ہوں۔ میرا یہاں کوئی حق نہیں۔ کیا تمام عورتیں اپنے گھروں میں اسی طرح مشروط زندگیاں گزارتی ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ کل شادی ہوئی ہے اور آج بچے پالنے لگ جاؤ۔ دو چار دن تو کھل کھیلنے کے لیے ہونے چاہئیں۔'' میں نے سوچا۔

لیکن اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے اپنے شوہر کے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو یہ راج پاٹ یہیں دھرے رہ جائیں گے جو میرے شوہر کی ثروت مندی کے باعث مجھے حاصل ہونے والے تھے۔ چنانچہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی سلیم کی پرورش و تربیت کی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیں۔

اگرچہ سلیم کے لیے ایک آیا بھی موجود تھی لیکن میرے شوہر مجھے اس کی ماں بنانے پر مصر تھے سو مجبوری تھی۔ میں ان کے سامنے سلیم کو اٹھائے پھرتی۔ اس کی بلائیں لیتی بلکہ بوسے تک لے ڈالتی لیکن یہ سب کچھ چونکہ ان کے دکھاوے کے لیے تھا سو جونہی وہ گھر سے باہر جاتے میں سلیم کو آیا کی جھولی میں ڈال دیتی کہ جنے کوئی اور مصیبت کسی اور کے سر ہو۔ لیکن آیا نہ معلوم کس مٹی کی پیدا ہوئی تھی کہ اس نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی سلیم سے بیزاری کا اظہار نہ کیا تھا۔ میں کئی دفعہ سوچتی کہ وہ سلیم کو جتنا پیار کرتی ہے شاید اس کی حقیقی ماں بھی نہ کرتی۔ اس موقع پر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا لیکن میں یہ کہہ کر اسے چپ کرا دیتی کہ ''وہ اس بات کی تو تنخواہ لیتی ہے۔''

وقت کے ساتھ ساتھ میرے دل میں سلیم کی نفرت کا پودا پروان چڑھتا رہا اور پھر اس دن تو یہ نفرت اپنی انتہا کو پہنچ گئی جب میں نے ایک بچے کو جنم دیا۔ ڈلیوری سے فارغ ہو کر میں اسپتال سے واپس آئی تو آیا سلیم کو اٹھائے ہوئے برآمدے میں کھڑی تھی۔ میں جیسے ہی قریب آئی اس نے کھلکھلا کر میری طرف اپنے دونوں بازو پھیلائے لیکن میں اس کے جذبات سے بے نیاز پاس سے گزر کر اندر داخل ہونے لگی۔ میرے شوہر نومولود نعیم کو اٹھائے ہوئے میرے پیچھے آرہے تھے۔ غالباً انہوں نے سلیم سے میری بے پروائی کو محسوس کرلیا۔ انہوں نے پیار اور غصے کے ملے جلے لہجے میں آواز دے کر مجھے کہا۔ ''ثمینہ! سلیم کو پیار نہیں کرو گی؟''

اور تب میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنی بانہوں میں لینے پر مجبور ہوگئی۔

میں چونکہ اپنے شوہر کی نافرمانی کی مرتکب ہونا نہیں چاہتی تھی۔ سو ان کی موجودگی میں سلیم کی تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔ لیکن یہ ناخوشگوار فرض مجھے زیادہ دیر تک انجام نہ دینا پڑتا کیونکہ میرے شوہر کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر رہتے اور اب تو میرا اپنا بچہ بھی ہوگیا تھا۔ پھر کسی دوسرے کے بچے سے لپٹنے چمٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ بہرحال میری نفرت و دھتکار کے باوجود بچہ مجھے ماں سمجھتے ہوئے عمر کی منزلیں طے کرنے لگا۔

وہ اندازاً گیارہ سال کا ہوگا کہ ایک روز اچانک آیا بھاگی بھاگی میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔ ''بیگم صاحبہ! سلیم میاں کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے، وہ اپنی ٹانگ پکڑ کر بہت رو رہے ہیں۔''

میں سلیم کے کمرے میں گئی تو وہ بار بار اپنی ٹانگ کے نچلے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رو رہا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر اِدھر اُدھر سے دیکھا۔ ایک جگہ زخم کا چھوٹا سا نشان تھا جس سے تھوڑا تھوڑا خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

اس نے بتایا۔ ''پتا نہیں مجھے کسی شے نے کاٹ لیا ہے۔''

میں نے اپنے اندازے کے مطابق آیا سے کہا۔ ''کسی کیڑے مکوڑے نے کاٹا ہے۔ کوئی خطرے والی بات نہیں۔ باتھ روم میں ڈیٹول رکھا ہے وہ لاکر ذرا لگا دو۔'' اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

لیکن ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ آیا پھر دوڑی دوڑی آئی اور کہنے لگی۔ ''سلیم میاں کی طبیعت زیادہ خراب ہوتی جارہی ہے جی! خدا کے لیے کسی ڈاکٹر کو بلوائیے۔''

اس کا اترا ہوا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سلیم کے لیے کتنی پریشان ہے لیکن خدا جانے میرے اندر کی عورت کہاں مرگئی تھی مجھے اس کی حالت پر کوئی رحم نہیں آرہا تھا۔ بہرحال میں نے آیا کے اصرار پر ڈاکٹر کو بلوا بھیجا۔ ڈاکٹر نے سلیم کا معائنہ کرنے کے بعد بڑے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

"آپ نے مجھے بلانے میں بڑی دیر کردی۔ اس وقت آپ کے بچے کی زندگی سخت خطرے میں ہے۔ میں دوا بھجواتا ہوں۔ گھنٹے کے وقفے سے اس کی چار خوراکیں اسے پلایئے شاید افاقہ ہو جائے ورنہ اسے اسپتال لے جایئے گا۔"

ڈاکٹر بڑے تعجب سے مجھے دیکھنے لگا۔ شاید میرے چہرے پر پریشانی کے آثار تلاش کررہا تھا۔ وہ یقیناً سوچ رہا ہوگا کہ یہ کیسی ماں ہے جسے اپنے بچے کی تکلیف کا کوئی احساس نہیں۔ میں نے جھینپ کر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اسی لمحے آیا نے اس سے سوال کیا۔ "ڈاکٹر صاحب! سلیم میاں کو ہوا کیا ہے؟"

"تعجب ہے آپ لوگوں کو اب تک پتا نہیں چلا اسے سانپ نے ڈسا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا تو آیا کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ میں خود بھی لرز گئی اور پریشانی کے عالم میں ڈاکٹر سے کہا۔

"براہِ کرم جلدی دوائی بھجوایئے۔" اور وہ ملازم کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ملازم دوائی لے کر واپس آیا تو آیا نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے شیشی لے لی اور پہلی خوراک سلیم کے حلق میں انڈیل دی۔

سلیم کی حالت واقعی اس وقت خطرے سے خالی نہ تھی۔ آیا بار بار اس کے اوپر جھک کر اسے ہلانے کی کوشش کررہی تھی لیکن وہ خاموش تھا۔ اِدھر میرے ذہن میں خیالات کا ایک جھکڑ چل رہا تھا۔ میں باہر آگئی اور لان میں ٹہلنے لگی کہ اچانک میرے دماغ میں ایک بھیانک سوچ وارد ہوئی۔

اگرچہ یہ خیال مجھے اس سے پہلے بھی کئی بار آیا تھا کہ اگر سلیم نہ ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔ میرے خاوند کی ساری جایداد نعیم کے حصے میں آتی۔ اب نصف تو یہ لے جائے گا اور آج جب کہ سلیم بستر مرگ پر تھا اس شیطانی خیال نے ایک مرتبہ پھر میرے وجود کا احاطہ کرلیا۔ "سلیم سے جان چھڑانے کا اس سے اچھا موقع پھر کب ملے گا؟ کیوں نہ اسے موت کے منہ میں جانے دیا جائے۔ پھر میرے بیٹے کو ساری جایداد کا وارث ہونے سے کوئی روک نہیں سکے گا۔" میں نے اپنے آپ سے کہا اور پھر چند لمحوں میں اس پر عمل درآمد کا فیصلہ کرلیا۔

میرے شوہر اس روز بھی شہر سے باہر تھے۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ میں سلیم کے کمرے میں گئی تو آیا بدستور اس پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم اپنے کوارٹر میں جاکر سو جاؤ۔ سلیم کے پاس میں بیٹھوں گی۔"

اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور انکار میں سر ہلا دیا۔ مجھے اس کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا اور میں نے درشت لہجے میں دوبارہ اسے حکم دیا۔

"سنا نہیں تم نے، رات کو اس کے پاس میں رہوں گی۔ تم جاکر سو جاؤ۔"

"بیگم صاحب! سلیم میاں سخت تکلیف میں ہیں۔ میرا جی ان کو چھوڑ کر جانے کو نہیں چاہتا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"میں اس کی ماں نہیں کیا؟ تم مجھ سے زیادہ اس کی ہمدرد ہو؟" میں نے سختی سے کہا تو وہ سسکتی ہوئی باہر چلی گئی۔

میں نے ایک نظر سلیم کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا زہر بتدریج اپنا اثر دکھا رہا ہے کیونکہ اس کا جسم نیلا پڑنا شروع ہوگیا تھا۔ مجھے اس پر پیار آتے آتے رہ گیا۔ میں اٹھ کر باہر آگئی اور اپنے عمل کے نتائج پر غور کرنے لگی۔ دل و

ایک بار مجاز کے پڑوس میں چوری ہوگئی۔ تفتیش کے لیے پولیس وغیرہ آئی، سارے محلے والے جمع ہوگئے۔ اس واردات کے موقع پر لوگ اپنی اپنی رائے دے رہے تھے۔ صاحب خانہ بے چارے بہت پریشان تھے۔ مجاز نے ان بے چاروں سے اظہار افسوس کیا۔ اس کے بعد آپ صاحب خانہ کو مجمع سے الگ لے گئے اور بہت ہی رازدارانہ انداز میں سوکھا سا منہ بنا کر بولے۔ "بھئی ہو نہ ہو مجھے تو یہ کسی چور کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔"

مرسلہ: سید معصوم رضا۔ لاہور

ایک دفعہ ریڈیو پروگرام کے بعد جب روشن آراء بیگم اسٹوڈیو سے باہر آرہی تھیں تو شعبہ موسیقی کے ایک پروگرام پروڈیوسر دفورِ عقیدت سے آگے بڑھے اور ہاتھ تھام کر عرض کیا۔ "بیگم صاحبہ! سبحان اللہ آپ بہت اچھا گاتی ہیں۔"

روشن آراء بیگم نے ایک معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ اس عقیدت مند کی طرف دیکھا اور کہا:

"آپ کو آج پتا چلا ہے!"

مرسلہ: سید معصوم رضا۔ لاہور

دماغ میں خاصی دیر کی جنگ کے بعد بالآخر فیصلہ میرے حق میں ہوا اور پھر پہلی خوراک کے بعد دوا کی ایک بوند بھی میں نے سلیم تک نہیں پہنچنے دی۔ صبح میں نے ساری شیشی کھڑکی سے باہر انڈیل دی۔

اس رات میں سو تو نہ سکی بس سلیم کے کمرے میں آتی جاتی رہی۔ صبح اس کے کمرے میں گئی تو آیا موجود تھی۔ نہ جانے وہ کس وقت کی آئی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے پہلا سوال دوا کی شیشی کے بارے میں کیا۔ میں نے صاف جھوٹ بول دیا "وہ تو میں نے ساری دوا پلا دی تھی۔"

وہ میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے سلیم کے گالوں پر تھپکیاں دینے لگی اور اسے سلیم سلیم کہہ کر پکارنے لگی لیکن میری بدنصیبی میری توقع سے پہلے کام کر چکی تھی۔ اب وہاں سلیم نہیں بلکہ اس کا خاموش جسم پڑا تھا۔ جیسے ہی آیا کو اس کا احساس ہوا وہ چیخ مار کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ میں نے اپنے چہرے کو رنجیدہ بناتے ہوئے اسے گلے لگا لیا اور کہا۔ "رو نہیں بہن! اللہ کی یہی مرضی تھی۔ جاؤ نوکر سے کہو اس کے ابا کو تار دے آئے۔"

تار (ٹیلی گرام) تو اسی وقت دے دیا گیا مگر میرے شوہر وقت پر نہ پہنچ سکے۔ ان کے آنے سے پہلے سلیم کو قبر میں اتار دیا گیا۔ دیر بھی خاصی ہو گئی تھی اور میں بھی یہی چاہتی تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے اسے لوگوں کی نظروں سے چھپا دیا جائے کیونکہ جس وقت بھی کوئی اس کے قریب آتا مجھے ایک انجانا خوف گھیر لیتا۔

میرے شوہر رات گئے گھر پہنچے اور اسی وقت قبرستان جانے پر اصرار کرنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا انہوں نے سلیم کی موت کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی۔ پہلے تو میں ان کی یہ کیفیت دیکھ کر ڈر گئی کہ کہیں وہ سلیم کی اچانک وفات کی ذمہ داری مجھ پر نہ ڈال دیں، کہیں انہیں حقیقت کا ادراک نہ ہو جائے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"میں نے تو سلیم کی جان بچانے کی بڑی کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔" اور سسکیاں لینے لگی۔

میرے شوہر کہہ رہے تھے۔ "خدا کی رضا یہی تھی۔ اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔" اور مجھے یقین ہو گیا کہ انہیں مجھ پر کوئی شبہ نہیں۔

شاید میں پہلے یہ بتانا بھول گئی کہ نعیم کو پانچ سال کی عمر میں ہی ہم نے ایک بڑے شہر کے انگریزی اسکول میں بھیج دیا تھا۔ دراصل میں چاہتی تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کسی بڑے عہدے پر فائز ہو۔ اب میں نے اسے واپس بلانے کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اتنی بڑی جایداد کا تنہا وارث ہو گا تو اسے ملازمت کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں حسب ضرورت پڑھ لکھ کر باپ کی جگہ سنبھال لے تو اچھا ہے، یہ سوچ کر میں نے اپنے شوہر سے کہا۔

"آپ نعیم کو واپس لے آئیں۔ تنہائی میں میرا جی بہت گھبراتا ہے۔"

"میرے شوہر جس روز اسے لینے کے لیے جا رہے تھے۔ اچانک اس کے اسکول کی انتظامیہ کی طرف سے ایک تار موصول ہوا کہ کل وہ گارڈن میں کھیل رہا تھا کہ کہیں سے ایک سانپ نکل آیا۔ اس نے بے خیالی میں اس کی دم پر پیر رکھ دیا۔ ہم نے بہت کوشش کی مگر اسے بچا نہ سکے۔ جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔ میت بھیجی جا رہی ہے۔"

مجھے اپنے اردگرد ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر میں بے ہوش ہو کر گر گئی۔ اگلی صبح ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا کہ نعیم کو دفن کر دیا گیا ہے۔ میں نے اس پر اپنے شوہر سے احتجاج کیا تو انہوں نے کہا۔

"نعیم کا جسد کل سہ پہر یہاں پہنچ گیا تھا۔ تمہیں ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی لیکن مایوسی ہوئی بالآخر کل شام کو ہم نے اسے سپرد خاک کر دیا۔"

میں دیوانہ وار قبرستان کی طرف دوڑی مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سلیم کی قبر کے ساتھ ایک چھوٹی سی قبر اور بنی ہوئی تھی۔ صرف چند دن کے وقفے سے عدم کو سدھارنے والے دونوں بھائی چین کی نیند سو رہے تھے۔ میں خاصی دیر تک دونوں قبروں سے لپٹ کر روتی رہی۔

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ نعیم کو مرنا ہی تھا کیونکہ چند روز پیشتر میں نے جس معصوم کی جان لی تھی وہ بھی تو کسی کا لعل تھا۔

بلاشبہ قدرت نے میرے جرم کی سزا مجھے فوراً اور عبرتناک دی۔ اب میں ہوں، میرے شوہر اور اتنی بڑی جایداد جس کا کوئی وارث نہیں۔ نعیم میرا پہلا اور آخری بچہ تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اب میرے ہاں کبھی اولاد نہیں ہو سکتی۔

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

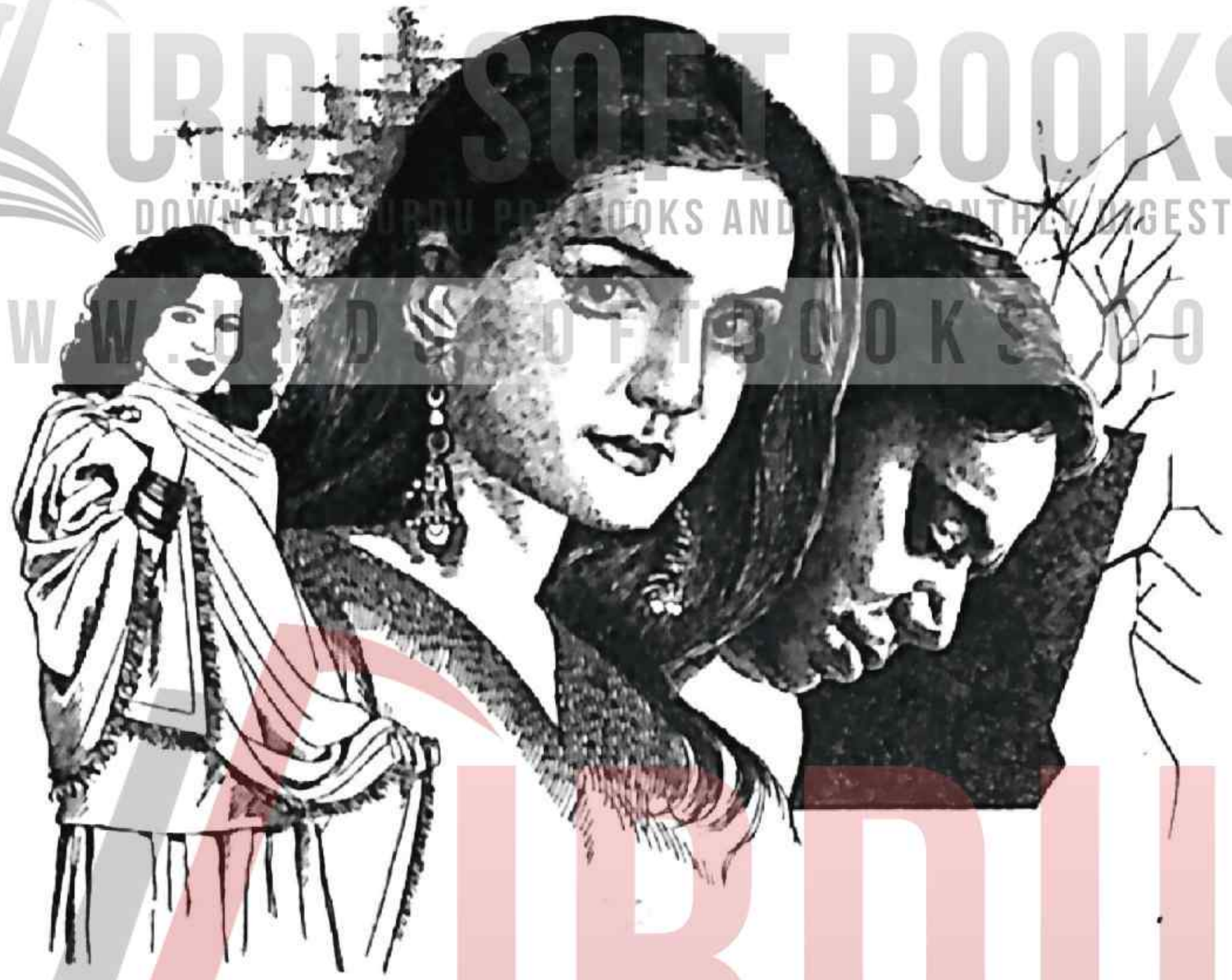

آئیڈیل

محترم مدیراعلیٰ
السلام علیکم

اس کہانی کے مرکزی کردار سے میری ملاقات ٹرین میں ہوئی تھی۔ دورانِ سفر اس نے جو روداد سنائی وہ مجھے سرگزشت کے لیے موزوں لگی۔ یہ ان لڑکیوں کے لیے سبق آموز تحریر ہے جو آئیڈیل کے لیے اپنا سب کچھ کھو دیتی ہیں۔

مظہر سلیم
(رحیم یار خان)

یہ آنسو بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں خوشی وغمی کے فرق کو ہی نہیں سمجھتے۔ جہاں جذبے انتہا کو پہنچتے ہیں چھلک پڑتے ہیں۔

خوشی سے میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ ''کیسی ہو تم؟'' میں نے سرتاپا اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

دو سال کی جدائی کے بعد رافعہ میرے سامنے آئی تو رافعہ نے اپنا بچہ بیڈ پر لٹا دیا جو اس کے کاندھے پر سر رکھے سو گیا تھا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟ کیا حالت کر

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

لی ہے تم نے اپنی؟" اس نے سر سے پاؤں تک مجھے دیکھا۔

"کیوں؟ کیا ہوا ٹھیک تو ہوں میں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا۔ "مسقط سے کب آئیں؟ اطلاع بھی نہیں دی آنے کی۔"

"ایک ہفتہ ہو گیا ہے آئے ہوئے، یقین مانو ہماری آمد کے بعد گھر میں مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی وقت ہی نہیں مل رہا تھا تمہارے پاس آنے کا اور ویسے بھی میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

ہم باتیں کر رہی تھیں کہ امی بھی آ گئیں۔ "آہا رافعہ بیٹی آئی ہے۔" امی رافعہ کو دیکھ کر خوش دلی سے بولیں۔ "کیسی ہو بیٹا؟"

"اللہ پاک کا بڑا کرم ہے آنٹی! آپ کیسی ہیں؟" رافعہ نے کہا۔

"رب کریم کا شکر ہے میں بھی ٹھیک ہوں۔" امی سامنے پڑے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ پڑوس سے سالن پکنے کی مہک اٹھی تو مجھے ابکائی آ گئی میں اٹھ کر واش بیسن کی طرف بھاگی اور قے کر دی۔

رافعہ اٹھ کر میرے پاس آ گئی۔ "کیا ہوا نجمہ؟" اس نے میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

اس کے سوال کے جواب میں، میں چپ رہی کلی کر کے منہ دھو کر اس کی طرف دیکھتی رہی، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر صوفے تک لے آئی۔ "اب میں سمجھ گئی تمہاری آنکھوں کے گرد حلقوں کا سبب کون سا ماہ چل رہا ہے؟" اس کے لہجے میں شوخی آ گئی۔

"تیسرا شروع ہوا ہے۔" میں شرم سے بیر بہوٹی بن گئی۔

"اچھا لڑکیو تم باتیں کرو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" امی کچن کی طرف چلی گئیں۔

"ماشاء اللہ بہت بہت مبارک ہو، دلہا بھائی کا سناؤ وہ کیسے ہیں؟"

میں چپ رہی۔ رافعہ نے اپنا سوال دہرایا۔ میں کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی پھر نظریں جھکا کر بولی۔ "پتا نہیں۔"

"کیا مطلب؟" رافعہ اچھل پڑی پھر میرے پاس آ کر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "نجمہ تمہاری آنکھوں کی نمی بہت کچھ کہہ رہی ہے، لیکن میں تم سے سننا چاہتی ہوں کہ ان خوبصورت آنکھوں میں آنسوؤں کے اسباب کیا ہیں؟"

میں رافعہ کے گلے لگ کر رونے لگی، وہ کافی دیر مجھے تھپکیاں دیتی رہی، جب دل کا غبار ہلکا ہو گیا تو میں نے کہا۔ "میں پرسوں تمہارے ہاں آؤں گی تمہیں سب تفصیل سے بتاؤں گی۔"

"اچھا ٹھیک ہے لیکن پلیز تم اپنا خیال رکھو۔ ایسی حالت میں کسی بھی قسم کی پریشانی تمہارے اور بچے کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔" اس نے میرا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

وہ مجھے تسلی دلاسے دے کر اور چائے پی کر چلی گئی اور میں یادوں کی پگڈنڈیوں پر چلتی ہوئی ماضی میں چلی گئی۔

میرا گھرانا چار افراد پر مشتمل تھا۔ امی، ابو میں اور میرا چھوٹا بھائی زین جو مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ ابو کی بچوں کے کھلونے بنانے کی ایک چھوٹی سی فیکٹری تھی۔ عزیز رشتہ داروں میں ہمارا گھرانا سب سے زیادہ خوشحال تھا۔ میری ایک ہی دوست تھی رافعہ، بہت پیاری اور ہنس مکھ۔ کالج ہو یا کالج کی کینٹین۔ شاپنگ سینٹر ہو یا بیوٹی پارلر، مینا بازار، کوئی فنکشن ہو یا پارٹی۔ میں اور رافعہ ہر جگہ ایک انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑی رہتی تھیں۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ ہم میں سے کوئی ایک اپنا ذاتی کام کسی ایک سہیلی کے بغیر مجبوراً کرتی ہو۔ ورنہ کوشش دونوں کی یہی رہتی تھی کہ ہمارا کام اسی وقت تکمیل کو پہنچے جب ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر نکلیں یا مشورے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں۔

ہم دونوں الگ الگ محلوں میں رہتی تھیں لیکن ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں اور ایک ہی کلاس میں بیٹھتی تھیں۔ ہم ایک جیسے ہی لباس پہنتے اور کھانے پینے خریداری کے معاملے میں بھی ہم خیال تھے۔ دونوں کی خواہش بھی یکساں تھی کہ کاش ایسا ہو جائے کہ ہماری ڈولیاں اور جنازے ایک ہی دن گھر سے نکلیں بلکہ ہم دفن بھی ایک ہی قبر میں ہوں۔

لیکن اس بات پر کبھی ہم متفق نہیں ہوئے کہ ہم دونوں کا شوہر بھی ایک جیسا ہی ہو بلکہ اپنے اپنے جیون ساتھی کے بارے میں مختلف رائے رکھتی تھیں۔ مجھے پان کھانے والے بھاری بھرکم اور کالے کلوٹے مردوں سے سخت نفرت تھی۔ میرا خیال تھا کہ بڑی توند مردوں کی وجاہت پر بدنما داغ ہے۔ اور اس پر مستزاد پان سے رنگین دانت اس کی بدصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ بس میں تو چاہتی تھی درمیانہ قد ہو، رنگت بالکل صاف نہ ہو تو کم از کم گندمی ضرور ہو اور نین نقش اچھے ہوں۔ گنجا بالکل نہ ہو۔ ایسا تھا میرا آئیڈیل۔ ایسی خوبیاں میں اپنے شریکِ سفر میں دیکھنا چاہتی تھی۔

رافعہ ذرا شاعرانہ خیالات کی مالک تھی اس کا کہنا تھا۔ "مرد ایسا ہو کہ عورت سے قد میں چھوٹا نہ لگے۔ مردانہ

وجاہت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو۔ ٹانگیں اتنی لمبی نہ ہوں کہ اونٹ یاد آجائے اور دانت اتنے بڑے نہ ہوں کہ ہاتھی نظروں کے سامنے جھومنے لگے بلکہ ایک دم سفید، انار کے دانوں کی طرح جڑے ہوئے ہوں۔ ہمدرد ہو گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے والا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ سر میں درد ہمارے ہو اور چائے اسے چاہیے۔ صبح ہی صبح بچوں کو تیار کروادے۔ کبھی کبھار چادر تکیہ غلاف وغیرہ تبدیل کروادے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ طبیعت خراب ہو تو کھانا اگر نہ بنا سکے تو ہوٹل سے لانے پر منہ نہ بنائے۔ اگر یہ خوبیاں ہوں تو معمولی شکل وصورت والے سے بھی نبھا کرلوں گی۔"

غرض ہم دونوں نے اپنے اپنے آئیڈیل بنا رکھے تھے۔ آئیڈیل تراشنے میں ٹی وی ڈراموں اور فلموں کا بھی بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وجیہہ ترین نوجوانوں سے اداکاری کرانے والے ہم جیسی لڑکیوں کے دل میں آئیڈیل کا جنون بھرتے ہیں۔ میں بھی ایک لڑکی ہوں اسی لیے میں نے آئیڈیل کے بھوت کو سر پر سوار کرلیا تھا۔

جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر تو آتے ہی رہتے ہیں۔

رافعہ کے گھر پہلا ہی پتھر ایسا آیا کہ نشانہ ٹھیک ٹھیک لگا۔ میزل میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو رافعہ اپنے آئیڈیل میں دیکھتی تھی۔ اچھا کھاتا پیتا گھرانا تھا اس پر طرہ یہ کہ اس کا مسقط میں اپنا کاروبار تھا۔ وہ صورت وشکل آن بان وجاہت میں کسی ریاست کے شہزادے سے کم نہیں تھا۔ گویا رافعہ کو اس کے خوابوں کی تعبیر مل گئی اور چٹ منگنی، پٹ بیاہ کے مصداق اس کی شادی ہوگئی۔

رافعہ خوشی سے پھولے نہیں سمارہی تھی۔ میں بھی اپنی دوست کی خوش قسمتی پر نازاں تھی اسی خوشی میں نہ جانے کتنی بار رافعہ کی قسمت پر رشک کرتے ہوئے بنی سنوری دلہن کو اپنی بانہوں میں جکڑ کر اس کے دولہا کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔

میں وقفے وقفے سے دلہا کے خدوخال، شاہانہ وقار اور برأت کی آمد کا آنکھوں دیکھا حال سرگوشی کے انداز میں رافعہ کے کانوں میں پھونکتی رہی۔ ایک تو دلہن اس پر میرا انداز بیاں، سرخی اس کے گالوں میں ایسی سمائی کہ تمام رعنائیاں شرما کر رہ گئیں اور پھر اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتے ہوئے، رافعہ، میری دوست مجھے تنہا چھوڑ کر مسقط چلی گئی۔

ایک وہی میری دوست تھی، کسی اور سے ایسی قربت نہیں تھی اس لیے میں اس کی کمی شدت سے محسوس کرنے لگی تھی۔ یوں بھی اس کے جانے کے بعد سے میں نے خواب دیکھنے کی عادت بنالی تھی۔ ہمہ وقت خوابوں کے درمیان گھری رہتی تمناؤں کے سیلاب ہر وقت مجھے اپنے بہاؤ میں رکھتے۔

میں سوچتی، وہ بھی کیا دن ہوں گے جو سارے کے سارے میرے اپنے ہوں گے۔ راتیں جواں ہوں گی اور تنہائیاں دل کے بہلاوے کا سامان ہوں گی۔ ہر ساعت پر صرف میری اجارہ داری ہوگی اور زندگی میں رنگ اتر آئیں گے۔

پھر ایک دن میرا بھی رشتہ آگیا۔ میں نے اکثر عزیزوں سے سنا تھا کہ طارق بہت با اخلاق اور اچھی خصلتوں کا مالک ہے لیکن اڑتے اڑتے یہ خبر بھی مجھ تک پہنچی کہ اداسی ہر دم اس کے چہرے پر گہرے بادلوں کی طرح چھائی رہتی ہے۔ چپ نے ایک دم اسے مٹی کا مادھو بنادیا ہے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہوسکتی ہے آخر ایسا کون سا غم ہے؟ کہیں یہ شادی طارق کی مرضی کے خلاف تو نہیں ہورہی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے دل پر کوئی اور لڑکی راج کررہی ہو؟ اس کے والدین اپنی پسند اپنا حق اس غریب کے ارمانوں کا خون کر کے اس پر مسلط کررہے ہوں اگر ایسا ہوا تو شادی تو ہو ہی جائے گی لیکن میں حقیقی خوشیوں سے ہمیشہ کے لیے محروم رہوں گی۔ میں نے اس خدشے کا اظہار امی سے کیا۔ امی نے ایک دن باتوں باتوں میں طارق کے چہرے پر چھائی مردنی کا ذکر اس کے والدین سے کر ہی دیا۔ جواب میں طارق کی والدہ نے کہا۔ "یہ بات ہم نے بھی محسوس کی ہے جب طارق سے پوچھا تو اس نے کہا یہ گھرانا اور تصویر میں دکھائی جانے والی لڑکی اسے اتنی پسند آئی ہے کہ اس پسند نے خوف کو جنم دے دیا ہے کہ کہیں یہ رشتہ ٹوٹ نہ جائے اور کوئی بات نہیں..... اگر خدانخواستہ کوئی اور بات ہے بھی تو ہماری ہونے والی شوخ وچنچل اور پیاری سی بہو اس سنجیدگی کی کیاری میں خوشیوں کے پھول کھلادے گی۔"

عورت ٹھہری تعریفوں کی بھوکی، شوخ وچنچل وغیرہ جیسے القاب اپنے بارے میں سنے تو میرے تمام وسوسے بھاپ کی طرح اڑ گئے اور جو رہ گیا وہ یہ کہ میں اپنے سسرالیوں کی تمنا ضرور پوری کروں گی۔

میں ہر روز اپنے کمرے میں آکر طارق کی تصویر نکالتی، ہر زاویے سے دیکھتی پرکھتی رہتی۔ تصویر میں وہ عمر میں مجھ سے تھوڑا سا بڑا لگتا تھا۔ نین نقش بھی اچھے لگ رہے تھے۔ قد وقامت اور جسم کے سائز کا اندازہ تصویر چھوٹی ہونے کی وجہ

سے نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر تھی جس میں صرف چہرہ اور سینے کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ آنکھیں بھوری بھوری تو نہ تھیں لیکن بال گھنے تھے۔ گھنگریالے نہ سہی سائڈوں سے خم کھائے ہوئے تھے۔

"جی جناب! کبھی تو ایسا موقع فراہم کریں کہ میں جناب کا دیدار کرسکوں صرف دیدار یا یہ دیدار پھر شادی کے بعد ہوگا۔ بڑے کٹھور ہیں جی....." میں تصویر سے باتیں کرنے لگتی۔ میرا بس چلتا تو میں اس خواہش کو گھر کے افراد کے سامنے رکھتی کہ ایک بار صرف ایک بار میری قسمت کے اس خریدار کا مکھڑا دکھا دیں۔ میرے وسوسوں اور در بدر بھٹکتی سوچوں کو وہ راستہ مل جائے جو میرے آئیڈیل کی طرف جاتا ہے پھر جب چاہیں شادی کردیں۔ لیکن میں ایسا صرف سوچ سکتی تھی کہہ نہیں سکتی تھی کیونکہ ہمارے معاشرے کے اکثر گھروں نے بعض معاملات میں عورت کو صرف سوچنے تک محدود کردیا ہے اور کنواری لڑکی پر کچھ زیادہ ہی زبان بندی کا قانون نافذ ہے۔ منگنی ہوئے چھ ماہ گزر گئے اور میں چاہتے ہوئے بھی منگیتر کو نہ دیکھ سکی۔

وقت کے پاؤں میں بیڑیاں کون ڈال سکا ہے وہ تو بڑھتا ہی رہتا ہے اور بڑھتے بڑھتے وہ گھڑی بھی لے آیا جب ہر لڑکی کی طرح مجھے بھی بابل کے گھر کو خیرآباد کہنا پڑا۔

بیلے کی کلیوں سے بنی ہوئی جھالروں اور گلاب سے ڈھکی بجی معطر سیج کے حوالے کرکے مجھے سب لڑکیاں اور افراد خانہ دبی دبی ہنسی کے ساتھ ایک ایک کرکے کھسک گئے۔ مجھے ایسا لگا جیسے جاتے جاتے سب یہی کہہ گئی ہوں کہ لو سنبھالو یہ رات..... ہر لڑکی کی زندگی میں ایسی رات آتی ہے جہاں دنیا کے تفکرات اور غم خود بخود مقید ہوجاتے ہیں صرف خوشیوں کی حکمرانی رہ جاتی ہے۔ ارمان سرنگوں ہوکر ہر حکم بجالاتے ہیں اور یہی وہ رات ہوتی ہے جہاں عورت اپنے گوہر غیر مشروط طور پر اپنے سر کے تاج پر لٹا دیتی ہے بلکہ لٹاتی رہتی ہے کہ یہی میرا محافظ بھی ہے حکمران بھی اور مجازی خدا بھی۔ لیکن یہاں معاملہ آئیڈیل کا بھی تھا۔ ایسا شوہر جس کا خواب میں نے جوانی کی سرحد پر قدم رکھتے ہی دیکھنا شروع کردیا تھا۔

دروازے کی چرچراہٹ اور قدموں کی چاپ نے طارق کی آمد کا اعلان کیا۔

چھ ماہ کی کروٹیں لیتی مضطرب خواہش میری آنکھوں سے باہر نکلنے کے لیے تڑپ تڑپ سی گئی۔ سوچا ایک نظر تو دیکھ لوں کہ وہ کیسے لگ رہے ہیں؟ کسی فلم کے ہیرو کی طرح یا کسی شہزادے کی طرح۔ میں نے پلکیں اٹھانا چاہیں لیکن ایسا لگا جیسے حیا اور شرم من من کے پتھر بن کر پلکوں پر براجمان ہوگئے ہوں پلکیں اٹھائے نہ اٹھیں۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئے لجاجت اور شرماہٹ سے میں اپنے آپ میں سکڑتے سکڑتے چھوئی موئی بن گئی، نگاہیں ایک بار پھر پلکوں کا نقاب اٹھانے کے لیے بے چین ہوگئیں لیکن پھر اٹھتے اٹھتے حجاب کی لپیٹ میں آکر کانپ سی گئیں۔

"آداب۔" طارق نے بہت ہی آہستگی سے کہا۔

گھونگھٹ کی اوٹ میں، میں شرم سے سرخ ہو رہی تھی۔

"مجھے طارق شہزاد کہتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو نجمہ کہتے ہیں، جواب نجمہ طارق بن گئی ہیں۔"

طارق نے میرا نام اس انداز سے لیا کہ میں زیرلب مسکرادی۔

وہ کچھ دیر چپ رہے۔ لمحوں پہ لمحے ڈھیر ہوتے رہے ہر گزرتا پل دل کی دھڑکنوں کو زیروزبر کررہا تھا۔

ان کی آواز ایک بار پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔ "اب ہم اتنے بھی بُرے نہیں کہ زبان ہم کلامی سے پرہیز کرے اور نگاہیں شرماہٹ کا بہانہ بنا کر پلکوں کے شامیانے میں قید کرلی جائیں۔"

میں نے دل ہی دل میں طارق کے لہجے کی شائستگی اور شاعرانہ انداز گفتگو کی تعریف کی لیکن حیا نے اپنے پنجوں میں ایسا جکڑا کہ میں خواہش کے باوجود بھی خود کو اس حصار سے باہر نہ نکال سکی۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔" اچانک میری نظریں انجانی قوت کے ساتھ اوپر اٹھ گئیں ادھر طارق کی باچھیں کھل گئیں۔

"یہ کیا۔" اچانک میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ طارق اپنی آواز کے برعکس بے ہنگم اور بے ڈول سا تھا سراسر میرے آئیڈیل کی ضد۔ ایک نظر صرف ایک نظر سے میرے آئیڈیل کا بت دھڑام سے زمین پر آگرا۔ میرے ارمان و احساسات کا آئینہ کرچی کرچی ہوکر بدنما عکس پیش کرنے لگا۔ طارق سانولی رنگت کا ایک عام سا آدمی تھا۔ جس کے چھوٹے قد پر موٹاپا بہت بُرا لگ رہا تھا۔

جو تصویر مجھے دکھائی گئی تھی، سامنے کھڑے آدمی کا چہرہ بیشک وہی تھا لیکن تصویر میں چہرہ صاف تھا بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے لیکن جو آدمی میرا شوہر بن کر آیا تھا اس کی رنگت گہری سانولی اور بال بے ترتیب سے تھے۔ "اتنا بڑا دھوکا۔"

میرے ذہن میں دھماکا سا ہوا۔ یعنی تصویر کو فوٹو شاپ میں صاف کیا گیا تھا؟

خوشیوں سے لبریز اور ارمانوں سے سجی میری زندگی میں آئی اس رات نے مجھے لرزا کر رکھ دیا۔ میں اندر ہی اندر زور سے چیخی۔ "نہیں نہیں میرے خوابوں کو اتنی بدنما تعبیر نہیں مل سکتی۔"

میری ذات میں اتنی ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ شب عروسی کہرام میں تبدیل ہوگئی۔ شوہر کی آمد پر طلوع سحر کی طرح جو مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اب ان ہونٹوں پر شام غم کی داستان مرتب ہوگئی۔ آنسوؤں نے تمام ولولوں کو تازیوں کی طرح ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ شہزادہ نہ جانے کہاں کھو گیا جس کی آواز ساعتوں میں رس گھول رہی تھی۔ سوچیں ہتھوڑا بن کر میرے ذہن پر بری طرح برسنے لگیں۔ سہاگ رات ہے یہ؟ نہیں نہیں، یہ تو شہر خموشاں ہے اور مجھے ایک دیئے کی صورت ٹوٹی پھوٹی قبر پر رکھ دیا گیا ہے کہ سلگتی رہ ساری زندگی، یہی تیری قسمت ہے اور یہی ہے تیری چاہت اور خواہش کا انعام اور یہی ہے سانولی رنگت والے چھوٹے قد کے موٹے آدمی سے نفرت کرنے کی سزا۔

پھر یہ رات مجھے بدن اور سرد سرد جذبات کے ساتھ بے رنگ ماحول اور وجود کی باسی خوشبو کے ساتھ گزر گئی مجھے ایسا لگا جیسے کسی جلاد نے قانونی اور شرعی پھندا ڈال کر تختہ دار پر چڑھا دیا ہو۔ میں جس کی تصویر کے ساتھ گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کیا کرتی تھی، معاملہ اب الٹ ہوگیا تھا۔ میرے روبرو آ کر اسے زبان مل گئی تھی جب کہ میری قوت گویائی چھن گئی۔ خاموشی کو میں نے اپنا شعار بنالیا، ولیمہ والے دن ایسی چپ لگی کہ میں بت بن گئی اور پھر میں نے گوشہ تنہائی کو گوشہ عافیت سمجھا۔ نہ کسی سے بات چیت اور نہ ہی کوئی مشغلہ۔ میرے چہرے کی دردانگیزی اور افسردہ نگاہی تمام اہل خانہ کے لیے معما بن گئی تھی۔

میں نے بارہا سوچا کہ سسرالیوں کی اٹھتی ہوئی سوالیہ نظروں کا کیا جواب دوں کیسے جواب دوں؟

"کیسے بتاؤں انہیں کہ میرے ارمانوں کی برأت تو دو چار قدم بھی نہ بڑھنے پائی تھی کہ لٹ گئی۔ میرا محافظ ہی میرے نصب العین کا قاتل نکلا اور اس کے ہمنوا اور ہمدم کوئی اور نہیں میرے ہی گھر والے تھے کیونکہ میرے سوا سب نے تو شادی سے پہلے طارق کو دیکھا تھا۔ میں نے تو صرف تصویر دیکھی تھی اور تصویر سے اندازہ کہاں ہوتا ہے کہ بندہ گورا ہے یا کالا۔ آج کل تو کمپیوٹر سے چند منٹ میں سانولے چہرے کو گورا کیا جا سکتا ہے حتی کہ ہیئر اسٹائل تک تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ کاش..... کاش..... مجھ پر یہ ظلم کرنے سے پہلے وہ بتا دیتے کہ تصویر فوٹو شاپ پر بنائی گئی ہے تو میں جان دے دیتی لیکن ساری زندگی اس عذاب کے جال میں نہ پھنستی۔ میں سمجھتی تھی کہ ایک بیٹی ہونے کی حیثیت سے بیٹی کی خواہش کا احترام والدین کے نزدیک کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے لیکن انہوں نے اسی پرانی روایت کو برقرار رکھا کہ والدین کا فیصلہ اٹل اور افضل ہے۔ میرے ذہن میں ارمانوں کی چیخ گونج رہی تھی کہ اب آ کر دیکھو تمہارے اٹل فیصلے نے زندہ لاش بنا دیا ہے مجھے۔ تمہارے فیصلے کی لو مجھے شمع کی طرح بوند بوند پگھلا رہی ہے اور میں ایک دن ایسے ہی ختم ہو جاؤں گی لیکن طارق کو اپنا نہ بنا سکوں گی، میں اس کی ہو کر بھی اس کے لیے غیر ہوں۔" میں اپنی ذات کے اندھیاروں میں بھٹکتی، چیختی چلاتی رہ گئی۔

طارق نے ہر ممکن طریقے سے مجھے خوش رکھنے کی کوشش کی تحائف لاتا تفریحی پروگرام بناتا لیکن میری نفرت، محبت میں تبدیل نہ ہوئی۔ میں طارق کو دیکھتی تو خود میں غیظ و غضب کے الاؤ دہکتے محسوس ہوتے، مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری ہو جاتی۔ میں اس سے کہتی مجھے تنہا چھوڑ دو مجھے تنہائی چاہیے۔ جب میں نے الگ تھلگ رہنا ترک نہ کیا اداسی کی چادر اتار کر نہ پھینکی تو دونوں گھروں کے افراد نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ڈاکٹروں کو دکھایا، مزاروں پر لے جا کر جھاڑ پھونک کرائی۔ تعویز گلے میں ڈالے گئے۔ پڑھ پڑھ کر پانی پلایا گیا لیکن خاموشی کو زبان نہ ملی میری ذات میں ٹھہرے سکوت میں ہلچل نہ ہوئی۔ ان کے اس عمل پر میں دل ہی دل میں مسکراتی کہ مرجھائی ہوئی کلی سے شگفتگی کی امید کرنا بیکار ہے۔ دم توڑتے ہوئے مریض سے سلسلہ گفتگو کی امید کیوں رکھتے ہو تم سب؟

میں ٹس سے مس نہ ہوئی، ایک ماہ گزر گیا۔ میں رات و دن کی تمیز کھو چکی تھی۔ میں اضطراب کی دلدل سے باہر نہ نکلی بلکہ دھنستی ہی رہی۔ کئی مرتبہ سوچا ایسے کب تک خاموشی کی مہر ثبت کیے پڑی رہوں گی۔ طارق کو آگاہ کر دینا چاہیے کہ تم خزاں ہو اور میں بہار۔ تم زوال ہو اور میں عروج، تمہارے وجود کے اندھیروں میں میری امنگوں کی روشنی دفن ہوگئی ہے۔ تم بوڑھے ہو طارق، ایک دم بوڑھے۔ امی ہر رات رنگین بنانے سے آدمی جوان نہیں بنتا۔ جوانی کی کرنیں شکل سے پھوٹتی ہیں اور تمہاری سانولی رنگت اور ناٹے قد نے تمہاری جوانی کو نگل لیا ہے۔ روز سوٹ بوٹ پہن کر تم اپنے چہرے کی

شاعری کی طرف سے تعصبات دور ہونے لگے۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ جس شاعری کو وہ گل و بلبل کی شاعری سمجھ کر نظرانداز کرتا رہا تھا اس میں بھی بیش بہا خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ اس نے کلاسیکی شاعری کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ہر مطالعے کے بعد ایک مضمون اپنے خیالات کے اظہار کے لیے تحریر کر دیا۔ یوں مختلف مضامین مثلاً غالب اور عصر جدید، بہادر شاہ ظفر ایک نئے زاویے سے، خواجہ میر درد متشفیہ شاعری کے آئینے میں، داغ کا فن، مومن، جوش ملیح آبادی، مجاز کی شاعری میں عورت کا تصور جیسے مضامین ظہور میں آئے۔ جسے اس نے ''فکروفن'' کے نام سے کتابی شکل میں پیش کر دیا۔

خلیل نے ان مضامین میں بہت سی گرہیں کھولیں اور نئے مطالعے پیش کیے۔

اس کا ایک اور تنقیدی مجموعہ ''زاویہ نگاہ'' شائع ہوا۔ اس مجموعے میں تنقیدی مضامین شامل کیے گئے تھے۔ اردو تنقید کے مسائل، جگر مراد آبادی، اختر الایمان، سرسید کے ادبی تصورات، اردو شعر و ادب میں علی گڑھ کا حصہ، اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ، فراق گورکھپوری، ابوالکلام آزاد کے مکاتب۔

ان مضامین میں سے اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ تحقیقی نوعیت کا ہے۔ اس میں خلیل نے اردو نظم کے سلسلے کی بعض کڑیوں کو دریافت کیا ہے جو نظروں سے اوجھل ہو گئی تھیں۔ اسی طرح ابوالکلام کے مکاتب، سرسید کے ادبی تصورات، اردو شعر و ادب میں علی گڑھ کا حصہ بھی تحقیقی نوعیت کے ہیں مگر ان مضامین میں خلیل کی تنقیدی بصیرت ہر جگہ جلوہ گر نظر آتی ہے۔

خلیل کی خوبی یہ تھی کہ اس نے تنقید کو روایتی اور میکانکی انداز سے نجات دلائی اور اسے ایک بالکل نئے راستے پر ڈال دیا۔

اس کا ایک مضمون ''بہادر شاہ ظفر'' ادب لطیف میں شائع ہوا۔ یہ مضمون قاضی عبدالغفار کو بہت پسند آیا۔ انہوں نے رقعہ بھیج کر اسے بلایا اور بہت تعریف کی اور کہا کہ جس نقطۂ نظر سے تم نے بہادر شاہ ظفر پر تنقید کی ہے وہ بالکل نئی چیز ہے اور بہت ہی قابل قدر۔ میری خواہش ہے کہ تم اس نقطۂ نظر سے ظفر کے کلام کا ایک انتخاب مرتب کر دو۔ میں اسے انجمن سے شائع کرا دوں گا۔

خلیل نے اپنا نام مرتبین کی فہرست میں بھی شامل کر لیا۔ ظفر کا ایک ایسا انتخاب کیا جو ظفر کے انفرادی رنگ کو ظاہر کرتا تھا۔ اس میں ظفر کے مخصوص رنگ سخن کا نمائندہ تمام کلام موجود تھا۔ اس انتخاب میں ظفر کا لب و لہجہ شاہ نصیر اور ذوق کے دبستان سے الگ ہو جاتا تھا۔

اس کے بعد اس نے ''نئی نظم کا سفر'' کے نام سے ایک انتخاب مرتب کیا۔

اس نے اعتبار نغمہ کے نام سے فراق گورکھپوری کے کلام کا انتخاب بھی شائع کیا۔

☆☆☆

وہ کامیابی سے اپنا تعلیمی و تخلیقی سفر جاری رکھے ہوئے تھا کہ ایک غلط پالیسی نے انجمن ترقی پسندی کو مشکل میں ڈال دیا۔ آزادی کے بعد سے ہی کمیونسٹ پارٹی میں بعض نظمی تبدیلیاں آنے لگی تھیں۔ جب سی پی جوشی کی جگہ رندیوے کمیونسٹ پارٹی کے سیکریٹری مقرر ہوئے تو انہوں نے پارٹی کو نئی لائن دی۔ ان کی لائن یہ تھی کہ ملک کو نئی آزادی ملی ہے۔ ریاستی ڈھانچا کمزور ہے اس لیے اسے آسانی سے توڑا جا سکتا ہے اور انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ یہی پالیسی انجمن ترقی پسند مصنفین پر بھی اثرانداز ہوئی۔

اس پالیسی کے تحت پنجاب، بنگال اور تلنگانہ میں کمیونسٹ تحریکات کا آغاز ہوا۔ انجمن نے بھی ان تحریکات میں بھرپور حصہ لیا۔ تلنگانہ کی تحریک سب سے پُرجوش اور بھرپور تھی۔ اس تحریک کی سرگرمیاں دیکھ کر یہ معلوم ہوتا تھا جیسے انقلاب دروازے پر کھڑا دستک دے رہا ہے۔ جاگیرداروں کے مظالم سے تنگ آ کر زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا اور اس قبضے کی برقراری اور حفاظت کے لیے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ تھانوں پر قبضہ کر لیا اور نظم و نسق کسانوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

اس صورتِ حال میں ترقی پسند ادیب خاصے پُرجوش تھے اور انقلابی نظمیں لکھ رہے تھے۔ خلیل اعظمی نے بھی نظم لکھی۔

آج دیکھو وہ تلنگانہ سے ایک صبح نمودار ہوئی
آج دھرتی مری گلنار ہوئی
آج تو جیسے اجنتا کے پہاڑوں نے پکارا ہے ہمیں
آج تو جیسے ایلورا کے انہی کھنڈروں نے للکارا ہے ہمیں
آج مخدوم کے ہاتھوں میں دمکتے ہوئے سورج کا حسین پرچم ہے

حکومت نے تلنگانہ کی تحریک کو سختی سے کچلنے کا حکم دے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دیا۔ اس حکم کے تحت انجمن ترقی پسند مصنفین کو بھی خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ اس کی زد میں اعظمی بھی آیا۔

خلیل اور باقر مہدی ان دنوں جذبی کے مکان کے ایک بیرونی کمرے میں رہتے تھے۔ اس روز بھی وہ حسب معمول اسی کمرے میں تھے اور سوئے ہوئے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ باقر کچھ کچھ جاگ رہا تھا۔ پولیس والوں نے خلیل کو دریافت کیا۔ یہ آواز اتنی بلند تھی کہ خلیل تک پہنچ گئی۔ اس نے بکس میں کپڑے اور چند کتابیں رکھیں اور باہر نکل کر پولیس کی جیپ میں جا بیٹھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ باقر پولیس والوں سے الجھ رہا ہے۔ اسے بھی مزاحمت کرنی چاہیے تھی۔

باقر نے اسے جیپ میں بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ کچھ دیر تو باقر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر جیسے اسے ہوش آگیا ہو اس نے نعرے لگانے شروع کردیے۔ ترقی پسند زندہ باد۔ خلیل زندہ باد۔ انقلاب زندہ باد۔ خلیل کی جانب سے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اس نے کسی نعرے کا جواب بھی نہیں دیا۔ بس وہ حیرت و حسرت سے باقر کو دیکھ رہا تھا۔

باقر نے اسی رات خلیل کی گرفتاری پر نظم لکھی۔

دوسرے روز یونیورسٹی کے انجینئرنگ ہال میں جلسہ ہوا جہاں باقر نے یہ نظم پڑھی۔ اس جلسے میں خلیل کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا اور اسے سیاسی شہید کا درجہ دیا گیا۔

خلیل گرفتار ہو کر جیل جا چکا تھا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ خلیل بی اے کے امتحان میں کیسے شریک ہو۔

ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ جیل کے معائنے کے لیے آئے تو باقر مہدی چند دیگر طلبہ کے ساتھ ذاکر حسین سے ملنے کے لیے گیا۔ ذاکر صاحب واپسی کے لیے اپنی گاڑی میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ باقر نے ان سے سوال کیا، کیا خلیل کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت ملے گی؟ ذاکر صاحب نے سنی ان سنی کردی اور کار میں بیٹھنے لگے۔ باقر نے ان کا راستہ روک لیا۔

''آپ اتنا کرم کریں کہ خلیل کو امتحان میں شرکت کی اجازت دلادیں۔''

ذاکر حسین کوئی جواب دیے بغیر واپس پلٹے، جیل میں گئے اور جیلر سے مل کر واپس آئے۔

''آپ فکر نہ کریں۔ خلیل کو امتحان میں شرکت کی اجازت مل جائے گی۔''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کالک کو ختم نہیں کر سکتے۔ قمقمے جلانے سے سحر نہیں ہو جاتی۔ ببول کے درخت گلاب کے پودے میں لگانے سے خوشبو نہیں دیتے۔ میں گہنائے ہوئے چاند کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی۔ تمہارا چہرہ لمحہ بہ لمحہ میرے ارمانوں اور میرے وجود کو چھلنی کرتا ہے۔

چند دن مزید گزر گئے۔ ایک دن بازار میں شاپنگ کے دوران ایک لڑکے پر میری نظر پڑی۔ اب یہ اتفاق ہی ہے کہ جس وقت میری اس پر نظر پڑی وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ہو بہو میرے خوابوں کے شہزادے جیسا تھا۔ میرے دل نے کہا۔ ''نجمہ یہی ہے تمہارا آئیڈیل جس کے تم خواب دیکھتی تھیں۔ یہی موقع ہے اس سے پہلے کہ آئیڈیل نظروں سے اوجھل ہو جائے وقت کے ہاتھوں سے اپنا آئیڈیل چھین لو۔'' اچانک طارق کا خیال ذہن سے گزرا۔ ضمیر نے کہا۔ ''اب تم کسی کی منکوحہ ہو تم پر صرف تمہارے شوہر کا حق ہے۔'' دل نے کہا۔ ''طارق تمہاری جوانی کے محل میں ٹاٹ کا پیوند ہے اسے چھوڑو اپنی پسند کا خیال رکھو۔'' ضمیر نے احتجاج کیا۔ ''نجمہ اپنے لئے مشکلات کھڑی مت کرو۔'' میں دل اور ضمیر کی جنگ میں تختہ مشق بنی ہوئی تھی کہ اس کے کھنکھارنے سے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ اتفاقیہ نظروں کا تصادم اور اس کی مسکراہٹ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئی۔ اس کا نام امجد تھا۔

وہ میری زندگی میں کیا آیا میری دنیا ہی بدل گئی۔ میں ہر ہفتے اس سے ملنے جانے لگی۔ میں اس کی قربت میں اپنا آپ بھی بھول جاتی تھی۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ میں نے تمام حدیں پار کر لیں پھر تو یہ سلسلہ دراز ہو گیا۔

امجد سے ہر ملاقات کے بعد گھر آ کر میں خاموشی اختیار کر لیتی۔ مجھے طارق سے چڑ ہونے لگی تھی میں اس سے نجات کے طریقے سوچنے لگی۔ کچھ سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کروں ایک دن سوچتے سوچتے میرا ذہن بری طرح کھول اٹھا، سوچیں انگارہ بن گئیں تو میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ نہ تو میں خودکشی کر سکتی تھی اور نہ ہی خودکشی تو پھر کیوں صحرا نشین بن کر پڑی رہوں۔ کیوں زمانے سے کٹ کر گوشہ نشین ہو جاؤں۔ آج ہی کیوں نہ میں اس شب ظلمات کو خدا حافظ کہہ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امجد کا ہاتھ تھام لوں۔ ایک دن میں نے چند ضروری کپڑے اٹیچی میں رکھے اور چل پڑی۔ امی کے گھر آ کر میں آزادی محسوس کرنے لگی۔ ایک دن میں امجد سے ملنے گئی تو اس کے گھر کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کے موبائل نمبر پر کال کی تو وہ بند ملا۔ پڑوس سے معلوم کیا تو پتا چلا وہ اور اس کے گھر والے پنجاب چلے گئے ہیں۔ یہ مکان کرائے کا ہے جو انہوں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ سننا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ امجد صرف چند دن کے لیے میری زندگی میں آیا تھا۔ جگنو کی طرح چمکا روشنی کا جھماکا سا ہوا اور پھر تاریکی۔ میرے اندر ایک چیخ سی ابھری۔ نہیں نہیں وہ مجھے بتائے بغیر نہیں جا سکتا مجھے چکر سا آیا اور میں دیوار کا سہارا لے کر وہیں بیٹھ گئی۔ پڑوس کی ادھیڑ عمر عورت نے مجھے پانی پلایا، حواس بحال ہوئے تو واپسی کی راہ لی۔ وہ دن اور آج کا دن مجھے امجد کبھی نظر نہیں آیا۔

☆☆☆

میں کافی دیر تلخ و شیریں یادوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتی رہی۔ گھر کی دیواروں پر شام اتر آئی تھی امی رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ شام بھی گزشتہ بے کیف شاموں کی طرح گزر گئی۔ کھانے کا موڈ نہیں تھا لہٰذا میں بغیر کھانا کھائے سو گئی۔ صبح رافعہ کے گھر چلی گئی، وہ تو جیسے میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔

''آؤ نجمہ! آؤ کیسی ہو؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی گلے سے لگا لیا۔

''بس جی رہی ہوں اپنی ذات کی تنہائیوں کے ساتھ۔'' میں نے افسردہ دلی سے کہا۔

''کیا ہوا نجو! اتنی اداس کیوں ہو؟ آج مجھے کھل کر بتاؤ سب کچھ۔'' وہ پیار سے مجھے نجو کہتی تھی۔

''کیا کرو گی میرا دکھ جان کر۔'' میں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''میرا دکھ تو ہواؤں پہ لکھے گیت جیسا ہے جسے نہ کوئی سننے والا ہے نہ کوئی سمجھنے والا۔''

''پھر بھی کچھ تو بتاؤ تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔'' رافعہ نے اصرار کیا۔ ''آج مجھے سب کچھ بتا دو، آج ویسے بھی گھر پر کوئی نہیں ہے سب لوگ میری نند کے گھر گئے ہوئے ہیں۔''

رافعہ کے پُرزور اصرار پر میں نے اسے مختصراً بتا دیا۔ وہ کچھ دیر سکتے کی کیفیت میں بیٹھی رہی پھر بولی۔ ''مجھے امی سے تمہارے سسرال چھوڑ کر آنے کا پتا چلا تھا، لیکن آخر ایسی کیا وجہ تھی کہ تم نے اتنا بڑا اقدم اٹھا لیا؟'' اس نے متعجب ہو کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں کچھ دیر چپ بیٹھی رہی میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ ''میرا جھوٹ مجھے اس طرح ذلیل اور شرمندہ کرے گا

مجھے علم نہ تھا رافعہ!" میری آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔

"ایسا کیا جھوٹ بولا تھا تم نے؟"

"تم تو جانتی ہو کہ میں نے جیون ساتھی کے لیے کیسے مرد کا تصور اپنے خوابوں میں بسایا ہوا تھا۔" میں نے اسے بتانا شروع کیا۔ "لیکن مجھے میرے خوابوں کی تعبیر اس کے برعکس ملی۔ طارق میرے آئیڈیل کی ضد ہے۔ وہ کسی بھی پہلو سے میرے نصب العین پر پورا اترتا تو میں اس سے نباہ کر لیتی، پان کھائے پیلے دانت، سانسوں میں کپڑوں میں اور انگلیوں میں سگریٹ کی تمباکو کی رچی بدبو، خیر اس کا تو سدھار ممکن تھا لیکن اس کے چھوٹے قد اور گہری سانولی رنگت نے میرے خوابوں کو پیروں تلے کچل ڈالا، میرے آئیڈیل کا رقیب بنا دیا۔ طارق ہر دم مجھے زہر لگنے لگا۔ رافعہ کیا صرف اچھا کما لینا ہی سب کچھ ہوتا ہے؟" مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی رافعہ نے مجھے پانی پلایا۔ میں کچھ دیر چپ بیٹھی رہی رافعہ بھی چپ بیٹھی تھی شاید وہ مجھے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع دے رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔

"وہ جب بھی میرے سامنے آتا میرے آئیڈیل کی مجھے بہت یاد ستاتی۔ میں قسطوں میں مرنے لگی تھی رافعہ! وہ میرے قریب آتا تو مجھے وحشت ہوتی۔ میں لرزنے لگتی۔ عذاب مجھ پر اترنے لگتے۔ مجھے ایسا لگتا جیسے کسی بھیانک جنگل میں مجھے کسی خونخوار جانور کے سامنے چھوڑ دیا گیا ہو۔ مجھے سگریٹ کی متعفن سانسوں سے قے ہونے لگتی، امجد سے مل کر آتے ہی میری کیفیت بدل جاتی تھی اور میں طارق سے نجات کا راستہ ڈھونڈنے لگی پھر کئی دن گزر گئے سوچتے سوچتے پھر ایک دن ایسا خیال ذہن سے گزرا کہ مجھے دلی خوشی حاصل ہوئی۔ وہ خیال یہ تھا کہ طارق کو خود سے متنفر کرنے کے لیے میں ایسا جھوٹ بولوں کہ جھوٹ ثابت بھی ہو جائے تو تب بھی مجھے طارق قبول نہ کرے۔ اسی دن میں نے امی سے جھجکتے ہوئے کہا۔ "امی طارق اپنی پرموشن کے لیے مجھے اپنے باس کے پاس بھیجنا چاہتا تھا اور مجھے کہتا ہے اس بات کا ذکر کسی اور سے مت کرنا ورنہ طلاق دے دوں گا۔ میں اس کی یہ گھٹیا خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی اس لیے اسے چھوڑ کر آ گئی ہوں۔" میں نے امی کے سامنے من گھڑت جھوٹ کو آنسوؤں سے تر کر کے بتایا۔ امی کچھ دیر پتھر کا بت بنی مجھے دیکھتی رہیں۔ تفکر کی لکیروں نے ان کے چہرے پر جال سا بُن دیا۔ کچھ دیر بعد ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹی اور ان کے جھریوں زدہ چہرے میں گم ہو گئی۔ ماں تھی وہ میری۔ اپنے فیصلے پر ندامت اور پشیمانی کا احساس انہیں صدمے سے دوچار کر گیا۔ ابو اپنے فیصلے پر الگ نادم تھے۔ میکے میں میرے مسلسل قیام پر لوگ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے۔ امی نے ایک دن پڑوسن سے کہا پڑوسن نے دوسرے گھروں میں پھونکا اس طرح بات محلے رشتہ داروں سے ہوتی ہوئی میرے سسرال تک جا پہنچی۔ میں بھی یہی چاہتی تھی لیکن طارق نے تصدیق کی نہ تردید۔ ساس آئیں نہ سسر اور نہ طلاق نامہ آیا۔ امجد زندگی میں آیا لیکن وہ بھی بغیر بتائے کہیں چلا گیا۔ میرا دل کہتا ہے وہ آئے گا ایک نہ ایک دن ضرور آئے گا۔ اسے میری محبت کھینچ لائے گی۔"

"وہ اب کبھی نہیں آئے گا نجمہ!" رافعہ نے خفیف لہجے میں کہا۔ "بہتر ہے تم اسے بھول جاؤ، وہ اپنے مفادات کا

کراچی
ماہنامہ
پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی.... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

ترجمان بن کر تمہاری زندگی میں آیا تھا۔ وہ ایک سایہ تھا جو تمہیں بیوقوف بنا کر وقت کی تاریکی میں گم ہوگیا۔ اب بس تم اپنے شوہر کے بارے میں سوچو، وہی تمہاری پریشانیاں ختم کر سکتا ہے۔'' پھر سانس لے کر رافعہ نے کہا۔ ''پگلی طارق تم سے محبت کرتا ہے مجھے اُمید ہے وہ تمہیں معاف کردے گا بس اب جو میں پوچھتی جاؤں مجھے وہ بتاتی جاؤ، سب سے پہلے تو یہ بتاؤ تمہارے ساس سسر کا رویہ تمہارے ساتھ کیسا تھا؟''

''بہت ہی اچھا میری خاموشی، چڑچڑے پن، زیادتی اور بعض مرتبہ بدتمیزیوں کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کیا انہوں نے لیکن جب میں یہاں آرہی تھی تو صرف ساس نے مجھ سے پوچھا تھا۔ ''کہاں جارہی ہو بہو؟''

''اپنے گھر۔'' میں نے اختصار سے کام لیا۔

''کون سا اپنا گھر، کیا تمہارا کوئی دوسرا گھر بھی ہے؟''

''ماں کے گھر جارہی ہوں۔''

''خیر ہمیں اس قابل نہ سمجھو لیکن کیا طارق سے اجازت لے لی تھی؟''

''میں واپس آنے کے لیے نہیں جارہی ہوں۔'' میں نے زہرخند انداز سے کہا تھا۔

''کیوں کیا غلطی ہوئی ہم سے یا طارق سے؟'' میری ساس نے حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔

''غلطی میری سمجھ لیں یا میرے والدین کی جنہوں نے مجھے جنت سے نکال کر جہنم میں دھکیل دیا۔''

''اگر تمہاری ماں نے کہا کہ واپس جاؤ اس جہنم میں تو پھر.....''

''دنیا بہت بڑی ہے اور یہاں سے جانے کے بعد اپنی بقیہ زندگی کے بارے میں سوچنا میرا اپنا مسئلہ ہے۔'' مجھے کوفت ہونے لگی۔

''ٹھیک ہے جاؤ لیکن یہ یاد رکھنا کہ اس گھر سے کوئی بھی نہ جائے گا تمہیں واپس لانے اور تم خود آئیں تو تمہاری وہ توقیر نہ رہے گی ہماری نظروں میں جو اب بھی قائم ہے۔'' میری ساس نے منہ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

''میں نے کوئی جواب نہ دیا اور گھر کی دہلیز پار کرگئی۔''

''تمہارے مسلسل روکھے پن سے اکتا کر طارق نے کبھی الجھن یا ناراضگی کا اظہار کیا؟'' رافعہ نے پوچھا۔

''اب ماضی کو دہرانے کا فائدہ!''

''ہے پگلی..... دہرانے کا فائدہ ہے'' رافعہ نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ سوالات اس لیے کر رہی ہوں کہ تمہاری واپسی کا کوئی راستہ نکال سکوں اور یہ راستہ اس وقت نکل سکتا ہے جب تمہارے شوہر اور سسرالیوں کے ذہن اور دل کے بارے میں مجھے کچھ علم ہو۔''

''کبھی نہیں رافعہ! طارق نے کبھی صبر کا دامن نہیں چھوڑا تحمل مزاجی ان کی زندگی کا حصہ ہے۔ وہ بے انتہا قوتِ برداشت کے مالک ہیں، شادی کی پہلی رات.....'' رافعہ کو بتاتے ہوئے ایک بار پھر میری آنکھیں اور لہجہ بھیگنے لگا۔ ''جب میں نے طارق کو دیکھا تو میرے خوابوں کا تاج محل چکنا چور ہوگیا میں رونے لگی، ظاہر ہے وہ میرے رونے کا سبب نہ سمجھ پائے کہ اصل وجہ کیا ہے تو انہوں نے میرے سرد حنائی ہاتھ اپنے تپتے ہوئے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''انسان پیدائش کے بعد پہلا قدم دنیا میں رکھتا ضرور ہے لیکن اصل زندگی کی شروعات شادی کے بعد ہوتی ہے اور ہم اس ازدواجی زندگی کی بنیاد پیار اعتماد وفا اور یقین کا گارا بنا کر رکھتے ہیں اور یاد رہے کہ اس محبت کی عمارت کو تعمیر کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہوتا ہے سوائے میاں بیوی کے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہماری اس خوبصورت زندگی کی عمارت میں کبھی بھی نفرت دھوکا وعدہ خلافی یا پچھتاوے کی کوئی اینٹ نہ لگے۔ اگر یہ آنسو خوشیوں کا پیغام ہیں تو انہیں بہنے دو اور اگر یہ آنسو اس احساس کا جواب ہیں کہ نہ جانے تمہاری عملی زندگی کیسے گزرے گی تو انہیں میں اپنے ہونٹوں سے چن کر یہ یقین دلاتا ہوں کہ میری ذات تمہارے لیے کبھی بھی پچھتاوا تکلیف یا دکھ کا سامان نہیں بنے گی۔''

مزید کچھ روز گزرنے کے بعد بھی میری خاموشی کے بادل نہ چھٹے تو ایک دن انہوں نے مجھے سامنے بٹھا کر کہا۔

''ہوسکتا ہے نجمہ! تمہارا کوئی ایسا ماضی ہو جسے تم اب بھی دل سے لگائے بیٹھی ہو یا تم یہ سوچتی ہو کہ کبھی مجھے علم ہوا تو تمہاری وہ وقعت نہیں رہے گی میری نظروں میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ خیال بھی تمہاری مسلسل خاموشی کی وجہ سے ذہن میں پیدا ہوا کیونکہ خاموشی کی کئی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے اگر خدانخواستہ ایسی کوئی بات تھی بھی تو مجھے تمہارے اس ماضی سے کیا لینا، تمہارا گزرا کل تمہارا تھا۔ آج اور آنے والے کل پر پورا پورا اختیار میرا ہے یہ صرف اور صرف میرے لئے ہوگا، میں تمہارے ماضی میں کبھی نہیں جھانکوں گا تم میرے آج اور آنے والے کل میں کبھی بے ایمانی نہ کرنا تو

سمجھو زندگی سنور گئی۔ لیکن اگر تم ماضی کو اپنے پاس رکھو گی تو زندگی سنورنے کے بجائے الجھ جائے گی اور تم دنیاوی رنگینیوں سے کٹ کر رہ جاؤ گی۔"

"طارق کے ان خیالات نے مجھے متاثر ضرور کیا لیکن وہ اپنے لیے میرے دل میں کوئی جگہ نہ بنا سکے۔ ان دنوں امجد میرے دل و دماغ پر بری طرح چھایا ہوا تھا اور اس احساس نے بھی میرے دل کو بری طرح جکڑا ہوا تھا کہ اپنی دوستوں سے اپنے شوہر کا تعارف کراتے ہوئے مجھے کتنی سبکی محسوس ہوگی۔ پُر بہار چمکتے چہرے کے ساتھ خزاں جیسا شوہر کیا جچتا اس وقت تم سب کے پاس قہقہوں کی دولت ہوتی جب کہ میرے پاس ندامت کی مفلسی کے سوا کیا ہوتا۔"

"نجمہ!" رافعہ نے افسوس کے ساتھ کہا۔ "جب وجیہہ مرد کے اندر کا آدمی خراب نکلتا ہے تو سب آئیڈیل دھرے رہ جاتے ہیں۔ دراصل شادی سے پہلے ہم نوعمر لڑکیاں فلموں، کہانیوں، ناولوں اور افسانوں میں جیتی ہیں، حقائق کو بالائے طاق رکھ کر کسی بھی شخصیت کو ذہن میں بٹھا کر اسے ہم اپنا آئیڈیل بنا لیتی ہیں جب کہ حقیقی زندگی میں شادی کے بعد شوہر کو ہی اپنا آئیڈیل بنانا پڑتا ہے اور امجد کے روپ میں بھی تو تمہاری زندگی میں تمہارا آئیڈیل آیا تھا وہ کیا ہوا؟ کہاں گیا وہ آئیڈیل؟ نجمہ! خواب سارے پورے نہیں ہوتے بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ تصور حقیقت کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اب رہی بات ہینڈسم شوہروں کی تو تم یہ سن کر حیران ہوگی کہ اکثر وجیہہ مرد کاغذ کے خوشنما پھول ہیں جو دیکھنے کی حد تک خوب صورت ہوتے ہیں لیکن ان کا نہ اپنا رنگ ہوتا ہے اور نہ خوشبو ہوتی ہے۔ میرا شوہر مجھے دنیا کا بدصورت ترین انسان لگتا ہے جسے شادی کے شروع کے دنوں میں میرے پسینے کی بدبو، عطر کی خوشبو لگتی تھی۔ اب عطر بھی لگا کر سامنے آجاؤں تو ناک بھوں چڑھاتا ہے کہ تم سے ادرک، لہسن، پیاز کی بو آرہی ہے۔" پھر اس نے رک کر میرے چہرے کا جائزہ لیا اور بولی۔ "نجمہ! جو ہوا اسے بھول جاؤ آگے کی سوچو، ساری فکریں ذہن سے نکال دو۔ جاؤ دو تین دن خوب سوچو پھر مجھے بتانا۔ تمہاری باتوں سے لگتا ہے طارق بھائی بہت اچھے انسان ہیں، وہ مان جائیں گے۔ میں خود تمہارے ساتھ چل کر ان سے بات کروں گی۔ اب گھر جاؤ وقت کافی ہوگیا ہے۔"

"رافو تم بہت اچھی ہو تمہاری باتوں سے مجھے حوصلہ ملا ہے اور جینے کی راہ بھی اللہ حافظ۔" میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

"خدا حافظ اپنا خیال رکھنا۔" رافعہ نے میری پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ شام کے ملگجے اندھیرے میں، میں رافعہ کے گھر سے نکل آئی۔ اس کی باتوں سے مجھے کسی قدر سکون ملا تھا تاہم ذہن سے خیالات کی بھیڑ کم نہیں ہوئی تھی۔

"طارق کے گھر میں میری توقیر کی گنجائش ہوگی؟ وہاں میری قبولیت کا کیا سامان ہوگا؟ کچھ بھی تو نہیں۔ میرا دل گھبرا رہا تھا کہیں میرے سسرالی بے عزت کر کے نکال نہ دیں تو پھر یہ موہوم سی اُمید بھی ختم ہوجائے گی میرے پاس بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں بچے گا۔ مختلف خیالات کی تکرار ذہن پر یلغار کر رہی تھی۔ خیالات میں گھری میں گھر کی طرف جانے والی گلی کے موڑ پر پہنچ گئی۔ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی تاریکی میں اچانک ایک سایہ سا میرے سامنے لہرایا میں ٹھٹک گئی۔ سایہ چند قدم آگے جا کر پیچھے مڑا پھر میرے قریب آکر رک گیا۔ وقت ایک دم تھم گیا، ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے لمحے متحیر ہو کر رک گئے۔ "آ.....آ.....امجد تم۔" میں ہونق بنی اسے دیکھتی رہ گئی۔

"ہاں نجمہ میں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر گلی سے دور لے جانے لگا۔ میں اس کے ساتھ نہیں جانا چاہ رہی تھی لیکن یہ صرف میرا خیال تھا میں کوئی مزاحمت کوئی احتجاج نہ کر سکی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک دوسرے محلے کے بیچوں بیچ بنے پارک کے قدرے ویران گوشے میں لے آیا وہ ایک فیملی پارک تھا جس میں مقامی لوگ واک کے لیے آتے تھے۔ پارک میں لوگوں کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ باقی رہ جانے والے لوگ بھی روشوں پر واک کرتے ہوئے مرکزی گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ امجد نے مجھے ایک سنگی بنچ پر بٹھا دیا۔ چند گز دور نصب الیکٹرک پول پر جلتے ہوئے بلب کی مٹیالی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ میں متعجب ہو کر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ یہ وہ امجد ہی نہیں تھا جو میرا آئیڈیل بن کر میرے سامنے آیا

شمارہ مئی 2017ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب

☆اول: عشق ناکام ..... قیصر جمال (لندن، یوکے)

☆دوم: غلط ہاتھ..... زرینہ شوکت (کراچی)

☆سوم: برا وقت..... نائلہ (کراچی)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

تھا۔اس وقت اس کا حلیہ خاصا دگرگوں تھا۔اس کے چہرے پر بیرونی چھائی ہوئی تھی۔آنکھوں کے گرد حلقے تھے شیو بڑھی ہوئی تھی۔وہ چپ چاپ نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔"کیوں آئے ہو اب؟"میں نے اسے جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔اس نے ایک پل کے لیے نظریں اٹھائیں اور پھر جھکا لیں۔اس ایک پل میں، میں نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ لی۔ساری رنجشوں کے باوجود میں تڑپ کر رہ گئی وہ رو رہا تھا، مگر کیوں؟ اس سوال کی اذیت مجھے ڈسنے لگی۔"امجد تم رو رہے ہو؟" بالآخر مجھ سے رہا نہ گیا۔

"نجمہ تم اپنے طور پر ٹھیک سوچ رہی ہو۔"اس کی آواز ایک سسکی میں ڈوب گئی۔"مگر میں مجبور تھا۔"لمحاتی توقف کے بعد اس نے کہا۔"میرے بھائی کو پولیس نے پکڑ لیا تھا۔ بدنامی کے خوف اور لوگوں کے طرح طرح کے سوالوں سے بچنے کے لیے ہمیں وہ علاقہ چھوڑنا پڑا۔"وہ ایک دم سے چپ ہو گیا۔

"کیوں کیا، کیا تھا تمہارے بھائی نے؟"میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔وہ کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"میرے بھائی پر اس کے باس کے قتل کا الزام ہے۔ یقین کرو! میرا بھائی بے قصور ہے۔اس نے اپنے باس کا قتل نہیں کیا۔نجمہ میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاتا، بس اچانک ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ ہم سب کو جانا پڑا۔پلیز میرا یقین کرو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا نجمہ!"اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر نیچے زمین پر بیٹھتے ہوئے اپنی کہنیاں میرے گھٹنوں پر ٹکا دیں پھر نم آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔"نجمہ ہم بس اس عذاب سے نکل جائیں پھر میں تمہارے پاس آؤں گا تمہیں اپنا بنانے کے لئے، میں تمہیں اتنی خوشیاں دوں گا کہ تم اپنے سارے غم بھول جاؤ گی۔میرا انتظار کرنا۔"اس کی لمحہ بہ لمحہ گھٹتی ہوئی آواز سسکیوں میں بدل گئی۔میں شش و پنج میں پڑ گئی۔وقت کے دوسرے حصے میں وہ پھر میری زندگی میں چلا آیا تھا۔میری قوتِ فیصلہ مفلوج ہو گئی۔دل سے آواز آئی۔"امجد مجبور ہے، تم بیکار کی سوچوں میں وقت ضائع کر کے اپنی محبت کھو دو گی اس سے پہلے کہ وہ تم سے مایوس ہو کر چلا جائے اس کا ہاتھ تھام لو۔"

میرے اندر کافی دیر کشمکش جاری رہی بالآخر اس کے آنسوؤں نے مجھے کمزور کر دیا۔میں نے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔اس نے سر اٹھا کر بھرپور نظروں سے مجھے دیکھا اس کی آنکھیں تشکر کے احساس سے چمک گئیں۔ایک دم سے وہ میرے گلے سے لگ گیا۔"نجو! مم.....مم.....میری جان تم بہت اچھی ہو۔"خوشی کی شدت سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔"آئی لو یو نجمہ! آئی لو یو سو مچ۔"وہ اٹھ کھڑا ہوا۔کچھ دیر پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔"بھائی کی ضمانت کے لیے وکیل کو کچھ پیسے دینے ہیں میں پیسوں کا بندوبست کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔"کہاں سے پیسوں کا بندوبست کرو گے؟"

"کہیں نہ کہیں سے تو ہو ہی جائے گا اگر نہ ہوا تو مجبوراً اماں کے زیور بیچنے پڑیں گے۔"اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"کتنے پیسے دینے ہیں وکیل کو؟"

"فی الحال تو تیس ہزار روپے کی ضرورت ہے، بیس ہزار روپے وکیل کو دینے ہیں۔پانچ ہزار روپے تفتیشی افسر کو دینے ہیں تاکہ وہ بھائی پر تشدد نہ کرے۔اور باقی کے پانچ ہزار مزید بھاگ دوڑ کے لیے رکھنے ہیں۔"اس نے بتایا۔

"امجد اگر تمہیں برا نہ لگے تو میں تمہیں اتنے پیسے دے سکتی ہوں۔"میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن نجمہ تم!"اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔"میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔"دیکھو امجد! میرے پیسے تمہاری پریشانی سے بڑھ کر نہیں ہیں اور اس مشکل وقت میں دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔دیکھو اب انکار مت کرنا۔"میری بات کے اختتام پر اس نے والہانہ نظروں سے مجھے دیکھا۔"تم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے گھر کی گلی تک آؤ میں جلدی سے گھر جا کر پیسے لے آتی ہوں۔"میں نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود تیزی سے چلتی ہوئی گھر کی طرف بڑھ گئی۔گھر پہنچ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا کچن سے کھٹ پھٹ کی آوازیں آ رہی تھیں۔امی شاید رات کا کھانا بنا رہی تھیں۔ابو آفس سے واپس نہیں آئے تھے اور زین بھی کہیں باہر نکلا ہوا تھا۔میں دبے پاؤں چلتی ہوئی امی کے کمرے میں گئی ٹی وی ٹرالی کی دراز سے الماری کی چابیاں نکالیں اور الماری کھول کر پانچ پانچ سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی اٹھا لی میرے اندازے کے مطابق وہ پچاس ہزار روپے کے لگ بھگ رقم تھی جو میں نے زندگی میں پہلی بار امی کی الماری سے نکالی، بہ الفاظ دیگر چوری کی تھی۔الماری بند کر کے چابیاں ٹی وی ٹرالی کی دراز میں

رکھیں اور خاموشی سے باہر نکل آئی۔ رات اپنا آنچل پھیلا چکی تھی۔ گلی میں لوگ آ، جا رہے تھے لیکن ہر کوئی اپنی دھن میں چلا جا رہا تھا۔ میں تیزی سے چلتی ہوئی امجد کے پاس پہنچ گئی وہ ایک دکان کے ساتھ بنے چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ''آ گئی تم نجمہ۔'' مجھے دیکھ کر اس نے کہا۔

''ہاں آ گئی..... یہ لو پیسے۔'' میں نے نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ ''میرا بہت دل چاہ رہا تھا تمہارے ساتھ جانے کو مگر تم اس وقت کافی پریشان ہو۔ تم جاؤ!''

وہ کچھ دیر خالی خالی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر نظریں جھکا کر رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ ''نجمہ تم بہت عظیم ہو۔ تمہاری محبت کے سامنے میری محبت کچھ بھی نہیں ہے۔ میں زمیں پر تھا تم نے مجھے آسمان پر بٹھا دیا۔ میں آؤں گا پرسوں تم ضروری تیاری کر لینا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔'' وہ چل دیا میں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی وہ ایک پل کو رکا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پرسوں شام سات بجے میرا انتظار کرنا۔'' وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔

وہ جب تک نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا میں اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر گھر لوٹ آئی۔

''بہت دیر کر دی آنے میں کہاں رہ گئی تھیں؟'' امی تشویش میں مبتلا تھیں۔ ''وہ امی! رافعہ کے ساتھ باتوں میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور پھر آپ کو تو پتا ہے اس کا، آنے ہی نہیں دے رہی تھی۔'' میں نے دروغ گوئی سے کام لیا۔

''اچھا چلو تم منہ ہاتھ دھو لو میں کھانا لگواتی ہوں۔'' امی نے کہا اور کچن کی طرف چلی گئیں۔

میرا کھانے کا بالکل موڈ نہیں تھا لہٰذا میں نے منع کر دیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی لیکن نیند آنکھوں سے دور تھی۔ نیند آتی بھی تو کیسے آج امجد سے ملاقات جو ہو گئی تھی۔ وہ پریشان حال ضرور تھا لیکن اس کی آنکھوں میں میری محبت کا عکس جھلک رہا تھا۔ میں پُر امید تھی امجد کی قربت چند دن کی مسافت پر تھی۔ کروٹ پر کروٹ بدلتے جانے رات کے کون سے پہر میری آنکھ لگ گئی۔

صبح آنکھ شور کی آواز سے کھلی وہ امی کی آواز تھی جو زور زور سے بولتیں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکراتی پھر رہی تھیں۔

''اوہو، ہوا کیا ہے کچھ بتاؤ تو سہی۔'' ابو کی آواز سنائی دی۔

''یہ پوچھیں کہ کیا نہیں ہوا؟'' امی خفت سے بولیں

''افوہ..... ایک تو تم بات کو الجھاتی بہت ہو۔'' ابو نے کہا۔ ''چلو بتاؤ کیا نہیں ہوا۔''

میں بھی بیڈ سے اٹھ کر امی اور ابو کے پاس پہنچ گئی۔

''آپ نے چند دن پہلے جو پیسے مجھے دیے تھے وہ اب میری الماری میں نہیں ہیں۔'' امی کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔

پیسوں کا سن کر میں لرز گئی۔ میں سمجھ رہی تھی کچھ دن تک امی کو پیسوں کا پتا نہیں چلے گا لیکن یہاں تو دوسرے دن ہی پتا چل گیا۔ ابو بھی پریشان ہو گئے۔

''امی آپ ٹھیک سے دیکھیں کہیں الماری کے دوسرے خانے میں نہ رکھے ہوں۔'' میں نے چہرے پر پریشانی طاری کرتے ہوئے کہا۔

''الماری کے تمام خانوں میں دیکھ لیا ہے کسی خانے میں نہیں ہیں کسی ملازم پر بھی شک نہیں کیا جا سکتا ملازموں کے جانے کے بعد میں نے پیسے دیکھے تھے اور آج صبح ان کے آنے سے پہلے میں نے دیکھا تو پیسے وہاں نہیں ملے۔'' امی کی پریشانی سے میرا دل بیٹھا جا رہا تھا لیکن میں انہیں بتا نہیں سکتی تھی کہ ان کی پریشانی کی وجہ میں ہوں۔

''اچھا تم پریشان مت ہو نصیب میں ہوئے تو مل جائیں گے۔ جب کسی ملازم نے نہیں چرائے تو گھر میں ہی ہوں گے۔'' ابو کے لہجے میں پریشانی کا تاثر تھا مگر انہوں نے امی کے سامنے زیادہ بات نہیں کی۔

میں نے امی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''امی آپ پریشان نہ ہوں مل جائیں گے پیسے۔''

امی کچھ دیر تک خاموش کھڑی میری طرف دیکھتی رہیں پھر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ دو تین دن گھر میں کھچاؤ کی کیفیت رہی۔ پیسے گھر میں ہوتے تو امی کو ملتے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا لیکن امجد کا خیال میرے ضمیر کو تھپکی دے کر سلا دیتا۔ مزید کچھ روز گزرنے کے بعد بھی امجد نہ آیا نہ اس کی کال آئی۔ میرا ہر پل اس کے انتظار میں گزرتا اور اندیشوں کا بڑھتا ہوا آزار انتظار کو مشکل تر بنا رہا تھا۔ پندرہ دن گزر گئے امجد کے آنے کی امیدیں دم توڑ گئیں۔ اس دوران رافعہ کا پیغام آیا کہ میری واپسی کے دن قریب آ رہے ہیں میں چاہتی ہوں میری موجودگی میں تمہارا مسئلہ حل ہو جائے۔ امجد کے نہ آنے سے میں بالکل ٹوٹ گئی تھی اور رافعہ

کی بات سچ لگنے لگی تھی کہ امجد دھوکے باز ہے۔ایک دن رافعہ خود میرے پاس آگئی۔امی پڑوس کے گھر گئی ہوئی تھیں۔

"نجمہ اس معاملے میں تمہاری عدم دلچسپی تمہارے حالات کو مزید گھمبیر بنا سکتی ہے۔" وہ میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

"لیکن طارق....."

"طارق بھائی کا مسئلہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" رافعہ نے میری بات کاٹ کر کہا۔"دیکھو نجمہ تم اپنے شوہر کی خوبیوں کو مدِ نظر رکھو گی تو شوہر ان اوصاف کے جھرمٹ میں چاند چہرہ نظر آئے گا۔خوبصورتی کردار میں ہوتی ہے اور وہ سچی بھی ہوتی ہے۔پختہ بھی اور خوشبودار بھی، جو تمہارے شوہر کے پاس ہے ہم سب تو دکھاوے کی زندگی گزار رہے ہیں سرابوں میں منڈلا رہے ہیں لیکن تمہارے پاس سچی زندگی اور ٹھوس محبت ہے۔تم محبت کے اس چمن کو چھوڑ کر کانٹوں بھرے راستے پر آنکلی ہو۔ لوٹ جاؤ واپس تمہاری بھلائی کے لیے تمہارا لوٹ جانا ہی بہتر ہے۔معافی مانگ لو اور اتنی خوشیاں دو کہ تمہارے لگائے زخم پھولوں میں تبدیل ہو کر مہک پڑیں۔" وہ اچانک چپ ہو گئی اس کا ایک ایک لفظ مجھے اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس ہوا۔

"کس منہ سے جاؤں رافو! میں نے ان پر اتنا بڑا الزام لگایا تھا۔کیا پھر بھی وہ مجھے اپنے پاس رکھ لیں گے؟" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"میں نے کہا ناں سب ٹھیک ہو جائے گا۔" رافعہ نے اس یقین کے ساتھ کہا کہ میں قائل ہو گئی۔

"ٹھیک ہے تو پھر کل چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور رافعہ کے لیے چائے بنانے لگی۔رافعہ کچھ دیر بیٹھ کر اور چائے پی کر چلی گئی۔اور میں سوچوں کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر اترتی چڑھتی رہی۔بس اب تو رب سے یہی دعا تھی کہ طارق مان جائیں۔دوسری صبح امی سے رافعہ کے گھر جانے کا کہہ کر میں گھر سے نکل آئی۔وہ میرے ہی انتظار میں بیٹھی تھی۔

"آؤ آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" رافعہ نے خوش دلی سے کہا۔اس نے اپنے بیٹے کو سلایا اور ہم طارق کے گھر روانہ ہو گئیں۔

راستے میں، میں نے کہا "میرا دل گھبرا رہا ہے کہیں وہاں ذلت نہ اٹھانی پڑے۔میرے سسرال والے بے عزت نہ کریں۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" رافعہ نے کہا۔"اگر شوہر تمہارا ہے تو سسرال ماننہ تمہارا ہے۔خوامخواہ کے واہموں میں خود کو مت الجھاؤ۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے طارق کے گھر پہنچ گئے دہلیز پار کرتے ہی لان میں چائے پیتے ساس سسر سمیت دیگر اہلِ خانہ سلام کا جواب دیئے بغیر ہی اٹھ کر اپنے اپنے کمروں میں جا گھسے صرف طارق اخبار ہاتھ میں لیے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"طارق بھائی! میرا نام رافعہ ہے میں نجمہ کی بچپن کی دوست اور کلاس فیلو ہوں۔" رافعہ نے اپنا تعارف کرایا۔

"اوہ...! اچھا اچھا تو آپ ہیں ان کی دوست رافعہ جو مسقط میں رہتی ہیں۔" طارق نے ایک نظر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی طارق بھائی آپ نے صحیح پہچانا۔"

پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔"بھائی جان بلا تمہید میں یہ کہوں گی کہ آپ سمجھدار، کشادہ دل اور اچھے ذہن کے مالک ہیں اور ایسے مرد نادانوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں۔ اسے اپنی حماقت پر بڑی ندامت ہے۔" رافعہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔"لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ یہ بڑی اچھی لڑکی ہے بچپن سے جانتی ہوں۔اب غلطی ہو گئی ہے اس سے یہ معافی مانگنے کے لیے آپ کے پاس آئی ہے۔میں اتنا جانتی ہوں کہ پچھتاوے کے بعد کی ازدواجی زندگی بڑی پائیدار ٹھوس اور قابلِ اعتبار ہوتی ہے۔یہ خود چل کر آپ کے پاس آئی ہے تو اسے معاف کر دیں۔"

طارق نے کچھ نہیں کہا خاموشی کو اپنائے رکھا پھر سگریٹ سلگائی دو تین بھرپور کش لیے اور بات کا رخ یہ کہہ کر موڑا کہ "آپ چائے پئیں گی یا ٹھنڈا؟"

"میں مٹھائی کھاؤں گی بھائی جان۔" رافعہ جلدی سے بولی۔"لیکن اس وقت جب آپ دونوں کو ہنستا مسکراتا دیکھوں گی۔میں نے محسوس کیا ہے جب سے نجمہ کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا ہے اس کے دل میں آپ کی محبت اور بڑھ گئی ہے۔"

"محبت!" طارق نے طنزیہ کہا۔"محبت تھی ہی نہیں تو بڑھے گی کہاں سے..... محبت کرنے والے ایسے کام کرتے ہیں؟"

رافعہ خفیف سی ہو کر رہ گئی لیکن جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

"نہیں ایسی بات نہیں طارق بھائی۔محبت تھی، ہے اور رہے گی انشاء اللہ دراصل نجمہ نے اپنے اندر کی محبت کو زبان نہیں دی۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

طارق کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی جیسے کہنا چاہ رہا ہو کہ مجھے پتا ہے یہ سفید جھوٹ ہے۔

"میں کہہ رہی تھی طارق بھائی کہ...."

"معاف کیجیے گا قطع کلامی ہو رہی ہے۔" طارق نے ایک دم سے کہا۔ "مجھ سے اب کیا چاہتی ہے نجمہ۔"

میں نے پیش قدمی کی اور طارق کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر نم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پلیز مجھے معاف کر دیں، میرا نہیں تو کم از کم میرے وجود میں پلنے والے ننھے سے وجود کا خیال کر لیں جو آپ کا خون ہے۔"

طارق کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کے نیچے سے کھینچتے ہوئے کہا۔ "مجھے خوشی ہوئی ہے یہ سن کر کہ تم ماں بننے والی ہو۔" پھر رافعہ اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"آپ اس وقت جائیں میں کل نجمہ کے ماں باپ کے گھر آؤں گا اور تم اپنے خاندان کے افراد کو وہاں بلا لینا میں سب کے سامنے عزت کے ساتھ تمہیں وہاں سے لاؤں گا۔ بس اب آپ لوگ جائیں۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

رافعہ نے میری طرف دیکھا میں نے اسے واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم ساتھ ساتھ چلتی ہوئی طارق کے گھر سے نکل آئیں۔

"میں نے تمہیں کہا تھا ناں طارق بھائی مان جائیں گے۔" رافعہ نے چلتے چلتے کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہتی تھیں میں خوامخواہ وہم میں مبتلا تھی۔ رافعہ تمہارا بہت شکریہ، تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا۔ اگر تم نہ ہوتیں تو میں طارق تک کبھی نہ پہنچ پاتی۔ اگر پہنچ بھی جاتی تو بے عزت کر کے نکالی جاتی۔" میں نے احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر رافعہ کو گلے سے لگا لیا۔

"چلو ان باتوں کو چھوڑو میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ تمہارا گھر مزید اجڑنے سے بچ گیا۔" رافعہ نے کہا۔ "بس اب آئندہ خیال رکھنا اور اپنے شوہر کی خوشی کو مقدم سمجھنا۔" وہ مجھے گھر چھوڑ کر دوسرے دن کا آنے کا کہہ کر اپنے گھر چلی گئی۔

سب سے پہلے میں نے وہ تمام چیزیں نظروں کے سامنے سے ہٹا دیں جن کا تعلق امجد سے تھا۔

میں اسے کسی بھی حوالے سے یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔

پھر میں نے وارڈ روب سے اپنی شادی کے کپڑے نکالنا شروع کر دیے۔ عروسی جوڑا نکال کر ایک طرف رکھا اور باقی کے کپڑے الماری میں رکھ دیے۔ میں گزرے ہوئے کل کو بھلا کر طارق کے سامنے دلہن بن کر جانا چاہتی تھی۔ اس رات اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتے سوچتے رات کے آخری پہر میری آنکھ لگ گئی۔ صبح اٹھی نہا دھو کر عروسی جوڑا پہنا اور طارق کا انتظار کرنے لگی اس نے شام کا وقت دیا تھا میں نے امی کو ساری بات تفصیل سے بتا دی۔ وہ ماں تھیں خوشی کے آنسو ان کی آنکھوں میں جھلملانے لگے بیٹی کا گھر دوبارہ بس جانے کا ان کا ارمان پورا ہو رہا تھا۔ انہوں نے قریبی رشتہ داروں کو اطلاع بھجوا دی کہ شام کے وقت گھر پر آئیں۔ مجھے شام کا بے چینی ..... سے انتظار تھا۔ جن لوگوں کو امی نے بلایا تھا ان میں میرے ایک ماموں ان کا بڑا بیٹا ایک خالہ۔ ایک ابو کے چچا زاد بھائی اور میری ایک پھپھو شامل تھیں۔ رافعہ کو بھی

ڈاکٹر راشد لطیف خاں

عالمی شہرت یافتہ پاکستانی پروفیسر اور پاکستان میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے خالق۔ وہ ملتان میں رائے لطیف حسن خاں کے گھر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ مئی 1961ء میں نشتر میڈیکل کالج ملتان سے ایم بی بی ایس کیا۔ 1965ء میں رائل کالج آف گائنا کالوجی لندن سے امراض نسواں میں ڈپلومہ لیا اور 1967ء میں لندن سے ایم آر سی او جی کا امتحان پاس کیا۔ پھر ایڈنبرا کی معروف طبی درسگاہ رائل کالج آف سرجنز سے ایف آر سی ایس کی ڈگری لی۔ 1974ء میں جون ہاپکنز میڈیکل اسکول بالٹی مور (میری لینڈ) امریکا نے انہیں اے ٹی ایم ایف کی اعزازی ڈگری دی اس طرح حکومت بھارت نے بھی سب سے بڑی طبی ڈگری بطور اعزاز پیش کی۔ علاوہ ازیں کالج آف فزیشنز اینڈ سرجنز نے بھی ان کی طبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ایف آر سی پی کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ وہ علامہ اقبال میڈیکل کالج لاہور میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پاکستان میں پہلی ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا کرنے والی ٹیم کے سربراہ ہیں یہ بے بی 2 جولائی 1989ء میں پیدا ہوئی۔

مرسلہ: سلمٰی ممتاز، حیات آباد

میں نے بلالیا تھا۔ سب لوگ وقت مقررہ پر پہنچ گئے اور طارق کا انتظار کرنے لگے۔ انتظار کی کیفیت بھی کتنی صبر آزما ہوتی ہے یہ اس دن مجھے معلوم ہوا۔

خدا خدا کر کے وہ گھڑی بھی آ گئی جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ طارق نے گھر کے ہال کمرے میں بیٹھے افراد پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور با آواز بلند سب کو سلام کیا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ تھری پیس سوٹ میں ملبوس ایک اور شخص بھی تھا اس نے بھی سب کو سلام کیا اور ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ طارق اٹھا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''ایک ضروری کام کی وجہ سے مجھے آنے میں کچھ تاخیر ہو گئی اُمید ہے درگزر فرمائیں گے۔'' پھر اصل مدعا کی طرف آتے ہوئے گویا ہوا۔ ''کل نجمہ اور ان کی دوست رافعہ صاحبہ میرے گھر آئی تھیں۔'' طارق کی تمہید نے میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیں۔ وہ کسی مقرر کے سے انداز میں بول رہا تھا۔ ''مسز رافعہ مزمل کا کہنا ہے کہ نجمہ سے غلطی ہوئی ہے اور یہ اپنی غلطی پر نادم ہے۔'' طارق نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''چلیں اچھی بات ہے اسے اپنی غلطی پر ندامت محسوس ہوئی لیکن مجھے یاد نہیں ہے اس سے کیا غلطی ہوئی تھی۔'' پھر وہ روئے سخن میری جانب موڑتے ہوئے بولا۔ ''نجمہ تم سے جو غلطی ہوئی میں نے اس کے لیے تمہیں معاف کیا لیکن تم اپنے ان عزیز رشتہ داروں کو بتانا چاہو گی کہ تم سے کیا غلطی ہوئی تھی؟''

وہ بات ختم کر کے اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ سب لوگ میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں احتساب کے کٹہرے میں آ گئی تھی۔ میں سمجھ رہی تھی طارق سب رشتہ داروں کے سامنے کوئی سوال کیے بغیر مجھے عزت سے لے جائے گا۔ لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا وہ اپنی ذلت کا بدلہ اس انداز سے لے گا۔ میں نے رحم طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ میری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ میرا حلق خشک ہو گیا تھا زبان تالو سے چپک گئی تھی میں نے تھوک نگلتے ہوئے حلق تر کرنے کی ناکام کوشش کی۔ سب کی سوالیہ نگاہیں مجھے زہر میں بجھے تیر کی طرح لگ رہی تھیں۔ میں نے سوچا وقت نے مجھے ایک امتحان میں ڈال ہی دیا ہے تو سچ بول کر اپنی جان چھڑائی جائے اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور بولنا شروع کیا۔ ''میں غلط ہوں مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی کہ میں نے اپنے فرشتہ صفت شوہر پر بہتان لگایا تھا کہ طارق اپنی پروموشن کے لیے مجھے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے طارق سے اپنی جان چھڑانے کے لیے جھوٹ بولا تھا کیونکہ یہ میرے آئیڈیل کی ضد تھے۔ شادی کے پہلے دن سے ہی یہ مجھے اچھے نہیں لگے تھے۔ لیکن میرا جھوٹ مجھے اتنا رسوا کرے گا مجھے اس کا اندازہ نہیں تھا۔'' میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ رافعہ اپنی جگہ سے اٹھی اور مجھے تھپکتے ہوئے کرسی پر بٹھا دیا اور مجھے پانی پلایا۔ سب لوگ ہونق بنے مجھے دیکھتے رہے۔ طارق اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ ''میں عورت پر حکمرانی کا قائل نہیں ہوں نہ عورت کو غلام بنانا مجھے پسند ہے۔ میں نے نجمہ کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کی کبھی اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر یہ میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی تو مجھے بتاتی میں آزاد کر دیتا۔ خیر میں نے اسے معاف کر دیا۔'' وہ کچھ دیر رکا اور وہاں بیٹھے افراد کو متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اب جو بات میں کرنے لگا ہوں وہ سب غور سے سنیے گا اور اس کا فیصلہ بھی آپ لوگ کیجیے گا۔ نجمہ نے مجھے خوشخبری سنائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ ماں بننا ہر شادی شدہ عورت کی خواہش ہوتی ہے اور اس معاملے میں نجمہ بہت خوش قسمت ہے۔'' وہ ایک دم سے چپ ہو گیا پھر تھری پیس سوٹ میں ملبوس شخص کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ ذرا ایک منٹ کے لیے آیئے گا ڈاکٹر صاحب۔'' وہ شخص جسے ڈاکٹر کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا اپنی جگہ سے اٹھا اور طارق کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ طارق نے ڈاکٹر سے کہا اب وہ رپورٹ انہیں پڑھ کر سنائیں جو آپ نے اپنی فائل میں رکھی ہوئی ہے۔''

طارق اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور وہ پیپر پڑھنے لگا۔ اس پیپر کی رو سے طارق کسی عورت سے شادی کر کے ازدواجی تقاضے پورے کر سکتا تھا لیکن وہ کسی عورت کو ماں نہیں بنا سکتا تھا۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق اس میں کرموسوم کی بہت کمی تھی۔ طارق پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے میری طرف مڑا اور میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے با آواز بلند بولا۔ ''جب تمہیں اس سوال کا جواب مل جائے کہ تمہارے وجود میں پلنے والا ننھا سا وجود کس کا ہے تو مجھے بتانا میں آ کر تمہیں لے جاؤں گا۔'' اتنا کہہ کر وہ ڈاکٹر کے ساتھ چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

میرے بے ہوش ہونے سے پہلے امجد کا سراپا میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا جس کی قربت میں، میں اپنا آپ بھی بھول جاتی تھی۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خلیل کے ساتھی اس مختصر جواب سے مطمئن نہیں ہوئے تھے لیکن دوسرے ہی دن خلیل کو پیرول پر رہا کر دیا گیا۔ اس نے باقر کے ساتھ مل کر امتحان کی تیاری کی اور امتحان میں بیٹھ گیا۔

امتحان کے بعد اسے علی گڑھ جیل بھیج دیا گیا۔ پھر لکھنو جیل بھیجا گیا۔ تین ماہ کی جیل کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ وہ جیل سے ''ردولی'' پہنچا اور کچھ دن باقر مہدی کے گھر رہا۔ یہاں رہتے ہوئے اسے اپنے گاؤں سیدھا سلطان پور کی یاد آئی۔

لہلہاتی ہوئی فصلیں وہ مرے آم کے باغ
وہ مکانوں میں لرزتے ہوئے دھندلے سے چراغ
دور تک پانی میں پھیلے ہوئے وہ دھان کے کھیت
اور تالاب کنارے وہ چمکتی ہوئی ریت
میرے ہم عمر وہ ساتھی وہ مرے ہم جولی
میرے اسکول کے وہ دوست مری وہ ٹولی

.....

ایک اور نظم میں ایک اور حسین یاد کا خیال آیا۔

یہیں پہ ایک ماہ وش کے چاہنے کی آرزو
مرے لیے حیات نو کا جام لے کے آئی تھی
کسی کی دلنواز مسکراہٹوں کے سائے میں
مری نگاہ کو ملا وہ ذوق جستجو جیسے
جہاں کی بے پناہ وسعتیں بھی راس آئی تھیں
مری رفیق میری روح میری ماہ وش کہیں
جہاں کی اندھی وادیوں میں جیسے جا کے کھو گئی
مرا ادھورا شاہکار کوئی چھین لے
لہو کی موج بڑھ کے میرے آسماں پہ چھا گئی
مری وہ جنت خیال تیرگی میں ڈوب کر
فنا کے گھاٹ میں ..... اتر گئی
میں جیسے تلملا..... اٹھا

ان نظموں نے ان یادوں نے اسے اتنا بے چین کیا کہ عرصہ دراز کے بعد ''سیدھا سلطان پور'' پہنچ گیا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں خلیل پیدا ہوا تھا۔ یہاں کے بھیانک در و دیوار، زنگ آلود مسجدیں اور ان کے میناروں نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن گھر کے لوگ ایک بے نیازی کے انداز میں ملے۔ ہنس رہے تھے تو لگتا تھا دنیاداری کے لیے ہنس رہے ہیں۔ مصنوعی خوشی نظر آ رہی تھی۔ اس طرح اظہارِ ہمدردی کیا جا رہا تھا جیسے کوئی بھگوڑا عرصے بعد گھر آ گیا ہو۔ جیسے اتنا عرصہ فضول گھر سے باہر رہا ہو۔ بعض رشتہ داروں کی طرف سے صاف کہا جا رہا تھا کہ وہ چلا گیا تھا تو واپس کیوں آ گیا۔ طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جا رہی تھیں۔ کہا جا رہا تھا خلیل نے مذہب بدل لیا ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا اس نے علی گڑھ میں شادی کر لی ہے۔ یہ باتیں کہنے کا اس لیے بھی موقع مل رہا تھا کہ پولیس خلیل کی انکوائری کے لیے یہاں بھی آ چکی تھی۔ اب رشتہ دار یہ کہہ کر دوسروں کو ڈرا رہے تھے کہ اگر خلیل کچھ عرصہ یہاں رہا تو اس کے ساتھ ہم بھی اسے پناہ دینے کے الزام میں گرفتار کر لیے جائیں گے۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک افواہ پھیلائی کہ خلیل رہا ہو کر نہیں آیا بلکہ جیل توڑ کر فرار ہوا ہے۔

بھائی بھائی کی محبت میں نرالے سے شکوک
نگہ غیر میں جس طرح انوکھے سے سوال

رشتہ داروں کے اس رویے نے اسے سخت مایوس کیا۔ بوڑھی ماں کی محبت بھی اسے نہ روک سکی اور اس نے گاؤں چھوڑ دیا وہ یہ کہتا ہوا گاؤں سے روانہ ہو گیا۔

گھر سے نکلا ہوں تو اب دور کہیں جانے دے
روک اے گردش ایام نہ رستہ میرا
میرے دامن میں رہی خاک غریب الوطنی
رہ گیا دیکھ کے منہ دامن صحرا میرا

وہ علی گڑھ واپس پہنچا تو ایک مرتبہ پھر تنہا تھا۔ رشتہ داروں کی بے مروتی کا احساس بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اک بوجھ تھا جو دل پر اٹھائے پھر رہا تھا۔

کون سی منزل میں ہوں اب کچھ بھی یاد آتا نہیں
اپنی تنہائی سے اکثر پوچھتا ہوں اپنا نام

.....

یہ بھی ہم بھول گئے نام ہمارا کیا تھا
پوچھ کر گردش دوراں سے بتا دو ہم کو

.....

آج آئینہ جو دیکھا تو ہوا یہ محسوس
جانے یہ کون ہے میں ایسا تھا؟ یہ میں تو نہیں

.....

بی اے کا رزلٹ آ چکا تھا۔ اب اسے آگے تعلیم جاری رکھنے کے لیے کسی راستے کا انتخاب کرنا تھا۔ رشید احمد صدیقی نے ایک مرتبہ پھر اس کی رہنمائی کی۔ اس کی تخلیقی قوت اور ادبی ذوق کو دیکھتے ہوئے، انہوں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ ایم اے (اردو) میں داخلہ لے لے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اس راہ میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس کے نمبر بھی حسب ضرورت تھے اور اس کی شہرت بھی اسے سہارا دے رہی تھی۔ اس نے داخلہ لے لیا۔

اس کے مسائل اب بھی موجود تھے۔ تنہائی کا کرب شدت اختیار کر چکا تھا۔ اس کے سامنے پھر اس کی تصوراتی محبوبہ آ کھڑی ہوئی۔ وہ اس کے خیالوں سے جی بہلانے لگا۔ آنکھیں بند کر لیتا اور اس کی زلفوں سے کھیلتا رہتا۔ اس سے باتیں کرتا اور اس کے لیے نظمیں لکھتا لیکن ظاہر ہے یہ نارمل حالت نہیں تھی۔ وہ اپنی دیوانگی پر خود ہنسا کرتا تھا۔ باقر کی دوستی تھی جو اسے سہارا دیے ہوئے تھے لیکن اب وہ اس سے بھی اکتانے لگا تھا۔ اس نے اس خلا کو پُر کرنے کے لیے انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینا شروع کر دیا۔

ان سرگرمیوں کے دوران اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی۔ وہ اس کی طرف یوں بڑھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''مرے دل کی جگہ خالی ہے اب تک'' اس کی تصوراتی محبوبہ کی جگہ اس گوشت پوست کی محبوبہ نے لے لی لیکن جلد ہی اس پرچھائیں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ سیاسی کارکن تھی۔ گرفتار ہوئی اور جیل پہنچ گئی۔ خلیل کو سوچنے کا موقع مل گیا۔ ''وہ اپنی شاہراہ پر اتنا آگے جا چکی ہے کہ واپس لوٹنا مشکل ہے اور میں وہاں جاتا ہوں تو اپنی شخصیت کو ختم کر کے پارٹی میں ضم ہو جاتا ہوں۔ اس محبوبہ سے وابستگی کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے آپ کو کلیتہً سیاست سے وابستہ کر لوں جبکہ میں ایک ادیب کی موت مرنا چاہتا ہوں۔''

وہ شدید ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا۔ مسلسل خاموش رہنے لگا۔ دوستوں کی موجودگی بھی اب اسے پریشان کرنے لگی تھی۔ وہ کسی نہ کسی بہانے کوئی گوشۂ تنہائی ڈھونڈتا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا۔ کئی مرتبہ ٹھنڈے دل سے خودکشی کے بارے میں سوچا لیکن خاندان کے مذہبی احساسات اب بھی دل کے کسی گوشے میں چھپے ہوئے تھے لہٰذا گناہ سمجھ کر خودکشی سے باز رہا۔

☆☆☆

بھیمڑی (علاقہ بمبئی) میں پہاڑوں سے گھری ہوئی ایک عمارت کے ہال میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کل ہند کانفرنس منعقد ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں 1936ء کے منشور کو ناکافی خیال کرتے ہوئے نئے منشور کی منظوری دی گئی۔ اس منشور میں پرانے منشور کی وسیع المشربی کی بجائے انتہا پسندی اختیار کی گئی۔

یہ سخت گیری بہت جلد ان ادیبوں کو ہدف ملامت بنانے لگی جو انتہا پسند نہیں تھے۔ فیض اور جذبی پر کڑی تنقید کی گئی۔ فیض کی لطافت کو رجعت پسندی کہا گیا۔

علی گڑھ میں انجمن کی ایک خاتون رکن سے خاص طور پر جذبی کی مشہور نظم ''موت'' پر نہایت سخت الفاظ میں تنقید لکھوا کر ایک نشست میں پڑھوائی گئی۔ ان باتوں سے بددل ہو کر جذبی صاحب انجمن سے کنارہ کش ہو گئے۔

خلیل ترقی پسندی سے متفق تھا مگر ترقی پسندوں سے بیزار ہونے لگا۔

چھٹیاں ہوئیں تو وہ اپنے دوست جاوید کمال کے ساتھ رامپور چلا گیا۔ وہ رامپور کے شاعر شاد عارفی کی طنزیہ نظمیں ''نگار'' اور دوسرے رسائل میں پڑھ چکا تھا۔ ان نظموں میں اسے ایک بالکل منفرد رنگ نظر آیا تھا اور وہ علی گڑھ میں رہتے ہوئے شاد عارفی کا گرویدہ ہو چکا تھا۔ اسے خوشی ہو رہی تھی کہ وہ رامپور کے اس سفر میں شاد عارفی سے ملاقات کر سکے گا۔

☆☆☆

یہ ان دنوں کی بات ہے جب برطانوی ہندوستان میں سیاسی حالات، سیاسی شعور کی بیداری تک آ گئے تھے۔ عوام میں جذبۂ ایثار بڑھا اور اپنے مطالبات کی تکمیل کے لیے مصائب برداشت کرنے کی سکت پیدا ہوئی۔ ٹریڈ یونین کے قیام اور مزدوروں کی کامیاب ہڑتال کے بعد تو ماحول نے سیاسی بیداری کو عام کر دیا۔

ان حالات کا اثر شاعروں پر بھی پڑنے لگا تھا۔ اشتراکی نظریات معاشرے میں سرائیت کرتے جا رہے تھے۔ اشتراکیت نے اپنے تمام ساز و سامان اردو ادب کے سامنے بکھیر دیے۔ ولولہ انگیز تبدیلیاں نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کو آزادی، مساوات، بغاوت اور انقلاب کے تصور سے سرشار کر رہی تھیں مگر یہ سب تبدیلیاں دیسی ریاستوں سے باہر نشوونما پا رہی تھیں۔ انگریزی نوکر شاہی کی سب سے بڑے پشت پناہ دیسی ریاستوں کے حکمران تھے۔ ایسے ماحول میں کوئی بھی ترقی پسندانہ بات سوچنا اور اس کا اظہار کرنا جرم سے کم نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ریاستی ماحول کے پروردہ ذہن شاد عارفی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ شاد بھی کہاں دبنے والا تھا، خم ٹھونک کر میدان میں اتر آیا۔ ریاست کے بارود خانے سے اکیلا ٹکراتا رہا اور اس

حال میں کہ مالی حالات بھی اس کے حق میں نہیں تھے۔ اس پر کئی کئی وقت کے فاقے گزر رہے تھے اور وہ سیاسی نظمیں لکھ لکھ کر نوجوان طبقے کو اپنے حق میں ہموار کر رہا تھا۔

جب رام پور جیسی سخت گیر ریاست میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ قائم کرانے کا سوال آیا تو سب پر گھبراہٹ طاری تھی۔ شاد عارفی نے عبدالحئی تاباں کی معرفت یہ بظاہر ناممکن کام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یہ شاخ رام پور میں قائم ہوگئی۔ اس کے تحت جلسے ہونے لگے۔ اس کی نظمیں اس ماحول میں آگ لگانے لگیں۔

یہ ماحول تھا جب خلیل نے رام پور کی زمین پر قدم رکھا۔ جاوید کمال کے گھر پہنچتے ہی اس نے شاد صاحب سے ملنے کی ضد شروع کردی۔ جاوید کمال اسے لے کر نکلا اور کئی تنگ تنگ گلیوں سے گزرنے کے بعد وہ مطلوبہ مکان پر پہنچ گیا۔

شاد صاحب بانوں کی کھری چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ حقے کی نے منہ سے لگی ہوئی تھی۔ فرش پر شاگرد ''چوسر'' کھیلنے میں مصروف تھے۔ گھر کی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا فرنیچر ادھر ادھر پڑا تھا باقی سناٹے کا راج تھا۔ خلیل کو ان کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا کہ اتنا بڑا شاعر اور اس حال میں۔

خلیل کے پہنچنے اور تعارف ہونے کے بعد باتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ شاگردوں نے چوسر لپیٹ کر رکھ دی۔

خلیل کو یہ چھٹیاں رام پور میں گزارنی تھیں۔ وقت ہی وقت تھا۔ لہٰذا شاد صاحب سے طویل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

شاد نے بعض قدیم شعرا کے بارے میں خلیل کے تعصبات کو بہت حد تک ختم کر دیا۔ وہ باتوں باتوں میں ذوق، داغ، امیر مینائی اور نظام رام پوری وغیرہ کے ایسے ایسے شعر سناتے اور ان کے نکات بیان کرتے کہ خلیل کو قائل ہونا پڑتا۔

چند ملاقاتوں کے بعد خلیل نے ان سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنا شاگرد بنالیں۔ پہلے تو وہ انکار کرتے رہے لیکن جب وہ بضد ہوا تو فرمایا۔ ''اچھا اپنی بیاض لاؤ۔''

یوں خلیل، شاد کا شاگرد بن گیا۔

☆☆☆

ان دنوں ڈاکٹر ذاکر حسین مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ انہیں پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد کی سرپرستی حاصل تھی۔ پنڈت نہرو اور ان کی حکومت کو کمیونسٹوں نے بیزار کر رکھا تھا۔ ذاکر صاحب نے پنڈت نہرو کی مرضی کے مطابق پانچ لڑکوں کو یونیورسٹی سے نکال باہر کیا۔ بعض نام زیرِ غور تھے۔ ان میں خلیل کا نام بھی تھا۔ رشید احمد صدیقی کو معلوم ہوا تو وہ ذاکر صاحب سے ملے اور انہیں باور کرایا کہ یہ لڑکا شعبہ اردو کا فخر ہے۔ آئندہ جاکر یونیورسٹی کا نام بلند کرے گا۔ اگر اسے نکال دیا گیا تو ہم ایک جوہرِ قابل کو مٹی میں ملادیں گے۔

یوں خطرہ ٹل گیا اور خلیل یونیورسٹی میں ٹکا رہا۔

خلیل کی سرگرمیاں جاری رہیں اور بالآخر ایم اے کا امتحان امتیاز سے پاس کیا۔

یہ ایسی ڈگری تھی کہ اس کے بعد وہ علی گڑھ سے باہر لیکچررشپ حاصل کر سکتا تھا۔ کئی جگہوں سے خطوط بھی آئے جن میں اس کو لیکچررشپ کی پیشکش کی گئی تھی۔ کچھ دوستوں نے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ پاکستان چلا جائے وہاں اردو کے لیے سنہری مواقع ہیں۔ وہ اکیلا ہی نہیں بلکہ تنہا تھا۔ گھر سے نکلنے کے بعد لوٹ کر نہیں گیا تھا۔ کسی بھائی سے کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ پاکستان ہجرت کر جانے میں کوئی چیز مانع نہیں تھی لیکن رشید احمد صدیقی نے حکم دیا کہ وہ مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ایڈیٹرشپ قبول کرلے۔ رشید صاحب کے اس پر بڑے احسانات تھے۔ وہ ان کا حکم ٹھکرا نہیں سکتا تھا۔ اس نے تمام مواقع نظرانداز کر کے ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی یہ نوکری قبول کرلی۔

خلیل نے چارج سنبھالتے ہی گزٹ کو انقلابی تبدیلیوں سے روشناس کیا۔ اس سے پہلے گزٹ میں رجسٹرار آفس کے نوٹس وغیرہ چھپتے تھے۔ خلیل نے اس میں ادب کو بھی شامل کیا اور اس کا معیار بلند کرنے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی یہ تبدیلیاں علی گڑھ تحریک کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوں گی لیکن یہ سلسلہ ایک سال سے زیادہ نہ چل سکا۔ اس کا کمیونسٹ یا ترقی پسند ہونا یہاں بھی آڑے آیا اور لوگوں نے اسے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ اس نے رشید احمد صدیقی کے نام خط لکھا اور ملازمت چھوڑ دی۔

''میں نے خود اپنے لیے ایک سزا تجویز کی ہے وہ یہ کہ مجھے اس ملازمت سے سبکدوش فرمایا جائے یہ اقدام آپ کے لیے بھی مفید ہوگا اور میرے لیے بھی۔ آپ گزٹ کے لیے ایک معقول ایڈیٹر تلاش کرسکیں گے اور میں اپنے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

لیے ایک بہتر ملازمت۔"

ملازمت چھوڑنے کے بعد وہ ایک ایسے معاشی بحران میں مبتلا ہوگیا جس سے کئی سال تک اس کا پیچھا نہیں چھوٹا۔ اسے کرائے کی رہائش گاہ چھوڑنی پڑی کہ کرایہ ادا کرنے کے لیے رقم نہیں تھی۔ تھک ہار کر اپنے دوست ابوسعید زیدی کے ساتھ ہاسٹل میں رہنے لگا۔ رہنے کیا لگا بس دن بھر سڑکیں ناپنے کے بعد شام کو ہاسٹل میں آجاتا تھا۔ اس کی حالت دیوانوں جیسے ہورہی تھی۔

پھر ایک دن علی گڑھ کی سڑکیں اسے دیکھنے کو ترس گئیں۔ احباب فکرمند تھے کہ دیوانہ کہاں چلا گیا۔ معلوم ہوا بمبئی چلا گیا ہے اور فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کررہا ہے۔ ان دنوں بمبئی کی فلمی دنیا ہر شاعر کو گلے لگا رہی تھی لیکن اس کی قسمت خراب تھی۔ کئی مہینے کی تگ ودو کے بعد بھی وہ ناکام رہا۔ کوئی کام تو ملا نہیں البتہ اس کی ملاقات حنیف ناشاد سے ہوگئی جو ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بمبئی سے ناکام لوٹنے کو تھا کہ حنیف ناشاد اسے کام کا آدمی دیکھ کر اپنے ساتھ شمالی بہار کے ایک دورافتادہ گاؤں میری کوٹھی لے گئے۔ اس دوست نے اسے غلط راہ پر ڈال دیا۔ اسے شراب نوشی کی لت پڑ گئی۔

اس دوست کے نام سے خلیل نے کئی خوب صورت غزلیں چھپوائیں یا اسے لکھ کر دیں جو ہمیشہ کے لیے اس کی ہوگئیں۔

علی گڑھ میں اس کی تلاش ہورہی تھی۔ دوستوں کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ بالآخر رشید احمد صدیقی نے اسے ڈھونڈ نکالا اور علی گڑھ میں شعبہ اردو میں ایک پوسٹ پر اسے بلا لیا۔ اس وقت شعبے میں دو اسامیاں تھیں، ایک مستقل اور ایک عارضی۔ خیال تھا کہ خلیل کا تقرر مستقل اسامی پر ہوجائے گا لیکن آل احمد سرور، لکھنو سے محمد حسن کو لے آئے اور مستقل جگہ پر محمد حسن کا تقرر ہوگیا اور خلیل کو عارضی جگہ ملی جو خورشید الاسلام کی رخصت کی وجہ سے خالی ہوئی تھی۔ (بعد میں وہ مستقل لیکچرر ہوگیا)

یہ ملازمت عارضی سہی لیکن خورشید الاسلام پانچ سال کے لیے انگلستان گئے تھے اس لیے اسے یک گونہ اطمینان حاصل تھا۔ اس کی آوارگی میں بھی کمی آئی۔ پیروں میں ایک زنجیر سی پڑ گئی تھی۔ اپنے مرتبے کا پاس تھا اپنی ذمہ داریوں کا لحاظ۔ اب وہ سیاست سے کاملاً لاتعلق ہوچکا تھا۔ معاشی تحفظ نے اسے نئی زندگی عطا کردی۔

اس ملازمت کا ایک نقصان بھی ہوا۔ اس پر تخلیقی جمود سا طاری ہوگیا۔ بہت دن سے کوئی نظم، کوئی غزل، کوئی شعر نہ ہوسکا تھا کہ ایک رات ایسا ہوا کہ سوتے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ جس طرح بھوک لگتی ہے اسی طرح ایک نظم نے اسے جگا دیا جو ابھی لکھی نہیں گئی تھی۔ تخلیقی چشمہ پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے کاغذ قلم سنبھالا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ اسے سوچنا ہی نہیں پڑا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے مصرعے خود بخود چلے آرہے ہیں۔

"نظم مکمل ہوئی تو عنوان بھی خود بخود طے ہوگیا۔ "نیا جنم"

اس نظم کے بعد شعری سلسلہ شروع ہوگیا۔ پے بہ پے نظمیں ہونے لگیں۔

دو سال بعد 1955ء میں جب اس کی نظموں کی تعداد بہت کم تھی اس نے اپنی بعض ناتمام اور مکمل منظومات اور تازہ کلام مرتب کرکے "کاغذی پیرہن" کے نام سے شائع کروادیا۔ اس مجموعے میں اس نے اپنی کوئی سیاسی نظم شامل نہیں کی۔ وہ ان نظموں کو اپنی ناجائز اولاد قرار دے رہا تھا۔ یہی اس کا "نیا جنم" تھا۔

اس مجموعے میں شامل اس کی یہ نظمیں اس کی انفرادی روح کی داستان تھیں۔ ایک خودنوشت سوانح تھی، ایک آئینہ تھیں جن میں اس کی شخصیت پہچانی جاتی تھی۔ یہ مجموعہ یادوں اور خوابوں کا حسین مجموعہ تھا۔ ان نظموں کا رومانوی لب ولہجہ اسے نوجوانوں کا پسندیدہ شاعر بناتا تھا۔

مری داستانوں کے دلچسپ کردار
سنسان گلیوں کے رنگین قصے
یہ سب میرے پیچھے چلے آرہے ہیں
کہ جیسے کوئی روٹھے ہوئے آدمی کو
منا کے بڑے پیار سے تھپ تھپائے

.....

تیرے اک جانے پر..... لیکن
میرا یہ کیا حال ہوا ہے
اپنے آپ سے میں روٹھا ہوں
میرا دل خود مجھ سے خفا ہے
میرے کان بھی مری باتیں
مجھ سے آج نہیں سنتے ہیں
گھر میں اتنی تاریکی ہے
آنکھیں ساتھ نہیں دیتی ہیں

سارے روزن سارے دریچے
سب دروازے بند پڑے ہیں

اس کی زندگی کا لاابالی پن ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ رات گئے سڑکوں پر گھومنا اب بھی اس کا مشغلہ تھا۔ جب شہر سو جاتا تو وہ سڑکوں پر نکل آتا۔ سناٹوں میں سناٹا بن کر گھومتا رہتا۔ گنگناتا رہتا، شعر کہتا رہتا۔ سگریٹ پر سگریٹ پھونکتا رہتا۔ کب گھر لوٹنا ہے گھر سے نکل کر بھول ہی جاتا تھا۔

1957ء کے ایک مہینے کی کسی تاریخ کا قصہ ہے کہ سہیل عظیم آبادی نے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وقت بھی بتا دیا اور یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ گھر پر رہے۔ خلیل حسب معمول گھر سے نکلا تو واپسی کا راستہ ہی بھول گیا۔ وہ رات گئے واپس آیا تو سہیل بند دروازے پر اس کا منتظر تھا۔ خلیل کو اپنی کوتاہی پر شرمندگی ہوئی۔

اس رات کو تو سہیل نے مناسب نہ سمجھا کہ اس سے کوئی بات کرے لیکن صبح ہوئی تو سہیل نے اسے سمجھایا۔

''تمہاری یہ حالت اس لیے ہے کہ تمہاری زندگی کا مرکز نہیں ہے۔ جب تک تمہاری شادی نہیں ہو جاتی تمہاری حالت سدھرنے والی نہیں۔''

''میری جان یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آنے والی ایسی ہو جو میری آوارگیوں میں مزید اضافہ کر دے۔''

''ایسے اندیشے کیوں پالتے ہو؟''

''مجھ اکیلے، ٹھیلے کو بیٹی دے گا کون؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تمہارے لیے لڑکی میں ڈھونڈوں گا۔''

''ٹھیک ہے تم کوشش کرو۔ میں تیار ہوں۔''

خلیل کو یا تو شادی کا خیال تک نہیں آیا تھا یا اب اتنا سنجیدہ ہو گیا کہ سہیل کو خط لکھ لکھ کر بار بار یاد دہانی کرانے لگا۔

''آپ میری شادی کے معاملے میں ابھی تک سست رفتاری سے کام لے رہے ہیں۔ دیکھیے ان گرمیوں میں میرا معاملہ کہیں نہ کہیں انجام کو پہنچا دینا..... میں اس زندگی سے بہت گھبرا گیا ہوں۔ میری شادی مئی کے آخر میں ہو جانی چاہیے۔''

سہیل نے یہ سنجیدگی دیکھی تو پیلی بھیت کے حکیم محفوظ الدین کی صاحب زادی راشدہ مریم سے اس کا رشتہ طے کرا دیا۔

راشدہ مریم 12 نومبر 1957ء کو رخصت ہو کر خلیل کے گھر آ گئیں۔

خلیل کا رشتہ اپنے گھر والوں سے ایسا ٹوٹا تھا کہ اس شادی میں بھی اس کے خاندان کا کوئی فرد شریک نہ ہوا۔ شادی میں چند دوستوں کے سوا کوئی شامل نہ تھا۔

شادی کا یہ تجربہ اس کے لیے معقول اور مفید ثابت ہوا اور اس کی زندگی اطمینان سے گزرنے لگی۔ اطمینان ہوا تو بہت سے تخلیقی کام بھی انجام دیے جانے لگے۔

''مجھے خوشی ہے کہ نہ صرف مجھے راشدہ جیسی بیوی ملی جو میری زندگی کو سنوار دے گی بلکہ پورا خاندان شرافت اور محبت کا ایسا نمونہ ہے جس کی اس دور میں مثال نہیں ملتی۔ مجھے وہ سکون ملا ہے جو مجھے اپنے وطن کی مٹی نہ دے سکی تھی۔''

اس شادی نے اسے سکون بھی دیا اور نظم و ضبط بھی سکھایا۔ اس دور میں جو نظمیں اس نے لکھیں ان میں بھی زندگی کی خوشیاں چھلکے پڑ رہی تھیں۔

چھوٹا موٹا مگر خوب صورت سا گھر
گھر کے آنگن میں خوشبو سی پھیلی ہوئی
منہ دھلاتی سویرے کی پہلی کرن
سائباں پہ امربیل مہکی ہوئی
کھڑکیوں پہ ہواؤں کی انگھیلیاں
روزن در سے چھنتی ہوئی روشنی
شام کو ہلکا ہلکا سا اٹھتا دھواں
پاس چولہے کے بیٹھی ہوئی لکشمی
اک انگیٹھی میں کوئلے دہکتے ہوئے
برتنوں کی سہانی مدھر راگنی

(سایہ دار)

اسی گھریلو سکون کا نتیجہ تھا کہ اس نے شادی کے صرف ایک سال بعد ہی ''ترقی پسند ادبی تحریک'' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور خلیل الرحمن اعظمی سے ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی ہو گیا۔

یہ پچاس سالہ تاریخ کا نہایت پھیلا ہوا موضوع تھا لیکن خلیل نے اسے نہایت خوب صورتی سے سمیٹا اور تاریخی تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ اسی لیے اس مقالے کو ترقی پسند تحریک کے حوالے سے بھی اور اردو کے تحقیقی و تنقیدی سرمائے کے حوالے سے بھی خاصا اہم قرار دیا گیا۔

1959ء میں اس کا بیٹا کامران خلیل پیدا ہوا۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھا اور ان اشعار کے ذریعے اس کا استقبال کیا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اے مرے سن و سال کے حاصل
میرے آنگن کے نودمیدہ گلاب
میرے معصوم خواب کے ہم شکل
میری مریم کے سائے شاداب
صبح تخلیق کا سلام تجھے
زندگی تجھ کو کہتی ہے آداب
اے مری روح فن کے عکس جمیل
تجھ کو میری سی زندگی نہ ملے
جو نہ میں ہو سکا وہ تو ہو جائے
کاش تو میرا جانشیں نہ بنے
میں تصور میں بھی جہاں نہ گیا
ان دیاروں میں تیرا نام چلے

(اپنے بچے کے نام)

اسی سال اس کا تنقیدی شاہ کار یعنی آتش پر اس کا سلسلہ مضامین ''مقدمہ کلام آتش'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ بھی کئی تنقیدی تخلیقات شائع ہوئیں۔

☆☆☆

بمبئی میں اعجاز صدیقی اپنے رسالے ''شاعر'' کا جشن منا رہے تھے۔ خلیل کا جو تعلق رسائل و جرائد سے تھا انہیں اور اس کی شہرت کو مدنظر رکھتے ہوئے خلیل کو بھی اس جشن میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ غالباً اعجاز صدیقی کو یہ احساس تھا کہ خلیل کے تعلقات اس کے گھر والوں کے ساتھ خوش گوار نہیں ہیں اور یقیناً یہ احساس بھی رکھتے ہوں گے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے گھر والوں سے اس کے تعلقات ٹھیک کرا دیں۔ خلیل کے بڑے بھائی پرواز اصلاحی ان دنوں بمبئی میں مقیم تھے۔ اعجاز صدیقی نے انہیں بھی مدعو کیا۔ صلح صفائی کے لیے مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی سے درخواست کی۔ مولانا نے پرواز اصلاحی سے ملاقات کی اور خلیل کے ساتھ گھر والوں کی ناچاقی کے بارے میں دریافت کیا۔ پرواز نے جواب میں خلیل کے بن باس کی ساری کتھا سنا دی۔ خلیل آخری بار 49ء میں گاؤں گیا تھا۔ اور اب 62ء آ گیا تھا۔ خلیل نے گاؤں کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا تھا جبکہ اس کی ماں ابھی زندہ تھی۔ اسے ماں کی محبت بھی گاؤں نہ لے جا سکی تھی۔ وہ اپنے بھائیوں خاص طور پر سوتیلے بھائیوں سے سخت نالاں تھے۔ مولانا نے تمام حالات سنے اور پرواز سے وعدہ کر لیا کہ وہ خلیل کو گھر

مختلف غذائوں کی مختلف اقسام کھائیے

کوئی ایک غذا ہمارے جسم کی تمام ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی، اس لیے صحت مند رہنے کے لیے ہمیں ملی جلی غذا لینی ہوگی۔ مختلف غذائیں جسم کو درکار مختلف اجزا یا ان کے مرکب مہیا کرتی ہیں۔ قسم قسم کی غذائیں کھا کر ہم ان تمام ضروری اجزاء کو حاصل کر سکتے ہیں جن کے بغیر جسم کی نشوونما اور قوت مدافعت پیدا نہیں ہو سکتی۔

روٹی، چاول، دلیے اور آلو جیسی نشاستہ دار غذائیں ہمارے باقاعدہ اور بے قاعدہ کھانوں کا اہم جزو ہونی چاہئیں۔ یہ غذائیں توانائی کے ساتھ ساتھ وٹامن، پروٹین، ریشہ اور معدنیات فراہم کرتی ہیں اور بہت کم چکنائی دیتی ہیں۔ اگر ان غذاؤں کے ساتھ ہم چکنائی یا شکر شامل نہ کریں تو یہ بڑی مقدار میں کیلوریز بھی مہیا نہیں کرتیں۔

مرسلہ: نوید اصغر۔ سرگودھا

جانے پر آمادہ کر لیں گے۔

خلیل جشن میں شریک ہونے کے لیے بمبئی گیا تو جشن کی تقریب میں مولانا ان دونوں (خلیل اور پرواز) کو ایک طرف لے گئے۔ درمیان میں وہ چل رہے تھے اور دونوں طرف دونوں بھائی تھے۔ مولانا نہایت مخلصانہ نصیحتیں کر رہے تھے۔ قرآن و حدیث کے حوالے دے کر ''قطع رحمی'' کے خلاف تقاریر کر رہے تھے۔ نہایت جذباتی انداز میں گھر کی یاد دلا رہے تھے۔ ماں کے حقوق بتا رہے تھے۔

اس تقریر نے خلیل کے دل پر اثر کیا اور اس نے اپنے رویے پر نظر ثانی کرنے کا وعدہ کیا۔

جشن کی تقریب ختم ہوئی تو خلیل نے اپنے بھائی سے ملاقات کی۔ معافی تلافی ہوئی۔

''میں گھر کی کچھ زیادہ خدمت تو نہیں کر سکتا۔ ہاں اپنے تمام بھائیوں کی اولاد کی تعلیم کی ذمے داری لیتا ہوں۔''

پرواز اصلاحی اس پیشکش سے بھی خوش ہوئے اور اس خیال سے بھی کہ خلیل کا دل بھائیوں کی طرف سے صاف ہو گیا۔ ابھی اتنا ہوا ہے جلد ہی وہ گھر (گاؤں) آئے گا اور دوسرے رشتہ داروں سے بھی ملے گا۔

پرواز اصلاحی گھر گئے تو خاندان والوں سے اس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

ملاقات کا ذکر کیا۔ یہ خوش خبری بھی سنائی کہ خلیل جلد ہی گاؤں آئے گا۔ ماں کو تسلی دی۔ خلیل کی شادی کے بارے میں بتایا۔ اس پیشکش کو بھی دہرایا کہ خلیل نے اپنے بھتیجوں کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کی ہے۔

اس پیشکش کا پہلا فائدہ خلیل کے بھائی مولانا عزیز الرحمٰن نے اٹھایا۔ وہ اپنے بیٹے طارق عزیز کو لے کر خلیل کے پاس آئے اور اپنے بیٹے کو علی گڑھ میں پڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وقت کتنا بدل گیا تھا۔ جو لوگ خلیل کو علی گڑھ بھیجنے کی مخالفت کر رہے تھے وہی اب اپنے بچوں کو علی گڑھ بھیج رہے تھے اور اس کی سفارش ڈھونڈ رہے تھے۔

خلیل نے یہ درخواست خوشی سے قبول کی۔ اسے کالج میں داخلہ بھی دلوایا اور اپنے گھر میں رہنے کے لیے جگہ بھی دی۔

خلیل کی اپنے بھائیوں سے تعلق کی تجدید ہو گئی تھی مگر اس کی بوڑھی والدہ ابھی تک اسے دیکھنے کو ترس رہی تھیں۔ ان کی ماما ٹھنڈی ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ خلیل اپنے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔

☆☆☆

خلیل کی شاعری کا جو سفر بچپن میں شروع ہوا تھا اور کاغذی پیرہن تک پہنچا تھا۔ نیا عہد نامہ میں یہ تنہائی کسی قدر کم ہوتی دکھائی دی لیکن معاشرتی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کی گونج صاف سنائی دینے لگی۔

اس مجموعے کے آتے آتے وہ ترقی پسندی سے تائب ہو چکا تھا۔ اس طرح پہلی تبدیلی تو یہی تھی جو اس کے موضوعات اور ڈکشن میں نظر آنے لگی۔

اس مجموعہ کی ابتدائی چار نظمیں موضوعاتی سطح پر ''کاغذی پیرہن'' ہی کو دہراتی تھیں وہی گاؤں چھوڑنے کی یاد اور وہی افسردگی و تنہائی۔ اس کے باوجود فنی سطح پر خوشگوار تبدیلی کا احساس ہوتا تھا۔ اس نے اس مجموعے میں خود کو جذباتیت سے الگ کر لیا تھا۔ اس نے اس کے لیے ''امیجز'' کا سہارا لیا۔

ننھے ننھے کتنے جگنو میری بھیگی پلکوں کے
بجھے دیے کی لو رہ رہ کر آدھی آدھی راتوں کو
اپنی گہری نیند سے جیسے چونک اٹھتی ہے بول اٹھتی ہے
آشاؤں کے سندر مکھڑے پر لالی سی آجاتی ہے

خلیل کی نظمیں ''بھیروں'' آنچل کی چھاؤں میں ''سایہ دیوار'' اور اپنے بچے کے نام ایک نئے موضوع کو پیش کرتی تھیں اور صاف بتا رہی تھیں کہ شادی کے بعد وہ جن کیفیات سے گزرا تھا اس کو اس نے تخلیقی درجہ دے دیا ہے۔

اگر پرانا موضوع اختیار بھی کیا تو اسے وسیع تناظر سے ہمکنار کر کے قابل توجہ کر دیا۔ مثلاً گھر سے جدائی اس کا قدیم موضوع تھا لیکن اب وہ اسے ''بن باس'' کہہ کر زیادہ وسیع کر دیتا ہے۔

میرا یہ جرم کہ میں صاحب ادراک و شعور
میرا یہ عیب کہ اک شاعر و فنکار ہوں میں
مجھ کو یہ ضد ہے کہ میں سر نہ جھکاؤں گا کبھی
مجھ کو اصرار کہ جینے کا سزاوار ہوں میں
مجھ کو یہ فخر کہ میں حق و صداقت کا امیں
مجھ کو یہ زعم خود آگاہ ہوں خوددار ہوں میں
.....

اس مجموعے میں اس کی ذاتی تنہائی صنعتی عہد کی تنہائی میں تبدیل ہو گئی جس میں تعلقات ضرورتوں کی بنیاد پر ہیں۔

آتے ہیں بہت سے آنے والے
کچھ اجنبی کچھ رفیق و ہمدم
لیکن کئی سال مجھ سے گزرے
سننے کے لیے ترس گیا ہوں
دستک کے جواب بھی جانتی ہو
وہ نام جو میرا پیار کا ہے
(رفتگاں)

خلیل نے نیا عہد نامہ میں اپنی آواز کو پالیا اور وہ جدید نظم کے کئی کامیاب نمونے تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان نمونوں میں جذباتیت نہیں ٹھہراؤ اور فکری گہرائی تھی۔

☆☆☆

رسائل و جرائد سے خلیل کا تعلق بہت پرانا تھا۔ 54ء میں علی گڑھ کے بعض اساتذہ نے مل کر ایک ادبی جریدہ شائع کیا اس کا نام فکر و نظر رکھا گیا۔ خلیل اس کی مجلس ادارت میں شامل تھا۔

''فکر و نظر'' کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے رسائل میں بھی معاونت کرتا رہا۔ ان میں بعض گمنام رسائل بھی تھے۔ معاونت کے علاوہ کالم نویسی بھی کی۔ یہ کالم آل احمد سرور کی دعوت پر انجمن کے رسالے ہماری زبان میں لکھے

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND DAILY MONTHLY DIGESTS

English
Pakistan's 1st
Anti-Bacterial Toothpaste
English
FLUORIDE TOOTHPASTE
ANTIBACTERIAL
CAVITY PROTECTION ALL DAY LONG
Round-the-clock
Cavity protection
Herbal
Dental Care
English
English Herbal
SnScares
@SnScare

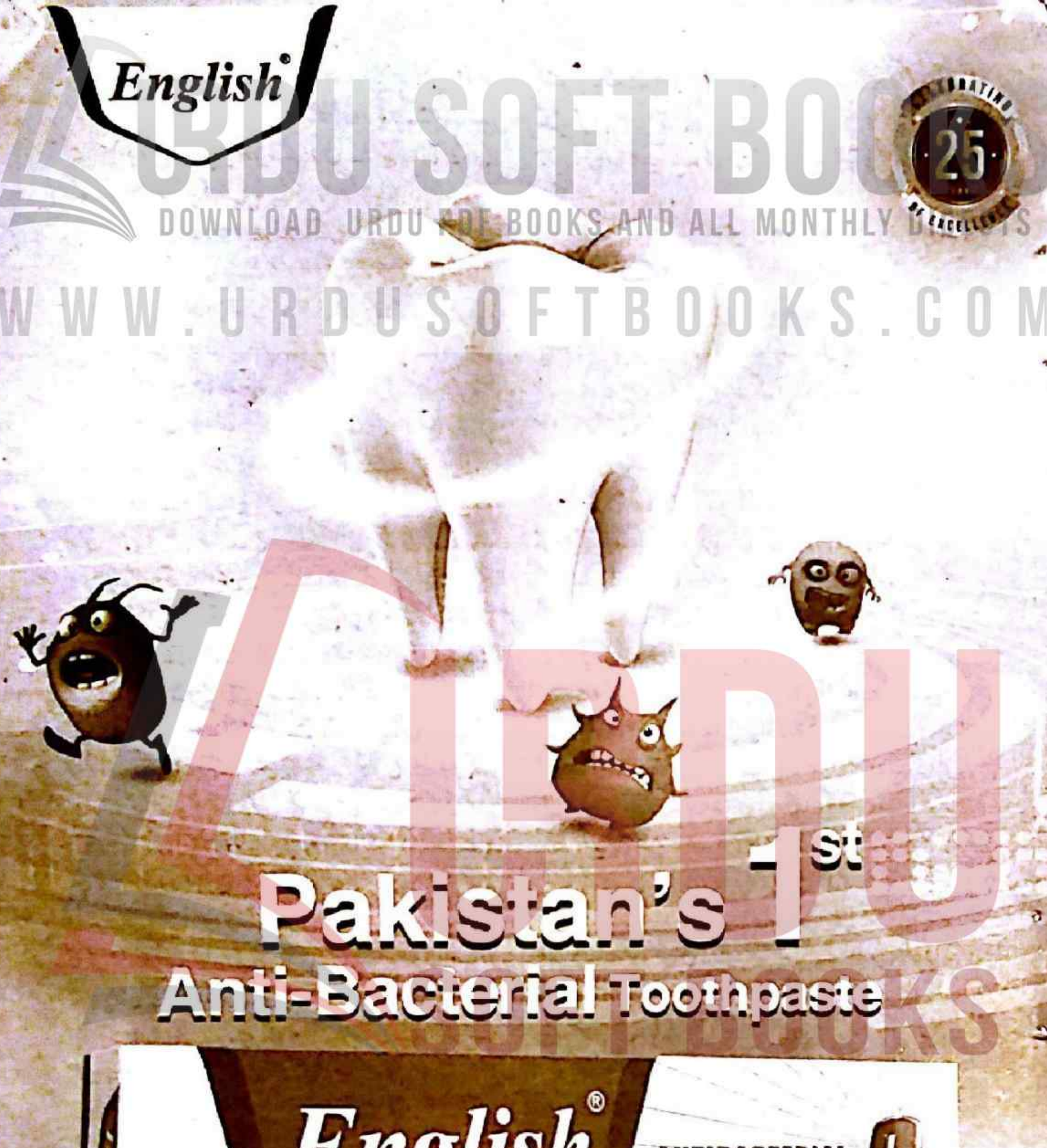

گئے۔

تدریسی سرگرمیوں کا سفر کرتا ہوا وہ ریڈر کے عہدے تک پہنچ چکا تھا کہ 1970ء میں اس نے خاندان والوں کے بے حد اصرار پر گاؤں جانے کا ارادہ کرلیا۔

اب اس کے حالات ایسے نہیں تھے کہ خالی ہاتھ چلا جاتا۔ اس نے گاؤں جانے کا ارادہ کرتے ہی تیاری شروع کردی۔ اپنی والدہ، بھائی، بھاوج اور بچوں کے کپڑے بنوائے۔ توشک، چادریں، چائے کے ڈبے، چائے کا سیٹ غرض جتنا ممکن ہوسکتا تھا سامان لے کر گیا۔ اپنی مسجد کے امام کے لیے خوب بڑا سا کرتہ بنوایا۔ مدرسۃ الاصلاح کی لائبریری کے لیے بہت سی کتابیں لے کر گئے۔

وہ جب طویل بن باس کے بعد گاؤں لوٹا تو اس کے بھائی عزیز الرحمٰن سرائے میر کے اسٹیشن پر گاؤں کے کچھ لوگوں کے ساتھ استقبال کے لیے موجود تھے۔

گاؤں پہنچا تو وہاں کے استقبال کا تو کچھ ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ رشتے داروں کا یہ حال تھا کہ واری صدقے ہورہے تھے۔ یہ وہی رشتہ دار تھے جو طالب علمی کے زمانے میں اسے منہ لگانا گوارا نہیں کرتے تھے۔ جب وہ طالب علم تھا تو اس کے ایک رشتہ دار علی گڑھ آئے تو اس سے ملنا تک گوارا نہ کیا تھا۔ صرف اس لیے کہ اس وقت اس کی کوئی پوزیشن نہیں تھی اور نہ یہ اُمید تھی کہ وہ کبھی کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچے گا۔ اب وہ علی گڑھ یونیورسٹی جیسے ادارے کا ریڈر تھا۔ پورے ملک میں اس کی شہرت تھی۔ اب وہ آوارہ گرد نہیں قابلِ عزت شوہر تھا۔ اس کی بیوی اس کے ساتھ تھی اب وہ تین بچوں کا قابلِ احترام باپ تھا۔ اب وہ لوگ بھی اسے اپنا رشتہ دار ثابت کررہے تھے جو رشتہ دار نہیں تھے۔ اس نے اس منافقت پر بعد میں ایک نظم لکھی۔

جی میں آتی ہے
ان مسخروں پر ہنسوں
ان سے کہہ دوں کہ تم کھوکھلے ہو
اپنی کرسی پہ بیٹھا ہوا کوئی احمق
اونٹ کی طرح بلبلائے
تو کہہ دو کہ کیا بک رہے ہو

وہ پورے اٹھارہ سال بعد گاؤں آیا تھا۔ خوشامدیوں میں گھرا ضرور لیکن اس سمندر میں ماں کی سچی محبت کا جزیرہ بھی تھا۔ اک وہی تھی جس کی محبت میں خوشامد نہیں تھی۔ بیٹے کو دیکھ کر جو آنسو آنکھوں میں آگئے تھے وہ بھی سچے تھے۔ کب کے ترسے ہوئے ہونٹوں پر جو ہنسی آئی تھی وہ بھی سچی تھی۔

خلیل جب تک گاؤں میں رہے ماں کی محبت سے سرشار ہوتے رہے۔

یہ خلیل کی خوش قسمتی تھی کہ ماں کی عمر میں برکت ہوئی اور عرصہ دراز کے بعد انہیں دیکھنا نصیب ہوا۔ ماں بھی شاید اسی انتظار میں زندہ تھیں۔ وہ گاؤں سے لوٹا تو چند مہینے بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا۔ اس کے ایک سال بعد ہی اس کے بڑے بھائی مولانا عزیز الرحمٰن بھی فوت ہوگئے۔ ان دونوں مواقع پر خلیل گاؤں پہنچا اور تعزیت کی۔ اس کے بعد وہ کبھی گاؤں نہیں گیا۔

علی گڑھ واپس آنے کے بعد اس نے ماضی کی کھوج میں پیچھے پلٹ کر دیکھا تو ہاسٹل کے کمروں، خالی سڑکوں اور کرائے کے مکانوں کے سوا اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ اب بھی کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا۔ یہ پچھلے اٹھائیس برس کی کہانی تھی جو کسی ایک مکان میں رہ کر نہیں سنی جاسکتی تھی۔ اس نے ابھی تک اپنا ذاتی گھر نہیں بنایا تھا۔ اسے غالب یاد آئے، اپنے استاد شاد عارفی یاد آئے مگر وہ نہ غالب تھا نہ شاد عارفی۔ اسے بچوں کے لیے ایک گھر کی ضرورت تھی جو اس کا اپنا ہو۔ اس کے بعد اس کے بچوں کو وہاں سے اٹھ کر کہیں اور جانا نہ پڑے۔ 1973ء میں اس نے سرسید نگر علی گڑھ میں زمین خریدی اور ذاتی مکان کی تعمیر کا ارادہ کیا۔ اس کے سنگ بنیاد کے لیے اس نے اپنے استاد رشید احمد صدیقی سے فرمائش کی۔ رشید صاحب نے معذرت کرلی۔ انہوں نے اپنی بیماری کے سبب نہ صرف معذرت کی بلکہ ایک مشورہ بھی دیا۔

"جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پہلی جوبلی کے موقع پر جب ہندوستان بھر کے اکابرین کا ایک اجتماع ہوا تو ذاکر صاحب نے جامعہ کی کسی بہت بڑی عمارت کا سنگ بنیاد جامعہ کے سب سے چھوٹے لڑکے سے رکھوایا تھا۔ اس کے مضمرات کا آپ بخوبی اندازہ کرسکتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ بھی ایسا ہی کریں اور اپنے سب سے چھوٹے بچے سے یہ رسم ادا کرائیں۔"

خلیل نے اس مشورے پر عمل کیا اور اپنے چھوٹے بیٹے عدنان خلیل (عمر دس سال) سے سنگ بنیاد رکھوایا۔

مکان کی تعمیر کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے اپنے ادبی کاموں سے وقت نکال کر تعمیر کا کام دیکھنا پڑ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

رہا تھا۔ جوں جوں مکان کی تعمیر آگے بڑھتی جارہی تھی اس کی مصروفیات بھی بڑھتی جارہی تھیں۔

مکان بن کر تیار ہوگیا لیکن وہ بیمار پڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے یرقان تجویز کیا۔ علاج ہونے لگا۔ ابھی یہ علاج ہو ہی رہا تھا کہ اس کی پیٹھ میں درد ہوا۔ یہ تکلیف ایسی تھی کہ قابل تشویش تھی۔ اسے یونیورسٹی میڈیکل کالج کے اسپتال میں داخل کرادیا گیا۔

بیس بائیس دن اسپتال میں رہنے کے بعد گھر آگیا لیکن پھر طبیعت بگڑ گئی۔ دوبارہ اسپتال میں داخل کرادیا گیا۔ کچھ عرصہ اسپتال میں گزارنے کے بعد دوستوں نے یہ طے کیا کہ اسے دہلی لے جایا جائے۔ شہریار کے ساتھ دہلی آیا اور شمیم احمد شمیم کے توسط سے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں چیک اپ کرایا۔ ڈاکٹروں نے رازدارانہ طور پر بتایا کہ بیماری جگر کی ہے اور خون بنانے والے خلیوں نے کام کرنا بند کردیا ہے۔ اب جب تک زندگی ہے تازہ خون کی منتقلی کے سہارے جینا ہوگا۔

معاملہ صرف جگر کا ہی نہیں تھا اور بھی کئی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ تلی بھی بڑھ گئی تھی۔ گردے میں بھی کچھ خرابی تھی۔

ان کئی بیماریوں کے باوجود وہ خوش باش تھا۔ اس کا قلم نظمیں اور غزلیں بھی اگل رہا تھا۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پروگراموں میں بھی حصہ لے رہا تھا۔

اب اس کی شاعری اک ایسے آدمی کا احوال پیش کررہی تھی جس نے موت کے قدموں کی چاپ سن لی ہو اس کی تنہائی اس دور میں قبر کی تنہائی بن گئی۔

اے وہ اک شخص
جو مرے مرنے کی پہلی خبر سن کے دوڑے
اور آواز دے، بھائیو! آؤ اس کا جنازہ اٹھاؤ
اور اس آواز پہ کوئی آواز اس تک نہ پہنچے
اور پھر مجھ سے بے کس اکیلے کو کاندھے پہ اپنے دھرے
اور اکیلی سی اک قبر میں مجھ کو پہنچا کے محفوظ کردے

.....

اب اس کی شاعری میں "نیند" موت کی ہم معنی ہو جاتی ہے۔

موت ہی وہ اپنی پیاری نیند ہے
جو ہمیشہ کے لیے اپنے مسافر کو سلاتی ہے
اسے تحفہ عطا کرتی ہے
جس کو ہم کبھی آرام کہتے ہیں اور کبھی امن وسکوں
میں اس کی کالی زلفوں کا اسیر
میں اس اپنی دلہن کا منتظر ہوں

.....

خلیل کی تکالیف میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس کی بیماری پیچیدہ صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔ اس نے اسی بیماری کے سبب 1976ء میں ایک سال کی رخصت لے لی اور کھوئی ہوئی صحت کو بحال کرنے کے لیے سرینگر چلا گیا۔ یہاں اس کے ہم زلف کمال احمد صدیقی بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔

وہ جب سرینگر پہنچا تو بہت کمزور تھا لیکن یہاں کی خوشگوار آب وہوا نے اس کی صحت پر بہت اچھا اثر کیا اور وہ پیدل سیر کرنے کے لیے نکلنے لگا۔ صحت کی اس بحالی میں اس کے دوستوں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے کئی دوست یہاں تھے جو اسے ریڈیو اور ٹیلی وژن کے پروگرام دلاتے رہے تاکہ اسے اپنی علالت کا احساس نہ ہو۔

احباب کی محفلوں اور خوشگوار آب وہوا نے اس کی صحت پر معجزانہ اثر ڈالا۔ اس کے چہرے پر گوشت نظر آنے لگا اور آنکھوں میں وہی چمک آگئی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اب اس کی ٹانگوں میں اتنی طاقت آگئی کہ پہاڑوں پر چڑھنے لگا۔

اس کے بدن میں نیا خون بننا بند ہوگیا تھا۔ ہر پندرہ دن بعد خون کی منتقلی کی ضرورت پڑتی تھی مگر یہاں تازہ خون بننا شروع ہوگیا۔ جتنے عرصے وہ سرینگر میں رہے، نئے خون کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

وہ چھٹیاں گزارنے کے بعد علی گڑھ واپس آگیا اور یونیورسٹی جوائن کرلی۔ شعبے کے سب کام نارمل طور پر کرنے لگا لیکن یونیورسٹی کے ارباب اختیار اسے اب تک بیمار سمجھ رہے تھے۔ جو لوگ اس کے خلاف تھے وہ سازشوں میں مشغول تھے۔

شعبہ اردو میں پروفیسر شپ کی جگہ نکلی تھی۔ اسے قابلیت اور سینیارٹی کی وجہ سے اس منصب کے لیے مضبوط امیدوار سمجھا جارہا تھا لیکن وہ سازشوں کا شکار ہوگیا۔ اس کی سنگین بیماری کو بہانہ بنایا گیا کہ ایسا آدمی کیا پروفیسری کرسکے گا۔ مزیدار بات یہ تھی کہ انٹرویو کے وقت آل احمد سرور ایکسپرٹ تھے اور خورشید الاسلام صدر شعبہ۔ اس سے بھی مزیدار اور تکلیف دہ حقیقت یہ تھی کہ ایک مرتبہ پروفیسر شپ

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کی اسامی نکلی تھی جس میں خورشید الاسلام امیدوار تھے۔ خلیل نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو دست بردار کرلیا تھا۔ ان کے مقابل نہیں آیا تھا۔ اب اسی خلیل کو سینئر ہونے کے باوجود اسے نظرانداز کر دیا گیا اور یہ خورشید الاسلام کے سامنے ہوا۔

جسے بیمار قرار دے کر نظرانداز کر دیا گیا تھا وہ اپنے معمولات کو جاری رکھے ہوئے تھا۔ تین تین گھنٹے کی کلاسیں لے رہا تھا۔

ہم بانسری پر موت کا گاتے رہے نغمہ ترا
اے زندگی اے زندگی رتبہ رہے بالا ترا

25 اپریل 1978ء کو شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کے زیراہتمام اقبال سیمینار منعقد ہوا۔ خلیل اس اجلاس میں شریک ہوا۔ ایک اجلاس کی صدارت بھی کی۔ ایک صدارتی خطبہ بھی ارشاد فرمایا۔

26 مئی کو طلبہ کا زبانی امتحان لیا اور اسی روز ایکسٹرا کلاس لی لیکن اس رات پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ درد زیادہ ہوا تو میڈیکل کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ وہاں اسے تازہ خون دیا گیا اور 29 مئی کی شام کو گھر آ گیا۔

اس کے بھائی پرواز اصلاحی اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں علی گڑھ آئے۔ خلیل کے بچوں نے پہلی بار اپنے تایا کو دیکھا۔ گھر میں جشن کا سا سماں ہو گیا۔ وہ اپنے بھائی کو شعبہ اردو ساتھ لے گیا۔ لائبریری میں بھی ساتھ گیا اور مخطوطات کی نقول حاصل کرنے کی اجازت دے دی۔

پرواز نے یکم جون کو واپس جانے کا ارادہ کیا تو بادیدۂ نم رخصت کیا۔

''میں تو مستقل مریض ہوں۔ چلنے پھرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ آپ بچوں سے ملنے آجایا کیجیے۔ اب ہمارا خاندان ہم سے ہی عبارت ہے اسے قائم رہنا چاہیے۔ بچوں کو معلوم تو ہو کہ ان کا بھی کوئی خاندان ہے۔''

پرواز بیس سال بعد اس سے ملنے اس کے گھر آئے تھے۔

اسی دن اس کا بھائی رخصت ہوا تھا اسی دن اس نے بھی رخصتی کی ٹھان لی۔ کوئی بارہ بجے کے بعد اسے سردی محسوس ہوئی۔ اپنی دوا مانگی۔ بیوی نے دوا دے دی۔ پھر انار کا جوس مانگا۔ جوس اور دوا پینے کے بعد کچھ حالت سنبھلی۔ سورۂ یٰسین پڑھنے کو کہا۔

تھوڑی دیر بعد آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

''خلیل صاحب، ہاتھ ہٹائیے۔'' بیوی نے کہا۔

خلیل نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹایا۔ کچھ دیر خالی آنکھوں سے تکتے رہے۔ یہ تو چند سیکنڈ بعد معلوم ہوا کہ کھیل ختم۔

پڑوس سے وصی الرحمٰن آ گئے۔ انہوں نے نبض دیکھی۔ موت کی تصدیق ہو گئی۔ اسی وقت ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے بھی تصدیق کر دی۔

اسی روز چند دوستوں کی ہمراہی میں اس نے اردو باغ سے قبرستان تک کا سفر طے کیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں قبر تیار ہوئی۔

مٹی کی امانت مٹی کے سپرد ہو گئی۔

بہار کے دنوں کی یاد
دھوپ میں جھلس گئی
کہ زرد پھول دور دور کھل اٹھے
زمیں پہ اب کوئی جگہ نہیں بچی
کہاں یہ خواہشوں کے بیج بوؤں میں
مجھے تو بس اس فیصلے کا اختیار ہے
ہنسوں کہ اور روؤں میں

.....

اس کے انتقال کے بعد مردہ پرستی کی روایت کو نبھاتے ہوئے یونیورسٹی نے اسے پروفیسر بنا دیا لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔ وہ تو اپنی تخلیقات سے زندہ تھا اور زندہ رہے گا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا آخری مجموعہ ''زندگی اے زندگی'' شائع ہوا جس میں 66ء سے اس کی وفات 78ء تک کا کلام شامل تھا۔

اس نے پوری زندگی خاندان والوں سے دور، دکھ، تکلیفوں میں گزاری۔ تعلیم کا خرچ خود برداشت کیا لیکن اپنے بچوں کو چھت دے گیا۔

مٹی کی چادر میں چھپیں گے قبر بنے گی مٹی کی
سب مٹی میں مل جائیں گے ختم فسانے مٹی کے

ماخذات

خلیل الرحمن اعظمی احوال و آثار
پروفیسر امجد علی شاکر
شاد عارفی
مظفر حنفی

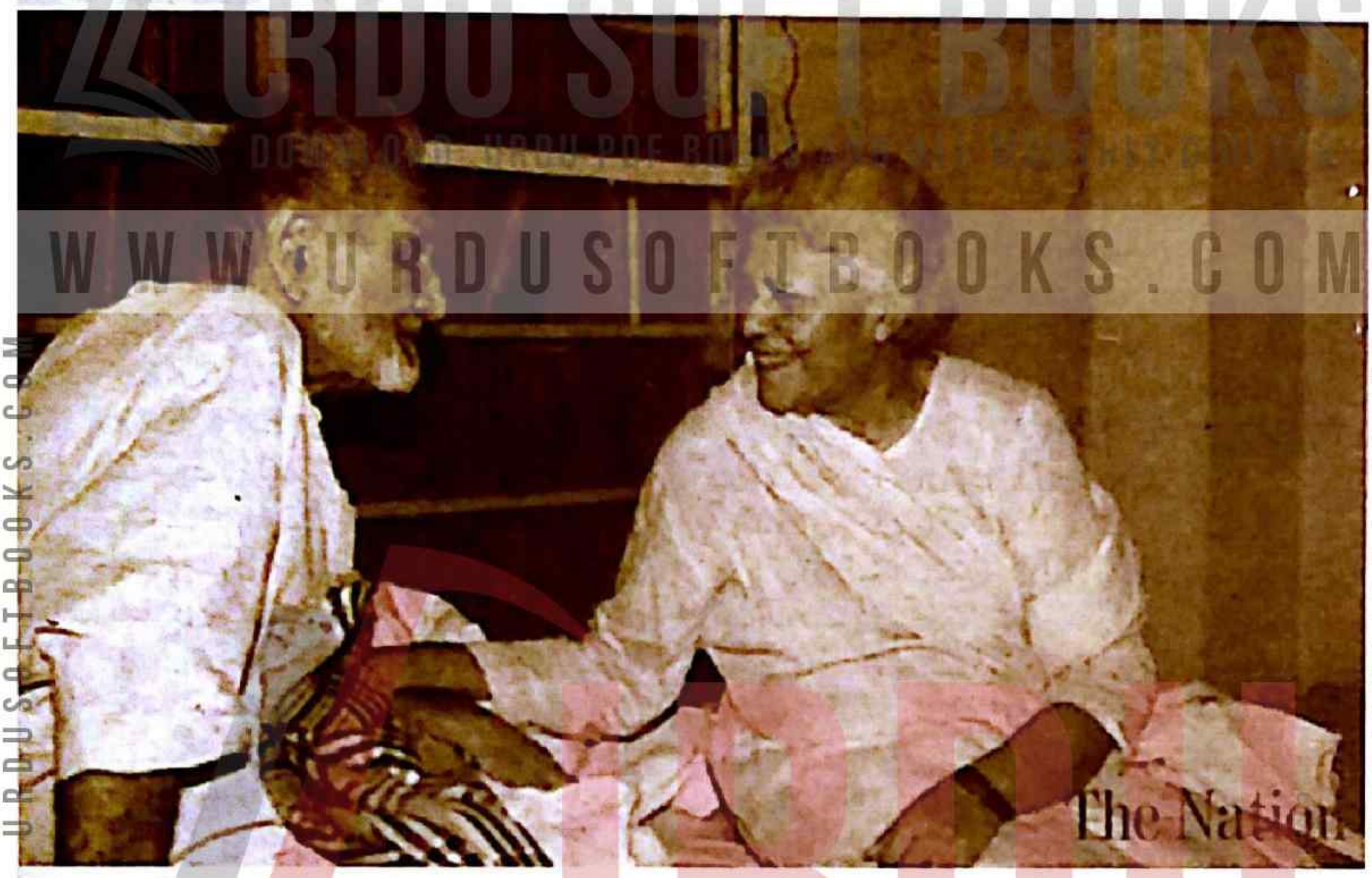

آپا جی

زین مہدی

وہ ذہن رسا کی مالک تھی لیکن اندر کے قلم کار کو بیدار کرنے سے ہچکتی تھی۔ ادب سے ناتا جوڑنا چاہتی تھی مگر اسے مہمیز کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ایسے میں اس کی شناسائی ایک ایسے نوجوان سے ہو گئی جو اسے اوج پر پہچانے کا خواہاں تھا لیکن وہ حد درجے کا شرمیلا تھا۔ اسے اپنانے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اپنی خواہش کے اظہار میں اس نے کئی سال لگا دیے۔ لیکن جب وہ دونوں ایک ہوئے تو اردو ادب میں کئی اہم اضافے ہوئے۔

قلم کی دھنی اردو ادب کو کئی شاہکار ناول دینے والی ادیبہ کی کتھا

مشرقی پنجاب کا ایک چھوٹا سا شہر فیروز پور۔ اس شہر کی بہت سی خصوصیات ہیں، انہی میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں فوجی چھاؤنی ہے۔ اس وقت اس چھاؤنی میں انگریز سپاہی بھی تھے اور دیسی بھی۔ وہ شہر اسی فوجی چھاؤنی کی وجہ سے زیادہ پہچانا جاتا تھا۔ وہ شہر اتنا بڑا بھی نہ تھا کہ لوگ اسے زیادہ اہمیت دیتے۔ بس ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ اسی لیے وہاں رات اترتے ہی ویرانی چھا جاتی تھی۔ سناٹے کا راج ہو جاتا تھا۔ پھر وہ دور بھی ایسا تھا کہ لوگ شبینہ محفلوں کو پسند

نہیں کرتے تھے۔شام ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں میں بند ہوجاتے تھے۔

رات اترنے سے پہلے شام آتی ہے۔ وہاں بھی شام ہوتے ہی مساجد سے اذانیں مگر دواروں سے گرہنت صاحب کا پاٹھ اور مندروں سے کڑتال کی آوازیں آنا شروع ہوجاتیں۔شہر میں ہندو اور سکھوں کی اکثریت تھی لیکن مسلمانوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔کئی محلے تو ایسے تھے جس میں ایک بھی غیر مسلم نہ تھا۔ایسا ہی ایک محلہ وہ بھی تھا جہاں بدرالزماں کی رہائش تھی۔وہ سرکاری ملازم تھے۔اونچے عہدے پر فائز تھے اس لیے ان کی عزت بھی خوب تھی۔ان کے گھر سے باہر ایک سرکاری لیمپ پوسٹ تھا جس کو سرکاری کارندے شام ہوتے ہی تیل ڈال کر روشن کردیتے تھے۔اس لیمپ پوسٹ کی دھندلی روشنی اس گھر پر بھی پڑتی تھی۔اس رات بھی لیمپ کی کانپتی روشنی اس گھر پر پڑ رہی تھی۔اس ہلکی سی روشنی میں صاف نظر آرہا تھا کہ گھر کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔وہ دروازہ نشست گاہ کا تھا۔باہر سے ہی نظر آرہا تھا کہ اندر رہا ہی ہے۔روشن فانوس کی روشنی میں کئی آدمی بیٹھے ہیں۔جبکہ یہ سردی کا موسم تھا۔1928 کا نومبر دم توڑ رہا تھا یعنی نومبر کی 28 تاریخ تھی۔ایسی سرد رات میں لوگوں کا وہاں بیٹھے رہنا کسی خاص وجہ کی جانب اشارہ تھا۔بدرالزماں ان کے درمیان بیٹھے تھے لیکن سب کے سب خاموش تھے۔

عام طور سے ایسے وقت میں وہ اپنے بستر پر ہوتے تھے۔مگر آج وہ خلاف توقع یہاں بیٹھے تھے۔گھر کا نوکر ابھی ابھی حقہ تازہ کرگیا تھا جس کی 'نے' وہاں بیٹھے ایک صاحب کے منہ سے لگی ہوئی تھی۔وہ بھی سرکاری ملازم تھے اور اکثر دورے پر رہا کرتے تھے۔ان کی یہاں آمد بھی ایک سرکاری دورے کی مرہون منت تھی۔ وہ اسی دن لاہور سے آئے تھے۔ان کا شمار بدرالزمان کے قریبی دوستوں میں ہوتا تھا۔انہوں نے ایک لمبی کش لی اور پھر دھواں اڑاتے ہوئے بولے۔"تم تو ایسے گھبرا رہے ہو جیسے یہ کوئی پہلا موقع ہے۔ اختر بتا رہا تھا کہ اس نے نہایت تجربے کار دائی کو بلایا ہے۔"

ابھی ان کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ نشست گاہ کے اندر والا دروازہ کھلا اور ایک نوکرانی نے سر باہر نکال کر کہا۔"مبارک ہو۔بیٹی ہوئی ہے۔"

بدرالزمان نے فوراً جیب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔یہ ایک بہت بڑی رقم تھی۔وہ خوش خوش واپس چلی گئی۔

باہر نشست گاہ میں بیٹھے لوگوں میں بحث شروع ہوگئی کہ بچی کا نام کیا رکھا جائے۔اس پر مشورے ہونے لگے۔کئی نام پیش کیے گئے لیکن بدرالزمان کو پسند نہ آئے تو بات کل پر ٹال دی گئی۔یہ مشورے ایک دو دن نہیں کئی دن تک ہوئے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔اب تک سب اسے بانو ہی کہہ کر مخاطب کررہے تھے۔بانو یعنی شہزادی۔پیاری بٹی۔

وقت گزرتا رہا۔کیلنڈر بدلتے رہے۔بچی بڑی ہوتی رہی۔گھرانا پڑھا لکھا تھا اس لیے اسے کھیلنے کے لیے بھی پنسل کاپی ملی۔وہ اپنے بھائی پرویز کی تو جان تھی۔ذرا سا موقعہ ملتا اور پرویز اسے گود میں اٹھا کر باہر نکل جاتا جس پر اسے باتیں بھی سننا پڑتیں لیکن وہ بہن کی محبت سے دستبردار ہونے پر تیار نہیں تھا۔وہ اس پر صرف اپنا حق سمجھتا۔

ابھی وہ صرف ساڑھے تین سال کی تھی کہ یکا یک اس پر ایک افتاد ٹوٹ پڑی۔تین ساڑھے تین سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔وہ تو ابھی خود اپنے آپ کو بھی پہچان نہیں پائی تھی۔اسے اپنا بھی ہوش نہیں تھا۔اسی لیے وہ دلچسپی سے گھر میں برپا ہلچل کو دیکھ رہی تھی۔اسے رہ رہ کر دکھ ہورہا تھا۔وہ بار بار کمرے میں جاکر اپنی ماں ذاکرہ بیگم کو دیکھ آتی۔اسے حیرت ہورہی تھی۔اس لیے کہ ماں لگاتار رو رہی تھی۔دوسری عورتیں اسے تسلی دے رہی تھیں۔ماں کے پاس جاتے ہی اسے بھی رونا آنے لگتا اور وہ رونے لگتی۔تب کوئی نہ کوئی اسے گود میں اٹھا کر باہر لے آتا اور وہ خاموش ہوکر پھر سے لوگوں کو دیکھنے لگتی۔اس سے پہلے اتنے لوگوں کو اس نے کبھی اپنے گھر میں دیکھا نہیں تھا۔جو بھی اس کے قریب آتا اس کے سر پر ہاتھ ضرور پھیرتا اور اپنے آنسو پونچھنے لگتا۔وہ حیران تھی کہ لوگ اتنا رو کیوں رہے ہیں۔پھر وہ وقت بھی آگیا جب بدرالزمان کو کفن پہنا کر باہر لایا گیا۔

لوگ اس کے ابا کو کندھے پر اٹھا کر چلے گئے اور وہ دیگر بچوں کے ساتھ پھر سے کھیل میں مصروف ہوگئی۔اسے پتا ہی نہیں چلا کہ اس کے سر سے دست شفقت پدری ہٹ چکا ہے۔اس کی ماں جو ابھی صرف ستائیس سال کی تھیں وہ بیوگی کی چادر تلے آگئی ہیں۔وہ تو اپنے آپ میں ہی گم رہی۔

وقت کا کام ہے گزرنا اور وہ گزرتا رہا۔اسے ابجد سے ماں آگاہ کر ہی چکی تھی۔حروف شناسی سکھا چکی تھی۔اس لیے اسے جب مقامی اسکول میں داخل کیا گیا تو اسے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی۔یوں بھی اسے بہت ساری نئی سہیلیاں جو مل گئی تھیں۔شاید یہ خون کا اثر تھا کہ وہ پڑھائی میں بہت زیادہ

دلچسپی لیتی تھی۔خوب دل لگا کر پڑھتی تھی۔اسے گھر سے زیادہ اسکول پسند تھا اس لیے کہ اسے دوسروں سے مقابلہ جو کرنا پڑتا تھا۔پھر وہ اپنی ماں کے ساتھ جالندھر آ گئی۔ہوا یوں تھا کہ اس کی ماں نے اپنے آپ کو بچوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ان کے لیے کئی رشتے آئے تھے لیکن انہوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوں گی۔کسی اور کا سہارا نہیں چاہیے۔انہوں نے اسکول جوائین کر لیا تھا۔ان کا تبادلہ جالندھر کے ایک اسکول میں ہوا تھا اور یہ تبادلہ ان کی پسند پر تھا۔وہ اسکول کی پرنسپل بنا دی گئی تھیں۔اسی اسکول میں اسے بھی داخل کیا گیا تھا۔اس کی اہمیت اس لیے نہیں تھی کہ وہ اسکول کی ہیڈ مسٹریس کی بیٹی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ پڑھائی میں بہت تیز تھی اور اساتذہ اس کے ذہن کی تعریف کرتے تھے۔اس کی لکھائی دوسروں کو دکھا کر کہتے، دیکھو کتنے خوبصورت انداز میں لکھا گیا ہے،اس وقت اسے یہ جملہ بہت بھاتا تھا۔اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا۔دراصل اس کی لکھائی اس لیے دوسروں سے اچھی تھی کہ اسے خالہ جی (وہ اس کی سگی خالہ نہیں تھیں، وہ تو کرکٹر، سیاست داں عمران خان کی خالہ تھیں) اسے تختی لکھانا سکھاتی تھیں اور وہ دل لگا کر لکھتی تھی۔محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور اس کی لکھائی میں پختگی آتی جا رہی تھی۔اس عمر کی کوئی دوسری لڑکی اتنے صفائی سے لفظ کے پیالے بنا ہی نہیں سکتی تھی۔اسے ایک اور مدد حاصل تھی کہ اس کے نانا جان جو اسے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے وہ اسے پابندی سے لالٹین کی روشنی میں پڑھانا ضروری سمجھتے تھے۔اس طرح اسے دو طرفہ موقع مل رہا تھا۔پھر وہ خود بھی پڑھائی میں دلچسپی لیتی تھی۔دل لگا کر محنت کرتی تھی۔

سرکاری ملازم کبھی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے۔کیونکہ حکومت ان کے پیروں میں تبادلے کا چکر باندھ دیتی ہے۔اس کی ماں کا بھی تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔کبھی اس شہر تو کبھی اس شہر۔ہر تبادلے کے بعد اسے نئی سہیلیاں ملتیں۔نئے اساتذہ ملتے۔گویا کہ اس نے کئی اسکول بدلے کئی نئے شہر دیکھے۔تبادلہ ماں کا ہوتا اور اثر بچوں پر پڑتا لیکن ان کی پڑھائی متاثر ہوتے ہوئے بھی وہ اس پر قابو پا لیتی۔

اس بار ماں کا تبادلہ دھرم شالہ ہوا تھا۔وہ بھی ماں کے ساتھ نقل مکانی کرنے پر مجبور تھی۔یہ ایک نیا شہر تھا۔نئے لوگ تھے پھر بھی اس نے نئے اسکول میں خود کو ایڈجسٹ کر لیا۔نئی نئی لڑکیوں سے دوستی بنائی۔پڑھائی میں تو تیز تھی اس لیے اسے ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی۔وہ نہ صرف پڑھائی میں تیز تھی بلکہ نت نئے جملے بنانے میں بھی تیز تھی۔اس کے جملے بعد میں بھی سہیلیاں دوہرا کر لطف لیتی تھیں۔اس کی اس خوبی نے اسے ہر دل عزیز بنا رکھا تھا۔غیر نصابی سرگرمیوں میں اسے اوّلیت حاصل تھی۔اسی دوران اسکول کے سالانہ فنکشن کی تاریخ نزدیک آ گئی۔ہر کلاس کی مانیٹرز کو کہا گیا کہ وہ اپنی کلاس کی لڑکیوں سے کہیں کہ وہ ڈراما تیار کریں۔اس کی کلاس کو بھی حکم تھا کہ وہ لوگ بھی آدھے گھنٹے کا ایک ڈراما تیار کریں۔جس کی پیشکش اچھی ہوئی تو یا سنگ مارکس میں اضافی نمبر ملیں گے۔

اس کی کلاس کی لڑکیوں نے ڈراما کی تلاش شروع کر دی لیکن جتنے بھی ڈرامے ملے سب دورانیہ کے لحاظ سے زیادہ تھے۔تب سہیلیوں نے اس سے کہا کہ تم تو اتنے چبھتے ہوئے، چلبلے جملے بولتی ہو، کہانیاں پڑھتی ہو، تم ہی کوشش کرو؟

سہیلیوں کے اصرار پر اس نے ایک ڈراما لکھا اور استانی کو دکھایا۔ڈراما انہیں بھی اچھا لگا۔ریہرسل شروع کرا دی گئی۔بالآخر تقریب میں وہ ڈراما پیش کیا گیا۔اس ڈرامے کو سب نے پسند کیا اور پہلے انعام کا حقدار قرار دیا۔اس کامیابی نے اس کے لیے ایک نیا در کھول دیا۔وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھنے لگی۔اس کی کہانیاں سہیلیوں کو خوب پسند آتی۔سب کہتیں کہ اسے کسی رسالے کو بھیج دو ضرور چھپے گی لیکن اس کی ہمت نہ ہو رہی تھی کہ وہ ان کہانیوں کو کہیں بھیجے۔وہ تمام کہانیاں جمع ہوتی رہیں۔اور وہ ایک جماعت سے دوسری جماعت میں جاتی رہی۔بالآخر میٹرک بھی پاس کر لیا۔

اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوا کہ میٹرک کے بعد وہ کرے کیا؟ والدہ کا خیال تھا کہ اسے آگے پڑھنا چاہیے لیکن وہاں لڑکیوں کا کوئی کالج نہ تھا۔ایک ہی کالج تھا جس میں لڑکے پڑھتے تھے۔اسی کالج میں پرویز بھی تھا۔اس نے جب سنا کہ بہن کو بھی اسی کالج میں داخلہ دلوایا جائے گا تو اس نے سختی سے احتجاج کیا۔وہ مخلوط تعلیم کا مخالف نہیں تھا لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ جس کالج میں وہ ہے اس میں بہن بھی جائے۔قریبی شہروں میں لاہور تھا لیکن ماں اسے لاہور بھیجنے پر تیار نہیں تھی۔بیٹی کو نظروں سے دور بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ماں نے شہر کی لبرل خواتین کو جمع کیا اور پھر ان کے سامنے لڑکیوں کے مسائل کو رکھا۔وہ سب بھی اس سے متفق ہو گئیں کہ اس مسئلہ کا حل نکالا جائے۔لڑکیوں کا ایک کالج ہونا چاہیے۔سب نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور پھر ان سب کی اعانت و حوصلہ افزائی سے دھرم شالہ بازار سے کچھ اوپر ایک کوٹھی کرائے پر لی گئی اور اس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں ایف اے تک کی کلاسیں شروع کرادی گئیں۔

اس کالج میں اس کا گروپ ہی پہلا بیچ تھا جو زیر تعلیم تھا۔ اس گروپ میں وملا گیان سنگھ، مہندر کالسی اور طیبہ ٹکا جیسے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ گیان سنگھ بہت بڑے بزنس مین تھے۔ ان کی بسیں چلتی تھیں۔ گویا کہ تمام کی تمام لڑکیاں بااثر گھرانے کی تھیں۔ تعلیم کے ساتھ غیر تعلیمی سرگرمیاں بھی جاری رہیں۔ شعروشاعری ہی نہیں بیڈمنٹن اور دیگر کھیلوں میں بھی وہ سب آگے آگے رہیں۔ جبکہ ملک بھر کا سیاسی افق بڑی تیزی سے بدل رہا تھا۔ قیام پاکستان کا اعلان ہو چکا تھا اور اس بات پر ہندو سکھ آگ بگولا ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ لوٹ مار، قتل، خوں ریزی شروع ہو گئی تھی۔ کبھی اس شہر تو کبھی اس شہر سے مسلمان بستیوں کو لوٹنے، آگ لگانے کی خبریں آنے لگی تھیں۔ اس وجہ سے ذاکرہ بیگم نے اسکول انسپکشن کے لیے دورے محدود کر دیئے تھے۔ وہ گورداس پور سے باہر نہیں جارہی تھیں۔

گورداس پور میں ان کا گھر ترمو روڈ پر تھا جو پتن کی طرف جاتی تھی۔ اس گھر سے بڑے پھاٹک تک ایک روش تھی پھر ڈیوڑھی کا دروازہ آتا تھا۔ یہ بیٹھک نما ڈیوڑھی اندر صحن میں کھلتا تھا جس کے چاروں طرف اور اوپر بھی کمرے تھے۔ کافی بڑا گھر تھا۔ صحن کے ایک طرف باورچی خانہ وغیرہ تھا اور دوسری طرف کمرے تھے۔ ان میں سے ایک کمرا بھائی پرویز کے تصرف میں تھا اور دوسرے کمرے میں وہ اپنی امی کے ساتھ سویا کرتی۔ باہر کا بڑا سا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا لیکن جب تعصب کی آندھی چلی اور حالات کشیدہ سے کشیدہ تر ہونا شروع ہو گئے تو دروازہ بند رہنے لگا۔ گورداس پور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہاں کے لوگ پوری طرح مطمئن تھے کہ یہ علاقہ پاکستان کے حصے میں آئے گا اس لیے دیگر علاقوں کی طرح یہاں کے لوگوں نے ہجرت نہیں کی تھی مگر سکھ اقلیت میں ہوتے ہوئے بھی شرارت سے باز نہیں آرہے تھے۔ وہ مقامی لوگوں کو تو کچھ نہیں کہتے لیکن اگر کوئی دوسرے علاقے کا مسلمان نظر آجاتا تو وہ اسے نقصان پہنچانے میں ہچکتے نہیں تھے۔ اس دن بھی ایک ایسا ہی منظر نظر آیا۔ وہ سب گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ باہر سے شور کی آواز آئی۔ پرویز دوڑتے ہوئے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر ایک جم غفیر پر پڑی۔ سب کے ہاتھوں میں کھلی ہوئی کرپانے اور ڈنڈے تھے۔ وہ سب ایک عورت اور ایک بچے کو گھیر رہے تھے۔ وہ دونوں اپنے حلیے سے ہی مسلمان نظر آرہے تھے اسی لیے بلوائی ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں کوئی عقلمند اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالتا لیکن پرویز سے صبر نہ ہو سکا اور وہ دوڑتا ہوا باہر نکلا اور ان دونوں کو کھینچتا ہوا اندر لے آیا پھر اتنی ہی پھرتی سے اس نے دروازہ لگا دیا۔ بلوائی باہر سے شور مچاتے رہے۔ ''جو بولے سو نہال ست سری اکال'' کا نعرہ لگاتے رہے۔ پوچھنے پر عورت نے اپنا نام زینب اور بچے کا لالو بتایا۔ اس نے کہا کہ وہ پٹیالہ کے تحصیلدار کی بیوی ہے اور جان بچا کر یہاں تک پہنچی ہے۔ اس کے گھر والے سب کے سب مارے جا چکے ہیں۔

ان دونوں کو مکان میں ہی ٹھہرا لیا گیا۔ یوں بھی سب کو یقین تھا کہ یہ علاقہ تو پاکستان میں آئے گا ہی۔ اس لیے بھی دوسرے علاقے کے لوگ پناہ کی تلاش میں گورداس پور آتے جارہے تھے۔ وہ گھر ایک طرح سے کیمپ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اس لیے کہ جتنے بھی لوگ گورداس پور آتے وہ اسی گھر کا رخ کرتے۔ ابھی تک یہاں فسادات کی ابتدا نہیں ہوئی تھی۔ سکھ اور ہندو نعرے بازی تو کر لیتے تھے لیکن کوئی بڑی واردات نہیں ہوئی تھی۔ وہ گھر سے باہر نہیں نکلتی تھی کیونکہ وہ بھی ڈر گئی تھی۔ حالات کے اس نئے رخ سے وہ خوفزدہ تھی۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے جب اس کا بی میتھ کا پرچہ تھا۔ سینٹر کنیئرڈ کالج میں تھا۔ پرچہ شروع ہی ہوا تھا کہ کچھ شرپسندوں نے کالج کے عقبی حصہ میں آگ لگا دی۔ دھواں اٹھتے ہی لڑکیاں خوفزدہ ہو گئیں۔ ممتحن نے لڑکیوں سے پرچے لیے اور سب کو ایک بس میں بٹھا کر ایف سی کالج پہنچایا اور وہیں سب نے پرچے دیئے۔ امتحان گاہ سے وہ واپس آئی تو حد سے زیادہ ڈری ہوئی تھی۔ گورداس پور پہنچ کر بھی اس کا خوف کم نہیں ہوا۔ ابھی وہ اس خوف کے گھیرے سے نکلی بھی نہیں تھی کہ تقسیم کا اعلان ہو گیا۔ کشمیر کو راہ داری دینے کے لیے مسلم اکثریتی علاقہ گورداس پور کو بھارت کی جھولی میں ڈال دیا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیئے۔ مسلمان بستیوں پر حملے بھی شروع ہو گئے۔ لوگ جان بچا کر لاہور کی جانب بھاگنے لگے لیکن ذاکرہ صاحبہ کا ابھی پاکستان جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ پرویز جو پاکستان بننے سے بہت زیادہ خوش تھا وہ بھی ابھی پاکستان جانے پر غور نہیں کر رہا تھا کہ ایک دن گھر کا پشتینی نوکر چراغ سراسیمہ سا گھر آیا اور ذاکرہ صاحبہ سے بولا۔ ''بی بی جی میں ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیا بولو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''وہ جو فوجی بیرک ہے نا....'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر جھجک رہا تھا۔

اس گھر سے قریب فوجی بیرک تھے جن میں پہلے انگریز افسران رہا کرتے تھے۔اعلان تقسیم کے فوراً بعد اس میں ہندوستانی فوجی آگئے تھے۔وہاں بجنے والا بگل اور پریڈ کی آوازیں بھی گھر تک آتی تھیں۔چراغ وہیں سے آرہا تھا اور اب وہ خاموش کھڑا تھا۔ذاکرہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔"تم کچھ کہہ رہے تھے؟"

"وہ جی آج میں نے اپنے کانوں سے ہندو فوجی افسران کو باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔وہ لوگ چھوٹی بی بی کو اغوا کرنا چاہتے ہیں۔گندی گندی باتیں کررہے تھے۔"

اتنا سننا تھا کہ ذاکرہ بیگم نے حکم صادر کردیا کہ ابھی اور اسی وقت ہم لاہور کے لیے نکل چلیں گے۔آناً فاناً فیصلہ ہوا اور جلد بازی میں جتنا کچھ لیا جاسکتا تھا وہ لے لیا گیا۔ذاکرہ بیگم نے اپنے اثر رسوخ سے ایک ٹرک حاصل کرلیا۔اس ٹرک میں اس گھر میں مقیم پناہ گزینوں کو بھی بٹھا لیا۔ایک رضائی میں بانو کو لپیٹ کر ڈرائیور کے پیچھے کھڑا کردیا گیا۔ماں کا حکم تھا کچھ بھی ہوجائے وہ ہلے بھی نہیں تاکہ کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ اس رضائی میں کوئی زندہ وجود بھی ہے۔ٹرک پر ترپال ڈھانک دیا گیا اور پرویز پیچھے کھڑا ہو گیا۔اس کے ہاتھ میں ایک ائرگن تھی جس سے وہ چڑیا کا شکار کرتا تھا۔اس گن کی صرف نال باہر تھی کہ دور سے دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ رائفل کی نال ہے۔

ٹرک لاہور کی جانب چلا۔کئی جگہ بلوائیوں نے انہیں روکا لیکن رائفل دیکھ کر بلوائی خود پیچھے ہٹ جاتے وہ سمجھتے تھے کہ اندر فوجی ہیں۔

اس طرح وہ لوگ بلوائیوں سے بچتے بچاتے باحفاظت لاہور پہنچ گئے۔اب ان کا ٹھکانا یونیورسٹی کیمپس تھا۔لاہور آتو گئے تھے مگر اب رہنے کے لیے چھت کی ضرورت تھی۔بغیر چھت کے تو کوئی بھی رہ نہیں سکتا۔شہر کی حالت دگرگوں تھی۔کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔لٹے پٹے قافلے پر قافلے آرہے تھے۔جسے جہاں جگہ ملتی وہ وہیں ٹھہر جاتا۔یونیورسٹی کیمپس میں آکر وہ لوگ بھی ٹھہر گئے۔

کھلے برآمدے میں ٹھہرنا آسان نہیں۔چراغ کی عقلمندی سے روٹی اور اچار ساتھ آگیا تھا۔وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ کر سب نے اچار سے روٹی کھائی۔ذاکرہ خاتون نے سوچنا شروع کیا کہ کہاں جایا جائے۔ان کو یاد آگیا کہ یہاں ان کی ایک خالہ زاد بہن بھی رہتی ہیں۔فیروزہ ان کا نام ہے۔اب ان کے گھر کی تلاش شروع ہوئی۔بالآخر ان کو ڈھونڈ لیا گیا۔وہ مین فیروز پور روڈ پر رہتی تھیں۔ان کے گھر میں آسرا لیا گیا۔چھت ملی تو نوکری کی فکر ہوئی۔ذاکرہ صاحبہ نے محکمہ تعلیم کو اپنے آنے کی خبر دینا ضروری سمجھا اور اطلاعی درخواست جمع کرا دی۔جواب آنے میں دیر نہ لگی۔انہیں لیڈی میکلیگن کالج میں پرنسپل کا عہدہ دے دیا گیا۔نوکری جیسی بھی ہو ایک آسرا ہوگیا۔انہوں نے کالج کا دورہ کیا تو پتا چلا کہ یہ ٹیچر ٹریننگ کالج ہے۔ڈوبتے کو تنکا بھی شہتیر نظر آتا ہے۔انہوں نے خوش دلی سے چارج سنبھال لیا۔

ابھی انہوں نے عہدہ سنبھالا ہی تھا کہ ایک اور اضافی کام ان کے ذمے لگا دیا گیا کہ لاوارث بچوں کا کیمپ احاطے میں لگایا جائے اور ان بچوں کی نگاہ داشت کی جائے۔مشرقی پنجاب سے ہر آنے والے قافلے میں دو چار ایسے بچے ضرور ہوتے تھے جن کے والدین شہید ہوچکے تھے۔ایسے بچوں کے لیے کیمپ قائم کیا گیا تھا۔ان بچوں کو وہاں رکھ کر ان کے والدین کو تلاش کیا جاتا۔اگر مل گئے تو ٹھیک ورنہ انہیں کسی خواہش مند خاندان کو سونپ دیا جاتا۔

کالج سے ملحق پرنسپل لاج تھا۔اس کے دو حصے تھے۔ایک وہ حصہ جو پرنسپل کی رہائش گاہ تھا اور دوسرے حصے میں ہیڈ مسٹریس رہتی۔کالج کی انگریز پرنسپل مس رائز رہتی تھی جو حالات خراب ہوتے ہی انگلینڈ چلی گئی۔ہیڈ مسٹریس بھی غائب ہوگئی اس طرح دونوں حصے انہی کے تصرف میں تھے۔پرویز نے ہیڈ مسٹریس والا حصہ اپنے تصرف میں لے لیا لیکن اس کا صرف ایک کمرا وہ استعمال کرتا تھا ورنہ کھانا پینا سب کچھ ساتھ ہی تھا۔اس کا سوشل ورک بھی جوبن پر تھا۔وہ ہند میں پھنسے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے مشرقی پنجاب کے اندر تک چلا جاتا تھا۔کبھی امرتسر تو کبھی لدھیانہ۔وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر اندر دور تک چلا جاتا تھا۔اسے صرف ایک ہی رٹ تھی کہ ہمارے بھائی بند ہندو سکھوں کے نرغے میں ہیں انہیں کسی بھی طرح نکالنا ہے۔

ذاکرہ صاحبہ کو کالج کی سرگرمیاں گھیرے رہتیں۔برامدہ ان کا دفتر بنا ہوا تھا۔وہیں میٹنگز ہوتیں۔دن دن بھر لوگ انہیں گھیرے رہتے۔

حالات آہستہ آہستہ معمول پر آتے جارہے تھے۔اس نئے شہر میں دوبارہ سے زندگی شروع کرنی تھی اس لیے بانو نے سوچنا شروع کردیا کہ یہ پہاڑ جیسے دن کیسے گزارے جائیں؟ پرویز نے تو اپنا مشغلہ ڈھونڈ لیا تھا۔مصوری کو پس پشت ڈال کر اس نے مہاجرین کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا تھا۔ اب وہ بھی ختم ہوگیا تھا اس لیے وہ بھی اِدھر اُدھر وقت ضائع کر

رہا تھا۔

بانو اس کی طرح وقت ضائع کرنے کی روادار نہ تھی۔ اس کے لیے وقت گزارنا مشکل تھا۔ حالانکہ اس نے وقت گزاری کا بندوبست کر رکھا تھا۔ کالج ٹائم ختم ہوتے ہی وہ درمیانی دروازہ کھول کر کالج کے احاطے میں چلی جاتی۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں بیڈمنٹن کی ریکٹ ہوتی۔ کالج کی کئی پروفیسر جو دو چار سال ہی بڑی ہوں گی ان کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتی۔ وقت اچھا گزر رہا تھا پھر بھی وہ سوچتی کہ مجھے کچھ اور بھی کرنا چاہیے۔

مگر کیا کرنا چاہیے یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کافی دماغ سوزی کے بعد بھی جب سمجھ نہیں آیا تو اس نے یہ مسئلہ ماں کے سامنے رکھا۔ ماں کا مشورہ تھا کہ وہ پھر سے تعلیم کی کڑی جوڑ لے۔ پارٹ ون مکمل تھا اب بی اے مکمل کر لے۔ وہ اسی پر غور کر رہی تھی۔ اس دن اس نے کھیل کے دوران مس ملک سے بھی اسی ٹاپک پر بات کی تھی۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ پڑھائی شروع کر دینا ہی عقل مندی ہے۔ مغرب کی اذان ہوئی تو وہ کھیل بند کر کے گھر آگئی۔ جیسے ہی اس نے دروازہ پار کر کے اپنے حصے میں قدم رکھا۔ اس کی نظر سیدھے برآمدے کی طرف اٹھی۔ ہر روز کی طرح آج وہاں بھیڑ نہیں تھی۔ صرف ایک عورت ذاکرہ صاحبہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ لاہور کے اے ڈی سی کی بیوی زبیدہ تھی۔ جو کسی کام سے ہی آئی تھی۔ بانو جیسے ہی ٹیوب ویل سے ہاتھ منہ دھو کر برآمدے میں پہنچی ماں نے کہا۔ ”یہ میری بیٹی قدسیہ ہے۔“

آپا زبیدہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا بلکہ سرتاپا جائزہ لیا اور پھر پوچھا۔ ”ماشاءاللہ کرتی کیا ہے؟“

ذاکرہ صاحبہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔ ”بی اے کر چکی ہے۔ کینئرڈ کالج سے۔ بے چاری کی فرسٹ ڈویژن ماری گئی۔ افراتفری میں اس نے امتحان دیا تھا اس لیے پوزیشن حاصل نہ کر سکی۔“

”اچھا۔“ آپا زبیدہ نے بانو کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔ ”اب کیا ارادہ ہے؟“

”اب انتظار میں ہوں کہ کوئی لڑکا پسند آئے تو اس کے ہاتھ پیلے کر دوں۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ آپا زبیدہ نے الجھے الجھے میں کہا۔ ”اتنی سی عمر میں شادی کر دیں گی۔ ابھی اسے پڑھنے دیں۔ ایم اے تو کر لے۔ کتنی عمر ہے؟“

”انیس۔“ ماں نے جواب دیا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ زبیدہ آپا بولیں۔ ”ایسا ظلم نہ کریں.... اتنی سی عمر میں شادی۔ آپ اتنی پڑھی لکھی ہیں اور یہ نپٹ جاہلوں جیسی باتیں۔ اسے ایم اے کرنے دیں۔“

”لیکن کینئرڈ کالج تو صرف بی اے تک ہے۔“

”کینئرڈ کالج کیوں.... گورنمنٹ کالج میں بھیجیں۔ وہاں ایم اے کی تیاری ہو رہی ہے۔ میں نے بھی داخلہ لے لیا ہے۔ پطرس بخاری دیکھ رہے ہیں۔ اچھی پڑھائی ہوگی۔“ آپا زبیدہ نے اطمینان بھرے لہجے میں ایسے کہا جیسے ذاکرہ صاحبہ فوراً اجازت دے دیں گی۔

ماں نے ایک نظر بیٹی پر ڈالی پھر الجھے لہجے میں کہا۔ ”جب یہ وہاں تھی تو اس کے ریاضی کے استاد سرداری لعل کہا کرتے تھے کہ اسے میتھ میٹکس میں ایم اے کرنا چاہیے۔“

”اور مس متھائی کہتی تھیں کہ مجھے اکنامکس میں ایم اے کرنا چاہیے۔“ بانو نے لقمہ دیا۔

”چلیں مسز چٹھہ اس بات کو جانیں دیں۔ یہ پاکستان کے قیام سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب ہم نے ہندوؤں اور انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کر لی ہے۔ پاکستان بن چکا ہے۔ آپ تو خود ایجوکیٹڈ ہیں۔ محب وطن ہیں۔ مہاجروں کی خدمت میں پیش پیش ہیں۔ آپ جانتی ہیں اردو کے بغیر پاکستان کی شناخت ممکن نہیں۔ اگر ہم نے اس وحدت کے خلاف سندھ میں سندھی۔ بلوچستان میں بلوچی۔ سرحد میں پشتو۔ پنجاب میں پنجابی کو فوقیت دی تو ہماری شناخت بھی اتنے حصوں میں بٹ جائے گی۔“

ذاکرہ چٹھہ الجھ گئیں انہیں جواب دیتے نہ بنا تو وہ بولیں۔ ”دراصل وہاں.... کو ایجوکیشن ہے نا۔“

”تو کیا ہوا۔ میں ہوں نا۔ یہ مرغی کے بچوں کی طرح پروں میں رہے گی۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔“

آپا زبیدہ نے اپنے طور پر کوشش کر لی لیکن مسز ذاکرہ چٹھہ ابھی بھی فکر مند تھیں کہ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ تک یہ بات پہنچ گئی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے۔ عربی کے اسکالر تھے اور اردو ایم اے کے پہلے بیچ میں عربی کی کلاس ان کی ذمے داری تھی۔ وہ پی ٹی کی کلاس لینے آئے ہوئے تھے لیکچر کے بعد مسز ذاکرہ چٹھہ نے ایم اے اردو کا ذکر کیا تو وہ بولے۔ ”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ قدسیہ کو فوراً داخل کرا دیجیے۔ پاکستان کو پڑھی لکھی خواتین کی بہت ضرورت ہے۔ آپ خود سوچیں اگر آپ پڑھی لکھی نہ ہوتیں تو ان بچوں کو لے کر کہاں جاتیں؟“

ان کے سمجھانے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور انہوں نے پرنسپل

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کرامت صاحب کوفون کیا اور بانو کا داخلہ ہو گیا۔

یہ داخلہ نہیں کاتب تقدیر کچھ لکھ رہا تھا ایم اے اردو تو ایک بہانہ تھا۔ وہاں اشفاق صاحب سے ان کو ملانا تھا۔ جب کہ اس وقت تک اشفاق صاحب منشی فاضل کر چکے تھے۔ ان کی کتاب "ایک محبت سو افسانے" چھپ چکی تھی پھر بھی ان کے دل میں ایم اے اردو کرنے کا ارمان جاگ اٹھا اور وہ بھی اس کلاس میں آ گئے۔

اشفاق صاحب مہمند پٹھان تھے۔ وہ چھ بھائی تھے اور دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن فرخندہ۔ آپا فرحت۔ بھائی آفتاب۔ افتخار۔ اقبال۔ اسحاق۔ اشتیاق۔ (عرف ڈیڈی جی) کہتے ہیں کہ ان کے دادا دوست محمد خان۔ خاصے خوبصورت تھے۔ بڑے نفاست پسند تھے۔ کبھی شکن آلود کپڑے تک نہیں پہنتے تھے۔ ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ فارسی اور عربی شعرا کے کلام اس طرح سناتے کہ لگتا' سامنے کتاب کھلی ہوئی ہے۔ اتنا پڑھنے کے بعد بھی وہ برادری کے قوانین سے روگردانی نہیں کر سکے تھے۔ برادری میں رواج تھا کہ شادی ہو گی تو برادری میں ہی ہو گی۔ ماں باپ نے جسے پسند کر لیا وہی حرف آخر۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس لڑکی کو دیکھا بھی نہیں تھا جس سے شادی طے ہوئی تھی۔ شادی کی رات انہوں نے لڑکی کو پہلی بار دیکھا۔ جیسے ہی انہوں نے گھونگٹ اٹھایا ان کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ لڑکی نہ صرف کالی تھی بلکہ قد بھی بونا سا تھا۔ وہ اشتعال میں آ گئے تھے لیکن بزرگوں کے سامنے زبان بھی نہیں کھول سکتے تھے۔ مگر ان کی ناراضی کی خبر بزرگوں تک پہنچ ہی گئی۔

گھر والوں نے لڑکی پسند کی تھی اس لیے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن دل میں گرہ سی پڑ گئی تھی کیونکہ انہیں بیوی بالکل پسند نہ آئی تھی۔ زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن حجرت کی ٹھان لی۔ برادری کا خوف یا کوئی اور بات کہ حجرت سے قبل وہ بیوی سے قریب رہنے پر مجبور ہوئے پھر ایک دن خاموشی سے گھر چھوڑ دیا۔ دوست محمد خان نے حیدر آباد دکن کا رخ کیا تھا۔ اس لیے کہ اس دور میں حیدر آباد علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پورے برصغیر سے اہل علم اس ریاست کی طرف کھنچے چلے آ رہے تھے۔ ریاست بھی اہل علم کو جمع کر رہی تھی۔ دوست محمد خان کو بھی یقین تھا کہ اس ریاست میں انہیں پزیرائی ملے گی۔ انہیں فارسی زبان پر عبور حاصل تھا۔ اس وجہ سے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شہزادوں کا اطالیق مقرر کر دیا گیا۔ یہ ایک بڑا منصب تھا۔ تنخواہ بھی معقول تھی۔ وہاں وہ اکیلے تھے۔ پھر بھی خوش تھے۔ گھر سے خط و کتابت ہوتی رہتی تھی لیکن انہوں نے بیوی سے کوئی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ گھر سے آئے خطوط سے ہی پتا چلا کہ وہ ایک بچے کے باپ بن چکے ہیں۔ بچے کا نام محمد خان رکھا گیا ہے۔

بیوی سے کوئی رابطہ نہ رکھنے کے باوجود وہ گھر کے اخراجات پابندی سے بھیجتے تھے۔ بچے کی ولادت کا سن کر انہوں نے رقم میں اضافہ کر دیا تھا۔ ساتھ ہی تاکید کی تھی کہ بچے کی تعلیم کا خاص خیال رکھا جائے۔

محمد خان کو صرف تین سال کی عمر میں مکتب میں بٹھا دیا گیا۔ وہ پڑھتے رہے بڑھتے رہے۔ شکل و صورت میں وہ ماں پر گئے تھے۔ وہی سانولی رنگت۔ بونا سا قد اس پر ایک اور آفت' چیچک کا حملہ ہوا جس کے داغ چہرے پر جا بجا نظر آنے لگے۔ شاید اسی وجہ سے وہ کبھی بھی باپ کا بھرپور پیار نہ پا سکے۔ انہوں نے اپنی دنیا الگ بسا لی تھی۔ اپنی بھرپور توجہ پڑھائی پر لگا دی تھی۔ میٹرک پاس کی پھر آگے کیا پڑھنا ہے یہ سمجھ نہ آئی تو ڈاکٹر بننے کے لیے ویٹنری کالج میں داخلہ لے لیا اور پھر ڈنگر ڈاکٹر بن گئے۔

ڈاکٹر بننے کے بعد اطراف پر نظر ڈالی کہ کس علاقے میں پریکٹس کی جائے جہاں ترقی کے امکانات زیادہ ہوں۔ کافی غور کرنے کے بعد انہیں مکتیسر زیادہ مناسب لگا اور وہ مکتیسر منتقل ہو گئے۔

مکتیسر میں ان کی پریکٹس خوب چلی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ امرا میں شمار ہونے لگے۔ زمینیں خریدیں بڑی سی حولی بنائی' اصطبل میں گھوڑوں کی اعلیٰ نسلیں جمع کر لیں اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اللہ نے اولاد کی طرف سے بھی خوش رکھا۔ چھ بیٹے اور دو بیٹیاں وہیں ہوئیں۔ سارے بچے ان کی طرح تعلیم سے خاص دلچسپی لیتے۔ اشفاق خان نے بھی میٹرک مکتیسر سے کی۔ آگے کی پڑھائی کے لیے وہ بڑی بہن کے پاس فیروز پور چلے گئے۔

فیروز پور کے رام سنگھ داس کالج میں پہنچنے کے بعد ان کے جوہر کھلنے لگے۔ ادب سے تو پہلے ہی دلچسپی تھی۔ یہاں آ کر ماحول بھی ادبی ملا تو مزید نکھار آ گیا۔ خوش پوش بھی بلا کے تھے۔ سب میں منفرد نظر آتے۔

پڑھائی جاری تھی کہ سیاسی افق گدلانے لگا۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے وہ مسلم لیگ کو سپورٹ کر رہے تھے اور ماسٹر تارا سنگھ کے لوگ ان کی تاک میں رہنے لگے۔ کئی بار دھمکیاں بھی ملیں لیکن ڈر خوف تو گویا چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ ساری

ساری رات دوستوں کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کے لیے کام کرتے۔ ریفرنڈم ہوا تو ان کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ سکھوں کی دشمنی انتخابات تک ہی رہے گی لیکن ماحول بتا رہا تھا کہ مسلم لیگ کی کامیابی غیر مسلموں کے دل میں پھانس بن کر چبھ گئی ہے۔

پھر وہ دن بھی آ گیا جب اعلان قیام پاکستان ہوا۔ اس اعلان سے تو ایسا لگا جیسے ہندو اور سکھوں کے دل میں چھپی نفرت کو ابال دے دیا ہو۔ ہر طرف قتل وخوں کا بازار گرم ہو گیا۔ ایسے وقت میں بس ایک ہی راہ سجھائی دی کہ وہ ہجرت پر خود کو آمادہ کر لیں۔

واپس مکتیسر آئے تو سب ہی تیار بیٹھے تھے۔ محمد خان نے سب کو لیا اور گھر باریوں ہی کھلا چھوڑ کر لاہور کی جانب چل پڑے۔ اگر ایک دن اور دیر کرتے تو شاید کوئی بھی زندہ سلامت نہ آ پاتا۔

لٹے پٹے محمد خان اپنے چھ بیٹے اور دو بیٹیوں کے ساتھ لاہور پہنچے۔ D 96 ماڈل ٹاؤن میں ایک رشتے کی بہن رشیدہ رہتی تھیں۔ وہ سب ان کے ہاں جا کر اترے۔ کچھ دن رہنے کے بعد انہیں خبر ملی کہ موج دریا کے پاس مزنگ روڈ پر ایک مکان خالی ہے۔ یہ لوگ وہاں پہنچے۔ مکان کھلا پڑا تھا۔ بجلی کا میٹر غائب۔ تل سوکھے پڑے تھے۔ کمرے ملبے کے ڈھیر بنے تھے۔ صفائی ستھرائی کے بعد یہ لوگ وہیں ٹک گئے۔ اشفاق سے بڑے اقبال بھائی نے کمانے کا ایک نیا طریقہ ڈھونڈا۔ وہ بکرا منڈی چلے جاتے اور ایک بکرا خرید کر اسے کندھے پر سوار کر کے شہر میں چکر لگاتے۔ بک جاتا تو پیسے لا کر اماں جی کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ اسی سے گھر کی دال روٹی چلنے لگی۔ آفتاب بھائی سرکاری وکیل تھے لیکن ابھی لاہور کے کورٹ سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ اشفاق بھی روز نوکری والے دفتر جاتے اور انہیں ایک ہی جواب ملتا کہ ابھی کوئی نوکری نہیں ہے۔ روز روز کے ٹکے سے جواب پر وہ ایک دن بول پڑے۔ ''بھائی کلرک' میں روز آتا ہوں اور ایک ہی جواب ملتا ہے۔ آخر میرے لیے کوئی نوکری کیوں نہیں آتی۔ کلرک نے جواب دیا کہ آپ بی اے پاس ہیں اور جو نوکری آ رہی ہے وہ دسویں پاس کے لیے ہے۔ اشفاق نے کہا۔ ''اس میں مشکل کیا ہے۔ آپ میری دسویں کی سند رکھ لیں۔''

کلرک نے فوراً انہیں والٹن کیمپ کی نوکری دے دی۔ وہاں مانک پر گمشدہ افراد کی اناؤنسمنٹ کرنا ہوتی۔ وہیں ان کی ملاقات ممتاز مفتی سے ہوئی جو جلد دوستی میں بدل گئی۔ اشفاق کے افسانوں کا مجموعہ ''ایک محبت سو افسانے'' آ چکا تھا اس لیے وہ تھوڑا بہت پہچانے بھی جا رہے تھے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ اسی چھوٹی نوکری میں صرف اوپر کے اخراجات پورے ہو رہے تھے اسی لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب انہیں ایم اے کرنا چاہیے اور وہ داخلے کے لیے کالج پہنچ گئے۔

انہیں ایم اے کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ منشی فاضل کر چکے تھے لیکن قسمت بھی تو کوئی چیز ہے۔ انہیں کسی سے ملانا تھا۔ اسی لیے قسمت انہیں کھینچ کر ایم اے کی طرف لے جا رہی تھی۔

ادھر بانو کو بھی اسی کالج میں جگہ ملی۔ جس دن وہ کالج پہنچی تو پرنسپل نے انہیں اپنے روم میں بلا لیا۔ سوال جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ پرنسپل کرامت نے پوچھا۔ ''آپ نے بی اے کہاں سے کیا ہے؟''

''کینز ڈ کالج سے۔'' بانو نے جواب دیا۔

''فرسٹ ڈویژن آئی تھی؟''

''یقیناً فرسٹ آتی لیکن اس دن جب ہم پرچہ دے رہے تھے۔ جیل روڈ پر شرپسندوں نے آگ لگا دی تھی۔ پرنسپل صاحبہ سب کو بس میں بٹھا کر ایف سی کالج لے گئیں۔ افراتفری میں امتحان دیا تھا۔''

''اور بی اے میں کون کون سے سبجیکٹ تھے؟''

''میتھ اور اکنامیکس۔''

''میتھ کون پڑھاتا تھا؟''

''پروفیسر سرداری لال۔''

''اچھا اچھا... وہ تو ہمارے بھی پروفیسر تھے.... اور اکنامیکس؟''

''مسز متھائی۔ وہ ساؤتھ سے آئی ہیں۔ ان کے بھائی نے اکنامکس میں بڑی معرکے کی کتاب لکھی ہے۔''

''او بھائی اتنے قابل پروفیسروں سے پڑھنے کے بعد ایم اے اردو میں کیوں کرنا چاہتی ہو۔ میتھ میں کرو یا پھر اکنامیکس میں کرو۔''

''مجھے اردو میں ایم اے کا شوق ہے۔ میں رائٹر بننا چاہتی ہوں۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے ایم اے اردو کا اجرا پطرس بخاری نے کیا اور یونسکو چلے گئے۔ ہم سب کسی نہ کسی مسئلہ میں الجھے ہوئے ہیں۔ ابھی تک پروفیسروں کا بھی انتخاب نہیں ہو پایا ہے۔ خیر تم فیس وغیرہ جمع کرا دو اور فارم بھر دو لیکن احتیاط

URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

سے فارم بھرنا۔'' کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے۔

گویا باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔ وہ پرنسپل کے کمرے سے باہر نکلی اور کلرک کی کھڑکی پر پہنچی۔ وہاں پہلے سے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ خوب گورا چٹا کسی اطالوی شہزادے جیسا۔ وہ بانو کو دیکھتے ہی ایک جانب ہو گیا۔ نظریں نیچی رکھیں۔ فیس اور فارم لے کر کلرک نے نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ اشفاق احمد ہیں آپ ہی کی کلاس میں ہوں گے۔ میں نے ابھی انہی کا فارم وصول کیا ہے۔؟''

بانو نے ایک نظر اس نوجوان پر ڈالی اور نظریں جھکا لیں اس لیے کہ وہ نوجوان آنکھوں کے راستے دل میں اترتا جا رہا تھا، وہ رسید لے کر تیز تیز باہر کی سمت چل دی۔ یہ اس نوجوان سے بانو کی پہلی ملاقات تھی۔

بانو جب دھرمشالہ میں تھی اور اس کی وجہ سے اس کی امی نے چند دیگر ملنے والیوں کے ساتھ مل کر گرلز کالج کھولا تھا تو اس میں چپراسی کی نوکری موسیٰ کو ملی تھی۔ لیکن جب پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا اور دھرمشالہ کے تمام مسلمان پاکستان آ گئے تو موسیٰ بھی یہاں آ گیا اور وہ ڈھونڈتا ہوا ذاکرہ صاحبہ کے کالج پہنچ گیا۔ ذاکرہ نے اسے فوراً چپراسی کی ڈیوٹی سونپ دی۔ بانو کے کالج جانے کا ہوا تو اسے کالج پہنچانے کی ذمے داری اسی کو سونپی گئی۔ وہ بانو کو لے کر کالج کی سمت چلا۔ آگے آگے بانو اور اس کے پیچھے پیچھے بستہ اٹھائے موسیٰ۔

بانو کے لیے وہ پہلا دن بڑا عجیب تھا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ یہ دھرمشالہ تو ہے نہیں۔ سب نئے لوگ ہیں۔ پتا نہیں کیسے کیسے لوگ ہوں گے۔ وہ کلاس میں داخل ہوئی جہاں ایک مستطیل میز بچھی ہوئی تھی۔ ایک طرف لڑکے تھے اور دوسری طرف لڑکیاں۔ اس نے پہلے سے موجود طلبا اور طالبات پر نظر ڈالی سامنے کی طرف مولوی طوطا قسم صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی لڑکیاں موجود تھیں مگر ان کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی اس لیے وہ دیکھ نہیں پائی کہ کون کون ہے۔ وہ کچھ آگے بڑھی۔ آپا زبیدہ اور ذکیہ موجود تھیں۔ آپا کو دیکھ کر حوصلہ ہوا آپا نے اسے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ جا کر اس پر بیٹھ گئی۔

ابھی وہ کاپیاں اور کتابیں رکھ ہی رہی تھی کہ دروازے سے وہی نوجوان داخل ہوا' اطالوی شکل و صورت والا' اس نے لٹھے کی شلوار اور نیلی لکیروں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ پیروں میں پشاوری چپل تھی۔ وہ بڑے اعتماد سے اندر آیا تھا اور مولوی طوطا کے برابر میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ پھر اس نے ایک نظر تمام طلبا و طالبات پر ڈالی۔ اسے دیکھ کر بانو کا دل ایک بار پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ لڑکوں کے درمیان آ کر بیٹھی تھی۔ یہ لڑکا پہلی ہی بار میں اس کے حواسوں پر چھانے لگا تھا۔ اس نوجوان نے بیٹھنے کے بعد قدرے اونچی آواز میں کہنا شروع کر دیا۔ ''میرا نام اشفاق احمد ہے۔ میں فیروز پور کے قصبہ مکتسر سے آیا ہوں۔ وہاں میرے والد ڈانگر ڈاکٹر تھے پھر دھیرے دھیرے حیوان ناطق کا علاج بھی کرنے لگے۔ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں اور اس وقت موج دریا کے مقابل 1 مزنگ روڈ پر رہ رہے ہیں۔''

اس کے اس طرح خود اعتمادی کے ساتھ اپنا تعارف کرانا بانو کو اچھا لگا لیکن زبان سے کچھ بولی نہیں۔ یوں بھی اس وقت تک اپنا تعارف کرانا وہ بھی اس اعتماد کے ساتھ ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ لوگ جھجکتے تھے۔ مولوی طوطا نے اس تعارف کو اس کی شوخی سمجھا مگر ذکیہ جو بلند شہر یوپی سے آئی تھی وہ اس پر ہزار جان سے فدا ہو گئی۔ متواتر وہ چور نظروں سے اسی کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ تبھی کمرے میں پہلے پروفیسر داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی اپنا تعارف انگلش میں کرایا کہ میرا نام غلام محی الدین ہے۔ پھر بلیک بورڈ پر جا کر کیپیٹل لیٹر میں اپنا نام لکھا اور مڑ کر سب کے چہروں کا جائزہ لیا پھر اردو پر آ گئے۔ گو کہ وہ زیادہ تر لیکچر انگلش میں دیتے تھے مگر جب اردو پر آتے تو ایسی ٹکسالی زبان بولتے کہ ارمغان حجاز فلسفہ خودی سہل ممتنع بن جاتی۔ سمجھنے میں ذرا سی بھی دشواری نہیں ہوتی۔

ان کے بعد دبلے پتلے اثر صاحب کلاس میں آئے۔ انہوں نے بھی انگریزی میں اپنا تعارف کرایا۔ کہ میں مدراس سے آیا ہوں اور اس وقت کنٹرولر آف ایگزامینیشن ہوں۔ میرا کمرا لیڈیز روم کے بالکل سامنے ہے۔ آپ میں سے جب بھی کسی کو کوئی دشواری ہو میرے پاس آ سکتا ہے۔ میں اس کے لیے ہر ممکن کوشش کروں گا۔

اثر صاحب سے جا کر کون کون ملا یہ تو کسی کو خبر نہ تھی مگر بانو نے اندازہ لگا لیا کہ اشفاق اور وہ بہت قریب آ چکے ہیں۔ اثر صاحب مدراس میں ڈپٹی کمشنر تھے لیکن پاکستان کی محبت میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے آئے تھے۔ ایک اہم عہدہ کو لات مار کر آئے تھے اور بیڈن روڈ کے عقب میں کشمی بلڈنگ کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنی اہلیہ ممتاز کے ساتھ رہ رہے تھے۔ وہ اتنے سیدھے سادے تھے کہ کبھی زبان پر نہ لایا کہ میں ڈپٹی کمشنر رہ چکا ہوں۔ وہ کالج سے گھر پہنچنے کے بعد اضافی آمدنی کے لیے ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' میں

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کالم لکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ اس اخبار کے ایڈیٹر بن گئے۔ اسی دوران ان کی ملاقات ایک محترمہ سے ہوئی جو ان کی پُرکشش شخصیت سے ایسی متاثر ہوئی کہ اس نے اثر صاحب کو دوسری شادی پر اکسا دیا۔ امیر کبیر عورت تھی، اپنی منوا کر دم لی۔ اثر صاحب کی بیگم ممتاز آپا نے بھی اف نہ کیا اور وہ محترمہ اوپر کی منزل پر آٹھہریں۔ اثر صاحب ایک آرٹسٹ جیسی فطرت والے تھے۔ ایسے لوگ ان موجوں کی طرح ہوتے ہیں جو بار بار ساحل پر آکر سر پٹختے ہیں۔ ان کی زندگی بھی ایسی ہی طلاطم بھری رہی۔ ایسی زندگی کے حامل ہو کر بھی وہ کلاس میں طالبات کے لیے ایک شفیق باپ جیسے تھے۔ بانو کو تو وہ سگی بیٹی کی طرح چاہتے۔ یوں بھی کلاس میں جتنے لوگ تھے سب اپنے آپ میں گم رہنے والے تھے۔ آپا زبیدہ کہنے کو تو ڈپٹی کلکٹر کی بیوی تھیں لیکن علم سے ان کا ناتہ نہ تھا۔ مولوی تو تا اپنی عربی دانی پر نازاں تھے۔ ذکیہ اپنے لب ولہجہ کی وجہ سے خود کو اردو داں تسلیم کرانے میں لگی رہتیں۔ رہ گئے قمر الزمان تو وہ ایک مرجا مرنج آدمی تھے۔ پروفیسر کلاس میں آتے تو وہ انہیں بچوں جیسے تحیر سے دیکھتے رہتے۔ بانو کانونٹ سے آئی تھی۔ اس زمانے میں بھی یہ چلن عام تھا کہ جو کانونٹ سے پڑھ لیتا اس میں انگریزوں والی اکڑ آجاتی۔ لیکن بانو میں ایسا کچھ نہ تھا۔ وہ اردو کو ہی اہمیت دیتی مگر اس کی اردو چند کتابوں تک محدود تھی۔ اس کے پاس فسانہ آزاد کی ساری جلدیں تھیں اور وہ اسے ہی دنیا سمجھتی تھی۔ اشفاق احمد جنہوں نے گلستان بوستان حفظ کر رکھا تھا۔ اردو ادب کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتابوں کو کھنگال رکھا تھا۔ ان کے گھر پر ان کی ذاتی لائبریری تھی اور ان کی ایک محبت سو افسانے چھپ کر مقبول ہو چکی تھی لیکن بانو کے نزدیک وہ بھی اردو میں اس سے زیادہ نہیں جانتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اشفاق کلاس کے کسی بھی اسٹوڈنٹ کو اپنی علم دانی سے احساس کمتری کا شکار ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ بس ایک بات دیگر اسٹوڈنٹ سے الگ تھی کہ ہر وقت اشفاق احمد کے ہاتھوں میں لائبریری کی ایک دو کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ بانو نے لائبریری کی ممبر شپ نئی نئی لی تھی۔ وہ گاہے بہ گاہے کتابیں اشو بھی کراتی تھی۔ اس دن بھی وہ کتابیں اشو کرا کر لائبریری سے نکلی تھی کہ کوری ڈور میں اس کی ملاقات اشفاق احمد سے ہو گئی۔ اس نے بغیر سلام کلام کے سیدھا سوال کیا۔ ”کیا میں آپ کی یہ کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟“

”کیوں نہیں۔“ کہہ کر اس نے کتابیں اس کی طرف بڑھا دیں۔ اشفاق احمد نے کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولے۔ ”اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟“

”جی فرمائیں۔“

”ہم ایسا کرتے ہیں کہ کتابوں کو ایکسچینج کر لیتے ہیں۔ دو چار دن میں، میں آپ کو کتابیں لوٹا دیا کروں گا۔ آپ تب تک میری کتابیں بھی پڑھ چکی ہوں گی۔“ کہہ کر انہوں نے اپنی کتابیں اسے دے دیں اور اس کی کتابیں خود لے لیں۔

گھر آکر بانو نے کتابوں کو دیکھا تو سوچ میں پڑ گئی۔ اس لیے کہ اس نے جتنی بھی کتابیں ایشو کرائی تھیں وہ سبجکٹ کے مطابق نہیں تھیں۔ لیکن اشفاق احمد نے جو کچھ دیا تھا وہ سبجکٹ کے مطابق تھیں۔ انہوں نے اسے شرر کے ناول، تاریخ ادب اردو، موازنہ انیس و دبیر جیسی کتابیں تھیں جو سلیبس کے مطابق تھیں۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اشفاق احمد نے بغیر اسے نیچا دکھائے، غلطی کا احساس کرائے صحیح سمت دکھا دی تھی۔ اب تواتر سے کتابوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ اس تبادلے سے بانو خوفزدہ ہو گئی۔ اسے ایک عجیب سے خوف نے گھیر لیا تھا کہ ... کہیں اس ملاقات کو کوئی افسانہ بنا دے۔ اسی دوران ایک دن اشفاق احمد نے اسے کوری ڈور میں روک لیا۔ ان کے ہاتھوں میں کئی کتابیں تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ”آپ نے یہ خطوط پڑھے ہیں؟“

”کون سے خطوط؟“ بانو کی سمجھ میں نہ آئی کہ یہ کن خطوط کی بات کر رہے ہیں۔

”گو کہ یہ کتاب کورس سے متعلق نہیں ہے لیکن ادبی حیثیت کی حامل ہے۔ یہ خطوط ملینا کو لکھے گئے ہیں۔“ کہتے ہوئے انہوں نے وہ کتابیں اس کی طرف بڑھا دیں۔ گھر آکر اس کتاب کا مطالعہ کیا تو اسے پسینے آگئے۔ گو کہ آج کے ماحول میں ان باتوں کی اہمیت نہیں رہی لیکن اس دور میں وہ بہت بڑی بات تھی۔ کیونکہ وہ خطوط جذبات سے بھرے ہوئے تھے۔ جیسے ایک جگہ لکھا تھا۔ ”تم جس کرسی پر بیٹھتی ہو، تمہارے جانے کے بعد بھی وہ کرسی مجھے تمہارے وجود سے بھری ہوئی لگتی ہے۔ تم جس کمرے سے گزر جاتی ہو وہ کمرا تمہارے وجود کی مہک سے مہک اٹھتا ہے اور بہت دیر تک سانس لینا دشوار کر دیتا ہے۔ ہر موسم میں ہر جگہ تمہاری چھاپ لگی ہے۔ بتاؤ میں اس دیوانگی سے کیسے نجات پاؤں۔“

ان خطوط کو پڑھ کر اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے۔ اب وہ اس بات سے ڈرنے لگی تھی کہ کہیں کسی کتاب اسے کوئی ہاتھ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

سے لکھا خط نہ برآمد ہو جائے۔ اس لیے کتابوں کا تبادلہ رک سا گیا تھا۔ کبھی وہ کتاب لینے سے صاف انکار کر دیتی اور کبھی کوئی بہانہ کر دیتی۔

کتابوں کا تبادلہ رکا تو اشفاق احمد نے ایک دوسری راہ ڈھونڈ لی۔ ایک دن کوری ڈور میں انہیں روک کر بولے۔ ”آپ کے پاس ایک دوانی ہوگی؟ میری سائکل پنکچر ہوگئی ہے۔ بنوانا ہے۔“

بانو نے کوئی جواب دیئے بغیر دوآنے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہ دوانی مانگنے کا سلسلہ عرصہ تک چلتا رہا۔ وہ آتے دوآنے مانگتے اور بانو ان کے گورے گورے پھیلے ہوئے ہاتھ پر دوآنے رکھ دیتی۔ لیکن اسے ایک عجیب سا خوف بھی تھا کہ یہ دوآنے سے بات آگے نہ بڑھ جائے۔

اشفاق احمد خالصتاً پٹھان تھے۔ اپنی روایتوں میں جکڑے پٹھان کہ کسی غیر پٹھانی کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کے بھی روادار نہ ہو ایسے پٹھان۔ اسی درمیان ایک اور بات سامنے آگئی۔ ایک دن وہ آئے تو انگلی میں شادی کی انگوٹھی تھی جسے وہ اس انداز میں نمائش کر رہے تھے جیسے واقعی وہ شادی کی انگوٹھی ہو۔ یہ تو بہت بعد میں اشفاق احمد کی ڈائری سے بانو پر راز کھلا کہ وہ انگوٹھی دراصل دوسری لڑکیوں کو دور رکھنے کے لیے پہننے لگے تھے۔

بانو کو کالج لانے لے جانے کی ڈیوٹی موسیٰ کی تھی۔ موسیٰ جو عرصے سے دفتر میں ذاکرہ کا چپراسی تھا۔ دفتر کے بعد گھریلو کام کا ذمہ وہ اپنے کاندھے پر اٹھائے ہوئے تھا۔ بانو کو جہاں کہیں جانا ہوتا وہ اسی کے ساتھ جایا کرتی۔ گوکہ ابھی تک لوگوں کی آنکھوں کا پانی مرا نہیں تھا۔ نظروں میں شرم وحیا باقی تھی۔ مرد حضرات بھی اپنی عزت ووقار بچائے رکھنے کی سعی کرتے تھے لیکن جوانی دیوانی تو ہوتی ہی ہے۔ جب بانو کالج آتی تو کچھ چھچھورے لڑکے آپس میں گفتگو کرنے کے نام پر کچھ اونچی آواز میں موسیٰ پر طنز بھی کرتے جو موسیٰ کی سمجھ میں تو نہ آتا لیکن بانو سمجھ جاتی۔ لڑکے قوالی کے انداز میں کہتے۔ ”سنگ لیلیٰ۔ سنگِ لیلیٰ...... کدھر آیا کدھر بھولا۔ آ آ آ“

موسیٰ یہ سمجھتا کہ وہ قوالی گا رہے ہیں لیکن بانو سمجھ جاتی کہ یہ آوازہ کس رہے ہیں۔ یوں بھی موسیٰ بہت معصوم فطرت تھا۔ ایک دن ڈاکٹر محمد صادق کلاس لے رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بڑے ڈسپلین والے تھے۔ اگر کوئی آڑا ترچھا بیٹھا ہے یا کلاس میں کہیں کوئی کاغذ کا ٹکڑا پھینکا ہوا ہے۔ یا بلیک بورڈ گندا ہے تو ان کی تیوری پر بل آجاتے تھے۔ وہ زبان سے بھی

جون 2017ء کا دلفریب شمارہ

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل، محفل شعروسخن اور

ملک صفدر حیات کی تفتیش

غرق محبت

محبت کے دل آزار معاملات ...... جہاں کوئی راز پوشیدہ نہیں رہتا مگر حال دل کسی پر کھلتا بھی نہیں۔ آخری صفحات پر طاہر جاوید مغل کا شاہکار

شکن در شکن

سلطان محمود غزنوی کے عہد کا اگلا پڑاؤ جب بادشاہت اگلی نسل میں ایک الگ ہی دھارے پر چل نکلی۔ تاریخی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کا منفرد انداز

شیش محل

پاکستان کے ابتدائی حالات کے تناظر میں بدلتے اور چونکا دینے والے واقعات کا تسلسل ...... اسماء قادری کے قلم کی روانی

وقت

وقت کے دلچسپ نشیب وفراز ...... اور حالات کے گھاؤ میں لپٹی انوکھی داستان ...... حسام بٹ کے خیالات کی پرواز

اس کے علاوہ

سلیم انور، کبیر عباسی، مزمل منظر امام، تنویر ریاض، محمد یاسر اعوان اور نعمان اسحاق کی خوبصورت کہانیاں آپ کی منتظر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

کچھ نہ کہتے بس خشمگین نظروں سے دیکھتے اور ان کا یوں دیکھنا ہی کافی ہوتا۔ ہر کوئی سہم جاتا۔ اس دن ان کا لیکچر کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔ باہر بیٹھا موسیٰ کچھ پریشان ہو گیا۔ وہ کلاس روم تک پہنچا اور اس نے ہلکا سا پردہ کھسکا کر اندر جھانکا کہ ڈاکٹر صاحب کی نظر پڑ گئی۔ ابھی وہ اس کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ اشفاق احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانستے ہوئے دروازے کی سمت بڑھے۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ کھانسی روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ باہر گئے اور فوراً ہی لوٹ آئے۔ جب کلاس کے خاتمہ کے بعد بانو باہر آئی تو موسیٰ نے کہا۔ "وہ آپ کے کلاس کا گورا والا لڑکا کہہ رہا تھا کہ اس طرح جھانکتے نہیں ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟"

بانو نے جواب دینے کی بجائے ہنس کر بات ختم کر دی لیکن ایک دو دن بعد ایک اور مسئلہ سامنے آ گیا۔ ہوا یہ کہ بانو کا بھائی پرویز کبھی کبھی پرندوں کا شکار کر لیا کرتا تھا لیکن جب سے دھرم شالہ چھوٹا تھا اسے شکار کا موقع نہیں ملا تھا۔ اتوار کی وجہ سے کالج بند تھا۔ وہ اپنی چھرے والی ڈیزی بندوق جسے وہ دھرمشالہ سے ساتھ لے کر آیا تھا اسے صاف کر کے کالج پہنچ گیا۔ کالج کی چھتوں پر کبوتر رہ رہے تھے۔ اس نے کئی ایک کبوتر کو نشانہ بنا لیا۔ اتفاق کی بات ہے' ڈاکٹر صاحب آن ٹپکے۔ انہوں نے پرویز سے بندوق چھینی اور اسے کیمپس سے بھگا دیا۔ اگلے روز انہوں نے بانو سے کہا۔ "مس قدسیہ چٹھہ 'پرویز چٹھہ آپ کا بھائی ہے؟"

بانو نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "جی سر۔"

"اس نے کالج کا رول توڑا ہے۔ کیمپس کے کبوتروں کو مارنا منع ہے۔ اس نے ایک دو نہیں، تین تین کبوتروں کو مار دیا۔"

اشفاق احمد کھڑے ہو گئے۔ "سر قدسیہ چٹھہ پہاڑی علاقے سے آئی ہیں۔ پہاڑی شکار کے شوقین ہوتے ہیں۔ دھرمشالہ میں رہتے ہوئے ان کے بھائی نے ایک سیمرخ بھی شکار کیا تھا۔"

"تو میں کیا کروں؟" ڈاکٹر صاحب نے ٹکا سا جواب دے دیا۔

"سر پہلی غلطی ہے اسے معاف کر دیں۔"

"کوئی غلطی پہلی غلطی نہیں ہوتی۔ ہر غلطی آخری غلطی ہوتی ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے جھلا کر کہا۔

ڈاکٹر صاحب کا موڈ دیکھ کر اشفاق بھی تلملا گئے تھے۔ انہوں نے پھر کہا۔ "سر ایک بار کی تو معافی دینی چاہیے۔"

ڈاکٹر صاحب نے انہیں نظر انداز کر کے بانو سے کہا۔ "اسے کالج سے رسٹریکٹ کیا جاتا ہے۔ اسے کالج بھیجنا بھی نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کو اشفاق نے کچھ نہیں کہا مگر خود اٹھ کر کلاس سے باہر چلے گئے۔ اس وقت بانو کو ایسا لگا کہ کوئی تو ہے جو اس کا خیال رکھتا ہے۔ ایسی کئی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوئی تھیں لیکن جو خاموش زبان سے بہت کچھ کہتی رہی تھیں لیکن اشفاق احمد نے اپنے منہ سے ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا۔ اور کہتے بھی تو کیسے اس لیے کہ وہ ہجرتی پٹھان تھے۔ ہجرتی پٹھان اپنے رسم و رواج کے قیدی ہوتے ہیں۔ منیر نیازی ہر بات میں دیر کر دیتے ہیں۔ احمد فراز شاعری میں پناہ ڈھونڈ لیتے ہیں اور اشفاق احمد خاموش رہ کر صوفی بن جاتے ہیں۔ اپنے پٹھانی وصف کی وجہ سے ہی اشفاق احمد کو شادی کر لینے کے اظہار میں بھی سات سال لگ گئے۔ وہ بھی اگر ممتاز مفتی جیک نہ بنتے تو اور بھی دیر ہو جاتی۔ ادھر بانو کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی امی نے مخلوط تعلیم کے لیے اجازت دیتے ہوئے کہا تھا۔ "کاکی تو ایک بیوہ کی بیٹی ہے۔ تیرے سر پر باپ کا سایہ نہیں ہے جو عزت کی حفاظت کرے گا۔ تیرے بھائی کا مسئلہ ہے کہ وہ انجینئرنگ نہ کر سکا۔ بی اے بھی کر لے تو خوب ہے۔ اس لیے اپنی محافظ تو خود ہے۔"

بانو اس ایک جملے نے اس کے منہ پر بھی ٹیپ چپکا دیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی کچھ بول نہیں سکی اور پانچواں سال بھی گزر گیا۔ اسی دوران ایک دن محترمہ فاطمہ جناح دورے پر آئیں۔ ذاکرہ صاحبہ کے کام کو سراہا اور کہا کہ اس وقت ملک کو ہیومن ریسورس کی ضرورت ہے۔ آپ جیسی عورتوں کو آگے بڑھنا ہوگا۔ وطن کو محنتی انسان کی ضرورت ہے اگر کہیں اور جانے کا کہا جائے تو انکار مت کیجئے گا۔"

ذاکرہ صاحبہ نے ہاں کہہ دیا۔ اس کے کچھ دن بعد ہی ان کے نام پر لیٹر آ گیا کہ آپ کا تبادلہ شیخوپورہ کیا جا رہا ہے۔ اور وہ شیخوپورہ چلی گئیں، انسپکٹر آف اسکول بن کر۔ پرویز اور بانو بھی ساتھ گئے مگر ایک مسئلہ تھا۔ بانو کا ایم اے کا سال آخر تھا اور پرویز کی پڑھائی بھی جاری تھی مجبوراً ان دونوں کو واپس لاہور آنا پڑا۔ ان کے لیے زینب اور لالو کو ساتھ کر دیا گیا۔ سائرہ کا گھر ان کے لیے سازگار ثابت ہوا تھا کہ اب کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں تھا۔

ادھر فائنل امتحان کا وقت بھی آ گیا۔ پنجاب یونیورسٹی

ہال میں امتحان ہونا تھا۔اب اشفاق احمد کی دونی والا ناٹک بھی ختم ہو چکا تھا۔انگوٹھی کا ڈراما بھی فیل ہو چکا تھا۔اب کم کم ہی دونوں میں ملاقات ہوتی۔امتحان ہال میں دونوں تھے مگر الگ الگ اور چپ چپ۔چوتھے پرچے والے روز اشفاق احمد اپنی جگہ سے اٹھے اور بانو کی میز کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔اپنا قلم آگے بڑھا کر بولے۔"پلیز روشنائی دے دیں۔"

انہیں وہاں کھڑا دیکھا تو انوبجی لیٹر بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔"کیا بات ہے یہاں کیوں کھڑے ہو؟"

اشفاق احمد نے بانو کی میز پر رکھی دوات اٹھا کر کہا۔"میری انک ختم ہو گئی ہے۔ان محترمہ سے مانگ رہا ہوں۔"

انوبجی لیٹر نے سخت انداز میں کہا۔"آپ کو پتا نہیں ہے کہ امتحان ہال میں کسی دوسرے سے باتیں کرنا منع ہے۔"پھر اشفاق احمد کو دیکھتے ہوئے وہ بولا۔"آپ اشفاق احمد ہیں نا۔وہی ایک محبت سو افسانے والے میں نے وہ مجموعہ پڑھا ہے۔کیا خوبصورت افسانے ہیں۔"

گویا وہاں اشفاق احمد کا یہ جرم چھپ گیا۔معافی مل گئی۔پرچہ دے کر سب باہر آئے۔اس دن پہلی بار بانو کی ملاقات اشفاق احمد کے کسی گھر والے سے ہوئی۔وہ ان کا چھوٹا بھائی تھا۔اشفاق احمد نے تعارف کرایا۔"یہ میرا چھوٹا بھائی اشتیاق احمد ہے۔نیا نیا فوج میں بھرتی ہوا ہے۔"اور پھر بھائی کی طرف مڑ کر بولے۔"یہ قدسیہ ہیں۔میری ہی کلاس میں پڑھتی ہیں۔"

یہ پہلی ملاقات ہی دونوں کو قریب لے آئی۔وہ جب واپس کاکول چلا گیا تو وہاں سے بھی بانو کو خط لکھتا جس کا وہ پابندی سے جواب دیتی۔

امتحان گزر چکے تھے۔اب چھٹی ہی چھٹی تھی۔بانو اپنے لان میں لگے گھریلو جھولے پر جھول رہی تھی کہ باہر کا بڑا سا کالا گیٹ کھلا۔پہلے سائیکل کا پہیا اندر آیا پھر دو گورے ہاتھ نظر آئے جن پر سنہری بال تھے۔بانو ادھر ہی دیکھنے لگی تھی کہ اندر آنے والا آ گیا۔اس نے سائیکل کو ایک طرف کھڑی کی اور بانو کی طرف بڑھا۔اسے دیکھ کر بانو بری طرح گھبرا اٹھی۔اس کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔اسے مطلق اُمید نہ تھی کہ وہ گھر تک آ جائے گا۔مگر وہ آ گیا تھا۔اب بانو اسے گھر سے نکال بھی نہیں سکتی تھی۔اس لیے اس نے صرف اتنا کہا۔"آپ؟"

"جی میں۔"جواب میں اس نے اتنا ہی کہا۔

بانو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کہاں بٹھائے۔جھولے کے پاس ڈگڈگی نما کئی مونڈھے رکھے تھے مگر اس پر اسے بٹھانا عجیب سا لگا۔وہ برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔ادھر کئی کرسیاں رکھی تھیں جن پر اس کی امی دفتری امور کو نمٹایا کرتی تھیں۔اس نے اشفاق احمد کو مڑ کر دیکھا وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔وہ سوچ رہی تھی کہ ان کو یہاں کا پتا کس نے دیا ہوگا۔تبھی اشفاق احمد خود ہی بولے۔"میں ریزی سے ملنے آیا ہوں۔اس سے ایک کتاب کا ٹائٹل بنوانا ہے۔"

اب وہ اور بھی الجھ گئی کہ اسے پرویز کا گھریلو نام کس نے بتایا۔ریزی اسے صرف امی کہتی ہیں یا میں۔انہیں کیسے معلوم ہوا یہ نام۔وہ الجھی الجھی سی آگے بڑھتی رہی اور پھر کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے اشفاق احمد سے بولی۔"آپ یہاں بیٹھیں میں ابھی آئی۔"

وہ انہیں بٹھا کر اندر کی طرف بھاگی۔زینب پردے کی آڑ میں کھڑی ہوئی باہر جھانک رہی تھی۔بانو نے اس سے کہا۔"جلدی سے لالو کو بھیج کر نمک پارے اور برفی منگوا لو ..... ہاں چائے بھی تیار کر دو۔"

زینب نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔"یہ کون ہے؟"

"یہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتے ہیں...ابھی یہ ریزی سے ملنے آئے ہیں۔"

"اتنے سوہنے ہائے ربا اتنے سوہنے۔"زینب نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

"جلدی کرو۔وہ زیادہ دیر بیٹھیں گے نہیں۔لالو کو بھیج کر ناشتے کا سامان منگوا لو۔"

وہ باہر آ کر اشفاق کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔اشفاق احمد نظریں جھکائے کسی دلھن کی طرح بیٹھے تھے۔اس سے سامنے بیٹھا محسوس کر کے بولے۔"آپ کو معلوم ہے میں مزنگ روڈ پر رہتا ہوں۔"

"جی پتا ہے۔"اس نے بھی اشفاق احمد کی طرح دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"کیا آپ جانتی ہیں کہ جب ہم لوگ پاکستان آئے تو پہلے اپنی خالہ رشیدہ کے یہاں ٹھہرے تھے لیکن جلد ہی ہمیں مزنگ روڈ کا پتا چلا...آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت ہم بے سرو سامانی میں تھے۔تقو اور میں چھوٹے تھے۔جو بھائی کراچی میں تھے۔بابا جی میرے والد اپنی کل جمع پونجی بارڈر کے اس پار چھوڑ آئے تھے۔اس وقت اقبال بھائی اپنی ڈگری کو الگ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

رکھ کر ایک ایسا کام کرنے لگے جس بارے میں ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ بکرا منڈی سے ایک بکرا خریدتے اور اسے کندھے پر اٹھا کر شہر کا چکر لگاتے۔ وہ بکرا بکتا تو وہ خوش ہو جاتے۔ بکرے سے ہونے والی آمدنی کو وہ اماں کے حوالے کر کے پھر سے باہر نکل جاتے۔ اتنا پڑھ لکھ کر وہ ایسا کام کر رہے تھے۔"

"جی۔" بانو نے پھر ہنکارا بھرا۔

اشفاق احمد نے پھر سے سلسلہ کلام جوڑا۔ "پھر میں نے سوچا کہ مجھے بھی کوئی کام کرنا چاہیے۔ نوکری تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔ اس خیال کے آتے ہی میں اس دفتر پہنچ گیا جہاں نوکری دی جا رہی تھی۔ ایمپائیٹ ایکسچینج میں درخواست جمع کرا دی۔ دسویں کی سند جمع کر کے والٹن کیمپ میں نوکر ہو گیا۔"

"جی۔" بانو نے جواب دیا۔ اس وقت بانو کا چہرہ دیکھ کر کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ اسے اشفاق پر ترس آ رہا ہے۔

اشفاق احمد اپنی رو میں کہتے گئے۔ "والٹن کیمپ میں ہر طرف اجڑے بچھڑے لوگ بھرے پڑے تھے، ایسے سینکڑوں لوگ تھے جو اپنوں سے بچھڑ گئے تھے۔ یہ لوگ بڑی کسم پرسی کی حالت میں تھے۔ میرا کام یہ تھا کہ وہاں آنے والوں کے نام اور دیگر کوائف لکھوں۔ ان کی شکایات لکھوں۔ ایک نمبر مزنگ روڈ سے پیدل والٹن کیمپ تک جاتا تھا۔ واپسی پر تھک کر چور ہوتا تھا۔ والٹن میں ہی میری ملاقات مفتی سے ہوئی' ممتاز مفتی سے اور پھر یہ دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔"

اشفاق احمد جیسا داستان گو ہو' بانو بیان کے سحر میں کھوسی گئی تھی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اشفاق احمد اسے انٹرٹین کر رہے ہیں۔ اس کے پاس بیٹھنے کا جواز ڈھونڈ چکے ہیں۔ مگر ان کی نگاہیں بار بار دروازے کی سمت اٹھ رہی تھیں۔ جیسے وہ پرویز کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

بانو سوچ رہی تھی کہ یہ اکیلے بولے جا رہے ہیں۔ کہیں برا نہ مان جائیں کہ میں ان کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہی۔ اس لیے اسے بھی بولنا چاہیے۔ لیکن گھبراہٹ اس طرح اس پر طاری تھی کہ وہ سوچ بھی نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیا بولنا چاہیے۔ جیسے ہی اشفاق احمد خاموش ہوئے اس نے کہا۔ "میں آپ کو اپنا البم دکھاؤں؟"

"جی ہاں ضرور دکھائیں۔" اشفاق احمد جلدی سے بولے۔

بانو اٹھ کر اندر گئی اور ایک البم اٹھا لائی۔ البم دیکھ کر اشفاق احمد نے دلچسپی کا اظہار کیا اور پوچھا۔ "یہ آپ کی فیملی البم ہے؟"

"جی نہیں یہ تو میں نے خود بنایا ہے۔" کہتے ہوئے بانو نے البم ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اشفاق احمد نے پہلا پیج کھولا اور ان کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ وہ البم ایم اے کی ایک طالبہ کی تھی اور اس میں تصویر اخبارات سے کاٹ کر لگی ہوئی تھی۔ دوسرا صفحہ کھولا اس پر بھی کسی اخبار سے کٹی ہوئی تصویر چپکی ہوئی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کہیں یہ مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہی ہے؟ بالآخر انہوں نے پوچھ ہی لیا۔ "یہ کیا ہے؟"

"یہ میرا شوق ہے۔ مجھے جتنے فلمی اداکار پسند ہیں میں ان کی تصویر کاٹ کر اس میں چپکا لیتی ہوں۔ ہے نا دلچسپ۔"

بانو کا سوال اتنا معصومانہ تھا کہ اشفاق احمد نے کہا۔ "ہاں دلچسپ ہے۔ لگتا ہے آپ کو کندن لال سہگل بہت پسند ہے؟"

"جی ہاں۔ آگے دیکھیں رینوکا دیوی کی بھی تصویر ہے۔"

اشفاق احمد نے اس کا دل رکھنے کے لیے کئی صفحے پلٹے لیکن مذاق نہیں اڑایا کہ یہ بھی کوئی شوق ہے۔ بس ورق پلٹتے رہے پھر بولے۔ "آپ کے بھائی کا کیا زبردست شوق ہے۔ کتنی عمدہ تصویر بناتے ہیں۔ کیا آپ کا ایسا کوئی شوق نہیں ہے؟"

بانو پر اب تک گھبراہٹ طاری تھی وہ جلدی سے بولی۔ "ہاں کبھی کبھی میں کہانیاں بھی لکھتی ہوں۔"

اشفاق احمد کے چہرے پر دلچسپی کا عکس لہرایا۔ وہ بولے۔ "یہ تو زبردست شوق ہے۔ کیا آپ مجھے اپنی کوئی کہانی دکھائیں گی؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ میں ابھی لاتی ہوں۔" کہہ کر وہ اندر گئی اور بنڈل کی صورت میں بہت سارے اوراق اٹھا لائی۔ اشفاق احمد نے اس کے ہاتھ سے وہ پلندہ لیا اور بڑی دلچسپی سے اسے دیکھنے لگے۔ ایک کے بعد ایک وہ کہانیوں کو دیکھتے چلے گئے۔

بانو کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کہانیاں دے کر پچھتا رہی ہے۔ اس لیے کہ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ اس نے غلط کیا ہے۔ جس کی کہانیاں ملک بھر میں مشہور ہیں۔ جس کا مجموعہ "ایک محبت سو افسانے" کی ہر طرف دھوم ہے اسے میں نے اپنے ناتجربے کار افسانے دے دیئے ہیں۔ وہ اسے پڑھ کر کیا سوچتا ہوگا۔ لیکن اشفاق احمد کے چہرے پر ایسی کوئی علامت

URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND URDU MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

English

GARMI KO THAND KARAO

SnScares @SnScare

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نظر نہیں آ رہی تھی جس سے اندازہ لگایا جا سکتا کہ اسے یہ افسانے پسند نہیں آ رہے ہیں۔ اتنے انہماک سے وہ پڑھ رہے تھے جیسے کسی بڑے فنکار کی کہانیاں ہوں۔ پھر وہ سر اٹھا کر بولے۔ ''کاکی آپ صفحہ نمبر نہیں ڈالتی ہیں۔ اس سے تو پیج اِدھر اُدھر ہو جانے کا خطرہ ہے۔''

''وہ.. بات یہ ہے کہ جلد بازی میں نمبر ڈالنا بھول گئی۔ ابھی تو یہ رف ہے نا۔ بعد میں جب اسے صاف کروں گی تو نمبر بھی ڈال دوں گی۔'' بانو نے اپنی غلطی پر پردہ ڈالنا چاہا۔

''آئندہ احتیاط کریں۔'' کہتے ہوئے اشفاق احمد کھڑے ہو گئے۔ ''لگتا ہے ریزی کہیں دور نکل گئے ہیں۔ اب میں چلتا ہوں پھر کبھی آ جاؤں گا۔''

اشفاق احمد چلے گئے لیکن بانو کو ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے وہ اب بھی اسی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ اتنی دیر تک وہ بیٹھے رہے تھے لیکن ایک بار بھی انہوں نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بغور نہیں دیکھا تھا۔ جیسے کالج میں نظریں جھکا کر باتیں کرتے تھے۔ اس وقت بھی ان کا وہی انداز تھا۔ اس وقت بانو نے سوچا' کہیں میں نے غلط تو نہیں سمجھا۔ وہ تو ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے میری کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اگر مجھ میں وہ دلچسپی لے رہے ہیں تو پھر مجھے نظر انداز کیوں کر رہے تھے۔ یقیناً میری غلطی ہے کہ میں ان کی آمد کو غلط سمجھ بیٹھی۔ کافی دیر تک وہ خود سے الجھتی رہی۔ پھر اس نے اپنے دل کو سمجھایا اور سونے کے لیے اپنے روم کی طرف چل دی۔ یہ وقت اس کے سونے کا نہیں تھا پھر بھی وہ خود سے فرار کی خاطر اپنے بیڈ پر ڈھے گئی۔

ابھی دو چار دن ہی گزرے تھے کہ وہ پھر آ گئے۔ اس بار بھی ان کی آمد سے وہ گھبرا اٹھی۔ شاید اس لیے کہ اس کے دل میں چور تھا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اس کے لیے آتے ہیں۔ اس بار اشفاق احمد نے آتے ہی کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تمہارے افسانے چھپیں۔ یوں لکھ کر گھر میں پڑے رہنے سے بہتر ہے کہ وہ قارئین کے سامنے آئیں۔ قارئین ہی رہنمائی کرتے ہیں۔''

اس نے اپنے دو تین افسانے انہیں دے دیے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ افسانہ مانگنے کے بہانہ آئے ہیں۔ انہوں نے ایک نیا بہانہ ڈھونڈا ہے ورنہ میرے افسانے ایسے کب ہیں کہ کوئی رسالہ انہیں چھاپے۔ لیکن ایک ڈیڑھ ہفتے بعد اسے خبر ملی کہ اس کا ایک افسانہ ادب لطیف میں چھپ گیا ہے۔ وہ رسالہ لے کر خود آئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے کہا کہ مبارک ہو آپ کا افسانہ چھپ گیا۔ اس نے بے صبری سے رسالہ کھولا۔ درماندگی شوق کے عنوان سے اس کا افسانہ ادب لطیف میں شامل تھا۔ افسانے کے اوپر قلم سے لکھا تھا۔ ''کاش ایسا افسانہ میں خود بھی لکھ سکتا۔''

افسانہ چھپنے پر اس کی خوشی دیدنی تھی۔ اس کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ افسانے پر قدسیہ چٹھہ کی بجائے بانو قدسیہ لکھا تھا۔ اس کی توجیح انہوں نے یہ دی کہ چٹھہ کچھ غیر شاعرانہ نام ہے جب کہ بانو قدسیہ ردھم میں ہے۔

اس ایک افسانے سے اس کی ادبی زندگی شروع ہو گئی۔ اشفاق احمد آتے۔ اسے ون لائن دیتے جس پر وہ کہانی تیار کر لیتی۔ اب اس میں خود اعتمادی سی آ گئی تھی۔ اسے اشفاق احمد نے باضابطہ قلم کار بنا دیا تھا۔ اس کے اندر کی مصنفہ کو جگانے کے لیے انہوں نے اسے ''داستان گو'' کا ایڈیٹر بنا دیا۔ اس بہانے اسے دوسرے فنکاروں کی تحریریں پڑھنے کا زیادہ موقع ملنے لگا تھا۔ دوسروں کی تحریریں پڑھنے سے اسے لکھنے کے نئے نئے زاویے مل رہے تھے۔

1950 سے 1955 کا دور اس کے لیے بڑا طوفانی تھا۔ ماں کی پوسٹنگ ملتان ہو چکی تھی۔ وہ وہیں رہ رہی تھیں۔ وہ ماں سے ملنے کے بہانے کبھی ملتان چلی جاتی۔ وہاں پہنچتی تو اشفاق احمد خط کے ذریعہ اس کی خیریت پوچھتے۔ نئے نئے ادبی مشورے دیتے پھر جب وہ لاہور لوٹ آتی تو اشفاق صاحب خود چلے آتے۔ بے ربط سی ملاقاتیں ہوتیں۔ ایسا لگتا کہ دونوں طرف آگ برابر کی لگی ہوئی ہے لیکن زبان سے کوئی بھی اقرار نہیں کر رہا تھا۔ ادھر اشفاق احمد نوکری کے لیے بھی پریشان تھے اور نوکری سے بھی پریشان تھے۔ اب تک ریڈیو سے ہی وابستہ تھے۔ نوکری ٹرانسفر لازمی ہے۔ اس لیے کبھی انہیں جہلم بھیج دیا جاتا اور کبھی مری۔ لیکن اس وقفہ میں بھی وہ اسے خط لکھنے سے پیچھے نہیں ہٹتے۔ ان کی نوکری اس ریڈیو اسٹیشن میں تھی جو ٹرک پر قائم کیا گیا تھا۔ تاکہ ان کی آواز بغیر کسی الجھن کے انڈیا تک پہنچتی رہے۔ ان کا مقبول ترین پروگرام ''ہم آگئے'' مقبوضہ کشمیر اور مشرقی پنجاب میں بھی پسند کیا جاتا تھا۔ اس پروگرام کی خاص بات یہ تھی کہ انڈیا جو پروپیگنڈا آکاش وانی سے کرتا وہ فوراً اس کا جواب دیتے۔ جیسے ہی بھارتی پروگرام ختم ہوتا اسی ویو نمبر پر یہ اپنا پروگرام شروع کر دیتے۔ ان تمام پروپیگنڈا کا جواب دینا شروع کر دیتے۔ جیسے ہی وہ کہتے ''ہم آگئے'' لوگ ریڈیو سے گویا چپک جاتے۔ ہلکی ٹھٹول کے درمیان وہ جواب نشر کرتے

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

رہتے۔ایسا جوابی حملہ ہوتا کہ آکاش وانی والے سوچتے رہ جاتے۔

یہ ریڈیو اسٹیشن ٹرک پر۔شور شرابے کے درمیان کھڑا رہتا اس لیے باہر کا شور اندر تک گونجتا تھا۔اس پریشانی کا علاج یہ ڈھونڈا گیا تھا کہ تمام صداکار بڑی بڑی رضائی اوڑھے رہتے تاکہ باہر کی آواز صداکاری کے وقت پریشان نہ کرے اور انڈیا والوں کو اس اسٹیشن کا محل وقوع سمجھ میں نہ آئے۔اشفاق احمد بڑی دلجوئی سے اس پروگرام کا اسکرپٹ لکھتے تھے۔یہ پروگرام ''تلقین شاہ'' کی ابتدا تھی جو 39 سال ریڈیو پر چلتا رہا تھا۔اس پروگرام سے ان کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ باباجی محمد خان کا انتقال ہوا اور گھر مہمانوں سے بھر گیا۔سب دلاسہ دیتے آنسو بہانے میں مصروف تھے اور یہ ایک کونے میں بیٹھے سب کی نظر سے چھپ کر تلقین شاہ کی اسکرپٹ لکھنے میں مصروف رہے۔

ریڈیو سے فل ٹائم وابستگی کے بعد بھی انہیں چین نہیں مل رہا تھا اس لیے انہوں نے فل ٹائم نوکری سے استعفیٰ دے کر دیال سنگھ کالج میں لیکچرر کی نوکری تلاش کر لی۔اس دوران بھی وہ ریزی سے ملنے کے بہانے بانو کے گھر آتے رہے۔مگر زبان سے ابھی تک وہ لفظ ادا نہیں کیا تھا جسے سننے کے لیے بانو بے تاب تھی۔وہ اکثر سوچتی کہ اس خوبصورت گونگے آدمی کو کیا خبر کہ وہ لڑکی جو ساندہ کلاں سے پیدل چل کر کرشن نگر تک آتی ہے اور پھر وہاں سے بس کے ذریعہ گورنمنٹ کالج کے مقابل اسٹاپ پر اترتی ہے اس کے دماغ میں بھی خناس بھرا ہے۔جو کسی کو ابھی تک اپنا رازدار بھی بنا نہیں پائی ہے۔اسے بھی بے صبری سے صرف ایک لفظ سننے کی آرزو ہے جو اس گونگے آدمی کو ادا کرنا ہے۔

اسی دوران ایک اور بات ہوگئی۔اشفاق احمد کے نام روم سے ایک خط آگیا۔وہ خط روم یونیورسٹی سے ملحق ادارہ iSMEO کی جانب سے آیا تھا۔ان لوگوں کو اردو کے ایک لیکچرر کی ضرورت تھی۔کافی پہلے اشفاق احمد نے ان کے ہاں درخواست دی تھی یہ اسی کا جواب تھا۔وہ خط لے کر پرنسپل کے پاس پہنچے۔انہوں نے خط دیکھ کر کہا۔''یہ ہے کیا؟''

اشفاق احمد نے کہا۔''یہ نوکری کا پروانہ ہے۔''

''مگر یہ تو اطالوی زبان میں ہے؟''

''جی ہاں وہاں کی رائج زبان میں خط دیا گیا ہے۔''

''خوب اچھی طرح سوچ لو' لگی لگائی نوکری چھوڑ کر جا رہے ہو' کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹھوکر کھا جاؤ؟''

''نہیں ادارہ معتبر ہے۔''

کئی اور لوگوں نے بھی سمجھایا کہ بغیر سوچے سمجھے جا رہے ہو ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتاوا ہو۔انہوں نے کسی کی نہ سنی اور روم چلے گئے۔وہاں جا کر بھی وہ بانو کو نہیں بھولے تھے۔ہر ایک دو روز بعد وہاں سے بانو کو خط لکھتے۔ان خطوط میں صرف ادبی ہدایت نامہ ہوتا۔داستان گو سے متعلق مشورے ہوتے۔بانو خط پڑھتی جواب لکھتی لیکن وہ بھی ایسا کچھ نہیں لکھ پائی تھی جو لکھنا چاہتی تھی۔یہی حال اشفاق احمد کا تھا۔وہ بھی ایسا کچھ نہیں لکھ سکے تھے جسے قول و قرار کہا جا سکتا۔ان کی زندگی میں 1950 سے 1956 تک بڑے طوفانی ایام گزرے تھے۔1952 میں انہوں نے ملک سے فرار کا اہتمام کیا تھا اور 1955 تک iSMEO میں پڑھانے کا اہتمام کیا۔

اشفاق احمد کی طرح یہ ایام بانو کی زندگی میں بھی طوفانی رہے۔لاہور کالج فار ویمنز میں جاب کی آفر ہوئی لیکن ذاکرہ چٹھہ نے بیٹی کو سمجھایا۔''عورت جب مالی طور پر مختار ہو جاتی ہے تو شادی کے قابل نہیں رہتی۔''

ماں کے سمجھانے پر اس نے بھی نوکری سے خود کو دور رکھا۔جب لاہور میں وقت گزرنا مشکل ہو جاتا تو وہ ماں کے پاس ملتان چلی جاتی اور جب وہاں بھی بوریت گھیرنے لگتی تو وہ واپس لاہور آجاتی۔ملتان آتی تو اسے گزرے دن یاد آجاتے کہ پہلے وہ جب بھی ماں سے ملنے ملتان آتی تھی تو دو چار دن کا وقفہ دے کر اشفاق احمد بھی پرویز سے ملنے کے بہانے ملتان آجاتے۔ان کی باتوں سے خطوط سے بانو کو ایک نئی اُمید بندھ جاتی۔وہ خوابوں میں کھو جاتی۔ایسا لگتا کہ جیسے وہ ٹھہرے پانیوں میں پتھر پھینک کر طلاطم پیدا کرتے ہیں اور پھر اپنے گھر والوں، قبائلی رسم و رواج کے خوف سے سرپٹ بھاگ لیتے ہیں۔دراصل ان کی سرشت میں شامل تھا کہ وہ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں چاہتے تھے۔ان کی یہی کوشش ہوتی کہ دوست دشمن سب سے ان کی بنی رہے۔

وہ ان دنوں لاہور میں تھی کہ روم سے اشفاق احمد کا خط آ گیا جو انہوں نے اس کی امی کو لکھا تھا۔

''آپ کا خط ملا جتنی بار اسے پڑھا اتنا مزہ آیا۔گو کہ یہ خط کاکی والے خط کی پشت پر تھا لیکن میں نے سب سے پہلے اسی کو پڑھا۔کینٹین کے کاؤنٹر پر بیٹھے بیٹھے اسے کئی بار پڑھا۔کینٹین میں کتنے ہی گاہک آئے اور چلے گئے لیکن میں پڑھتا رہا۔''

جاتی دفعہ میں نے بیرے کو ڈبل ٹپ دی تھی یعنی پورے بیس لیرے۔ پاکستانی کرنسی میں دو آنے (2017 میں دو لیرا پاکستانی کرنسی میں ایک روپیا چار آنے پہنچ گیا) دیئے تھے۔ بیرا اتنا خوش ہوا کہ بار بار جھک کر 'گراتسے گراتسے' کہتا رہا تھا۔ یہاں عام طور سے دس لیرے ٹپ دینے کا رواج ہے۔ یہاں کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ بارش کبھی بھی برس سکتی ہے۔ ابھی مطلع صاف اور ابھی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اس لیے ہر کوئی اپنے ساتھ ایک چھتری یا برساتی کوٹ ضرور رکھتا ہے۔ سبزیاں بہت سستی ہیں۔ یہاں سب سے مہنگی چیز مکان ہے جو اسی روپے سے سو روپے ماہانہ پر ملتے ہیں، مکانوں سے مہنگے ڈاک کے ٹکٹ ہیں۔ مجھ سے افسانہ مانگنے والے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے اس لیے مجھے ڈاک کے ٹکٹ کا انتظام رکھنا پڑتا ہے۔ باقی روم ہر معنوں میں سستا اور اچھا ہے۔ لوگ بہت اچھے اور امن پسند ہیں۔ کیونکہ غریب اور احساس کمتری کا شکار ہیں۔ یہاں کوئی کسی سے الجھتا نہیں۔ اگر بات بگڑ بھی جائے تو سرنش کرنے سے زیادہ بات نہیں بڑھتی۔ کسی کو ایک طمانچہ مارنا قتل کے برابر ہے۔ یہاں کی سب سے بڑی گالی۔ ''چل دفع ہو جا'' ہے۔ اگر کسی کو کہہ دیا تو وہ مارنے مرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

یہاں کے لوگ پاکستان کو امیر ملک سمجھتے ہیں کیونکہ سر آغا خان پاکستان کے ہیں اور رینا ہیورتھ پاکستان کی بہو ہے۔

امی! کاکی میرا خط پڑھ کر کیوں روتی ہے۔ کیا وہ سمجھتی ہے کہ میں مر گیا ہوں؟ ایسا سمجھتی ہے تو اسے تلاوت کرنی چاہیے یا فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھا دینا چاہیے۔ کیا کروں کہ یہ تماشا آپ سے آپ بن گیا ہے۔ آپ خود سوچیں کیا میں برا ہوں؟ میں نے دانستہ تو اسے کوئی تکلیف نہیں دی۔ فقط شفو

ابھی وہ اس خط کا جواب بھی دے نہ پائی تھیں کہ ایک اور خط آ گیا جس میں لکھا تھا۔ ''آپ کا ایک خط ملتان سے ایک خط لاہور سے اور ایک خط پتا نہیں کہاں سے آیا ہوا ہے لیکن میں جواب بروقت نہ دے سکا۔ کل میں استانی کو سلام کرنے گیا تو اس نے زبردستی بٹھا لیا اور کہا کہ تم استعفا لکھ ہی دو۔ دیکھو کتنی غلطیاں کر رہے ہو۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ وہاں قدسیہ ڈراما کر رہی ہے جس کا اثر میرے دماغ پر پڑ رہا ہے۔ اگر بیس تاریخ تک خط لکھیں تو روم کے پتے پر ہی لکھیں کیونکہ بعد میں آپ کے خط کو میں نہیں مل پاؤں گا۔ اس وقت مجھے ریزی بہت یاد آ رہا ہے، پیکنگ کیسے کرنی ہے مجھ سے ہو نہیں رہا ہے اس لیے کہ میری وہ کتابیں جو مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہیں جو میری کل پونجی کھا چکی ہیں ان کو پیک کیسے کیا جائے سمجھ نہیں آتا۔''

امی! آپ کاکی سے کچھ نہ بولا کریں۔ وہ ایسے ایسے خط لکھتی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ سب اس کے دماغ سے اترا ہے۔ فقط شفو

پھر سنا گیا کہ اشفاق احمد روم سے لوٹ آئے ہیں۔ دو تین دن تک وہ اپنے قریبی عزیزوں سے ملنے ملانے میں مصروف رہے تیسرے دن بانو سے ملنے کے لیے پرویز کا بہانہ بنا کر آ گئے۔ کافی دیر بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ روم کے قصے' کیسے وقت وہاں گزرا یہ سب سناتے رہے پھر اٹھ کر چلے گئے۔ بغیر بانو سے سلام دعا کیے۔ اپنی پرانی روش پر وہ قائم تھے کہ بیٹھے بیٹھے اٹھے اور چل دیئے۔ بانو نے بھی اس بات کا برا نہ منایا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وقت گزرا ہے۔ ان کے عادات و اطوار نہیں بدلے ہیں۔

وہ اپنی دلچسپیوں میں پھر سے جت گئی۔ اس دن وہ 30 جیل روڈ میں رہنے والی اپنی دوست محمودہ اصغر کے گھر منیزہ کے ساتھ جا رہی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی جب بھی اسے موقع ملتا وہ منیزہ کے ساتھ سڑک ناپنے نکل پڑتی تھی۔ وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی چلی جا رہی تھیں کہ پیچھے سے آواز آئی۔ ''منو.. کاکی۔''

بانو نے توجہ نہ دی اور آگے بڑھتی رہی۔ پھر آواز آئی۔

''کاکی۔ کاکی ذرا رکنا۔''

منزہ نے بانو کے بازو کو پکڑ کر روکا۔ دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ جگت ڈیڈی افتخار احمد چلے آ رہے ہیں۔ نزدیک پہنچ کر بولے۔ ''کاکی کہاں جا رہی ہو؟''

''تیس نمبر جیل روڈ پر میری سہیلی محمودہ رہتی ہے اس سے ملنے جا رہی ہوں۔'' بانو نے جواب دیا۔

''امی ملتان سے آ گئیں؟''

''جی ہاں کل رات ہی آئی ہیں۔''

بانو کو ذرا بھی شک نہ گزرا کہ افتخار احمد اتنی بڑی خوشخبری لے کر آئے ہیں۔ اگلے دن جب بانو اپنی خالہ کے ہاں گئی ہوئی تھی' کہ ڈیڈی جی افتخار احمد اس کے گھر پہنچ گئے۔ انہوں نے ذاکرہ صاحبہ سے کہا۔ ''مجھ سے اب شفو کا یہ سنتاپ دیکھا نہیں جاتا۔ کل میں دو گواہ اور قاضی کے ساتھ آؤں گا۔ آپ تیاری رکھیں۔''

ذاکرہ صاحبہ کے چہرے پر فکر کا سایہ اتر آیا۔ انہوں نے

پوچھا۔ ''ایسی کیا مجبوری ہے؟ تم یہ فیصلہ کیوں کر رہے ہو۔''

''مجبوری میری نہیں میرے بھائی کی ہے۔'' انہوں نے کھلے دل سے کہا۔ ''لیکن ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ مزنگ روڈ کے حالات صحیح نہیں ہیں اس لیے ابھی اس خبر کو راز میں ہی رکھنا ہے۔ کیونکہ اماں جی کی حالت اچھی نہیں ہے۔''

ذاکرہ چٹھہ نے بیٹی سے کہا۔ ''قدسیہ یاد رکھنا' اپنی مرضی کا فیصلہ کبھی کبھی مہنگا پڑتا ہے۔ اس کی قیمت زیادہ ادا کرنی پڑتی ہے۔ کسی سے کبھی شکوہ نہ کرنا۔''

16 دسمبر 1956 کی شام بڑی خاموشی سے آئی مگر بانو کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی لے کر آئی۔ اس وقت بانو کے پاس کوئی اچھے کپڑے بھی نہیں تھے۔ اس نے گھر کے دھلے ہوئے کپڑے پہنے۔ صرف ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں پہن لیں۔ محمودہ نے دیکھا تو بولی۔ ''مجھے بتایا ہوتا تو میں ایک جوڑا ایسا لے آتی جو زرق برق ہوتا۔''

''ارے کچھ نہیں ہوتا..... یہی کافی ہے۔''

برابر والے کمرے میں ممتاز مفتی۔ محمد حسین آرٹسٹ اور ڈیڈی تھے۔ یہی اشفاق احمد کی طرف سے گواہ تھے۔ براتی تھے۔ مائکے کی طرف سے پرویز، محمودہ اصغر اور والدہ تھیں۔ نکاح ہوا۔ میز پر ایک ڈبے میں مٹھائی تھی۔ پانچ چھ پیسٹریاں پڑی تھیں دودولہا والے وہی کھا کر رخصت ہوئے۔ اشفاق احمد کو اندر بھیجا گیا۔ وہ آئے۔ انہوں نے اندر آتے ہی کہا۔ ''میں کوئی انگوٹھی وغیرہ لا نہ سکا یہ میری پاس بک ہے۔ بینک میں نو سو روپے پڑے ہوئے ہیں۔ یہ تمہارے ہوئے۔''

زندگی میں کوئی خاص تبدیلی آئی نہیں۔ اشفاق احمد رات دیر گئے آتے اور صبح منہ اندھیرے چلے جاتے۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک دن صبح ہی صبح ڈیڈی جی آئے اور کھڑکی پر دستک دے کر بولے۔ ''شفو شفو جلدی چلو اماں اوپر آنے والی ہیں۔ وہ تم سے ملاقات کریں گی۔''

اشفاق احمد چھلانگ مار کر بستر سے اترے۔ جیسے تیسے کپڑے تبدیل کیے اور یہ جا وہ جا۔

1 مزنگ روڈ میں دھما کا سا ہو گیا تھا۔ ابا جی نے شفو کو تو کچھ نہیں کہا ڈیڈی کو بلا کر کہا۔ ''یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے ورنہ شفو کی یہ ہمت نہ ہوتی اپنی بیوی بچوں کو لو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

وہ بیچارے بیوی بچوں کے ساتھ سمن آباد منتقل ہو گئے۔ ان کا وقت زیادہ تر بانو کے ہاں ہی گزرتا۔ پھر بانو بھی 455.N سمن آباد میں منتقل ہو گئیں۔ یہیں سے داستان کو نکالا جانے لگا۔ یہیں ان کے گھر میں پہلی قلقاری گونجی۔ ان کے گھر پہلے بیٹے انیق کی پیدائش ہوئی۔ وہ تاریخ تھی 18 اکتوبر 1957۔ جیسے ہی ذاکرہ چٹھہ کو احساس ہوا کہ بانو کے ماں بننے کا وقت قریب ہے انہوں نے اسے بہن کے ہاں بھیج دیا۔ ساتھ میں نومولود کے لیے بنائے گئے چھوٹے چھوٹے کپڑوں کی پوٹلی بھی کر دی۔ بانو ماچھا جی کے ساتھ 450 N میں جا پہنچی۔ کسی نے ڈیڈی جی کو خبر دے دی تھی۔ وہ بھاگتے ہوئے آئے اور بانو کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ خالہ نے حسین بی بی کو فوراً بلا لیا۔ وہ بانو کو لے کر اندر والے کمرے میں چلی گئی۔ جس وقت انیق کی پہلی چیخ گونجی جمعہ کی اذان ہو رہی تھی۔ حسین بی بی نے بچے کو نہلا کر ڈیڈی جی کی گود میں ڈال دیا۔ انہوں نے یٰسین شریف جو وہ مسلسل پڑھ رہے تھے۔ اسے تپائی پر رکھی اور بچے کو گود میں لے کر کانوں میں اذان دی اور پھر بچے کو اشفاق احمد کی گود میں دے دیا گیا۔ وہیں اس کا نام انیق تجویز ہوا۔ پھر پورے ایک سال بعد سولہ ستمبر 1958 کو انیس پیدا ہوا۔ تیسرے بیٹے اثیر کی پیدائش 15 جون 1962 کو ہوئی۔

بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ ہاتھ ہمیشہ کی طرح تنگ رہتا تھا۔ گھر کا کرایہ تک نہیں نکل پاتا تھا۔ اشفاق احمد ریڈیو پر ملازم تھے۔ وہاں سے جو پیسے ملتے تھے وہ راشن کے لیے بھی کم پڑتے تھے۔ بانو نے آمدنی میں اضافے کے لیے درسی کتابیں لکھنی شروع کر دی تھیں جس سے ساٹھ ستر روپے آجاتے تھے۔ بچے کے دودھ کا ڈبہ چالیس روپے میں آتا تھا بچے کے لیے مہینے میں تین ڈبے کی ضرورت ہوتی تھی اس زمانے میں مٹی کے تیل کا چودہ بتیوں والا چولھا آچکا تھا۔ اس کی وجہ سے ایندھن کا خرچ کم ہو گیا تھا۔ بانو جب کالج میں تھی تو اسے روٹی پکانا بھی نہیں آتی تھی اور اشفاق احمد کو سودہ لانے کا تجربہ نہیں تھا لیکن شادی کے بعد ان دونوں نے اپنی اپنی اس خامی پر بہت حد تک قابو پا لیا تھا۔

انیق کی وجہ سے دونوں جان توڑ محنت کر رہے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ انیق ڈیڑھ سال کا ہو چکا تھا کہ جون کے مہینے میں جب گرمی میں تیزی آئی تو وہ بیمار پڑ گیا۔ اسے اسہال اور قے کی شکایت ہو گئی تھی۔ جو تین دن میں بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ بچے کی تشویش ناک صورت حال دیکھ کر کسی نے مشورہ دیا کہ اسے ڈاکٹر پراچہ کو دکھا

دو۔ وہ بچوں کے علاج کے ماہر ہیں۔ایک بار کی دوا سے یہ اچھا ہو جائے گا۔

اس دن تو گرمی اور بھی سخت تھی۔ایسا لگ رہا تھا کہ دھوپ کی گرمی برچھی بن کر جسم چھید دے گی۔لیکن بچے کی حالت دیکھ کر دونوں باہر نکل آئے۔بانو نے بچے کو آنچل میں چھپا رکھا تھا تاکہ اس پر سورج کی گرمی کم پڑے۔دونوں تیز تیز قدموں سے چل پڑے پراچہ کا کلینک میکلوڈ روڈ پر تھا۔وہاں تک پیدل جانا ممکن نہ تھا۔تانگا اسٹینڈ تک پہنچتے پہنچتے ہی ان دونوں کی حالت غیر ہو گئی تھی۔اسٹینڈ پر پہنچ کر پتا چلا کہ ادھر کوئی تانگا جاتا نہیں ہے۔انہیں سالم تانگا لینا پڑے گا جس کا کرایہ بارہ آنے ہوں گے۔مجبوری تھی اس لیے انہیں بارہ آنے کی قربانی دینی پڑی۔

کلینک پر پہنچے۔ڈاکٹر موجود تھا۔اس نے بچے کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کر دیکھے۔پھر بانو سے بولے۔"تم لوگ کیسا پیرنٹ ہے۔اس کو اب آخری وقت میں لے کر آیا۔اس کا اب ہم کیسے ٹریٹمنٹ کرے گا۔"

بانو اتنا سنتے ہی رونے لگی۔وہ دوپٹے میں منہ چھپا کر رو رہی تھی کہ ڈاکٹر نے دو تین شیشیوں میں سے دوا انڈیل کر ایک چھوٹی شیشی میں سفید رنگ کا محلول تیار کیا اور پھر اس میں اپنی دراز سے کوئی پڑیا نکال کر شامل کیا اور اس محلول کو ہلاتے مکس کرتے ہوئے بچے کے قریب آئے۔اشفاق احمد نے بچے کو گود میں لے رکھا تھا۔ڈاکٹر نے بچے کے سوکھے جبڑے میں انگلی ڈال کر کسی ظالم جلاد کی طرح اس کا منہ کھولا اور اس ننھے سے منہ میں وہ محلول ڈال دیا۔بچے پر نقاہت طاری تھی۔اس نے بمشکل دوا اندر کی۔اشفاق احمد بچے کو کندھے سے لگائے کھڑے تھے اور بانو اس کی پیٹھ پر ہولے ہولے تھپکی دے رہی تھی۔

محلول بچے کے پیٹ میں گیا ہی تھا کہ اس نے منہ بھر کر قے کر ڈالی جو اشفاق احمد کے کندھے کو بھیگوتا ہوا فرش پر پھیل گیا۔فرش کو گندا ہوتے دیکھ ڈاکٹر چلایا۔"لڑکی تم کیسا پیرنٹ ہے بچہ لوگ کو سنبھال بھی نہیں سکتا۔"

بانو فوراً زمین پر بیٹھ گئی اور آدھے دوپٹے سے فرش کو صاف کرنے لگی۔فرش جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔اندر سے بجری باہر آ رہی تھی۔ایسے فرش کو صاف کرنا بھی جوئے شیر لانا ہے۔مگر وہ فرش کو رگڑتی رہی۔

ڈاکٹر نے کن انکھیوں سے فرش کو دیکھا پھر بولا۔"تم لڑکی لوگ کیسا بے پروا ہے۔اپنے دو پٹے کو بھی گندہ کر دیا۔اب جاؤ دوپٹا کو دھو کر آؤ۔اس میں جراثیم ہے۔اسے بچے کے قریب بھی نہ لانا۔ورنہ حالت اور بگڑ جائے گا۔"

اشفاق احمد نے ڈاکٹر سے پوچھا۔"نلکا کدھر ہے؟"

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔"باہر جاؤ۔ادھر بہت پانی ہے۔الٹے ہاتھ پر گھوڑا لوگ کے لیے ناد بنا ہے۔اس میں پانی ہی پانی ہے۔"

بانو فوراً باہر نکل گئی۔اور جب واپس آئی تو اس کا آدھا دوپٹا بھیگا ہوا تھا۔

ڈاکٹر سے اجازت لے کر وہ دونوں باہر نکلے۔بس اسٹاپ بہت دور تھا اور دھوپ کی تپش جسم کو چھید رہی تھی۔اشفاق احمد نے ڈاکٹر کی کلینک سے نکلتے ہوئے گتے کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا تھا جس کو وہ بچے کے چہرے پر سایہ کرنے کے لیے آگے کیے ہوئے تھے۔

وہ دونوں چلتے ہوئے تانگا اسٹینڈ تک پہنچے۔کئی تانگے درخت کی چھاؤں میں کھڑے تھے۔ایک تانگے پر بیٹھتے ہوئے تانگے والے سے کہا۔"گورنمنٹ کالج تک چلو۔"

بانو نے نظریں اٹھا کر اشفاق احمد کی طرف دیکھا جیسے پوچھنا چاہتی ہو کہ وہاں کیا ہے؟

اشفاق احمد نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور بچے کی طرف دیکھا۔انیق کے چہرے سے نقاہت عیاں تھی۔لیکن آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔وہ بڑی دلچسپی سے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔گھوڑا ہانپتا ہوا کالج کی طرف دوڑ رہا تھا۔

کالج کے گیٹ پر پہنچ کر تانگا رک گیا۔وہ دونوں تانگے سے اترے اور اشفاق احمد نے تانگے والے کے ہاتھ پر آٹھ آنے کا سکہ رکھ دیا۔پھر وہ بانو کو ساتھ لے کر کالج کی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگے۔

کالج بند تھا اس لیے پوری عمارت سنسان پڑی تھی۔وہ دونوں آگے بڑھتے ہوئے کالج کے چبوترے تک پہنچ گئے، سامنے ہی وہ کلاس روم تھا جس میں انہوں نے کئی سال گزارے تھے، بند دروازے کو دیکھ کر دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔درختوں کی وجہ سے وہاں کی فضا ٹھنڈی تھی۔گرم ہوا کا جھونکا بھی فرحت بخش لگ رہا تھا۔انیق کو بھی یہ فرحت بھرا ماحول پسند آیا تھا کیونکہ وہ بڑی دلچسپی سے بڑے بڑے درختوں کو ہلتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔بانو نے بچے کو گود سے اتار کر بٹھا دیا تھا۔وہ خود ہی کھڑا ہوا اور کچے فرش پر چلنے لگا تھا لیکن دو چار قدم کے بعد ہی وہ تھک کر بیٹھ گیا۔پھر ہمت کر کے کھڑا ہوا اور واپس بانو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کے پاس آگیا۔

اشفاق احمد اسے بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ بانو اور ان کے چہرے بھی کھل اٹھے تھے۔ وہ بانو کی طرف دیکھ کر بولے۔ "ابھی دھوپ میں خاصی تپش ہے اسی لیے میں ادھر آگیا۔ جب دھوپ ڈھل جائے گی تو ہم گھر کے لیے چلیں گے۔"

ابھی ان کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ چوکیدار آگیا۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا تھا۔ ان دونوں کو سیڑھیوں پر بیٹھا دیکھ اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔ اس نے استفسار کیا۔ "کون ہو تم لوگ؟"

"یہاں گرمی کی وجہ سے آگئے تھے۔ دھوپ ڈھلتے ہی چلے جائیں گے۔"

"نہیں نہیں یہاں بیٹھنا منع ہے۔" چوکیدار نیا تھا اس کا لہجہ بھی درشت تھا۔

"کس نے منع کیا ہے؟" اشفاق احمد نے پوچھا۔

"پرنسپل کا حکم ہے۔ اجنبی کو گیٹ کے اندر آنا منع ہے۔" چوکیدار کا لہجہ انتہائی ہتک آمیز تھا۔ اشفاق احمد جواب دینا چاہتے تھے کہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں چپ رہنے کو کہا اور بچے کو گود میں اٹھا کر باہر کی جانب بڑھنے لگی۔ اشفاق احمد بھی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے باہر آگئے۔

شام تک انیق کی طبیعت سنبھل گئی۔ وہ دونوں زندگی کی دیگر الجھنوں کو سلجھانے میں لگ گئے۔ وقت گزرتا رہا کہ منجھلا بیٹا انیس بیمار ہوگیا۔ بانو اسے لے کر سمن آباد کے ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچی۔ کسی جاننے والی نے ڈاکٹر کی بڑی تعریف کی تھی۔ بانو کو یہ بھی پتا نہ تھا کہ ڈاکٹر کی فیس کتنی ہے۔ اس نے چند نوٹ مٹھی میں لیے اور بیٹے کو گود میں اٹھا کر چل پڑی۔ جب وہ ڈاکٹر کے کلینک پر پہنچی تو ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی پر اکڑے بیٹھے تھے۔ خود کو یورپ کوالیفائیڈ ڈاکٹروں کی طرح پری اوکوپائیڈ نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بہت بند بند شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے سامنے والی کرسی پر بانو بیٹھ گئی۔ انیس کی ناک بند تھی، سانس ناک سے سیٹی کی طرح نکل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کچھ پوچھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ بانو نے بات کرنے کی غرض سے کہا۔ "میں اشفاق احمد کی بیوی ہوں۔"

اس بات کا اثر ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر بالکل نہیں ہوا۔ انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تو بانو بولی۔ "ممتاز مفتی اور شہاب صاحب کا نام تو آپ نے سنا ہوگا... قدرت اللہ شہاب، وہ میرے شوہر کے قریبی دوست ہیں۔"

اس بات پر بھی ڈاکٹر صاحب نے کوئی توجہ نہ دی تو وہ بولی۔ "میں بھی لکھتی ہوں، ریڈیو ڈرامے ناول کہانیاں۔"

ڈاکٹر نے پھر بھی توجہ نہ دی اور بچے کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔ "منہ کھولو۔"

ایسا لگ رہا تھا جیسے ماں کی بات کی سچائی وہ بچے کا منہ کھلوا کر دیکھنا چاہتے تھے۔ انیس نے منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "اور کھولو۔"

بچے نے اور کھول دیا۔ انہوں نے کہا۔ "اور کھولو۔" پھر کہا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

پھر بچے نے توتلی زبان میں کہا۔ "لالہ۔" بس اسی پر توقف نہ کیا۔ اس نے مزید دو چار ایسی گالیاں دیں جو خود بانو نے بھی سنی نہ تھیں۔ یہ کمال تھا پرویز اور افتخار کا۔ ماموں اور تایا نے نوکر نے جو کچھ سکھایا تھا وہ زبان سے ابل پڑا تھا۔ ہوتا یہ ہے کہ بعض لوگ بچے کی توتلی زبان سے گالیاں سن کر محظوظ ہوتے ہیں اور ننھے بچوں کو سکھاتے ہیں۔ وہی کچھ اس کے ساتھ ہوا تھا۔ بانو شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب الگ حیران۔ وہ نسخہ لکھنا تک بھول گئے تھے۔ اب انہیں یقین آگیا ہوگا کہ ادیب عورتوں کے ایسے ہی بچے ہوتے ہیں۔ بانو خفت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ شرمندگی سے گڑی جا رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ سر جھکائے دوا لے کر باہر نکلی اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ خفت کا احساس اسے چین لینے نہیں دے رہا تھا۔

ڈاکٹر کے ہاں سے آنے کے بعد بھی وہ خفت میں مبتلا رہی۔ اس نے پرویز وغیرہ کو خبردار کر دیا تھا کہ اب اگر انہوں نے کسی چھوٹے بچے کو ناشائستہ لفظ سکھائے تو وہ اس کا آخری دن ہوگا۔

وقت گزرتا رہا۔ گھر میں خوشحالی کا گزر بالکل بند ہو چکا تھا۔ زندگی دشواریوں میں گھرتی جا رہی تھی۔ مکان کا کرایہ تک ادا نہیں ہو پا رہا تھا۔ مکان مالک انہیں بار بار مکان خالی کرنے کو کہہ رہا تھا لیکن وہ مکان خالی کرتے تو کہاں جاتے اس لیے اسی مکان میں پڑے ہوئے تھے۔ مکان مالک نے ایک چال چلی۔ اس نے پانی کا ٹیکس بھرنا بند کر دیا تھا۔ واٹر ٹیکس ادا نہ کرنے پر وہ لائن مین آگئے۔ اشفاق صاحب کے چاہنے والے انہیں روکنے لگے لیکن وہ کسی کی سننے پر تیار نہ تھے۔ اتنے میں اشفاق صاحب آگئے۔ انہوں نے معاملہ

بھانپ لیا اور تلقین شاہ کے انداز میں بولے۔ ''کاٹ دو۔ ہاں فوراً کاٹ دو ورنہ کسی دن ہم چلو بھر پانی میں ڈوب مریں گے۔''

تلقین شاہ کی آواز سنی تو دونوں لائن مین چونک گئے۔ وہ بولے۔ ''آپ تلقین شاہ ہو۔'' پھر ہاتھ جھاڑ کر کھڑے ہو گئے کہ اب یہ نل کسی حال میں نہیں کٹے گا۔ پلے رقم نہ تھی مگر عزت خوب تھی۔ اسی میں وہ دونوں خوش تھے وقت تیزی سے گزر رہا تھا کہ اثیر میاں بھی دنیا میں آ گئے۔ اب بانو تین شہزادوں کی ماں تھی۔ اسی دوران ایک اور تبدیلی رونما ہوئی۔ سمن آباد کے 455 N سے وہ لوگ 479 N سمن آباد منتقل ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ گھر گھر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ کوئی گھر کسی کو اتنا راس آتا ہے کہ زندگی بدل جاتی ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس گھر میں منتقل ہوتے ہی ان لوگوں کے دن پھر گئے۔ خوشحالی نے گھر دیکھ لیا۔ اشفاق احمد ''لیل ونہار'' کے ایڈیٹر تو تھے ہی ریڈیو پاکستان سے بھی وابستگی ہو گئی تھی۔ ریڈیو پاکستان کے لیے وہ تلقین شاہ لکھنے لگے تھے۔ تلقین شاہ کا خیال کیسے آیا یہ بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ہوا یہ کہ ان دنوں وہ USIS پر وائس آف امریکا کے لیے پروگرام لکھا کرتے تھے۔ وہیں ان کی ملاقات مارلاک سے ہوئی جو اس پروگرام کا انچارج تھا۔ وہ اردو اتنی اچھی جانتا نہیں تھا مگر وہاں موجود دوسرے لوگوں کے چہروں سے وہ اندازہ کر چکا تھا کہ یہ پروگرام اچھا لکھتے ہیں۔ اس نے اشفاق احمد کو مشورہ دیا۔ ''اشفاق تم کوئی ایسا پروگرام کرو جو Love able ہو۔ دوسروں کو نصیحت کرے اور خود پر کوئی پابندی نہ لگائے۔ بس اشفاق احمد کے دماغ میں ایک آئیڈیا آ گیا جو تلقین شاہ کا روپ تھا۔ جب اسے ریڈیو پاکستان سے نشر کیا گیا تو دلچسپی کی حد پار کر گیا۔ لوگ اس کا انتظار کرنے لگتے کہ کب آن ائر ہو گا۔

21 اپریل 1959 کو لیل و نہار میں نوکری ملی تھی اور 1960 میں وہ گیلڈ کے سیکریٹری بنا دیے گئے۔ یعنی خوش قسمتی کا ستارہ اوج پر تھا۔ اسی دوران ایک اور بات ہوئی۔ بہت عجیب بات۔ بانو نے کہیں نوکری کے لیے درخواست نہیں دی تھی' کسی اور نے اس کا نام دے دیا ہو گا۔ ایک دن ڈاکیہ اس کے نام ایک خط لے کر آ گیا۔ اس نے لفافہ دیکھا تو حیران ہوئی۔ اندر خط دیکھنے کے لیے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے جو خط نکلا اسے دیکھ کر وہ اور زیادہ حیران ہو گئی۔ اس نے خط اشفاق احمد کو دکھایا۔ خط دیکھ کر وہ مسکرائے اور پھر بولے۔ ''ایک ہم ہیں کہ نوکری ڈھونڈتے ہیں اور ایک تم ہو کہ گھر بیٹھے نوکری مل رہی ہے۔''

اس دور میں ٹیچنگ اسٹاف کی بہت کمی تھی اسی لیے اتنی آسانی سے لاہور کالج فار ویمن سے آفر آ گئی تھی۔ اس نے اشفاق احمد سے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے؟ نوکری کر لوں؟''

وہ سر جھکائے کچھ سوچتے رہے پھر بولے۔ ''یہ بتاؤ' وہاں سے تنخواہ کیا ملے گی؟''

بانو نے جواب دیا۔ ''یہی کوئی ڈھائی تین سو روپے۔''

''یہ بتاؤ' یہاں سے آنے جانے کے لیے اکیلا تانگا لینا پڑے گا۔ اس پر کتنا خرچ آئے گا۔ یہی کوئی ستر پچھتر روپے؟''

بانو نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہاں گھر میں تو جیسے تیسے کپڑے پہن کر وقت گزار لیتی ہو لیکن کالج میں تو ایسے کپڑے چلیں گے نہیں۔ اور اثیر خان ابھی چھوٹا ہے۔ اس کے لیے کسی ماما کا انتظام کرنا ہو گا۔ اس پر کیا خرچ آئے گا؟ یہی کوئی پچاس ساٹھ روپے۔''

اشفاق احمد کی باتوں نے اس کے غبارے کی ہوا نکال دی۔ اس نے آفر ٹھکرا دی۔ وقت مزید کچھ آگے سرکا تھا کہ ایک اور آفر آ گئی۔ یہ آفر شہاب صاحب خود لے کر آئے تھے۔ باتوں کے درمیان بولے۔ ''یہ تمہارے قریب ہی شاکر علی میوزیم بن رہا ہے۔ اس کے لیے ہمیں ایک ڈائریکٹر کی ضرورت ہے۔ اگر تم راضی ہو جاؤ تو میں بڑی آسانی سے یہ نوکری دلوا سکتا ہوں تمہیں گاڑی مع ڈرائیور بھی ملے گا، اچھی تنخواہ بھی ہو گی۔ دو نوکر گھر کے کام کے لیے بھی سرکاری خرچ پر مل جائیں گے۔''

اس بات نے بانو کے دل میں چھپی اس حسرت کو کہ اپنا آپ منواؤں پھر سے جاگ اٹھی۔ اس نے اشفاق احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ سن رہے ہیں نا' شہاب بھائی کیا کہہ رہے ہیں؟''

اشفاق احمد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بالکل سن لیا لیکن اس کا فیصلہ تو خود تمہیں کرنا ہو گا۔ جہاں تک میرا مشورہ ہے تو سوچ کر دیکھو اب ہمارے پاس پیسوں کی تنگی ترشی نہیں ہے۔ گھر میں ایک پرانی سی گاڑی بھی ہے۔ پرسنل گاڑی کی ضرورت ان کو ہوتی ہے جو سوشل ایکٹیویٹی میں رہتے ہوں۔ دو نوکر پہلے سے موجود ہیں۔''

بانو نے ایک بار پھر انکار کر دیا۔ نوکری نہ کرنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا مگر خوشی اشفاق احمد کے چہرے پر تھی۔ انکار کرتے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

ہوئے بھی وہ کچھ دکھی سی تھی کہ اس کے فیصلے پر کسی نے تعریف نہیں کی تھی۔ وہ اہمیت کی حامل ہے یہ کسی نے سراہا نہیں تھا۔ اس کے بعد بھی ایک اور موقع پر اسے خفیف ہونا پڑا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ ادیبوں کا ایک وفد گلڈ کی جانب سے مشرقی پاکستان بھیجا جارہا تھا۔ بانو کی ادبی یہاں بھی کوئی معجزہ دکھا نہ پائی۔ کسی نے اسے پوچھا بھی نہیں۔ جب کہ اسے سندر بن کے ہاتھی۔ شیلا پھول، بازاروں میں بکتے کچے ناریل اور اسی طرح لمبے لمبے بالوں والی لڑکیاں۔ سانولی سلونی سی لڑکیاں۔ انہیں دیکھنے کا اسے کتنا ارمان تھا لیکن اسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ وہ خود کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگی تھی۔ اپنے خوابوں میں ڈوب کر وہ یہ بھی بھول گئی تھی کہ وہ نہیں گئی تو کیا ہوا۔ اشفاق احمد تو اس وفد میں شامل ہیں اور انہیں گئے ہوئے کئی روز ہو چکے ہیں۔

ابھی وہ اسی بارے میں سوچ رہی تھی کہ شہاب آ گئے۔ قدرت اللہ شہاب کو دیکھ کر وہ کچھ انمنا سی گئی۔ شہاب صاحب بھی اس کے زخموں کو کریدنے آئے تھے۔ آتے ہی بولے۔ ”اشفاق کو کرشن چوڑا سے عشق ہو گیا ہے۔“

عشق ہو گیا ہے یہ سنتے ہی وہ چونک گئی۔ کرشن چوڑا؟ وہ سمجھ نہ پائی تھی کہ وہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ شہاب صاحب نے مزید کہا۔ ”اب وہ شاید ہی کرشن چوڑا کو چھوڑ کر آئے۔“

کسی بیوی کو یہ کب اچھا لگتا ہے کہ اس کا شوہر کسی کے عشق میں ڈوب کر گھر آنا بھول جائے۔ بانو کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ”کرشن چوڑا کیسی ہے؟“

”ارے کرشن چوڑا ایک پیڑ ہوتا ہے جس پر کاسنی اور نارنجی پھول لگتے ہیں۔ گچھوں کی شکل میں۔“ شہاب صاحب بولے تو اس کا دل اپنے مقام پر آیا۔ ”اور وہ اشفاق اور اعجاز بٹالوی کیلوں کا پورا پورا لنگر کھا جاتے ہیں۔“

بانو ہونق بنی ان کا منہ دیکھ رہی تھی۔ شہاب صاحب پھر بولے۔ ”دوپہر کے کھانے کے بعد وہ لوگ ڈاب پیتے ہیں۔ دو دو ڈاب فی کس۔“

”یہ ڈاب کیا ہوتا ہے؟“

”کچے ناریل کا پانی.. اسے ہی ڈاب کہا جاتا ہے۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کچا ناریل کیسے پیا جاتا ہے۔ شہاب صاحب بولے۔ ”اور رات کو وہ لوگ دو نہ بھر بھر کر سوندیش کھاتے ہیں اور کنبل کھاتے ہیں۔ آپ تو گئی نہیں ورنہ یہ سارا مزہ آپ کے حصے میں بھی آتا۔“

اب وہ کیسے کہتی کہ وہ کیوں نہیں گئی۔ شہاب صاحب کو احساس ہو گیا کہ مذاق میں وہ بہت دور نکل آئے ہیں اس لیے چپ ہو گئے مگر اس کی بھرپائی بھی انہوں نے ہی کی۔ 1968 میں انتظام کر دیا۔

ان دنوں وہ لوگ سمن آباد سے ماڈل ٹاؤن منتقل ہو چکے تھے۔ شام کے وقت ماڈل ٹاؤن کی سڑکیں ویران ہو جاتی تھیں۔ افضال چٹھہ، ریاض محمود اور عارف ان سے ملنے اسکوٹر پر لد کر آ جاتے۔ ان دنوں فلمی جگت کی برادری بھی اپنی کسم پرسی بھلا کر مالداروں کی طرح منہ میں پائپ دبا کر چلنا چاہتی تھی۔ انہیں شکایت تھی کہ وہ اتنے سالوں سے انٹرٹین کر رہے ہیں لیکن اداکاروں کو عزت و مقام کوئی نہیں دیتا۔ ایک دن وہ لوگ آئے تو جوش و خروش سے بھرے ہوئے تھے۔ آتے ہی بولے۔ ”آپا کل شہاب صاحب کے پاس ہمارا وفد جائے گا۔ شہاب صاحب اشفاق صاحب کے گرو ہیں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“

دوسری صبح کچھ لوگ شہاب صاحب سے ملے۔ قدرت اللہ شہاب بھائی نے ان کی باتیں بغور سنی اور اسلام آباد چلے گئے۔ وہ سب پُرامید تھے کہ بانو کے نام ایک سرکاری چٹھی آ گئی اس پر شہاب بھائی کے دستخط تھے۔ انہیں کسی میٹنگ میں

غرقِ محبت

”کب تک مجھ کو بھولو گے!“

چاہتوں کا بھیدوں بھرا یہ سوال اسے حال سے بے حال کیے ہوئے تھا۔ اس نے محبوب کی آہٹوں پر کان اور راہوں میں پلکیں بچھائے زندگی تمام کر دی مگر..... فاصلوں میں کمی نہ آئی۔ ابھی تو زندگی کی تلاش جاری تھی کہ اچانک اس انداز میں رقصِ اجل شروع ہوا کہ وہ چاہتوں کے مدفن پر حسرتوں کے پھول چڑھانے پر مجبور ہو گیا۔

جون 2017ء کے شمارے میں سسپنس

کے آخری صفحات پر جادوئی انداز لیے.....

محبوب قلمکار **طاہر جاوید مغل** کی چونکا

دینے والی سحر انگیز طویل داستان۔ آپ کی توجہ کی منتظر

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

شرکت کرنے کا کہا گیا تھا۔ اشفاق احمد کے ساتھ بانو اسلام آباد جا پہنچی۔ شہاب بھائی کے ساتھ ایل شیپ کے برآمدے میں مسعود کھدر پوش اور اشفاق علی خان بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ شہاب بھائی نے بانو سے کہا۔ ”کل فنکاروں سے ایک خصوصی میٹنگ ہے۔ فنکاروں کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ اس کے صدر فیض احمد فیض ہوں گے۔ اس میٹنگ میں تمہیں بھی شرکت کرنی ہے۔“

اگلے دن جب بانو میٹنگ ہال میں پہنچی تو حیران رہ گئی۔ اس لیے کہ وہاں بڑی بڑی ہستیاں بیٹھی تھیں۔ فیض صاحب تھے۔ جمیل الدین عالی تھے۔

اسٹینڈنگ کمیٹی آرٹ اینڈ کلچر کی تشکیل دی گئی۔ مشرقی پاکستان کے ممبران منتخب ہوئے۔ مغربی پاکستان کی طرف سے جمیل الدین عالی منتخب ہوئے۔ صدر فیض احمد فیض تھے، رکن کے نام منتخب ہونے لگے تو شہاب صاحب نے کہا۔ ”میں بانو قدسیہ کا نام تجویز کرتا ہوں۔“

بانو نے فیض صاحب سے پوچھا۔ ”ہم کریں گے کیا؟“

”مختلف جگہ جا کر وہاں کے فنکاروں کے مسائل سنیں گے اور ان مسائل کو حل کرنے کے لیے حکومت کو تجویز دیں گے۔“

شہاب صاحب نے کہا۔ ”تمہیں ڈھاکا دیکھنے کا شوق ہے نا۔ تم وہاں جا کر سیر سپاٹے کرنا باقی سارا کام فیض صاحب کرلیں گے۔“

اس طرح شہاب صاحب نے اپنی بات سچ کر دکھائی۔ بانو کو ملک بھر میں گھومنے کا موقع فراہم کر دیا۔

وقت گزرتا رہا اپنے نشان چھوڑتا رہا۔ یہ 1967 کی بات ہے۔ قدرت اللہ شہاب نے ایک ہی جھٹکے میں اشفاق صاحب کو مرکزی اردو بورڈ میں ڈائریکٹر بنا دیا۔ وہ بیسویں گریڈ میں آگئے تھے۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ سفارش پر آئے ہیں لیکن جب کام شروع ہوا تو پتا چلا کہ یہ عہدہ انہی کے لیے تھا۔ کام کرنے کا یہ عالم تھا کہ نہ وہ دن دیکھتے نہ رات۔ قلم ہے کہ چلا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا کہ کام کے علاوہ انہیں کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ وہ نہ صرف خود کام کرتے‘ دوسروں کو بھی کام میں جتا دیکھنا چاہتے۔ دفتر کا یہ عالم تھا کہ باہر سے کوئی آجاتا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگتا کیونکہ کمرے میں ایک خاموشی سی چھائی رہتی۔ سب کے سر جھکے ہوئے۔ سب کے سب کام میں مشغول، ایسا لگتا جیسے یہ لوگ صرف کام کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ وہ خود بھی کام میں مشغول رہتے۔ جہاں کوئی خالی بیٹھا نظر آتا۔ وہ اس سے ضرور پوچھتے کہ جو کام اس کے ذمّے ہے وہ پورا ہوا یا نہیں؟ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک صاحب کے مہمان آگئے۔ وہ ان کی سامنے والی کرسی پر بیٹھے مگر ان صاحب سے باتیں کرنے میں ڈر رہے تھے کیونکہ بار بار اشفاق صاحب کمرے میں آجاتے تھے۔ وہ صاحب اس ڈر سے کچھ بول نہیں پا رہے تھے کہ کہیں اشفاق صاحب ٹوک نہ دیں۔ مہمان الگ پریشان۔ وہ صاحب بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے کہ چھٹی کا ٹائم ہو تو وہ مہمان کو چائے پلانے لے جائیں۔ ادھر چھٹی کا ٹائم ہوا اور وہ صاحب اٹھنے والے تھے کہ اشفاق صاحب اپنے ہاتھوں میں بسکٹ کی پلیٹ لیے حاضر ہوئے اور مہمان کے سامنے رکھتے ہوئے بولے۔ ”معاف کیجیے گا یہاں آنے والا وزیٹر دفتر کا مہمان ہوتا ہے۔ آپ جب آئے تو دفتر کا وقت تھا اس لیے آپ کو چائے پلا نہ سکے۔ لیجیے آپ بسکٹ کھائیں‘ چائے آرہی ہے۔“

اس انداز میں کام کرنا کہ وقت برباد نہ ہو ایک فن ہے۔ اور وہ اس کام میں ماہر تھے۔ ادارے کا ایک ایک لمحہ بچاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور میں جتنی کتابیں بورڈ نے پیش کیں اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہی کچھ اشفاق صاحب کے ڈرامے میں بھی نظر آتا ہے۔ ننگے پاؤں ہو یا منچلے کا سودا‘ توتا کہانی ہو یا ایک محبت سو افسانے تقریباً ہر ڈرامے کا ہر سطر چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ اس پر محنت ہوئی ہے۔ وہ محنت کرتے تھے اور خوب کرتے تھے لیکن سیاسی رنجش نے یہ دن بھی دکھا دیے کہ ان کی محنت پر مٹی ڈال دیا گیا۔

1967 سے 2 جون 1981 تک وہ جس اردو بورڈ کو بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہے تھے وہاں سے انہیں ہٹا دیا گیا اور وجہ شاید تلقین شاہ کا پروگرام بنا تھا۔ سیاست کی بازی گری نے ایک ادیب پر کاری وار کیا تھا مگر وہ سہہ گئے۔ لیکن اوپر سے بھلے ہی کچھ دکھائی نہ دے مگر اندر ایک ٹوٹ پھوٹ سی مچ گئی تھی۔ وہ اس زیادتی کا جواب دے سکتے تھے۔ عوام ان کے ساتھ ہو جاتی لیکن انہوں نے ایسا کچھ نہ کیا۔ اپنا درد سینے سے لگائے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ اب وہ زیادہ وقت گھر میں گزارتے تھے۔ ہمہ وقت گھر میں ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔ داستان سرائے کا دروازہ کبھی بند نہیں رہتا تھا۔ جب جس کا دل چاہتا وہ گھر کے اندر آجاتا۔

اس دن اشفاق صاحب کسی دوست سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ بانو ہاتھ میں جھاڑن تھامے فرنیچر سے گرد دور کر رہی تھی کہ ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے انہوں نے پہلے کبھی دیکھا نہ تھا پھر بھی خندہ پیشانی سے اسے صوفے کی

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جانب اشارہ کرتے ہوئے بیٹھنے کو کہا۔

لڑکی نے خوب شوخ رنگ کی سرخ پتلون اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس دور میں کسی لڑکی کا' پاکستانی لڑکی کا ایسا لباس پہننا عجیب سی بات تھی۔ کیونکہ دوپٹے کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا۔ ''میں حنا بابر علی ہوں اور ann Arbor میں پڑھتی ہوں۔''

بانو نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے ہاتھ سے جھاڑن رکھا اور پھر پوچھا۔ ''یہ کالج ہے کہاں؟''

''امریکا کی ایک ریاست ہے Seatle وہاں یہ کالج ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے ایک کہانی نکال کر بانو کے سامنے دھری میز پر رکھ دی۔ عنوان تھا the heed seeker اس نے کہانی رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کی ایک کہانی ''توجہ کی طالب'' پڑھی تھی۔ اس کا ترجمہ کیا۔ میرے پروفیسر نے بھی اسے اپروو کر دیا لیکن جب تک آپ کی منظوری نہیں ملے گی میں اسے سب مٹ نہیں کر سکتی۔''

بانو نے اس کہانی پر دستخط کر دیے۔ یہی دوستی کی ابتدا بنی۔ اب وہ شوخ لڑکی روزانہ آنے لگی۔ آتے ہی بانو کو جو کام کرتے دیکھتی اسے روک دیتی۔ بانو کی عادت نہیں تھی کہ وہ کسی کو کریدے کہ تم کون ہو کہاں رہتی ہو۔ یہ تو اسے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ وہ بھی تب جب بانو سے اس کی ماں پروین بابر علی کی ملاقات ہوئی۔ تب اسے معلوم ہوا کہ وہ معروف صنعت کار سید بابر علی کی بیٹی ہے اور روز پیپل (ٹشو پیپر) ان کی کمپنی میں تیار ہوتا ہے۔

حنا بابر علی اب اس گھر کی فرد جیسی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ماں باپ چاہ رہے تھے کہ اس کی شادی انیس نامی لڑکے سے کرادی جائے جو ایک بڑے گھر سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہو رہی تھی۔ اس بات پر اس کے گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا کہ ایک دن پروین کا فون آیا کہ آپا جلد آیئے۔ حنا پستول لے کر کمرے میں بند ہوگئی ہے۔

بانو بھاگم بھاگ ان کے گھر پہنچی۔ ماں نے حنا کا کمرا دکھا دیا جو بند تھا۔ بانو نے انہیں اشارے سے دور ہٹ جانے کا کہا اور پھر اس کمرے کے دروازے کو بجایا۔ اندر سے حنا نے جواب دیا۔ ''اب یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔''

بانو نے کہا۔ ''یہ میں ہوں۔ دروازہ کھولو۔''

حنا نے اندر سے پوچھا کہ اور کون ہے۔ جواب میں بانو نے کہا کوئی نہیں۔ دروازہ کھول دو۔ لڑکی نے دروازہ کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بانو کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور دروازہ پھر

بعض محققین سینما کی ایجاد کے ابتدائی سلسلے کو سیام، چین، جاپان اور ہندوستان میں دکھائے جانے والے چھایا ناٹکوں سے وابستہ کرتے ہیں لیکن انہیں زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ ہاں مشہور جرمن ریاضی داں اتھاناسیس کرچر نے روم میں اپنی سیربین (Magic Lantern) کے ذریعے ہاتھ سے بنائی کچھ تصاویر پردے پر دکھائی تھیں جنہیں سینما کی ایجاد کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے لیکن اس کے بعد لگ بھگ دو سو برس تک اس طرح کی کوشش یا تجربے کے آثار نہیں ملتے۔ جس سے یہ کہا جا سکے کہ سینما کی ایجاد کے سلسلے میں مسلسل کوشش جاری رہی۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ سینما کی ایجاد کی کوششوں کا حقیقی سلسلہ انیسویں صدی کے ابتدائی دور سے شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں 24 دسمبر 1824ء کو شہرہ آفاق تصنیف Thesaurus کے مصنف پیٹر مارک روجٹ متحرک تصاویر سے متعلق لندن کی رائل سوسائٹی میں پڑھا گیا مقالہ The Perststance of vision with regard to Moving object بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اس کے کچھ عرصے بعد ایک سائنسداں جان ہرشل نے لکڑی کا ایک چھوٹا کھلونا بنایا جسے متحرک تصویروں کی ایجاد کے سلسلے کی ایک کڑی کہا جا سکتا ہے۔ ہرشل نے موٹے کاغذ کے ایک گول ٹکڑے پر ایک طرف ایک پرندے اور دوسری طرف ایک پنجرے کی تصویر بنائی تھی اور دونوں سروں پر ایک دھاگا باندھ دیا تھا جب اس گول ٹکڑے کو تیزی سے گھمایا جاتا تھا تو دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ پرندہ پنجرے میں قید ہے حالانکہ ایسا محسوس ہونے کی وجہ یہ تھی کہ تیزی سے گھومنے کی وجہ سے پرندے پر نظر ٹکنے سے پیشتر ہی آنکھوں کے سامنے پنجرہ آ جاتا تھا۔ ہرشل کے علاوہ ہنری فٹن اور ڈاکٹر مائیکل فیریڈے نے بھی متحرک تصاویر سے متعلق تحقیق میں نمایاں حصہ لیا۔

مرسلہ: زاہد علی زاہد۔ کراچی

سے بند کر دیا۔

بانو نے پوچھا۔ ''تم کسی کو پسند کرتی ہو؟''

اس نے جواب دیا۔ ''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ صرف میرا مطالبہ ہے کہ میں ابھی شادی نہیں کروں گی۔''

بانو اسے بڑی دیر تک سمجھاتی رہی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شادی پر راضی ہو گئی۔ اس قسم کے کام کرنے میں بانو بہت آگے تھی۔ یہی نہیں جب وہ اشفاق صاحب کی بیماری میں ان کی تیمارداری تو ایسا لگتا تھا کہ اسے اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔

چھوٹی موٹی بیماری نے اشفاق صاحب پر کئی بار حملے کیے جسے انہوں نے پسپا کر دیا لیکن جب پتے میں درد شروع ہوا تو گھر والے بھی پریشان ہو گئے۔ نزدیکی ڈاکٹر سے مشورہ لیا گیا۔ اس نے بتایا کہ اب آپریشن کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔ انہیں اسپتال لے جانا پڑے گا۔

سب سر جوڑ کر بیٹھے اور انہیں اسپتال پہنچا دیا گیا۔ آپریشن کے درمیان پتا چلا کے لبلبہ پر زخم ہے جو بڑھ رہا ہے۔ ڈاکٹر نے منجھلے صاحب زادے کو بلا کر بتایا کہ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ ایک قسم کا کینسر ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان بہت کم فاصلہ رہ گیا ہے۔

بیٹے نے کہا۔ ''ابو کو علم ہے؟''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''ابھی بتایا تو نہیں ہے لیکن ان جیسے ذہین شخص سے بعید نہیں کہ وہ سب کچھ سمجھ گئے ہوں۔''

یہ حقیقت تھی کہ وہ جان گئے تھے کہ انہیں کینسر نے گھیر لیا ہے لیکن اپنی زبان سے کبھی کچھ نہ کہا۔ انہوں نے ''دھوپ سائے'' جیسی فلم بنائی تھی تو اس لیے کہ عام آدمی کو احساس ہو سکے کہ وہ حالات کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہے۔ دوسروں کو حوصلہ کی تلقین کرنے والا خود کیسے حوصلہ ہار جاتا۔ بڑے حوصلے کے ساتھ وہ دھیرے دھیرے موت کی طرف بڑھتے رہے۔

☆☆☆

اس آخری ایام کے بارے میں بانو لکھتی ہیں۔ ''خاں صاحب کی بیماری نے کمر توڑ دی تھی اور میں نفسیاتی، قلبی، ذہنی طور پر تتر بتر ہو رہی تھی۔ اپنے ساتھی سے بچھڑ جانے کا خوف دامن گیر تھا۔ چھ ستمبر کی رات عجب بے کلی کی تھی۔ خان صاحب کی نبض کبھی ڈوبتی اور کبھی ابھرتی تھی۔ سرخ و سفید چہرہ جس تکیہ پر دھرا تھا اسی کی مانند سفید ہو رہا تھا۔ بازوؤں کا گوشت جھالر کی طرح لٹک گیا تھا۔ درد مسلسل چھاپے مار رہا تھا۔ وہ آواز دیتے۔ میں اٹھ کر جاتی تو وہ کہتے۔ ''میں نے تمہیں بہت ستا رکھا ہے۔ جاؤ سو جاؤ اب میں بلاؤں بھی تو نہ آنا۔''

درد اتنا زیادہ تھا جو چہرے سے مترشح تھا اور وہ کمال ضبط کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ روئیں چلائیں۔ ''درد کا اظہار کریں مگر وہ زبان سے کچھ بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ رات قطرہ قطرہ گزر رہی تھی۔ کمرے میں لگا بلب یرقان زدہ روشنی پھیلا رہا تھا۔ کتابوں سے لدی الماری جامد تھی، باسی اور پرانے کاغذوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ پتا نہیں کیوں آنکھوں کو دھوکا ہو رہا تھا کہ تمام کی تمام خاکستری کتابیں زرد رنگ کی ہو گئی ہیں اور ان پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ کتابوں کے عنوانات جو خان صاحب کی لکھائی میں تھے وہ پڑھے نہ جا رہے تھے۔

ابھرنے والی صبح بچھڑنے والی رات سے گلے مل رہی تھی۔ قریباً چار بجے انہوں نے مجھے بلایا۔ ''سنو انیس خان کو فون کر دو، وہ آ جائے۔''

میں نے پُرامید ہونے کے انداز میں غلط جواب دیا۔ ''آپ فکر نہ کریں، صبح ہونے والی ہے۔ وہ خوامخواہ پریشان ہو جائے گا۔''

چھ بجے کے قریب انہوں نے آواز دی۔ ''بانو سو گئیں؟''

میں جان بوجھ کر آنکھیں ملتی ہوئی اٹھی کہ وہ سمجھیں میں سو رہی ہوں۔ میں نے پوچھا۔ ''جی خان صاحب۔''

''یہ ذرا میری نبض دیکھنا۔'' کہہ کر انہوں نے ہاتھ آگے کر دیا۔

وہ بُدھا روپی چہرہ لیے لیٹے تھے۔ چہرے پر رتی بھر پریشانی نہ تھی۔ گرہ نیم باز کا قرض چکانے کے بعد اطمینان کی صورت تھی۔

میں نے نبض محسوس کرنے کی کوشش کی۔ پھر میں نے موبائل پر ڈاکٹر آصف کا نمبر ملایا اور اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری پریشانی بھری آواز سنیں۔

کال ملتے ہی میں نے کہا۔ ''پلیز آصف آپ چلے آئیں۔ خاں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ نبض بہت آہستہ چل رہی ہے اور.....''

''آپ فوراً ڈرپ لگوائیں۔''

''اچھا جی..... آپ آ جاتے اگر تو تسلی ہو جاتی۔''

''میں ضرور آ جاتا لیکن اس وقت میں ایئرپورٹ جا رہا ہوں۔''

میں واپس کمرے میں آ گئی۔

''آصف کو بلایا؟'' اشفاق احمد کی آواز میں کوئی جھگڑا نہ تھا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''وہ ایئرپورٹ جارہے ہیں..... اسلام آباد..... میں اشیر بیٹے کو جگالاؤں؟''

''ناں ناں..... وہ رات ایک بجے تک بیٹھا رہا ہے۔ بینکر کی نیند خراب نہیں ہونی چاہیے۔ بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔''

''انیس کو فون کروں؟''

''ناں ناں..... تم بھی سو جاؤ۔ اب میں ٹھیک ہوں۔''

اشفاق احمد نے مسکرانے کی کوشش میں ہونٹ ٹیڑھے کر لیے۔

میں ڈاکٹر عاطف گوہیر کو فون ملانے میں مصروف ہو گئی۔ سائرہ اسپتال والے ڈاکٹر گوہیر۔ وہ غالباً موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔ فوراً کال ریسیو کی۔

''ڈاکٹر صاحب! خاں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''ابھی ڈرپ لگائیں گے ٹھیک ہو جائے گی۔'' ڈاکٹر کی آواز نے حوصلہ دیا اور میں بہت حد تک پُرسکون ہو گئی۔

ابھی میں سوچ بھی نہ پائی تھی کہ کیا کرنا چاہیے۔ کیا ہونا درکار ہے کہ ڈاکٹر گوہیر آن پہنچے۔ یوں لگا تھا گویا وہ پہلے سے اسپتال کی ایمبولینس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے خاں صاحب کو دیکھا پھر کہا۔ ''انجکشن ضروری ہے میں ابھی لے کر آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ بمشکل دس منٹ میں واپس آ گئے۔

اس وقت اشیر خاں بینک کے لیے تیار ہو کر آ گئے۔

''میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں ابو۔'' پھر اس نے ڈاکٹر عاطف گوہیر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''شکریہ کہ آپ اتنے سویرے پہنچ گئے۔''

''بانو آپا کا فون آیا تو میں کیسے نہ آتا۔ صبح سات بج کر پچیس منٹ پر بانو آپا کی مخصوص سکون آمیز آواز فون پر سنائی دی تھی کہ ڈاکٹر صاحب تکلیف کی معافی، خاں صاحب کی طبیعت چار بجے سے کچھ ٹھیک نہیں۔ ٹھنڈے پسینے آ رہے ہیں اور کسی کروٹ آرام نہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''میں نے پچھلے چھ ماہ کے اس کٹھن امتحان سے گزرتے ہوئے کم ہی کبھی بانو آپا کو پریشان دیکھا تھا۔ شفقت و ممتا کی اس بارعب دیوی کو جو سفید لباس اور سفید کھلے دوپٹے میں اپنے آپ کو لپیٹے رکھتی، جب خاں صاحب کے بارے میں زیادہ تشویش ہوتی تو وہ پنجابی کی بجائے اردو میں اس کا اظہار کرتیں۔ اسی لیے اردو سن کر میرا دل ایک ہارٹ بیٹ مس کر گیا۔'' یہ کہہ کر وہ سوچنے لگا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔ اس وقت خیال آیا تھا کہ اشفاق احمد صاحب جو پچھلے تقریباً چھ ماہ سے انتہائی تکلیف دہ حالات کا مقابلہ مرحلہ

یمن کی مختصر تاریخ

یمن جسے جنوبی عرب بھی کہا جاتا ہے چھ بہت قدیم اور مختلف سلطنتوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے جو کبھی ایک دوسرے کے حلیف اور کبھی حریف رہی ہیں، اس میں مینائی (معین) قحطان، حضرموت، اوسان، سبا (Sheba) اور حمیری تہذیبیں شامل ہیں۔ مینائی دور میں مینائی زبان بولی جاتی تھی جو 100 قبل مسیح میں مردہ ہو گئی۔ سلطنت قحطان کا دارالحکومت تیماء تھا اور یہ آل ''عم'' کہلاتے تھے کیونکہ یہ ''عم'' خدا کی پرستش کرتے تھے، اسلام یہاں 630 میں آیا پھر یہ اسلامی تہذیب کا حصہ بن گیا۔ سبا کی مشہور سلطنت کا ذکر قرآن کی سورہ سبا اور نمل میں ہے یہ سورج کی پرستش کرتے تھے۔ سبا موجودہ صنعاء کے قریب عظیم شہر اور سلطنت کا نام بھی سبا تھا۔ ملکہ سبا بلقیس اس پر حکمران تھی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ پر ایمان لائی تھی۔ یمن کئی انبیاء کی قبور کا امین ہے جن میں نوح، ایوب، ہود، صالح اور شعیب علیہ السلام شامل ہیں۔

موجودہ یمن ان دنوں آپسی ٹکراؤ کا شکار ہے۔ اس سورش کی ابتداء 1962 سے ہوئی تھی۔ 1990ء سے قبل یمن دو حصوں میں منقسم تھا، شمالی یمن میں امامت قائم تھی جو 1897ء میں زیدی شیعہ کے امام یحییٰ الی الحق نے قائم کی تھی جس کا تختہ 26 ستمبر 1962ء کے انقلاب نے الٹ دیا اور یہ یمن عرب ری پبلک بن گیا۔ (یاد رہے کہ زیدی شیعہ یمن کے علاوہ کسی اور ملک میں نہیں ہیں) جنوبی یمن پر برطانیہ قابض تھا۔ یمنیوں نے 1967ء میں برطانوی غلامی سے آزادی حاصل کر لی اور یہ پیپلز ڈیموکریٹک ریپبلک آف یمن کہلایا 1990 (PDRY)ء میں دونوں یمن اکٹھے ہو گئے اور یہ جمہوریہ یمن کہلایا لیکن ان دنوں پورا یمن سورش سے گھرا ہوا ہے۔

مرسلہ: ڈاکٹر سید خالد محمود ترمذی

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

وار احسن طریق پر کر رہے تھے۔ شاید آج اس دنیا میں اپنا آخری فرض بھی عالمانہ تحمل اور صوفیانہ دلیری سے سرانجام دینے لگے ہیں۔" ڈاکٹر نے پھر توقف کیا اور بولا۔ "آغا جی کا قول ہے کہ دل میں جو پہلا خیال آتا ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔ میں نے اس سوچ کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر اللہ سبحانہ تعالیٰ سے دعا کی ہے کہ وہ اشفاق صاحب کو آسانیاں عطا فرمائے۔"

"بانو آپا سے فون پر بات کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہوگا کہ خود چل کر اشفاق صاحب کی مزاج پرسی کر آؤں۔ پھر خیال آیا کہ بیگم کو بھی ساتھ لے چلوں کہ اگر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو وہ بانو آپا کا ساتھ دے گی۔

سائرہ اسپتال فون کر کے میں نے ایمبولینس منگوالی اور خود درد کا ٹیکہ لینے داستان سرائے سے نکلا۔ میری غیر موجودگی میں اشفاق صاحب نے میری بیگم سے کہا۔ "آج ڈاکٹر صاحب کو پتا نہیں کیوں اتنی جلدی پڑ گئی ہے۔ آرام سے ناشتا کر کے نہا دھو کے اسپتال چلتے۔"

میں ٹیکہ بھی لے آیا۔ انہوں نے بازو خود میری طرف بڑھایا۔

ٹیکہ لگنے کے بعد ان کے دونوں خدمت گزاروں نے انہیں ایک مضبوط کرسی پر بٹھایا اور ایمبولینس کے عملے کے ساتھ ان کو اٹھا کر باہر پورچ میں لے آئے۔ ایمبولینس کچھ تو ویسے ہی اونچی تھی اور کچھ اس کی سیٹیں بھی اونچی تھیں۔ اشفاق صاحب کا اس میں بیٹھنا دشوار تھا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر کی گاڑی کھڑی تھی۔ گوہیر نے ان سے کہا اس میں چلے چلتے ہیں۔

اگلی سیٹ پر بمشکل اشفاق صاحب کو دراز کیا۔ اب اشفاق صاحب بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ ریاض نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر انہیں سہارا دیا۔ پھر بانو آپا نے ریاض کو چند ضروری ہدایات دیں اور اس کی جگہ خاں صاحب کو پیچھے سے تھام لیا۔ داستان سرائے سے ہم ماڈل ٹاؤن کی رنگ روڈ پر نکلے تو اشفاق صاحب کا سر کچھ دائیں جانب کو ہو گیا۔

اسپتال تک کا سفر ہم نے ایسے طے کیا کہ میں نے ان کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے بازو پر ان کو لٹائے رکھا اور بانو آپا نے بایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے گال سے لگائے رکھا۔ جب ہم رنگ روڈ سے سائرہ اسپتال کی طرف مڑے تو اشفاق صاحب کا بایاں ہاتھ آپا کے گالوں سے کچھ نیچے کھسک گیا اور آپا کو گمان گزرا کہ آخری سفر ہو چکا ہے۔

ساڑھے آٹھ سے تھوڑا اوپر ہم لوگ سائرہ اسپتال پہنچے۔ اشفاق صاحب کو بمشکل ویل چیئر پر بٹھایا اور اندر پہنچا دیا۔ بانو آپا ساتھ ساتھ تھیں۔ ڈاکٹر نے ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے آفس میں تشریف رکھیں۔ پھر ڈاکٹر نے اشفاق صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ بے جان خاموش اور ساکت تھے۔ میرے التماس پر انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور آپا کو اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کہتے ہوئے میری بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اس دوران ڈاکٹر فواد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے ای سی جی کی اسکرین پر ایک سیدھی لکیر کی طرف اشارہ کیا جو سندیسہ دے رہی تھی کہ طالب نے مطلوب کو پالیا ہے اور اس کی طلب تمام ہو چکی ہے۔ اشفاق صاحب کے چہرے پر سکون و اطمینان تھا جیسے محبوب کے پہلو میں بنا خوف رقیباں عاشق دراز ہو۔ کوئی شک چہرے پر نہ تھی۔ اطمینان بخش موت اللہ کے ولی کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسے جیسے وہ اس اٹل تجربے سے لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

سات ستمبر 2004 کو وہ دنیا کی ہماہمی سے منہ موڑ گئے۔ بانو پر ایسا اثر ہوا کہ وہ سائبان چھن جانے پر سکتے کی سی کیفیت میں تھی لیکن اس نے بڑی ہمت سے اس قیامت کو سہا اور جسد خاکی کو قبرستان تک پہنچا دیا گیا۔ ایک عہد تمام ہو گیا۔

لیکن نہیں ابھی تو ایک اور قیامت سی قیامت کو سہنا تھا۔ اس دن سے وہ ریزہ ریزہ ہو کر جینے لگی۔ ہر رات قیامت بن کر اترتی۔ ہر یاد تڑپاتی لیکن مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ وہ بھی جینے کا ظلم سہتی رہی۔ بہت سے دن زندگی کے کینوس پر اپنی سیاہی پھیرتے ہوئے گزرتے رہے اور پھر وہ دن آ گیا جس کا اسے انتظار تھا۔ اتفاق اسپتال کے بستر پر 5 فروری 2017 کو مغرب کے وقت بانو نے آخری سانس خارج کر کے اپنی زندگی کے محور کے پاس چلی گئی۔ اشیر خان نے اپنی ماں کے بارے میں آخری جملہ کہا۔ "شاید خدا نے میری ماں کی جیسی عورتیں بھیجنا موقوف کر دیا ہے۔"

بانو نے ڈرامے اور کہانیوں کا ایک سمندر چھوڑا ہے جس میں سے کچھ مندجہ ذیل ہیں۔ "آتش زیر پا۔ آدھی بات۔ ایک دن۔ امربیل۔ بازگشت۔ چہار چمن۔ دست بستہ۔ دوسرا دروازہ۔ دوسرا قدم۔ فٹ پاتھ کی گھاس۔ حاصل گھاٹ۔ ریڈ آن لائن۔ ہوا کے نام۔ کچھ اور نہیں۔" لیکن راجا گدھ کا اپنا ایک مقام ہے۔ پھر راہِ رواں اور مرد ابریشم کا بھی بدل اردو ادب میں فی الحال نظر نہیں آتا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جون کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے چھٹے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

گرمیاں تو مئی ہی میں عروج پر آگئی تھیں۔ سندھ میں گرمی کا خاصا زور رہا۔ سورج کا پارہ چڑھا رہا۔ لوڈشیڈنگ بھی ظلم ڈھاتی رہی۔ سیاسی محاذ بھی گرم رہا جبکہ گرمی کا اصل زور جون میں دکھائی دیتا ہے۔

قارئین یہ پہلے بتادوں جون گریگورین سال کا چھٹا مہینا ہے۔ شمالی نصف کرہ میں اس مہینے گرمی کا موسم ہوتا ہے۔ اس کا نام قدیم روم کی دیوی جونو (Juno) کے نام پر رکھا گیا ہے، جسے حفاظت کی دیوی تصور کیا جاتا تھا۔ 21 جون سال کا سب سے لمبا دن ہوتا ہے۔ پاک و ہند کی کئی ممتاز شخصیات کا تعلق ماہ جون سے ہے۔ رنجیت سنگھ، رعنا لیاقت علی، مہدی حسن اور راج کپور کی برسی اسی ماہ منائی جاتی ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو، یوسف رضا گیلانی اور شاہ محمود قریشی جیسی معروف سیاسی شخصیات نے اسی ماہ آنکھ کھولی۔ کئی بڑے کھلاڑیوں کا تعلق بھی اسی ماہ سے ہے، جیسے جاوید میاں داد اور جان شیر خان۔ صبا حمید اور فہد مصطفیٰ جیسے فنکار بھی اس ماہ پیدا ہوئے۔ ہدایت کار سنگیتا کا تعلق بھی اسی ماہ سے ہے۔ آئیں، اس ماہ کی چند معتبر ہستیوں پر نظر ڈالتے ہیں۔

ملک معراج خالد

پاکستانی قوم کے نظریات اور افکار میں کئی تضادات ہیں۔ ہم مغرب کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر ان کی ٹیکنالوجی بہ خوشی استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ سائنس کو اب تک ہم نے کھلے دل سے قبول نہیں کیا ہے مگر جب بیمار پڑتے ہیں، تو ایلوپیتھک طریقۂ علاج پر انحصار کرتے ہیں۔ مؤجدین کو اہمیت نہیں دیتے، مگر ہوائی سفر کو ترجیح دیتے ہیں، موبائل فون استعمال کرتے ہیں مگر خود اس نوع کی کوئی ایجاد کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ یہ تضاد بیرونی دنیا کے علاوہ داخلی فکر میں بھی نمایاں ہے۔ ایک سمت یہ شکوہ کہ اقتدار فقط اشرافیہ کا نصیب بنتا ہے، دوسری سمت جب انتخابات ہوتے ہیں، تو اسی جاگیر دار اور سرمایہ دار کو منتخب کیا جاتا ہے جس کے استحصالی کارنامے زبان زد خاص و عام ہوں۔ یہ شکوہ کرتے ہیں کہ سیاست داں کرپٹ ہیں مگر جب کوئی بے داغ شخص سامنے آتا ہے تو اسے منتخب نہیں کرتے۔ الٹا اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہی کچھ ہمیں ملک معراج خالد کے معاملے میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ پاکستان کے معتبر سیاست داں تھے جو نگران وزیر اعظم بھی

رہے۔ان شخصیات میں سے تھے جو فقیری میں امیری تلاش کر لیتی ہیں جس سے بے وسیلہ اور بے سہارا افراد کو مدد مل جاتی ہے۔وہ درویش صفت شخص تھے جو بڑے عہدوں پر پہنچ کر بھی غربا اور مستحقین کے کام آتے رہے۔

ملک معراج خالد 20 ستمبر 1916 کو لاہور کے قریب واقع ضلع قصور کے ایک گاؤں کوٹ رادھا کشن میں پیدا ہوئے۔کچھ کتابوں میں بستی کا نام ڈیرہ چاہل درج ہے۔اسی مانند کچھ حوالوں میں تاریخ پیدائش یکم فروری لکھی گئی ہے۔ان کا تعلق ایک کاشت کار گھرانے سے تھا۔وہ انتہائی محنتی اور ذہین نوجوان تھے۔ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی۔سینٹرل ماڈل ہائی اسکول لوئر مال لاہور سے 1934 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

انہوں نے عام کاشت کار گھرانوں کے نوجوانوں جیسی تلخ اور کٹھن زندگی گزاری۔وہ صبح تین بجے جاگ جاتے۔ بھینسوں کا دودھ دوہتے۔دودھ بیچ کر پڑھنے کے لیے جاتے تھے۔کئی ماہ تک ایک ہی قمیص کو یونیفارم کے طور پر استعمال کیا۔پہننے کے لیے جوتے بھی نہیں تھے۔والد کا جوتا پہن کر کالج جاتے اور واپس آ کر انہیں لوٹا دیتے۔دن کے وقت ان کے والد اور دوپہر میں ملک معراج خالد ننگے پاؤں پھرتے تھے۔دودھ فروشی اور معمولی ملازمتیں کر کے انہوں نے تعلیم حاصل کی۔

زمانۂ طالب علمی میں انہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔مہاجرین کی آبادکاری کے لیے بھی کام کیا۔سماجی محاذ پر بھی مصروف رہے۔اگست 1939 میں انجمن اخوان اسلام کی بنیاد رکھی جس کے زیر انتظام 1954 میں اخوان ہائی اسکول برکی کا قیام عمل میں آیا۔کئی عشروں بعد یکم فروری 1994 کو اخوان سائنس کالج برکی کی بنیاد رکھی تو اس کا افتتاح اس وقت کے صدر پاکستان فاروق لغاری سے کرایا۔

اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور سے 1939 بی اے آنرز کیا۔وہ زمانہ خاصا دشوار تھا۔کسمپرسی اور غربت کے دن تھے۔کالج کی فیس بھی ان کے پاس نہیں ہوتی تھی، تاہم انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔1946 میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔پھر وکالت کے میدان میں قدم رکھا۔عملی سیاست کا آغاز 60 کی دہائی میں مسلم لیگ سے کیا۔وہ ایوب کا دور تھا اور حکومت مخالف تحریک زوروں پر تھی۔انہوں نے "ضمیر کا بحران" کے عنوان سے ایک پمفلٹ

لکھا، جس میں ایوب خان کی حکومت پر تنقید کی گئی تھی۔اس پمفلٹ نے انہیں مقامی سیاسی حلقوں میں مقبول بنا دیا۔ملک تبدیلی کے عمل سے گزر رہا تھا۔صدارتی انتخابات میں فاطمہ جناح کو شکست ہوئی، مگر یہ شکست کوئی ہضم نہیں کر سکا۔کراچی میں لسانی فسادات ہوئے، تو اسے فاطمہ جناح کی حمایت کا نتیجہ قرار دیا گیا۔لیفٹ کی پارٹیاں پوری قوت سے ایوب خاں کے خلاف سرگرم تھیں، مگر یہ چھوٹے چھوٹے یونٹ تھے۔ انہیں ایک ایسی چھتری درکار تھی جس کے تلے طلبا، مزدور اور کسان اکٹھے ہو سکیں۔جب ذوالفقار علی بھٹو ایوب کابینہ سے الگ ہوئے تو اس کا امکان پیدا ہوا۔بھٹو نے لاہور میں ایفرو ایشین پیپلز سالیڈیریٹی نامی جس تنظیم کے پلیٹ فورم سے پہلی بار حزب مخالف کے رہنما کے طور پر خطاب کیا تھا، وہ ملک معراج خالد ہی نے قائم کی تھی۔

بھٹو کی آمد کے بعد جمہوری اور روشن خیال حلقوں میں ایک اُمید پیدا ہوئی۔طلبا اور مزدور تنظیمیں ان کے ساتھ جا کھڑی ہوئیں۔معراج خالد پارٹی میں شامل.... ہونے والے ابتدائی لوگوں میں سے تھے۔وہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر لاہور سے 1970 کے انتخابات میں رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے۔اس وقت کے آئین کے مطابق ایک رکن قومی اسمبلی کو چھ ماہ کے لیے کسی صوبے کا وزیر اعلیٰ منتخب کیا جا سکتا تھا۔ اس شق کے تحت وہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ان کا گورنر غلام مصطفیٰ کھر سے اختیارات پر تناؤ رہا۔جاگیر دار اور وڈیروں کی جیت ہوئی۔مگر اپنے ہم نام معراج محمد خاں کے برعکس... معراج خالد پارٹی سے الگ نہیں ہوئے۔انہوں نے پارٹی میں رہتے ہوئے جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا۔ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں وفاقی وزیر زراعت بنا دیا۔انہوں نے اصولوں کی بنیاد پر ذمے داریاں نبھائیں۔1977 کے انتخابات کے بعد قومی اسمبلی کے اسپیکر منتخب کیے گئے۔یہ انتخابات متنازع ثابت ہوئے دھاندلی کے خلاف تحریک شروع ہوگئی جو مارشل لا پر منتج ہوئی۔

اس واقعے کے خلاف زندگی کے تمام طبقوں نے بھرپور

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

جدوجہد کی۔ بھٹو کی پھانسی نے ایندھن کا کام کیا۔ سیاسی تنظیموں ایم آر ڈی کی چھتری تلے بحالی جمہور کی تحریک شروع کی جسے پورے قوت سے کچلا گیا۔ جیلیں بھر گئیں۔ مقدمے بنے۔ کوڑوں کی سزا ہوئی۔ اس تحریک کے دوران معراج خالد پیش پیش رہے۔ وہ گرفتار ہوئے۔ جیل کاٹی۔ جب بے نظیر بھٹو 1986 میں ملک واپس آئیں اور نصرت بھٹو کو کنارے کیا جانے لگا تو سینئر اور مخلص سیاست دانوں کے بجائے نئے لوگوں کو آزمانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایسے لوگ، جو اسٹیبلشمنٹ کے لیے قابل قبول ہوں۔ معراج خالد اس خانے میں فٹ نہیں بیٹھتے تھے۔ وہ ان بانی ارکان میں سے تھے جنھیں آہستہ آہستہ پارٹی کے معاملات سے دور کر دیا۔ البتہ بے نظیر بھٹو نے ان کے تجربے سے ضرور استفادہ کیا۔ 1988 کے انتخابات کے بعد منتخب ہونے والی پیپلز پارٹی کی حکومت میں بے نظیر بھٹو وزیر اعظم بنیں تو انہوں نے معراج خالد کو قومی اسمبلی کا اسپیکر بنایا۔

محترمہ کے لیے حالات کٹھن تھے۔ انہیں اسٹیبلشمنٹ نے قبول تو کر لیا تھا مگر ان کی حکومت کے خلاف سازشیں جاری رہیں۔ جب صدر غلام اسحاق خان اور فوج کے سربراہ جنرل مرزا اسلم بیگ نے بے نظیر بھٹو کی حکومت کو رخصت کرنے کا فیصلہ کیا تو ملک معراج خالد کو بے نظیر بھٹو کے خلاف تحریک عدم اعتماد لا کر وزیر اعظم بننے کی دعوت دی گئی، جو اس مخلص سیاست دان نے قبول نہیں کی۔ البتہ بے نظیر بھٹو کی رخصتی ٹھہر چکی تھی۔ 58 ٹو بی کو برتتے ہوئے پی پی کی حکومت ختم کر دی گئی۔ اب میاں صاحب اقتدار میں آئے، مگر ان کی بھی صدر سے نہیں نبھ سکی۔ ان کی گورنمنٹ کو بھی رخصت کیا گیا۔ البتہ سپریم کورٹ نے حکومت کو بحال کر دیا۔ اس کے باوجود حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ صدر اور وزیر اعظم دونوں کو استعفیٰ دینا پڑا۔ نئے انتخابات ہوئے اور پی پی اقتدار میں آ گئی۔ اس زمانے میں محترمہ اور معراج خالد میں اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ پیپلز پارٹی کی سربراہ نے انہیں لاہور سے ان کی روایتی نشست پر انتخاب لڑنے کے لیے پارٹی کا ٹکٹ نہیں دیا۔

اس واقعے کے بعد ملک معراج خالد پیپلز پارٹی کی سیاست سے دور ہو گئے۔ انہوں نے اخوان المسلمون نامی تنظیم بنا کر لاہور کے دیہی علاقے میں اسکول کھول لیے اور ان کے انتظامات پر توجہ مرکوز کر لی۔ وہ بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے ریکٹر بھی مقرر ہو گئے۔ معراج خالد ایک سادہ انسان تھے جنھیں اکثر لاہور کے مال روڈ پر گھومتے ہوئے اور باغ جناح میں سیر کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔

اب فاروق لغاری ملک کے نئے صدر تھے۔ ان کا تعلق پی پی ہی سے تھا۔ تاریخ نے خود کو دہرایا۔ صدر اور وزیر اعظم میں پھر فاصلے پیدا ہو گئے۔ آخر بی بی کی حکومت کو ان کے اپنے ہی صدر نے ختم کر دیے۔ اب اسی معراج خالد کو جسے پی پی سیاست سے دور کر دیا گیا تھا، نگراں وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ انہوں نے تین ماہ کی مقررہ مدت میں انتخابات کروا کے اقتدار نواز شریف کے سپرد کر دیا۔ جب وہ نگراں وزیر اعظم بنے تو انہوں نے وی آئی پی کلچر کے تحت ملنے والی مراعات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور ایئرپورٹ پر عام مسافروں کے راستے کو استعمال کرنا شروع کیا۔ اس زمانے میں مخالفین طنزاً کہا کرتے تھے کہ اب وزیر اعظم ہاؤس میں بھینسیں بندھیں گی۔

ان کی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ 60 کی دہائی میں وہ لاہور کے جس مکان میں منتقل ہوئے تھے، وہ کچا مکان تھا۔ 1964 میں ریگل کے پاس اندرون ہال روڈ لکشمی مشن میں ایک فلیٹ لے لیا اور بعد کی زندگی وہاں گزاری۔ ایک کمرا تھا۔ وہی ڈرائنگ روم، وہی دفتر وہی گھر۔ ان کی بیگم صاحبہ اسکول ٹیچر تھیں۔ 1973 میں وہ گورنر بن گئے تھے۔ تب ایک تقریب میں ان کی بیگم سے پوچھا گیا۔ ”آپ کے میاں وزیر اعلیٰ پنجاب ہیں؟ کیا آپ اسکول کی ملازمت چھوڑ دیں گی۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”میری ملازمت مستقل نوعیت کی ہے، میں کیوں چھوڑوں گی؟ ان کی ملازمت تو عارضی ہے۔“ گھر میں مٹی کے دو گھڑے تھے، جن سے میاں بیوی پانی پیتے۔ فریج تھا ضرور، مگر اس میں مہمانوں کے لیے پانی رکھا جاتا۔ انہوں نے کبھی باضابطہ طور پر پیپلز پارٹی چھوڑنے کا اعلان نہیں کیا، لیکن اب وہ اس سے لاتعلق ہو چکے تھے۔ 13 جون 2003 کو اس اصول پسند سیاست داں کا اسلام آباد میں انتقال ہوا۔

میاں طفیل

آپ جماعت اسلامی کے نظریات سے اختلاف کر سکتے ہیں، ان کی پالیسیوں اور فیصلوں کو تنقید کا نشانہ بنا سکتے ہیں، مگر اسے پاکستانی سیاست سے خارج نہیں کر سکتے۔ اس جماعت کے اثرات فقط پاکستانی سیاست تک محدود نہیں۔ اس نے مذہبی افکار اور ریاستی بیانیے پر بھی دیرپا نقوش

چھوڑے۔اس اثر پذیری کا سبب اس کے امیر ٹھہرے۔مولانا مودودی اس کے بانی امیر تھے، جنہوں نے نہ صرف اس ملک بلکہ پوری مسلم دنیا کی سیاست کو متاثر کیا اور کئی ممالک میں ایسی مذہبی سیاسی تحریکوں کا آغاز ہوا، جنہوں نے مولانا مودودی کی شخصیت اور ان کے افکار کو مشعل راہ بنایا۔مولانا کے بعد اس اہم ترین جماعت کی قیادت میاں طفیل نے سنبھالی جنہوں نے پاکستانی تاریخ کے اہم مواقع پر کلیدی کردار ادا کیا۔

میاں طفیل محمد نومبر 1913 میں مشرقی پنجاب کی ریاست کپورتھلہ کے ایک گاؤں صفدر پور آرائیاں میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلق ایک کاشت کار مذہبی گھرانے سے تھا۔ان کے والد اسکول میں معلم تھے۔یعنی انہوں نے فطری زندگی کو بھی قریب سے دیکھا اور علم سے بھی رشتہ جڑا رہا۔میاں طفیل اپنے بہن بھائیوں میں بڑے ہیں۔ پرائمری تک تعلیم اپنے گاؤں کے اسکول سے حاصل کیا۔اب سفر پر نکلے۔وہ ایک محنتی طالب علم تھے۔معاشی مسائل، کاشت کاری اور تعلیم ساتھ ساتھ چلتے رہے۔مڈل کا مرحلہ قصبہ نڈالہ سے طے کیا۔ میٹرک کا امتحان کپورتھلہ کے رندھیر ہائی اسکول سے کیا۔وہ پری انجینئرنگ کے طالب علم تھے۔رندھیر انٹر کالج، کپورتھلہ سے امتیازی نمبروں سے انٹر کیا اور وظیفے کے حق دار ٹھہرے۔ انہوں نے لاہور کا رخ کیا۔یہی شہر مستقبل میں انہیں اس راہ پر گامزن کرنے والا تھا، جس نے انہیں ملک گیر شہرت عطا کی۔انہوں نے لاہور کے گورنمنٹ کالج سے بی ایس سی آنرز کیا۔پھر وکالت کی سمت آگئے۔ پنجاب یونیورسٹی لا کالج، لاہور سے 1937 میں ایل ایل بی، دوسری پوزیشن کے ساتھ کیا۔انہیں جید اساتذہ ملے۔سابق چیف جسٹس آف پاکستان محمد منیر ان کے اساتذہ میں سے شامل رہے۔اب انہوں نے جالندھر میں شیخ محمد شریف کے ہمراہ وکالت شروع کی جو بعد ازاں سپریم کورٹ کے جج بنے۔ایک سال تک ان کے ساتھ کام کرنے کے بعد وہ کپورتھلہ منتقل ہو گئے۔وہاں اپنی آزاد وکالت کا آغاز کر دیا۔ ایک تحقیق کے مطابق وہ ریاست کپورتھلہ کے پہلے مسلمان (ایل ایل بی) وکیل تھے۔

خاندان دینی رجحان کا حامل تھا۔انہیں بھی مذہبی کتب کے مطالعے کا شوق تھا۔مولانا مودودی کے رسالے ترجمان القرآن کے وہ مستقل قاری تھے۔ جب جماعت اسلامی کا تاسیسی اجتماع ہوا، تو وہ شریک ہوئے۔اب ایک نئے سفر کا آغاز ہوا۔انہوں نے اپنی خدمات جماعت کے لیے وقف کر دیں۔ 21 جنوری 1942 کو وکالت ترک کرنے کا اعلان کر دیا۔اس وقت لوگوں نے اس فیصلے پر بڑی تنقید کی اور اسے جذباتی فیصلہ قرار دیا، مگر وہ ڈٹے رہے۔ان کی نظریں مستقبل پر ٹکی تھیں اور آنے والے وقت نے ان کے فیصلے کو درست ثابت کیا۔گزر بسر کے لیے وہ تجارت کی سمت آگئے لیکن یہ راہ کٹھن تھی۔شدید معاشی مسائل درپیش تھے مگر ذہنی اور روحانی سکون تھا۔ان کی محنت اور لگن جلد انہیں سینئرز کی نظروں میں لے آئی۔اس وقت کے امیر جماعت اسلامی لاہور ملک نصر اللہ خان کی تجویز پر انہیں قیم (سیکریٹری) مقرر کر دیا گیا۔ 1944 میں ملنے والی اس ذمے داری کو انہوں نے بڑی

خوش اسلوبی سے نبھایا۔ ارکان جماعت کو فعال کیا۔ دعوت و تنظیم کے لیے ہندوستان بھر میں دورے کیے۔اس دوران ان کی ممتاز مسلمان سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ ہندو اور مسیحی اسکالرز سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔

قیام پاکستان ایک معجزہ تھا، مگر قائد اعظم کی وفات کے بعد بگاڑ کی ابتدائی علامات ظاہر ہونے لگیں۔ اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی۔ جمہوری اور سیاسی تحاریک کا آغاز ہوا۔ جماعت ان میں پیش پیش تھی۔اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک کے دوران میاں طفیل کو اکتوبر 1948 میں گرفتار کیا گیا۔ پہلے وہ قصور جیل میں رہے۔ پھر انہیں ملتان بھیج دیا گیا۔اپریل 1950 میں نظر بندی کی مدت میں توسیع ہوگئی۔ بالآخر لاہور ہائی کورٹ کے پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ کے ایک فیصلے کے طفیل 28 مئی کو رہا کر دیا گیا۔دوران قید انہیں مولانا مودودی کی صحبت میسر آئی، جس نے ان کی شخصیت پر دیرپا اثرات مرتب کیے۔جیل میں انہوں نے سید مودودی سے سورہ یوسف سے سورہ الناس تک قرآن مجید سبقاً پڑھا۔ادھر امین احسن اصلاحی جیسے اسکالر بھی قید تھے، جن نگرانی میں احادیث کی کتب پڑھیں اور عربی زبان سیکھی۔

1965 تک وہ جماعت کے قیم رہے۔اس دوران ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔جنوری 1966 میں وہ نائب امیر جماعت ہوگئے۔ یہ ایک بھاری ذمے داری تھی جسے

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

انہوں نے توجہ اور لگن سے نبھایا۔ اس دوران وہ جماعت اسلامی مغربی پاکستان کے امیر بھی رہے۔ متعدد مرتبہ مولانا مودودی کی جگہ قائم مقام امیر کے فرائض انجام دیے۔ مارشل لا کے خلاف زندگی کے تمام طبقے احتجاج کی راہ پر گامزن ہو چکے تھے۔ جوائنٹ اپوزیشن (سی او پی) کا قیام عمل میں آیا، تو میاں طفیل اس کے مرکزی رہنماؤں میں سے تھے۔ عوام میں سیاسی شعور اجاگر کرنے اور ملک میں جمہوریت کے حق میں ایک مضبوط تحریک چلانے کے لیے انہوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے دور دراز علاقوں کے طوفانی دورے کیے۔ جماعت کا موقف ہے کہ اسی تحریک نے پہلی بار ایوب خان کی ڈکٹیٹر شپ کو چیلنج کیا۔ گو یہ دعویٰ سو فیصد درست نہیں۔ اس سے قبل ہی ترقی پسند طلبا مختلف مواقع پر آمریت کے خلاف بھرپور احتجاج کر چکے تھے اور شہر بدری کی سزائیں بھگت چکے تھے۔ ان کے جلوسوں پر فائرنگ بھی ہوئی تھی۔

خیر، میاں طفیل نے پاکستان ڈیموکریٹک موومنٹ (پی ڈی ایم) اور ڈیموکریٹک ایکشن کمیٹی (ڈیک) میں بھی جماعت کی بھرپور نمائندگی کی اور فعال کردار ادا کیا۔ دونوں تحریکوں نے 1969ء میں ایوبی آمریت کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1970 میں ملک میں پہلے عام انتخابات ہوئے۔ ان انتخابات کو پاکستان کی تاریخ کے شفاف ترین انتخابات کہا جاتا ہے، مشرقی پاکستان سے مجیب الرحمان اور مغربی پاکستان سے بھٹو کامیاب ٹھہرے۔ ان انتخابات کے بہت تلخ نتائج سامنے آئے۔ آمریت سے جمہوریت کے سفر میں دشمنوں کو سازش کا موقع مل گیا۔ مشرقی پاکستان میں علیحدگی کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس مشکل دور میں میاں طفیل نے مشرقی پاکستان کا تفصیلی دورہ کیا اور وہاں کے لوگوں کو اتحاد اور اسلامی بھائی چارے کا پیغام دیا۔ گو یہ کوششیں لاحاصل ثابت ہوئیں۔ حالات پوائنٹ آف نو ریٹرن پر پہنچ چکے تھے۔

پاکستان کا ایک بازو کٹ چکا تھا۔ مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں ڈھل گیا۔ مولانا مودودی اب متحرک نہیں رہے تھے۔ نومبر 1972 میں میاں طفیل کو ایک اہم ترین ذمے داری سونپ دی گئی۔ انہیں امیر مقرر کر دیا گیا۔

امیر جماعت بننے کے بعد انہوں نے تربیت گاہوں کے ذریعے جماعت کے بنیادی لٹریچر سے تجدید کی مہم شروع کی۔ کارکنان کی تربیت اور قیادت سے براہِ راست رابطے کے لیے مرکز میں ماہانہ دس روزہ تربیت گاہ کا اہتمام کیا۔ اسی طرح پورے ملک میں قرآنی حلقوں کا نیا سلسلہ شروع کیا، اور کم از کم تین ہزار مقامات پر یہ حلقہ درس قائم ہوئے۔

بھٹو کا زمانہ سیاسی طور پر خاصا متحرک تھا۔ مارچ 1973 میں اپوزیشن جماعتوں پر مشتمل متحدہ جمہوری محاذ (یو ڈی ایف) کے قیام میں میاں طفیل نے بھرپور کردار ادا کیا۔ گو آئین سازی کا کریڈٹ اس اتحاد کو نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اس کا اثر واضح تھا۔ جنوری 1977 میں ہونے والے انتخابات میں گو پی پی کامیاب ٹھہری مگر پاکستان قومی اتحاد (پی این اے) نے دھاندلی کے خلاف بھرپور تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک کے ہراول دستے میں میاں طفیل شامل تھے۔ بھٹو سے مذاکرات کے لیے جو کمیٹی بنی تھی، وہ نواب زادہ نصر اللہ خان، پروفیسر غفور احمد اور میاں طفیل پر مشتمل تھی۔ پروفیسر غفور نے اکثر انٹرویوز میں یہ کہا کہ معاہدہ طے پا گیا تھا۔ دستخط ہونے باقی تھے کہ ملک میں مارشل لا لگ گیا۔ ضیا الحق نے اقتدار سنبھال لیا۔ ضیا الحق کی مجلس شوریٰ کا حصہ بننا وہ فیصلہ تھا جس کے لیے جماعت کو ہمیشہ شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا، پروفیسر غفور احمد کا موقف تھا کہ وہ اس کے خلاف تھے مگر اجتماعی فیصلہ تسلیم کیا گیا۔ بعد میں منور حسن صاحب نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ اس وقت جماعت نہیں بلکہ پی این اے فیصلہ ساز باڈی تھی، جس نے یہ فیصلہ کیا تھا اور انتخابات کی تاریخوں کا اعلان کروانے کے بعد جماعت مجلس شوریٰ سے باہر آ گئی۔ اب جو بھی دلیل پیش کی جائے، ضیا الحق کی کابینہ کا حصہ بننا ہمیشہ ایک ناپسندیدہ عمل رہا۔ وقت نے کروٹ لی۔ دسمبر 1979 میں روس نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ شاطر امریکا نے اسے لادینیت اور اسلام کی جنگ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس کے طفیل نہ صرف ضیا الحق حکومت توانا ہوئی بلکہ مذہبی سیاسی جماعتوں کو بھی ابھرنے اور سماج میں سرایت کرنے کا موقف ملا۔ جماعت اسلامی نے افغانوں کے مؤقف کی تائید کی اور سوویت یونین کی مذمت کی۔ یہ جنگ سوویت یونین کے ٹوٹنے کا سبب تو بنی مگر پاکستان کے لیے بھی کتنے ہی مسائل لے کر آئی۔

وقت گزرتا رہا۔ جماعت میں نوجوان قیادت ابھر رہی تھی۔ میاں طفیل اب بوڑھے ہو گئے تھے۔ اکتوبر 1987 تک وہ امیر جماعت اسلامی رہے۔ ان کے بعد قاضی حسین احمد نے یہ ذمے داری سنبھالی۔ امارت سے فارغ ہونے کے بعد ادارہ معارف اسلامی، منصورہ کے چیئرمین اور عالمی مساجد کونسل کے رکن رہے۔ انہوں نے طویل عمر پائی۔ 24 جون

2009 کو 95 سال کی عمر میں لاہور کے شیخ زید اسپتال میں ان کا انتقال ہوا۔

وسیم اکرم

وسیم اکرم فقط ایک کرکٹر نہیں، ایک پورا عہد ہیں۔ ایک انوکھا کھلاڑی، صلاحیت کا پاور ہاؤس۔ ایسا باکمال بولر، جس کی کوئی مثال نہیں ملتی، جو اپنے ہم عصروں سا تیز رفتار نہیں تھا مگر اپنی بے پناہ قابلیت کے وسیلے اس نے ایسے کارنامے انجام دیے کہ سننے والا انگشت بدنداں رہ جائے۔

وہ پہلے بالر تھے جنہوں نے ون ڈے کرکٹ میں پانچ سو وکٹوں کا سنگ میل عبور کیا۔ اس وقت یہ ایک ناممکن خواب تھا جسے ان کی محنت نے تعبیر دی۔ انہوں نے یہ سنگ میل 2003 کے ورلڈکپ میں عبور کیا تھا۔ کرکٹ کے معتبر پرچے وزڈن نے جب 2002 میں پہلی بار تاریخ کے بہترین کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم ریلیز کی تو اس میں وسیم اکرم بھی شامل تھے جنہیں ون ڈے کا بہترین بولر قرار دیا گیا تھا۔ 2009 میں جب ہال آف فیم میں عہد حاضر کے پانچ کرکٹرز کو شامل کیا گیا تو وسیم اکرم کا نام بھی اس میں موجود تھا۔ انہوں نے ٹیسٹ کیریر میں 17 بار مین آف دی میچ کا ایوارڈ حاصل کیا۔ ون ڈے میں یہ کارنامہ 19 بار انجام دیا۔ انہوں نے اپنے کیریر میں چار بار ہیٹ ٹرک کی۔ دو بار ٹیسٹ کرکٹ میں، دو بار ون ڈے میں۔ وہ چار ہیٹ ٹرک کرنے والے اوّلین بالر تھے۔ انہوں نے بطور بلے باز آٹھویں نمبر پر بیٹنگ کرتے ہوئے ڈبل سنچری اسکور کی۔ یہ اس نمبر پر کھیلی جانے والی سب سے بڑی اننگ تھی۔

وسیم اکرم ایک شان دار کھلاڑی تھے۔ جہاں پہنچ کر دوسروں کے کیریر رک جاتے تھے، وہاں سے وہ ایک نئی اننگز کا آغاز کرتے تھے۔ کسی زمانے میں جنوبی افریقا کے ایلن ڈونلڈ، آسٹریلیا کے میگ گرا کو ان کا ہم پلہ خیال کیا جاتا تھا مگر پھر ریکارڈز کی دوڑ میں وہ ان سے بہت پیچھے رہ گئے۔ خود ان کے ہم وطن وقار یونس بھی ان ہی کے مانند عظیم کھلاڑی تھے۔ ایک زمانے میں دونوں میں وکٹوں کی دوڑ لگی رہتی تھی۔ گو وقار کی مہارت اور قابلیت میں کوئی شک نہیں اور ان کے ریکارڈز بھی قابلِ دید ہیں مگر وسیم اکرم کے کارناموں کی فہرست ان سے طویل ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ رہا کہ وہ بائیں ہاتھ کے بولر تھے جو سیدھے ہاتھ کے بلے بازوں کے لیے قہر ثابت ہوتا ہے۔ پھر ان کی کپتانی بھی ان کے کام آئی۔

عمران خان کے بعد جن کھلاڑیوں نے یہ منصب سنبھالا، ان میں وسیم اکرم سب سے خوش قسمت رہے۔ بے شک انہیں بھی مخالفت کا سامنا رہا۔ ان کے خلاف اسکینڈلز بنے، الزامات لگائے گئے، مقدمہ بھی چلا مگر قسمت نے انہیں بچالیا۔ پھر انہیں بطور کپتان بھرپور اختیار دیا گیا۔ ان اختیارات سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اپنی مرضی کی ٹیم بنائی۔ سعید انور معین خان، انضمام الحق، مشتاق احمد اور ثقلین مشتاق ان کی ٹیم کا کلیدی حصہ تھے، جنہوں نے وسیم اکرم کو بہ طور کپتان کتنی ہی فتوحات دلائیں۔

ایک زمانے میں ان کی اور وقار یونس کی جوڑی مشہور تھی۔ انہیں "ٹو ڈبلیوز" کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ایک اپنی تیز رفتار، ہوا میں گھومتی گیند سے مخالفین پر حملہ کرنا، دوسری اپنی تلی، کبھی پڑ کر اندر آتی، کبھی باہر جاتی گیندوں سے مخالفین کی دفاعی دیوار میں دراڑ ڈال دینا۔ ریوس سوئنگ کو پاکستانی بولرز کی ایجاد کہا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ اس کا سہرا سرفراز نواز کے سر باندھتے تھے۔ البتہ یہ عمران خان تھے جنہوں نے اسے باقاعدہ آرٹ کا درجہ دیا اور پھر وسیم اور وقار یونس نے اسے اپنے اوج پر پہنچایا۔ ایک زمانے میں تو انگریز ریوس سوئنگ کو بال ٹمپرنگ کی کارفرمائی قرار دیا کرتے تھے اور اسے کھیل سے دھوکا ٹھہراتے تھے۔ اس ضمن میں نہ صرف تنقید کی جاتی تھی، بلکہ ایک دوسرے ....کے خلاف مقدمات بھی کیے جاتے۔ عمران خان اور این بوتھم کا مقدمہ سب کو یاد ہے۔

خیر بات ہو رہی تھی وسیم اکرم کی جو نہ صرف اپنے عہد بلکہ کرکٹ کی تاریخ کے عظیم ترین بولرز میں سے ایک ہیں۔ اس کلا میں کوئی ان کا ہم پلہ نہیں تھا۔ گو بطور کپتان وہ ورلڈکپ میں بدقسمت رہے۔ 1996 ورلڈکپ میں وہ ان فٹ ہونے کی وجہ سے ٹیم سے آؤٹ ہوگئے۔ عامر سہیل نے کپتانی سنبھالی اور پاکستان کوارٹر فائنل میں انڈیا سے ہار گیا۔ 1999 میں انہیں پاکستانی تاریخ کی بہترین ٹیم ملی۔ یہ ٹیم فائنل تک بھی پہنچی مگر ایک بار پھر پاکستان ٹیم دباؤ برداشت نہیں کرسکی۔ فائنل میں پاکستان کو شرمناک شکست

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوئی۔ یہ ورلڈ کپ وسیم کی کپتانی کے لیے بد بخت ثابت ہوا۔ بڑھتی عمر اور مسائل رکاوٹ بننے لگے اور اشارے ملنے لگے کہ ان کا دور ختم ہو رہا ہے۔ گو اس ورلڈ کپ سے قبل انہوں نے انڈیا کو کانٹے دار سیریز میں ہرایا تھا۔ وہ ایک یادگار سیریز تھی، جہاں وہ اپنی اوج پر تھے۔ اسی طرح انہوں نے انگلینڈ کو انگلینڈ کی سرزمین پر یادگار شکست دی۔ اس سے کچھ پیچھے جائیں تو ہم انہیں 1992 ورلڈ کپ فائنل کے ہیرو کے طور پر دیکھتے ہیں، جہاں انہوں نے تین وکٹیں حاصل کیں اور زبردست بیٹنگ کی۔

وسیم اکرم کے جن ریکارڈز کا ہم نے متعدد بار تذکرہ کیا، مناسب ہے، ان پر تفصیلی نظر ڈال لی جائے۔ انہوں نے 104 میچز کھیلے، جس میں 23.62 کی شان اوسط سے 414 وکٹیں اپنے نام کیں۔ کسی زمانے میں یہ ایک ریکارڈ تھا۔ انہوں نے 25 بار پانچ وکٹیں لیں اور پانچ بار دس وکٹیں لینے کا کارنامہ انجام دیا۔ اس فارمیٹ میں ان کی بطور بلے باز بھی کارکردگی متاثر کن رہی۔ انہوں نے 2898 رنز بنائے جن میں سات نصف سنچریاں اور تین سنچریاں شامل تھیں۔ اس میں زمباوے کے خلاف 257 ناٹ آؤٹ کی ایک یادگار اننگز بھی تھی جس میں انہوں نے ثقلین مشتاق کے ساتھ ریکارڈ پارٹنرشپ کی۔ اس اننگز میں انہوں نے گیارہ چھکے جڑے تھے۔ اب ون ڈے پر نظر ڈال لیتے ہیں۔ وہ 356 مقابلوں میں اترے۔ یہاں چھ سنچریوں کی مدد سے انہوں نے 3717 رنز داغے مگر ہمیں تو ان کی بولنگ سے غرض ہے۔ انہوں نے 502 وکٹیں لیں۔ پانچ وکٹیں لینے کا کارنامہ چھ بار انجام دیا۔ یہاں بھی ان کی اوسط 23.5 رہی، جو حیران کن تھی۔

وسیم اکرم تین جون 1966 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد چوہدری محمد اکرم کا تعلق امرتسر سے تھا جو تقسیم کے بعد یہاں آن بسے۔ وہ فلموں کے شائق تھے اور امیتابھ بچن کی فلمیں بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ اسلامیہ کالج سول لائنز کے طالب علم رہے۔ عمران خان کے گرویدہ تھے۔ ان ہی کو دیکھ کر کرکٹ کھیلنی شروع کی۔

پاکستان میں سلیکشن کا طریقہ کار آسٹریلیا اور انگلینڈ سے یکسر مختلف ہے۔ کھلاڑی نیچے سے اوپر نہیں آتے۔ کسی سینئر کرکٹر، کوچ یا بورڈ آفیشل کی نظر کسی نوجوان پر پڑ جاتی ہے اور اس کی قسمت جاگ اٹھتی ہے۔ توصیف احمد کی مثال سامنے ہے۔ ان کا پہلا ٹیسٹ ہی ان کا پہلا فرسٹ کلاس میچ تھا۔ وسیم

اس کے بعد 1853ء میں آسٹریا کے بیرن فرینز فان اچٹس نے سیربین اور چرخی کو ملا کر ایک آلہ تیار کیا۔ اچٹس کے علاوہ لندن کے جارج ہارنر نے بھی اس سلسلے میں اہم کام انجام دیا۔ پلیٹو اور سٹیمفر کے مشاہدات و تجربات سے فائدہ اٹھا کر زیٹروپ (Zoetrope) نامی آلہ منظر عام پر آیا۔ زیٹروپ میں ایک چرخی پر بہت سی تصاویر چسپاں کر دی جاتی تھیں اور اس کے آگے ایک اور چرخی ہوتی تھی جب اس چرخی کو گھمایا جاتا تھا تو تصویر میں حرکت پیدا ہو جاتی تھی لیکن اس آلے میں ایک نقص تھا کہ تصویریں کیمرے کے بجائے ہاتھ سے بنی ہونے کی وجہ سے یکساں نہیں بنتی تھیں جس سے حرکت میں تسلسل نہیں رہتا تھا اور رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ اس آلے کے ذریعے جانوروں، مداریوں اور مسخروں وغیرہ کی تصویریں چلتی پھرتی صورت میں دکھائی جاتی تھیں۔ اس سلسلے میں ایمیلے رینالڈ کی Praxinoscope کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس میں اور پہلے کے بنائے گئے آلوں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا صرف اس میں دیکھنے والے سوراخوں کی جگہ شیشے لگا دیے گئے تھے۔ رینالڈ 1892ء تک اس میں مسلسل اضافہ و اصلاح کرتے رہے اور آخر انہوں نے پیرس میں ایک تھیٹر کھول لیا جہاں وہ 1900ء تک ان چلتی پھرتی تصویروں کی نمائش کرتے رہے حتیٰ کہ فرانس میں فلموں کی باقاعدہ نمائش شروع ہو گئی اور انہیں اپنے اس کھیل کو مجبوراً بند کرنا پڑا۔

1860ء میں ایک امریکن باشندے ہنری کول مین نے زیٹروپ کے تصویروں میں پیدا ہونے والی رکاوٹ کو دور کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن اس نے اپنے بچے کو ایک بکس میں کیل ٹھوکتے ہوئے دیکھا اور اس نے دوسرے شیشے کا استعمال کر کے اس کے کئی پوز کھینچ لیے اور انہیں اسٹیریو اسکوپ کے شیشے کے پیچھے گھومنے والے ایک پیڈل وہیل پر چپکا دیا جس سے حرکت میں پیدا ہونے والی رکاوٹ دور ہو گئی۔ اس سے تقریباً دس برس بعد فلاڈلفیا میں ہنری رینو ہیل نامی فوٹو گرافر نے پہلی بار کئی پوز کی تصاویر کو ایک طشتری پر چسپاں کر کے متحرک تصاویر کی صورت میں عوام کے سامنے پیش کیا۔ اس کے بعد 1877ء میں کیلی فورنیا کے گورنر کی فرمائش پر ایڈورڈ مائی برج نامی فوٹو گرافر نے دوڑتے گھوڑے کی مسلسل 25 تصویریں کھینچ کر متحرک تصاویر کی ترقی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا چونکہ ان دنوں آٹومیٹک کیمرے نہیں تھے لہٰذا مائی برج نے 25 کیمروں کو ایک قطار میں لگا کر ان سب کے شٹر دھاگے سے اس طرح باندھے کہ جب دوڑتا ہوا گھوڑا کیمرے کے سامنے سے گزرتا تھا تو یکے بعد دیگرے دھاگے ٹوٹتے جاتے اور شٹر کھل کر بند ہوتا جاتا تھا ان تصاویر کو ایک ساتھ دیکھنے سے گھوڑا دوڑتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ 1880ء میں سان فرانسسکو میں ان تصاویر کو ایک شیشے کی طشتری کے ذریعے متحرک حالت میں دکھایا گیا۔

اقتباس: قلم ڈائریکٹری، از: یاسین گوریجہ

مرسلہ: ارباز خان۔ پشاور

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اکرم کے معاملے میں یہ سینئر کھلاڑی جاوید میاں داد تھے جنہوں نے سب سے پہلے ان کی صلاحیتوں کو پہچانا۔ البتہ کچھ مصنفین کے مطابق یہ کہانی حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتی۔ واقعہ کچھ یوں ہے کہ قذافی اسٹیڈیم میں ٹرائلز ہوئے۔ وہاں سیکڑوں نوجوانوں نے قسمت آزمائی۔ پہلے دو دن تو وسیم کو بولنگ کے لیے بلایا ہی نہیں گیا۔ تیسرے دن موقع ملا تو وہ ٹرائلز پر موجود سینئرز کو متاثر کرنے میں کامیاب رہے۔

نیوزی لینڈ کے خلاف انہوں نے ظہیر عباس کی قیادت میں اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ 1985 میں انہیں آسٹریلیا کے خلاف چانس ملا جہاں وہ پانچ وکٹیں لے اڑے۔ انہوں نے 1985 میں نیوزی لینڈ کے خلاف سیریز سے اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ سیریز کے دوسرے ٹیسٹ میچ میں دس وکٹیں لے کر انہوں نے اپنے انتخاب کو درست ثابت کیا۔ ساتھ یہ اشارہ بھی دے دیا کہ ایک ورلڈ کلاس بالر میدان میں اتر چکا ہے۔ ویسے قابلیت اپنی جگہ، یہ ان کی قسمت تھی جس کی وجہ سے وہ ڈومیسٹک کرکٹ کے تجربے کے بنا پر انٹرنیشنل کرکٹ میں چلے آئے۔ اب وہ ٹیم کا حصہ بن گئے۔ ویسٹ انڈیز کا دورہ کرنے والی ٹیم کے وہ رکن تھے مگر وہاں وہ انجرڈ ہو گئے۔ بعد میں وہ سرجری سے گزرے اور زبردست کم بیک کیا۔ بعد کی کہانی تاریخ کا حصہ ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے بہ طور کومینٹیٹر اپنا کیریر شروع کیا۔ وہ آخر کے دنوں میں اس کا اشارہ دے چکے تھے۔ انہوں نے ملکی اور بین الاقوامی چینلز کے لیے کومینٹری کی اور خود کو منوایا۔ وہ ٹی وی پر ایکسپرٹ کے طور پر بھی نظر آئے۔ پھر انہوں نے کوچنگ کیریر شروع کیا۔ اس میدان میں انہوں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ انڈین لیگ کی مہنگی ترین ٹیم کلکتہ نائٹ رائیڈرز کے وہ بولنگ کوچ رہے۔ بعد میں جب پاکستان میں کرکٹ لیگ شروع ہوئی تو ہم نے انہیں اسلام آباد کے کوچ کے طور پر دیکھا۔ پی سی ایل کا پہلا سیزن اسلام آباد ہی نے جیتا۔ کئی مبصرین کا خیال ہے کہ پاکستان کرکٹ بورڈ کو ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنا چاہیے اور انہیں کرکٹ ٹیم کی کوچنگ سونپنی چاہیے۔ دیکھیں، یہ بیل کب منڈھے چڑھتی ہے۔

ان کی کہانی میں کئی شیڈز ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ فلمیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کا ایک پہلو وہ بھی ہے، جب انہیں اپنے کیریر کے عروج پر... یعنی 30 سال کی عمر میں شوگر کی تشخیص ہوئی۔ اس وقت خیال کیا جاتا تھا کہ یہ بیماری فقط بوڑھوں کے لیے مخصوص ہے اور اس کے بعد کھلاڑی پروفیشنل کرکٹ جاری نہیں رکھ سکتا۔ یہ وسیم اکرم کے لیے بڑا دھچکا تھا مگر انہوں نے مایوس ہونے کے بجائے اس بیماری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ وہ باقاعدگی سے ادویہ لیتے رہے اور آگے بڑھتے رہے۔ یقینی طور پر اس کی وجہ سے انہیں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر خدا کی دی ہوئی صلاحیت کے وسیلے وہ ایک کے بعد ایک ریکارڈ قائم کرتے چلے گئے۔ انہوں نے شوگر سے متعلق کئی آگاہی پروگراموں میں شرکت کی اور نئی نسل کو تحریک دی کہ کسی مسئلہ یا بیماری کو اپنی راہ کی رکاوٹ نہ بننے دیں۔

ان کی ازدواجی زندگی سے اسکینڈلز تو نہیں جڑے تھے مگر وہ خبروں کی زینت ضرور بنی کہ ان کی زوجہ ہما مفتی ایک سلجھی ہوئی، مہذب اور خوش شکل خاتون تھیں جو وسیم کے ساتھ خوب جچتی تھیں۔ 1995 میں ان کی شادی ہوئی۔ اس شادی سے وسیم اکرم کے ہاں دو بیٹے تیمور اور اکبر پیدا ہوئے۔ پندرہ برس انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری، مگر پھر امراض کے حملے نے 2009 میں ان کی جان لے لی۔ یہ ایک بھاری صدمہ تھا، انہیں اس سے ابھرنے میں کچھ وقت لگا۔ بعد میں ان کا نام سابق مس یونیورس سشمیتا سین کے ساتھ جوڑا گیا مگر 2013 میں یہ خبریں دم توڑ گئیں، جب وہ ایک آسٹریلوی خاتون سے رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے جنہوں نے شادی کے بعد اسلام قبول کر لیا اور شنیرا وسیم کہلائیں۔ ان دونوں کی ملاقات 2011 میں ہوئی تھی۔ لاہور میں شادی کی سادہ سی تقریب ہوئی، جس کے بعد وسیم نے نئے سفر کا آغاز کیا۔ 2014 میں خدا نے وسیم اکرم کو ایک بیٹی عائلہ سے نوازا۔

چند برس قبل وسیم اکرم کے ساتھ عجیب واقعہ ہوا۔ شارع فیصل پر ہونے والی تلخ کلامی کے بعد ایک شخص نے ان پر فائر داغ دیا۔ اس واقعے نے بین الاقوامی توجہ حاصل کی۔ بہت شور مچا۔ ایف آئی آر کٹی۔ بہت لے دے ہوئی۔ معاملہ تو جیسے تیسے نمٹ گیا مگر اپنے پیچھے تلخ یادیں چھوڑ گیا۔

سنتوش

پاکستان انڈسٹری کے زوال نے ہم پر جو اثرات مرتب کیے انہیں الفاظ میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ یہ فقط تفریح کی سب سے بڑی صنعت کا زوال نہیں تھا بلکہ اس نے ہمارے زرخیز ماضی پر بھی کاری ضرب لگائی اور ہمارے ذہنوں سے پڑھے

لکھے فلم ساز، مہذب اداکار، ادبی ذوق کے حامل اسکرپٹ رائٹرز اور باذوق فلم بینوں کی یاد محو کر دی۔ 80 اور 90 کی دہائی میں جب گنڈاسا کلچر ہماری فلم انڈسٹری کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا، تب کون کہہ سکتا تھا کہ ابتری کی سمت جاتی اس صنعت میں کبھی ندیم، وحید مراد، محمد علی اور سدھیر جیسے اداکار بھی تھے۔ کبھی یہاں سنتوش جیسا وجیہہ، تعلیم یافتہ اور باکردار فنکار بھی گزرا تھا جس کا ایک عالم معترف تھا۔

انہیں پاکستان فلم انڈسٹری کا پہلا سپر اسٹار کہا جاتا ہے۔

انہوں نے نہ صرف پاکستان، بلکہ برصغیر کی شوبز انڈسٹری پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ان کے انداز کو سیکڑوں اداکاروں نے کاپی کیا۔ ان کا اصل نام سید موسیٰ رضا تھا۔ وہ 25 دسمبر 1925 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلق ایک تعلیم یافتہ اور باعزت گھرانے سے تھا۔ علمی و ادبی ماحول میں پروان چڑھے، جس نے مطالعے کی جوت جگائی۔ قابل طالب علم تھے۔ انہوں نے حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی سے آئی ایس سی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اہل خانہ کی خواہش تھی کہ وہ سول سروس میں نام پیدا کریں مگر وہ ایک باغی تھے۔ انہوں نے فلم انڈسٹری میں قدم رکھنے کا فیصلہ کیا۔ قیام پاکستان سے قبل اس سمت آ گئے۔ 1947 میں وہ فلم ''اپنا'' میں نظر آئے۔ یہ فلم زیادہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی۔ پھر تقسیم کے بعد انڈسٹری کی رفتار تھوڑی دھیمی پڑ گئی۔ ان کی جہاں دیدہ نگاہوں نے دیکھ لیا کہ لاہور انڈسٹری میں ترقی کے زیادہ امکانات ہیں (اس زمانے میں لاہور کو بمبئی انڈسٹری پر فوقیت حاصل تھی) وہ ادھر آ گئے اور 1950 میں ایک پنجابی فلم ''بیلی'' میں جلوہ گر ہوئے۔ ''بیلی'' کامیاب ٹھہری، مگر ''آنسو'' کا تذکرہ زیادہ ضروری ہے۔ وہ پاکستان کی پہلی سلور جوبلی فلم تھی جس نے انڈسٹری کا چہرہ ہی بدل دیا۔ یقیناً پاکستانی فلمی صنعت کا مرد اوّل قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کہا جانے لگا کہ سنتوش کی صورت پاکستانی انڈسٹری کو اصل چہرہ مل گیا ہے۔ ہندوستانی فلم سازوں کو اندازہ ہوگا کہ انہیں کتنے بڑے نقصان سے گزرنا پڑا ہے۔

50 کے عشرے میں صبیحہ خانم اور سنتوش کمار نے کئی فلموں میں اکٹھے کام کیا جنہوں نے ریکارڈ بزنس کیا۔ ان فلموں میں غلام، رات کی بات، قاتل، انتقام، حمیدہ، سرفروش، عشق لیلیٰ، وعدہ، سردار، سات لاکھ، حسرت، کھڑا، دربار نمایاں ہیں۔ انور کمال پاشا کے ساتھ ان کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں۔ آنسو، قاتل اور سرفروش دونوں کی تخلیق صلاحیتوں کے ملاپ کا نتیجہ تھیں۔

''وعدہ'' اور ''سات لاکھ'' کی شوٹنگ کے دوران صبیحہ خانم اور سنتوش کمار ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے اور بالآخر دونوں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ اس محبت کا کرب ناک پہلو یہ ہے کہ سنتوش کمار پہلے ہی شادی شدہ تھے۔ ان کی بیگم جمیلہ ایک سلجھی ہوئی گھریلو خاتون تھیں۔ سنتوش خود بھی سمجھدار تھے۔ انہوں نے پہلی بیگم سے لاتعلقی اختیار نہیں کی۔ ان کی بیگم نے بھی کشادہ دلی سے صبیحہ کو قبول کر لیا۔ آخری دم تک ان کی دونوں شادیاں قائم رہیں۔ وہ شاید ان گنے چنے افراد میں سے ایک تھے، جو دو کشتیوں کا سوار ہونے کے باوجود ساحل تک بحفاظت سفر کیا۔

یہ تذکرہ بھی اہم ہے کہ پاکستان کا پہلا نگار ایوارڈ بھی فلم ''وعدہ'' کے لیے سنتوش کے حصے میں آیا۔ اس عظیم اداکار نے سن 1950 سے 1982 تک 84 فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ان کی اور صبیحہ کی جوڑی نے انڈسٹری کو کئی بلاک بسٹر فلمیں دیں۔ آخر کے برسوں میں انہوں نے کریکٹر رول خوب نبھائے۔ وہ 11 جون 1982 کو جہان فانی سے کوچ کر کے اور اپنے پیچھے اپنی میراث چھوڑ گئے۔ یہ انڈسٹری کے لیے ایک کرب ناک لمحہ تھا۔ بعد میں آنے والوں کے لیے خود کو ان کے اثرات سے بچائے رکھنا لگ بھگ ناممکن تھا۔ مصطفیٰ قریشی کی بات درست ہی ہے، جنہوں نے کہا تھا۔ ''یوں لگتا ہے کہ لفظ ''ہیرو'' بنا ہی سنتوش کے لیے تھا۔'' انہوں نے نہ صرف انڈسٹری کی آب یاری کی، بلکہ اسے وقار بخشا اور وسیع و عریض ہندوستانی انڈسٹری کے سامنے ایک چیلنج بن کر ابھرے۔

ان کے بھائی عشرت عباس المعروف درپن بھی پاکستانی فلمی صنعت کے معروف اداکار تھے۔ ایک بھائی ایس سلیمان نے پاکستانی فلمی صنعت کو بطور ہدایتکار یادگار فلمیں دیں۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

موت کے روبرو

شکیل ادریس

ہم آپ ٹی وی کی اسکرین پر ایسے رونگھٹے کھڑے کردینے والے مناظر دیکھتے ہیں جنہیں دیکھ کر ہی ہول اٹھنے لگتا ہے لیکن کیا کبھی کسی نے یہ بھی سوچا ہے کہ اتنی مشکل فلم بندی ہوتی کیسے ہے۔ ٹیلی ویژن کے ایک معروف کیمرا مین پر کیا گزری اسی واقعے کو پیش کیا گیا ہے۔

فلم بندی کے دوران میں آنے والے حادثے کا ذکر

''آج کا موسم حسین ہے۔'' شرنا بالفور نے اپنے شوہر ڈرائل سے کہا۔ اس وقت رات کے ساڑھے چار بجے تھے اور وہ اپنے منی ٹرک میں سوار تھے اور کروگر نیشنل پارک جنوبی افریقا جارہے تھے۔ ڈرائل کی عمر 40 برس جب کہ شرنا کی عمر 31 برس تھی اور وہ مثالی جوڑا سمجھے جاتے تھے۔ شرنا اپنے شوہر کی طرح سے مضبوط جسم کی مالک تھی اور افریقا کے جنگلات میں فوٹوگرافی کرتے ہوئے اسے قطعی خوف نہیں آتا تھا۔ وہ اسپیشل فورس اسکاؤٹ میں بھی رہ چکی تھی اور سوئٹزر لینڈ کے گنے کے ایک کھیت میں پروان چڑھی تھی۔ اس کے دو بھائی اور ایک بہن تھی۔ وہ کچھ کرنے کے جذبے کے تحت کام کررہی تھی کہ زندگی میں کچھ کر کے رہے گی۔ اس کا شوہر اور وہ خود اچھے فوٹوگرافر تھے اور جنگلات کے موضوع پر کئی کتابیں شائع کر چکے تھے۔ ان دنوں وہ ہاتھیوں کی زندگی پر شائع ہونے والی ایک کتاب پر کام کر رہے تھے۔

کروگر میں ہاتھی بڑی تعداد میں تھے۔ شرنا اس سے پہلے تقریباً آٹھ ہزار مربع میل کے علاقے میں گزشتہ آٹھ ماہ سے کام کر رہی تھی۔ اب ایک روز پیشتر انہوں نے ستارہ ریسٹ کیمپ میں ایک کمرا کرائے پر لیا تھا۔ انہیں تشکوان نامی ہاتھی کی تلاش تھی، جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ علاقے کا سب سے بڑا ہاتھی ہے۔

دوسرے حیوانوں کی عکس بندی کرتے ہوئے وہ جیک گریف کے بنگلے میں آگئے۔ اس وقت صبح کے سات بجے تھے۔ انہوں نے جیک سے پوچھا کہ کیا اسے تشکوان کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ جیک نے نقشہ کھول کر ایک جگہ انگلی رکھی اور بتایا کہ اس نے دو روز پیشتر اس ہاتھی کو یہاں دیکھا تھا۔

اس کی بات سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور پھر وہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہرے اور سوانا کی طرف چلنے لگے جہاں تشکوان کے ملنے کی توقع تھی۔ راستے میں انہوں نے زیبروں اور ہرنوں کی بہت سی تصاویر اتاریں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈرائل نے گھنے درختوں میں ایک ہاتھی کو تنہا ٹہلتے گھومتے دیکھا۔ وہ سڑک سے نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ ڈرائل ٹرک کی چھت پر چلا گیا اور اس نے دوربین آنکھوں سے لگا لی۔ چونکہ وہ گھنی جھاڑیوں میں تھا، لہٰذا ڈرائل اسے صحیح طریقے پر نہ دیکھ سکا۔ اس نے شرنا سے کہا۔ ''وہ ہاتھی بہت بڑا ہے، لیکن وثوق سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ تشکوان ہے یا نہیں۔''

شرنا کو دور کی چیزیں کم دکھائی دیتی تھیں۔ وہ چشمہ لگاتی تھی۔ مگر چشمہ چند روز پیشتر ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم نزدیک جا کر اسے کیوں نہیں دیکھتے؟ میں یہاں بیٹھی رہوں گی اور اپنا ناول پڑھتی رہوں گی۔''

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نیشنل پارک بورڈ نے اس جوڑے کو خصوصی اجازت دے رکھی تھی، وہ اپنی گاڑی سے اتر کر جنگل میں گھوم سکتے ہیں۔ جب کہ عام لوگوں کو اس کی اجازت نہیں تھی۔ اس وقت کوئی حیوان نظر نہیں آرہا تھا جن میں شیر، چیتا، گینڈا اور ریچھ شامل ہیں۔ کروگر پارک کی انتظامیہ اس معاملے میں محتاط تھی کہ کوئی عام آدمی جنگل میں گاڑی سے نہ اترے۔ اس لیے کہ حال ہی میں دو گارڈز کو حیوانوں نے ہلاک کر دیا تھا۔ ہاتھی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ شیر اور گینڈے تک کو ہلاک کر دیتا ہے۔ بعض اوقات وہ دوسرے ہاتھی سے دشمنی نکالتے ہوئے اسے بھی ہلاک کر دیتا ہے۔

ڈرائل نے اپنا کیمرا، فلم رول اور ایک چھوٹی سی تپائی سنبھال لی۔ پھر اس نے ایک بیلٹ اپنی کمر کے گرد کسا اور اعشاریہ 357 کا ریوالور لگا لیا۔

اس نے اپنی بیوی سے وعدہ کیا کہ اگر وہ ہاتھی تشکوان ہوا تو واپس آکر اسے وہاں لے جائے گا۔ پھر وہ اس طرف بڑھنے لگا۔ وہاں گھاس اتنی لمبی تھی کہ ڈرائل کو یقین تھا کہ ہاتھی اسے نہ دیکھ سکے گا۔ دس منٹ بعد وہ ان کانٹوں والی جھاڑیوں میں پہنچ گیا جس کی دوسری طرف ہاتھی تھا۔ وہ راستہ بناتا ہوا جھاڑیوں میں گیا تو کانٹے اس کے خاکی لباس سے رگڑ کھانے لگے۔ جب وہ مزید آگے بڑھا تو اسے ہاتھی کی پشت نظر آئی۔ وہ جوڑا تھا۔ ڈرائل سوفٹ مزید آگے گیا اور اس نے تپائی کو سیٹ کیا اور اپنا کیمرا اس پر رکھا۔ آہٹ پاکر دونوں ہاتھی مڑے۔ ان میں سے ایک زور زور سے سونگھنے اور اپنے کان پھڑ پھڑانے لگا۔ دائیں جانب والا ہاتھی بڑا تھا اور اس کی سونڈ تقریباً زمین کو چھو رہی تھی۔ جب کہ دوسرا نسبتاً چھوٹا تھا۔ ڈرائل بڑے ہاتھی کی تصاویر رسائل میں دیکھ چکا تھا۔ ”ارے! یہ تو تشکوان ہے۔“ اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”یہ تو بہت خوب صورت ہے۔“ پھر اس نے کیمرے کا شٹر آن کر دیا۔

افریقا کے بڑے ہاتھی عموماً تیرہ فٹ لمبے ہوتے ہیں اور ان کے پاؤں کی گولائی تقریباً 20 انچ ہوتی ہے۔ اس کی سونڈ ساڑھے پانچ سو پاؤنڈ تک ہوتی ہے۔ اپنی اس سونڈ سے وہ درخت تک اکھاڑ سکتا ہے۔ اپنے دشمن کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتا ہے اور چاہے تو زمین پر پڑی ہوئی ایک بیری کو بھی اٹھا سکتا ہے۔ جب ہاتھی کی کسی سے لڑائی ہوتی ہے تو وہ اپنی سونڈ کو بطور ہتھیار کام میں لاتا ہے اور جب اس کا شکار گر جاتا ہے تو وہ اس پر بیٹھ جاتا اور اپنا وزن اس پر ڈال دیتا ہے تاکہ اس کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جائیں۔

ڈرائل کو ہاتھی کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں۔ اس لیے جب تشکوان اپنا سر دائیں بائیں ہلاتا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوا آگے آیا تو ڈرائل کو قطعی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ اس کی حرکات سے محظوظ ہو رہا تھا۔ پھر ہاتھی ایک جگہ ٹھہر کر اپنے پاؤں زمین پر مارنے لگا۔ زمین سے دھول اڑنے لگی۔ پھر اس نے اپنی سونڈ دھمکی دینے والے انداز میں لہرائی۔

اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ڈر جاتا اور وہاں سے پلٹ کر آجاتا، لیکن وہ ہاتھی تشکوان کی تصاویر کھینچنے میں مصروف تھا۔ پھر اس نے تپائی کو وہاں سے اٹھا لیا اور کیمرا بند کرنے لگا۔ اسے تشکوان سے قطعی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آگے کانٹے دار جھاڑیاں تھیں اور اس کے بعد ایک تنگ سا راستہ۔ وہ اس طرف چل پڑا۔ تشکوان مڑا اور اس طرف بڑھنے لگا۔ تقریباً پچاس فٹ کے فاصلے پر وہ رک گیا اور زور سے چنگھاڑا۔ ڈرائل کا دل تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا۔ اسے محسوس ہو گیا کہ تشکوان اپنی برہمی کا اظہار کر رہا ہے۔ تشکوان ایک بار پھر آگے آیا۔ اس کے کان پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ اپنے سر کو نیچے کیے ہوئے تھا۔ اور واضح طور پر معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس پر حملہ کرنے والا ہو۔ ڈرائل کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی برہمی کا سبب کیا ہے۔ اس نے سراسیمہ ہو کر جھاڑیوں کے درمیان بنے راستے پر قدم رکھا۔ وہاں سے گزرنا پل صراط پر سے گزرنے سے کم نہیں تھا۔ اس لیے کہ کانٹے دار جھاڑیاں بھی کھال اتار سکتی تھیں۔

اسے دیر ہو گئی اور تشکوان وہاں آن پہنچا۔ اس نے زور کی ٹکر ماری۔ ڈرائل سرتاپا لرز گیا۔ اس کا جسم جھنجھنانے لگا۔ جب تشکوان نے دوسری بار ٹکر ماری تو ڈرائل کانٹے دار جھاڑیوں سے ٹکرا کر گر گیا۔ اس کی ران اور ایک بازو پر زبردست خراشیں آئیں اور خون بہنے لگا۔ وہ گھاس پر اوندھا پڑا تھا اور تاریکی اس کی آنکھوں میں اتر رہی تھی۔

تشکوان اپنے پیروں سے زمین پر دھمک پیدا کرتا ہوا پھر قریب آ گیا۔ اس کے جسم سے ناگوار بو آ رہی تھی۔ موت کو اتنا قریب پا کر ڈرائل نے اپنی زندگی بچانے کی کوشش کی اور گھاس پر کسی بیلن کی طرح سے لڑھکنے لگا۔ ''دھپ۔ دھپ۔ دھپ۔'' موت اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ پھر تشکوان نے اس کے نزدیک پہنچ کر اسے لات ماری۔ ڈرائل کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کا سر چکنا چور ہو گیا ہو۔ اس نے کرب سے سوچا کہ ہاتھی کے حملے سے کوئی زندہ سلامت نہیں بچ سکتا۔ اس کی موت یقینی ہے۔

اس نے ہاتھی کا ایک پاؤں تھام لیا تاکہ وہ حملہ نہ کر سکے۔ وہ پاؤں کسی ستون کی طرح سے لمبا چوڑا تھا۔ اس پر بال اگے ہوئے تھے۔ ڈرائل کی گرفت میں اس کا پاؤں صحیح طور پر نہیں آ پا رہا تھا۔ تشکوان نے اپنی سونڈ سے اسے تھام لیا اور دائیں بائیں حرکت دینے لگا۔ ڈرائل کی روح فنا ہو گئی۔ اس وقت اس پر قیامت گزر گئی جب تشکوان اس کی ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ وہ چیخنے چلانے لگا۔ پھر اس نے زور لگا کر ٹانگ چھڑا لی۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہے۔

یکبارگی تشکوان نے اسے اپنی سونڈ میں لپیٹا اور آسمان کی طرف اچھال دیا۔ وہ تیس فٹ تک فضا میں گیا اور پھر دھم سے کسی بے جان گڑیا کی طرح گھاس پر گر گیا۔ تشکوان پھر اس کی طرف آیا اور اس نے اپنے ایک دانت سے اس کے چہرے پر حملہ کیا۔ ڈرائل نے اس سے بچنا چاہا مگر ممکن نہ ہوا۔ وہ دانت اس کے چہرے سے رگڑ کھاتا ہوا سر میں جا لگا۔ اس کی چوٹ جان لیوا تھی۔ ڈرائل بے ہوش ہو گیا۔

اس کے سر سے نکلنے والے خون سے گھاس سرخ ہو گئی۔ تشکوان ایک بار اس کی طرف بڑھا، نزدیک آ کر وہ اس پر جھک گیا، لیکن کچھ کر نہ سکا اس لیے کہ اس کے دونوں دانت گھاس پر ٹک گئے تھے۔ چنانچہ تشکوان اور ڈرائل میں ایک فاصلہ قائم ہو گیا۔ اس بہیمانہ کھیل سے تشکوان خود اکتا گیا، لہٰذا مڑا اور گھنے جنگل کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا ہیولا نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔

☆.....☆

صبح کا وقت تھا، لیکن گرمی تھی۔ آسمان پر ایک بھی بادل نہ تھا۔ شرنا اطمینان سے ناول پڑھ رہی تھی۔ دس بج چکے تھے اور ڈرائل اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ بہرحال اسے کوئی تشویش نہیں تھی۔ مگر جب ایک گھنٹا اور گزر گیا تو وسوسوں اور واہموں نے اسے گھیر لیا۔ اتنی دیر تک تو تصویریں نہیں کھینچی جا سکتیں۔ وہ ٹرک ڈرائیو کر کے کہیں جانا نہیں چاہتی تھی۔

☆.....☆

جب ڈرائل کی آنکھ کھلی تو اس کا حلق خشک ہو رہا اور دماغ جھائیں جھائیں کر رہا تھا۔ دایاں کولھا جس پر ہاتھی نے پاؤں رکھ دیا تھا بری طرح سے اذیت دے رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس درد سے کیسے نجات حاصل کی جائے؟

دوپہر کا وقت تھا اور سورج پوری آب و تاب کے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

ساتھ چمک رہا تھا۔اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔اس کا ریوالور تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر پڑا تھا۔وہ اس کے لڑھکنے کے دوران ہولسٹر سے نکل گیا تھا۔اسے اپنا ریوالور اٹھانا تھا۔اس نے اپنی بیوی سے طے کر رکھا تھا کہ جب وہ فائرنگ کی آواز سنے تو اس کی مدد کو پہنچے۔گویا یہ ایک طرح کا سگنل تھا۔وہ ریوالور کی طرف کھسکنے لگا۔یہ اس وقت بڑا دقت طلب کام تھا،اس لیے کہ اس کا ایک کولھا تقریباً بیکار ہو چکا تھا۔اس کا دماغ کرب واذیت میں تھا اور وہ صحیح طور پر کچھ سوچ نہیں پا رہا تھا۔

ریوالور کے قریب پہنچ کر اسے اٹھانے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔بہرحال ریوالور جوں ہی اس کی گرفت میں آیا اس نے نال کو آسمان کی طرف کیا اور لگاتار تین فائر کیے۔ریوالور کو اس نے اپنے ہولسٹر میں لگا لیا۔دھوپ برے کی طرح اس کے جسم کو چھید رہی تھی۔وہ سرکتا ہوا کانٹے دار جھاڑیوں کے قریب ہو گیا۔پھر بے ہوشی کی ایک لہر آئی اور اس نے ڈرائل کو دنیا و مافیہا سے بے گانہ کر دیا۔

شرنا نے جب فائرنگ کی آواز سنی تو اسے پتا چل گیا کہ ڈرائل اسے بلا رہا ہے۔وہ مصیبت میں گرفتار ہے۔اس نے ٹرک کو اس طرف گھمایا اور نزدیک جا کر جھاڑیوں کا جائزہ لیا۔جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ چند فٹ کے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔اس نے کرب سے سوچا کہ ڈرائل موت و زندگی کی کشمکش میں گرفتار ہے۔اگر اسے وقت پر امداد نہ ملی تو وہ مر جائے گا۔

''ڈرائل!'' وہ چیخی۔''تم کہاں ہو؟''

اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔وہ ٹرک کی چھت پر چڑھ گئی تاکہ صاف طور پر دیکھ سکے۔اس کی یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔

ڈرائل کو تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو اس نے اپنے قرب وجوار میں کسی کو نہ پایا۔اس نے سوچا کہ فائرنگ کا دوسرا سگنل دینا چاہیے۔ریوالور نکال کر اس نے دو فائر کیے،لیکن تیسرا نہ کر سکا۔اس کا ہاتھ جھول گیا۔نتیجے کے طور پر ریوالور ہاتھ سے گر پڑا۔وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو چکا تھا۔

شرنا اس سے تین سو فٹ کے فاصلے پر تھی۔ایک گولی شائیں سے اس کے سر پر سے گزر گئی۔وہ چھلانگ مار کر ٹرک کی چھت سے اتر گئی اور آواز کی سمت کا دھیان کر کے

وادی سندھ کی تہذیب

زمانہ مسیح سے قبل دنیا میں تین بڑی تہذیبیں تھیں۔ایک ہڑپہ،موئن جوداڑو اور دوسری دو تہذیبیں مصر میں دریائے نیل کے کنارے فرعونوں کی تہذیب اور مشرق وسطیٰ میں میسوپوٹیمیا کی تہذیب تھیں۔ان تینوں ہم عصر تہذیبوں کا زمانہ 3000 ق۔م سے 1500 ق۔م بتایا جاتا ہے۔اس دور کو کانسی کا دور بھی کہتے ہیں کیونکہ اس زمانے میں زیور، سکے اور برتن بنانے کے لیے کانسی کا استعمال عام تھا۔ سندھ کی تہذیب کو ہڑپہ تہذیب کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے کیونکہ ہڑپہ وہ پہلا شہر تھا جس کے آثار قدیمہ انیسویں صدی کے وسط میں ملنے شروع ہوئے اور 1920ء میں پورا ہڑپہ شہر دریافت ہوا۔یہاں سے ملنے والی مہروں۔برتنوں اور زیورات سے ماہرین آثار قدیمہ نے اندازہ لگایا ہے کہ 2200 قبل مسیح سے لے کر 1900 قبل مسیح تک ہڑپہ کی تہذیب اپنے عروج پر تھی پھر اچانک ہی اس تہذیب پر زوال آ گیا اور یہ تہذیب ماضی کی تہوں میں گم ہو گئی۔آثار قدیمہ کے ماہرین ہڑپہ کے گردونواح سے ملنے والے انسانی ڈھانچوں سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ وہ کون سے عوامل تھے جو اس تہذیب کی تباہی کا سبب بنے۔مختلف شواہد سے سائنسدان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شروع شروع میں اس تہذیب کے لوگ انتہائی امن پسند،ملنسار اور بااخلاق تھے۔ہر شہری کو بنیادی سہولتیں میسر تھیں اور معاشرہ طبقاتی اونچ نیچ سے پاک تھا مگر آہستہ آہستہ سوسائٹی میں بگاڑ آتا گیا۔ معاشی طبقات وجود میں آ گئے۔حکمرانوں اور اشرافیہ کی طرف سے غریب اور لاچار طبقے کے لیے ناانصافیاں بڑھ گئیں۔نتیجتاً معاشرے میں ایک ایسا طبقہ وجود میں آ گیا جس نے بزور طاقت وسائل پر قبضہ کرنا چاہا۔اس کشمکش سے معاشرے میں تشدد،لاقانونیت اور انارکی پھیلیں۔رہی سہی کسر موسمیاتی تبدیلیوں اور وبائی امراض نے پوری کر دی اور اس طرح دنیا کی یہ عظیم تہذیب مکمل طور پر صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو گئی۔

مرسلہ:احمد توحید۔فیصل آباد

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

اس طرف دوڑی، جہاں اس کے اندازے کے مطابق ڈرائل کو ہونا چاہیے تھا۔ تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میدانِ جنگ میں آگئی ہو۔ جھاڑیاں ٹوٹی ہوئی تھیں اور گھاس ادھڑی ہوئی تھی۔ کیمرا ٹوٹا پڑا تھا اور اس کے پرزے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہ ڈرائل پر پڑی۔ وہ سمٹا سمٹایا ایک جھاڑی کے قریب پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ چکی ہو۔ وہ بے جان سا لگ رہا تھا، ممکن ہے بے ہوش ہو۔ ”مدد.....مدد۔“ ڈرائل نے جیسے سرگوشی میں کہا۔

”ہاں۔ میں آگئی ہوں۔“ شرنا نے اس کے قریب پہنچ کر تسلی دی۔ پھر پانی کی بوتل اس کے منہ سے لگا دی۔ ڈرائل نے ایک ہی سانس میں نصف بوتل خالی کر ڈالی۔ اس کی ایک ٹانگ عجیب سے زاویے پر مڑی ہوئی تھی۔ جب کہ دوسری ٹانگ متورم تھی۔ یہ صورتِ حال کافی بھیانک تھی۔ شرنا تذبذب میں گرفتار تھی کہ اپنے شوہر ڈرائل کے دو سو پاؤنڈ وزنی جسم کو کس طرح سے وہاں سے اٹھائے اور ٹرک میں ڈالے۔

پہلے اس نے کانٹوں کی جھاڑیاں ہٹا کر راستہ صاف کیا اس کے بعد ٹرک کو ریورس کر کے وہاں تک لائی۔ اس کے بعد وہ ڈرائل کی طرف گئی۔ وہ سیدھا چت پڑا تھا۔ شرنا نے کوشش کی کہ اسے اپنی پیٹھ پر اٹھالے، لیکن وہ وزنی آٹے کی بوری کی طرح سے تھا۔ چونکہ بے ہوش تھا، اس لیے اس نے اپنی طرف سے کوئی کوشش نہیں کی۔ ڈرائل کے دونوں ہاتھ پیٹھ کے نیچے تھے۔ شرنا نے انہیں کھینچ کھانچ کر اس کے جسم کے نیچے سے نکالا۔ پھر دلاسہ دینے والے انداز میں کہا۔ ”تم میرا ساتھ دو۔ ہم اس پریشانی سے نکل سکتے ہیں۔“

ڈرائل ہوش میں آچکا تھا۔ اس نے زور لگا کر خود کو اٹھایا۔ اس کے منہ سے کربناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ شرنا نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور ٹرک کی طرف گھسیٹنا شروع کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح سے اس نے اپنے شوہر کو ٹرک پر لاد لیا۔ اس کوشش میں اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ وہ تھوڑی دیر تک بیٹھی ہانپتی رہی۔

جب اس کے حواس بحال ہو گئے تو اس نے ٹرک چلانا شروع کر دیا۔ وہ نہایت احتیاط سے اسے چلا رہی تھی، اس لیے کہ اگر کوئی کانٹا ٹائر میں پیوست ہو جاتا تو ٹائر برسٹ ہو جاتا اور ایک دشواری اور کھڑی ہو جاتی۔ سڑک کو تلاش کرنے میں کافی پریشانی اٹھانا پڑی۔ بہرحال بیس منٹ کے بعد وہ سڑک مل گئی جس پر ڈرائیو کرتے ہوئے وہاں آئے تھے۔

پارک کی انتظامیہ کا ہیڈ آفس وہاں سے 43 میل دور اسکوکوزا کے مقام پر تھا۔ 75 میل کی رفتار سے ٹرک چلانے کے دوران اسے کئی بار ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی بینائی جواب دے رہی ہو۔ کوئی بھی حیوان اس کی راہ میں آکر راستہ مسدود کر سکتا تھا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ ڈرائل بے ہوش نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ مڑ کر اس سے گفتگو کر رہی تھی اور اس سانحے کے بارے میں استفسار کر رہی تھی۔ گفتگو ان کی درندگی پر وہ حیران رہ گئی۔

وہ ڈرائل سے سوالات کر رہی تھی۔ ”اسکوکوزا“ یہاں سے کتنی دور ہے؟ میں اس سڑک پر چل رہی ہوں۔ ہم وہاں تک پہنچ جائیں گے یا کوئی اور راستہ اختیار کرنا ہے؟ تمہیں معلوم ہے نا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں؟ یہاں گھیکوار کی خوشبو اتنی کیوں آرہی ہے؟ غالباً اسے کسی منصوبے کے تحت اگایا گیا ہے۔

اسکوکوزا میں اسپتال کے ڈاکٹر نے ڈرائل کو ٹرک سے اتارنے کی اجازت نہیں دی اور دو ڈرپس لگا دیں۔ جب ڈرائل قدرے ہوش میں آگیا اور کراہنے لگا تو ڈاکٹر نے بڑے اسپتال تک اسے منتقل کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر منگوایا۔ بڑے اسپتال پہنچ کر ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے اس کا معائنہ کیا۔ ان کی رپورٹ تھی کہ اس کی ایک ٹانگ کولھے کے پاس سے مخالف سمت میں مڑ گئی ہے، چھ پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ کھوپڑی میں چوٹ لگی ہے اور کاسۂ سر ایک جگہ سے ٹوٹ گیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے علاوہ کہیں کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی۔

اس کا کئی مہینے تک علاج ہوتا رہا۔ وہ صحت یاب ہو گیا۔ اس کے حوصلوں اور قوت ارادی نے اسے سہارا دیا۔ وہ پھر سے افریقا کے ان جنگلات میں اپنی بیوی کے ساتھ ہاتھیوں کی فوٹوگرافی کرنے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا پروجیکٹ ہے کہ وہ ہاتھیوں پر باتصویر کتاب مرتب کرے۔ بالآخر وہ کامیاب رہا۔ وہ اب بالکل صحت یاب ہو چکا ہے۔ بس اس کی ایک ٹانگ پر ہاتھی کے پاؤں کا نشان ہے۔

☆☆☆☆☆

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نایاب پرندے

سعید احمد سلطان

موسمی تغیرات اور انسانوں کا ظلم، ہمارے آس پاس اڑتے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرتے، یہ خوب صورت، خوب صورت سے پرندے آہستہ آہستہ معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ یہ پرندے انسانی زندگی کے لیے ضروری بھی ہیں اگر وقت رہتے ان کی افزائش نسل کی جانب توجہ نہ دی گئی تو یہ ماضی کا قصہ ہو جائیں گے۔

آہستہ آہستہ معدوم ہوتے پرندوں کا تذکرہ

پرندے!
انوکھے رنگوں سے آراستہ پرندے!
ہماری دھرتی کا حسن!
حسین اور دلکش پرندے!
جن کی چہچہوں سے بجتیں دل آویز، شامیں عطر بیز بن جاتی ہیں۔
جن کے گیتوں سے ماحول گنگنا اُٹھتا ہے، مسکرا اُٹھتا ہے۔
جن کے پروں کی رنگینی سے موسمِ بہار کے رنگ جھلکنے لگتے ہیں، روز و شب مہکنے لگتے ہیں۔
حسنِ ترتیب و توازن کے یہ شاہکار ماحول میں جمالِ دلنشیں کے منظر روشن کر دیتے ہیں۔
چڑیا، چکور، بلبل، ہدہد، فاختہ، طوطے، تیتر، بٹیر، کبوتر، چیپے، کوئل، لالی، عقاب، کونج، مُرغابی کس کس پرندے کا نام لیں اور کون سے پرندے کا تذکرہ کل پر اُٹھا رکھیں۔
ہرے بھرے بلند و بالا درختوں، سرسبز جھاڑیوں، دیواروں سے لپٹی بیلوں، قدیم عمارتوں، گھنے جنگلوں، میں بنے اور بنائے گئے گھونسلوں میں رہتے یہ خوبصورت پرندے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ایک جانب ماحول دوستی کا حق نبھاتے ہیں، تو دوسری جانب فطرت کے پرستاروں کے قلب ونظر کی تسکین کا سامان بھی کرتے ہیں۔

صبح شام کے لمحات میں، روشن ہوتے مدھم پڑتے اوقات میں ان پرندوں کے گیت ساعتوں کے سنگ سفر کرتے ہوئے، ماضی حال اور مستقبل کے اندیشہ ہائے دُور دراز سے پَرے لے جانے کا ذریعہ بنتے ہیں تو ساتھ ساتھ وقت، منظر اور ماحول میں وقوع پذیر ہونے والی ناگزیر اور لازمی تبدیلیوں کی نشاندہی کر کے، نئے موسموں کی نوید بھی سُناتے ہیں۔

کوئل کُو کُو کرے تو آم کے درختوں پر بُور کی بہار، سب سنگھار کر کے جلوہ گر ہو۔

مُرغابی کی اُڈاری باد بہاری کا منظر دکھائے تو موسم سرما کی دید ہو۔

کونج کُر لائے تو ہجر، فراق اور دُکھ کے دن ستانے لگیں۔

تلور کا ترانہ، سردی، گہرے اور نقطہ انجماد کا فسانہ سُناتا ہے تو بلبل کا گیت بہار کی نوید ساتھ لاتا ہے۔

اور جب حُسن، دلکشی، رعنائی اور باکمال انداز پذیرائی کے شاہکار، پرندوں کے بادشاہ مور کے دھنک رنگ پَر عجب دل آویز انداز میں لہراتے ہیں تو سُریلا ساون سُر بکھیرنے لگتا ہے۔

آسمان کی بلندیوں پر، درختوں کی چوٹیوں پر، اونچے پہاڑوں پر کالے سیاہ بادل چھاؤنی جما کر بارش برسانے پر تُل جاتے ہیں، تو نیلے سبز اور سفید کاندھوں والے مور رقص پر مائل ہو کر دلوں کو گھائل کرنے لگتے ہیں۔

اساطیری حوالوں کے مطابق حضرت انسان کے ساتھ جنت سے نکالا گیا یہ پرندہ جسے مور کہتے ہیں، ساون سے آراستہ موسم سے متاثر ہو کر، جب اپنے حُسنِ جہاں سوز پہ خود والہ وشیدا ہو کر رقص کرنے لگتا ہے، جب اس کے کم از کم پانچ فٹ لمبے رنگین پر جاپانی پنکھے کی صُورت کھلتے ہیں تو ماحول عجب دل نواز، سحر اعجاز رنگوں سے بھر جاتا ہے۔ اس کی کُوک، پرندوں کے حسن کے متوالوں، دل والوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔

کم از کم نو رنگوں کے دلکش امتزاج سے تخلیق شدہ مور کے پروں کا پھیلاؤ آنگن اور اردگرد کی ساری وسعت کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ رقص کرتا ہوا مور عجب دلکش، دلدار اور نظر نواز منظر دکھاتا ہے۔ دیکھنے والوں کا جی لبھاتا ہے۔ اپنے آپ اور ماحول سے بے خبر ہو کر، یہ رقص کے سارے ہُنر آزماتا ہے۔ اس کے دائرے میں پھیلے ہوئے پروں کے جھٹکنے سے، بدن کے لچکنے سے، ماحول میں عجب طرب انگیز جھنجھنا ہٹ سی بکھر جاتی ہے۔ اِک دل آویز آہٹ سی بکھر جاتی ہے، جس کو سُن کر، محسوس کر کے قلب ونظر کی کیفیت عجب پیرہن اوڑھ لیتی ہے۔

موسم کی دلکش ادا کے ساتھ مور کا والہانہ رقص جاری رہتا ہے۔ تسلسل اور روانی کے ساتھ، مسلسل دائرے میں گھومنے کا عمل کئی کہانیاں کہتا اور سُناتا چلا جاتا ہے، اپنے حسن پر آپ اِترانا آغاز ہوتا ہے کہ والہانہ پن کو اچانک ٹھوکر لگتی ہے، نظریں اچانک اپنے پاؤں پر پڑتی ہیں، اور پاؤں کا بھدا پن، غُرورِ حسن کو ٹھوکر لگاتا ہے!

رقص رُک جاتا ہے۔ بے خودی کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ خواب بکھر جاتے ہیں اور روایتوں کے مطابق مور کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں، والہانہ رقص پہ مائل مورنی، مور کی آنکھوں سے اُبلتے ندامت اور پشیمانی اور دُکھ کے سیلاب کو اپنی چونچ میں بھر لیتی ہے اور بار آور ہو جاتی ہے۔

ہاں یہ روایتی کہانی ہے، سینہ بہ سینہ چلتی سفر کرتی نشانی ہے، ابرِ نیساں کی طرح اس کی حقیقت بھی کہاں تک اصلیت سے آراستہ ہے، کسی اور وقت کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔

جدید تحقیق بہت مختلف ہے۔ مورنی، مور سے ملنے کے بعد ایک جھول میں تین سے پانچ یا پانچ سے آٹھ انڈے دیتی ہے۔ گھروں میں مور پالنے والوں کے مطابق جدید خوراک کے استعمال سے بیس تک بھی انڈے لیے جا سکتے ہیں۔ چڑیا گھروں میں ان انڈوں سے بچے نکالنے کے لیے انکیوبیٹرز کے علاوہ چینی مُرغی کا اور گھروں میں دیسی گوک مرغی کا سہارا لیا جاتا ہے، جو ان انڈوں پر بیٹھتی ہے، اُنہیں سیتی ہے اور کچھ روایات کے مطابق اکیس، بعض دوسرے لوگوں اور مور پالنے کے شوقین بہت پیارے برخوردار علی اشرف ایڈووکیٹ کے مُطابق پچیس تا ستائیس دنوں بعد اُن سے بچے نکل آتے ہیں۔

ماہرین اور مشاہدہ کاروں کے مطابق جنگلی مور عام طور پر بیس برس کی عمر حاصل کر پاتے ہیں۔ دُنیا بھر میں ان کی تین اہم اقسام ہیں۔ نیلے، سبز اور سفید رنگ کے حامل مور۔

اس کی دو مشہور قسمیں پاکستان، بھارت اور سری لنکا کے جنگلوں میں پائی جاتی ہیں۔ جبکہ سبز مور جاوا اور میانمار (برما) میں پایا جاتا ہے۔

تیسری قسم ایک اور کم معروف قسم ہے جو کانگو مور کہلاتی

ہے اور افریقا کے گھنے برساتی جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔

گھریلو افزائش میں اس کی کئی رنگوں پر مشتمل اقسام پیدا کی جاچکی ہیں۔

مقامی پرندوں سے ان کی ہمیشہ اَن بن رہتی ہے، اور کم ہی بنتی ہے، شاید یہ حُسن کا زعم ہو جو اِن کو دوسروں سے ملنے، اور الگ تھلگ رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

بلیو اور گرین شولڈر مور کے پَروں میں مجموعی طور پر نو رنگ گندھے ہوتے ہیں۔ تعداد میں تیس پَر چھوٹے، چار بڑے اور کم از کم بیس درمیانے یا مناسب سائز کے ہوتے ہیں۔

مور کی لمبائی اوسطاً پینتیس تا پچاس انچ ہوتی ہے۔ دُم کی لمبائی عموماً پانچ کے قریب ہوتی ہے۔ عام مور کا اوسط وزن چار سے چھ کلوگرام تک ہوتا ہے۔

آنکھوں کو بھلا لگنے اور بصارتوں پہ جادو کر دینے والا مور بلیو یا گرین شولڈر کہلاتا ہے۔ نر زیادہ دلکش اور خوبصورت ہوتا ہے۔ نر مور اور مادہ مورنی کہلاتی ہے۔

درختوں پر رہنے والا یہ پرندہ بھاری ہونے کی وجہ سے شاخوں پر بیٹھ کر نہیں کھا سکتا، لہٰذا زمین پر آ کر کیڑے مکوڑے، پھولوں کی پتیاں، پودوں کی نرم کونپلیں، بیجوں کے بیرے، ریپٹائلز اور ایمفیبینز کھا لیتا ہے۔ کھانے کے لیے صبح سویرے اور شام کے وقت نکلتا ہے۔ اس کی آواز پورے جنگل میں گونجتی ہے اور دُور دُور تک سُنائی دیتی ہے۔ دن کے گرم اوقات میں یہ گھنے جنگلوں کے گہرے سایوں میں رہتا اور آرام کرتا ہے۔ خوراک میں انتخاب اور پسند کا قائل نہیں، بلکہ جو چیز بھی چونچ میں آ جائے وہ ان کی خوراک بن جاتی ہے، چاہے وہ جنگلی چوہے ہوں کہ مینڈک، چھپکلیاں ہوں کہ سانپ، کیڑے ہوں کہ جھینگر، جو شے سامنے آ جائے پیٹ میں چلی جاتی ہے۔

ہاں پالتو موروں کو ڈبل روٹی، روٹی، دلیہ، جو، مکئی، پنیر اور پکے ہوئے چاول وغیرہ دیے جاسکتے ہیں، اور یہ ان کو شوق سے کھا لیتے ہیں۔ گوشت، سبزیوں، سبز پھلیوں اور پھلوں سے بھی رغبت رکھتے ہیں۔

مور، حسن، خوبصورتی اور دلکشی و دل آویزی کا حسین استعارہ ہے، اس کو گیتوں کا، نغموں کا، نظموں اور غزلوں کا حصہ بنایا گیا۔ اس پرندے کو شاعری میں جگہ دینے کے علاوہ زیورات میں بھی شامل کیا گیا۔ مور کو محبت کی علامت بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس کو پاک اور معصوم پرندہ سمجھ کر، اس کے پَر قرآن مجید، سیپاروں اور کتابوں میں رکھے جاتے ہیں۔ سرائیکی زبان میں مور کے آنکھ نما پَر کو بَنّی کہا جاتا ہے۔ دوستوں کو یہ بَنّی تحفے کی صورت پیش کی جاتی ہے، گھروں میں یہ پَر باندھ کر گلدان میں سجائے جاتے ہیں۔

پاکستان میں موروں کا گھر کلر کہار اور بہاول نگر کو سمجھا جاتا ہے۔ سندھ اور بلوچستان میں بھی پائے جاتے ہیں۔

مور کی بناوٹ، خوبصورتی اور رعنائی نے بادشاہوں کو تاجوروں کو، راجوں کو اپنا اسیر بنایا تو تختِ طاؤس تشکیل ہوا، اور اس پر راجے، مہاراجے، سلطان، بادشاہ، شہنشاہ بیٹھا کرتے تھے اور ان کو ہوا دینے کے لیے مور چھل کا استعمال ہوتا تھا، مور چھل جھلنے اور ہلانے کا کام درباری کیا کرتے تھے۔

مور یا طاؤس! ایک تاریخی اور اساطیری پرندہ ہے جس کی عمر کی قدامت اور طوالت حضرتِ انسان کی عمر کے برابر ہے، نظر افروز رنگوں سے آراستہ یہ پرندہ جب درخت کی ٹہنی شاخ سے اُڑان بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ تک کا سفر کرتا ہے تو ماحول اس کے پھیلے ہوئے لمبے پروں سے پیدا ہونے والی خاص آواز سے بھر جاتا ہے، سناٹے یکلخت ٹوٹ جاتے ہیں، می ی ی ی ی ی ی ی آؤ کی طویل آواز جنگل کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیل جاتی ہے۔

پرندوں کی جبلت، فطرت، اور اقسام وغیرہ کا مطالعہ کرنے والے ماہرین جنگلی حیات بتلاتے ہیں کہ نر مور کی یہ آواز مادہ مورنی کو قریب بلانے کا سندیسہ ہوتی ہے اور وہ دوڑی چلی آتی ہے۔ گھنے بادلوں سے ڈھکے آسمان سے کہیں کہیں بوندیں برس رہی ہوں، نرم رو ہوا کا خرام جاری ہو تو نیلے رنگ سے سنورے ہوئے کندھوں والا نر مور مست ہو کر والہانہ انداز میں رقص شروع کر دیتا ہے۔ کھل کر اک خاص گولائی میں پھیل جانے والے بے شمار رنگوں سے آراستہ پر، جب مور کے پیروں کی تال سے، ہم آہنگ ہو کر اک خاص جھنک کے ساتھ جھومتے ہیں تو چاروں طرف سرخوشی کا عالم مہکنے مُسکرانے لگتا ہے۔

رقص جاری رہتا ہے، ہوا مسکراتی رہتی ہے، ماحول گنگناتا رہتا ہے، اور اس عالم میں بے خودی کی صورت کچھ یوں ہوتی ہے،

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

مور مست ہو کر جنگل میں جب رقص کرتا ہے، اور پاس سے گزرنے والی ہوائیں الاپ دے رہی ہوتی ہیں، بارش کی

URDUSOFTBOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بوندیں انوکھے جذب وکیف کے ساتھ گھنے درختوں کے پتوں پہ تھاپ دے رہی ہوتی ہیں، تو مور کے پھیلے ہوئے پروں پہ اُتری ہوئی بے شمار آنکھیں اپنے ارد گرد کے سارے دلکش منظروں کو اپنے اندر اُتار رہی ہوتی ہیں، اپنا سراپا سنوار رہی ہوتی ہیں، اور سبحان تیری قدرت کے زمزمے زبانوں پہ بہنے لگتے ہیں۔

پرندے ہمارے ارد گرد پھیلے، بکھرے، ماحول کی خوبصورتی میں بے حساب اضافہ کرتے ہیں، سو ہمیں اپنے رب کا ہر دم شکر ادا کرتے رہنا چاہیے کہ جس نے ہمیں خوبصورت موسموں، منظروں اور پرندوں سے نواز دیا، اور ہمارے چاروں جانب اُن کے پروں کے خوبصورت رنگ بکھیر دیئے۔

مینا

عمر عزیز کے کسی مرحلے میں بولتے ہوئے طوطے کی باتیں اور باتیں کرتی مینا کی کہانی تو آپ نے سنی ہوگی!

پرانے زمانوں میں جب تاجر اور مسافر کسی قافلے کی سنگت اختیار کر کے دور دیسوں کی مسافرت اپناتے تو گھر والوں سے ان کی فرمائشیں پوچھتے کہ نئے دیس سے، جب واپس آئیں تو ان کے لیے کیا سوغات لائیں؟

تب ہر کوئی اپنی چاہت بتلاتا، اپنی پسند سناتا۔ ایسے میں کوئی لڑکی، کوئی بیٹی بڑے لاڈ سے، بہت چاؤ سے فرمائش کرتی، ''بابا! میرے لیے بولنے والی مینا لانا، وہ مجھے ملک ملک کے قصے سنائے گی، شہر شہر کے افسانے بتلائے گی، گاؤں گاؤں کی داستانیں سکھائے گی۔ اور جب آپ گھر نہیں ہوں گے تو اپنی میٹھی باتوں سے میرا دل بہلائے گی۔''

ایک دور تھا جب ہم سرما کی سرد طویل راتوں میں دادی اماں کی آغوش میں بیٹھ کر انوکھی کہانیاں سننے کی فرمائش کرتے تھے، اور وہ اپنے گرد لحاف لپیٹ کر، ہم سب کو سمیٹ کر یوں گویا ہوتیں!

''ایک تھا بادشاہ، ہمارا تمہارا خدا بادشاہ! اس بادشاہ کی سات بیٹیاں تھیں، جو شہزادیاں کہلاتیں۔ سب شہزادیاں حسن وجمال سے مالا مال، عقل ودانائی میں بے مثال، مگر وہ جو سب سے چھوٹی شہزادی تھی، وہ بڑی لاڈلی، بڑی چہیتی تھی، اس کو بالکل تم سب کی طرح کہانیاں سننے کا شوق تھا، وہ ہر رات ملکہ ماں کی گود میں چڑھ کر نئی کہانی سنانے کی فرمائش کرتی۔ ملکہ ماں ہر رات شہزادی کو نئی کہانی سناتیں، شہزادی کا دل بہلاتیں،

اور وہ کہانی سنتے سنتے ان کی گود میں ہی سو جاتی۔

پھر ملکہ ماں کے پاس کہانیوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا، شہزادی کی فرمائش نئی کہانی کی ہوتی، سوچ بچار کے بعد ملکہ ماں نے بادشاہ سلامت کو مسئلہ بتایا، بادشاہ سلامت نے دربار بلایا اور عقلمند وزیر نے مشورہ دیا کہ کوئی تاجر ملک چین جائے وہاں سے بولتی ہوئی مینا لائے جو ہر رات شہزادی صاحبہ کو نئی کہانی سنائے گی، ان کا دل بہلائے گی''۔

دادی اماں ہر رات ہمیں انہی بولنے والی میناؤں اور باتیں کرتے طوطوں کی کہانیاں سنایا کرتیں۔ اور جب ہم بڑے ہو گئے، کتابیں پڑھنے لگے، تب آگہی ملی کہ اٹھارہویں صدی میں اردو میں ایک داستان لکھی گئی تھی طوطا مینا کی کہانی۔ طوطا جو باتیں کرتا تھا، مینا جو کہانیاں سناتی تھی۔

حیرت کی بات ہے اکثر دوسرے پرندوں کی طرح مینا کو شاعری میں جگہ نہیں ملی، اگر ملی بھی ہے تو بہت کم کم۔ ہاں البتہ نثر میں مینا کو بہت مان دیا گیا اور اس کے فسانے لکھے گئے۔

مینا کیسا پرندہ ہے؟ داستانوں میں کیوں اس کے تذکرے ملتے ہیں؟ انسانوں سے اس پرندے کی مصاحبت اور رفاقت کب سے ہے اور کیوں کر ہے؟

یہ سب سوال کھوج پسند ذہنوں کو تحقیق پر آمادہ کرتے ہیں۔

سیاہی مائل بھورے پر، نارنجی رنگ کی چونچ، کالی سیاہ گول آنکھوں کے نیچے گردن کی طرف گھومتا، خوبصورت شکل بناتا زرد رنگ کا لہریا، پیلی رنگت لیے پنجے، لمبی دم رکھنے والے نایاب پرندے کا نام مینا ہے، جو خاص طور جنوب ایشیائی ممالک میں پایا جاتا ہے، اور پالتو ہونے کی وجہ سے دنیا بھر میں پھیل گیا ہے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU SOFT BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

بھارت، پاکستان، میانمار، سری لنکا، نیپال بھوٹان، بنگلہ دیش، ترکمانستان، افغانستان، قازقستان، ملائیشیا، تھائی لینڈ وغیرہ کے علاوہ ڈھیر سارے ایشیائی ممالک مضبوط چنچ والے اس پرندے کا مسکن ہیں۔

جارحانہ مزاج کے اس پرندے کا عام طور پر وزن 109 سے 130 گرام تک ہوتا ہے۔ مادہ مینا کا وزن نر کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی عموماً 23 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ موسم بہار میں مادہ مینا مہارت سے بنائے ہوئے یا کسی دوسرے پرندے سے چھینے ہوئے گھونسلے میں چار سے چھ چتکبرے انڈے دیتی ہے، جن کی رنگت سبزی مائل ہوتی ہے، گھونسلا اگرچہ مادہ مینا بناتی ہے لیکن اپنے انڈوں کو نر اور مادہ مل کر سیتے ہیں۔ اور انڈوں سے بچوں کے نکل آنے پر دونوں مل کر انہیں خوراک کھلاتے ہیں۔

مینا کی خوراک ہر طرح کے پھل، سبزیاں اور بیج ہیں۔ کیڑے مکوڑے اور پروں والے حشرے بھی ان کی غذا بن جاتے ہیں۔ خاص طور پر زرعی اجناس اور فصلات کو نقصان پہنچانے والے کیڑے ان کی مرغوب غذا ہیں۔ یوں گویا مینا ایک انسان دوست پرندہ ہے۔ خزاں کے دنوں میں جب سردی بڑھ جاتی ہے اور کیڑے مکوڑے دکھائی دینا ختم ہو جاتے ہیں تو مینا سڑکوں اور کچے راستوں کے کناروں پر خوراک تلاش کرتے پائی گئی ہے۔ کیڑے مکوڑے کھانے کی وجہ سے مینا کو دنیا بھر میں پسند کیا جاتا ہے کیونکہ یہ فصلوں کو نقصان پہنچانے والے حشرات اور کیڑوں کا خاتمہ کر کے بالواسطہ طور پر فصلوں کی پیداوار میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

اگرچہ عام طور پر مینا کا رنگ سیاہی مائل بھورا ہوتا ہے لیکن جغرافیائی منطقوں اور موسمی حالات کے تحت ان کی رنگت اور وزن میں فرق پڑ جاتا ہے۔ اس کی کئی اقسام ہیں۔ لیکن پسندیدہ ترین قسم بولنے والی مینا کی ہے، جو ہر ایک کی نقل اتارنے میں مہارت رکھتی ہے۔

حالات موافق رہیں تو مینا پچیس برس کی عمر بھی حاصل کر لیتی ہے۔

مینا کو دنیا بھر میں شہرت اس باعث ملی ہوئی ہے کہ یہ آوازوں کی نقل کرنا جانتی ہے۔ ہر طرح کے لفظوں، جملوں اور آوازوں کو توجہ سے سن کر ان کی ہو بہو نقل کرنے میں اس پرندے کو کمال مہارت حاصل ہے۔ ماہرین کے مطابق دنیا بھر میں کوئی ایسا پرندہ نہیں ہے جو، آوازوں کی نقالی اور جملوں کی ادائیگی میں مینا کا مقابلہ کر سکے۔

مینا کے مزاج میں تلخی اور تیزی بے پناہ ہوتی ہے۔ یہ پرندے نہ صرف آپس میں لڑتے جھگڑتے، شور مچاتے رہتے ہیں بلکہ اگر ان کے گھونسلے کے قریب کوئی دوسرا پرندہ بھی آجائے تو اس کے ساتھ چونچیں لڑانا اور جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ مینا کے پروں کے نچلی طرف سفید رنگ کے دھبے ہوتے ہیں جو اس وقت دکھائی دیتے ہیں، جب یہ اڑ رہے ہوں۔

نر مادہ مینا زندگی بھر ساتھ نبھانے والے پرندے شمار ہوتے ہیں، لیکن اگر جوڑے میں سے کوئی ایک بھی ناگہانی حالات کا شکار ہو کر دار عدم کو کوچ کر جائے تو دوسرا پرندہ فوراً متبادل تلاش کر لیتا ہے، تاکہ کوئی پرندہ اکیلا نہ رہے۔ عموماً یہ درختوں کی محفوظ شاخوں پر گھونسلے بناتے ہیں۔ لیکن پرانے درختوں کی کھوہ میں بھی بسیرا کر لینا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں۔

مینا ہر وقت شور مچاتی رہتی ہے۔ جنگل میں اس کی آواز سب سے نمایاں ہوتی ہے۔ مینا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ گھروں میں بآسانی پالی اور سدھائی جا سکتی ہے، اپنے اردگرد پائی جانے اور سنائی دینے والی تقریباً تمام آوازوں کو اپنے ننھے سے ذہن میں محفوظ کر کے ہو بہو ادائیگی کرنے اور نقل اتارنے میں کمال مہارت رکھتی ہے۔

نر اور مادہ مینا میں پہچان بہت مشکل ہے، صرف جنگلی حیات کے ماہرین ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ نر مینا ہے اور وہ مادہ مینا۔

ساری دنیا میں لوگ پرندوں سے، قدرتی ماحول سے، جنگلی حیات سے پیار کرتے اور یہ اقرار کرتے ہیں کہ ان کی بقا اور سلامتی کے لیے ہر طرح کے اقدامات کرتے رہیں گے۔ ماحول کو صاف ستھرا رکھیں گے، آلودگی کا خاتمہ کریں گے اور ان کی نسلوں کو معدوم ہونے سے بچائیں گے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے وہ واقعی ایسا ہی کرتے ہیں۔ سنجیدگی سے، سنجیدہ فیصلے کر کے ان پر عملدرآمد کی بھرپور سعی کرتے ہیں۔ وطن عزیز میں تھوڑا سا الٹ پھیر ہے۔

ہم کھیتوں میں زیادہ پیداوار کے حصول کے لیے بے حساب کیمیاوی کھادیں ڈالتے ہیں اور فصلوں پر بے دریغ زرعی ادویات چھڑکتے ہیں، جو زہر کہلاتے ہیں، یہ زہر مینا جیسے معصوم اور مفید پرندے کو بھی اپنا شکار بنا چکے ہیں۔

کہانی سننا کتنا بھلا لگتا تھا۔ ماضی کے سنہرے، دلکش

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

اور دلدار دن دامن میں چلے آتے تھے، مگر اب ہاں.... بے شمار پرندوں کی بس کہانیاں ہی رہ گئی ہیں۔

آج کل آپ چھدرے جنگلوں، مہکتے باغوں، آباد پارکوں، میں گھومنے جائیں۔ لہراتی ندیوں، گنگناتی نہروں، جھومتی جھیلوں، خاموش دریاؤں کے کنارے کنارے چلتے، کھلی آنکھوں سے سیر کرتے جائیں، آپ کو بولتے ہوئے طوطے، شور مچاتی بلبلیں، چہچہاتی ہوئی چڑیائیں، ڈار سے بچھڑی کونجیں، ببول کے درختوں پر بولتی فاختائیں، سر بکھیرتے ساون کو یاد کرتی کوئلیں، سبحان تیری قدرت کا نعرہ مستانہ بلند کرتے تیتر تو ضرور دکھائی دیں گے، مگر آپ کو اردگرد اگے درختوں، جھاڑیوں پر کہیں مینا کا گھونسلا دکھائی نہیں دے گا۔ آپ جھاڑیوں کی شاخیں ہٹا کر، جستجو بھری نگاہوں سے شوق کے دریچے کھولتے ہوئے طویل سفر کرتے چلے جائیں کہیں کسی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی پر، ویران رہگذر پر اس نایاب پرندے کا پر نہیں ملے گا۔ جو اڑان بھرتے ہوئے، کبھی کبھی بدن سے جدا ہو جاتا ہے۔

پرندے نایاب ہونے لگیں تو چڑیا گھروں کی زینت بننے لگتے ہیں۔ مینا منظر عام سے غائب ہونے لگی تو کہیں کہیں اس کے چند نمونے چڑیا گھروں کے ایک آدھ پنجرے میں دکھائی دیتے ہیں، جہاں مینا سر نیہوڑائے، گردن جھکائے سوچوں میں گم دکھائی دیتی ہے، شاید ان سنہرے دنوں کو یاد کرتی ہو جب اینٹ، لوہے، بجری اور کنکریٹ سے بنی عمارتوں کے جنگلوں کی جگہ بلند و بالا، سرو قد، سرسبز و شاداب درختوں کے جنگل ملتے اور دکھائی دیتے تھے۔ جب منظر اور ماحول میں صرف پرندوں کی آوازوں کا راج ہوتا تھا۔ جب اردگرد آلودگی کا جن قابض نہیں ہوا تھا۔ جب شکاریوں کی بندوقوں کی گولیاں شور نہیں مچاتی تھیں، خوف نہیں پھیلاتی تھیں۔

طویل عرصہ گذر گیا، وقت نے کئی قدم بھر لیے، صدی بیسویں سے اکیسویں کے شمار میں آگئی، مگر جستجو سے آراستہ آنکھیں مینا کے منظر سے محروم رہیں، سوچنے کی بات ہے کیا یہ دلکش پرندہ بھی معدومیت کا شکار ہو چکا ہے؟

بٹیر

آزادی بھی کیا نعمت ہے؟ جہاں جی چاہا بیٹھ گئے، جہاں دل چاہا چلے گئے، جب خواہش ہوئی سینے میں سانس کھینچی، پر پھیلائے اڑان بھری اور بلندیوں کو چھو آئے۔

مگر نجانے کیوں ہمیں ان اُڑان بھرنے والوں کی قید اچھی لگتی ہے، ہم سنہری تیلیوں میں انہیں قید کر کے پھر ان کی چہکاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے دوسروں کی آزادی ختم کر دیتے ہیں۔

پرندے انسان کے ازلی دوست ہیں، انسان نے انہی پرندوں سے شکار کرنا، اُڑان بھرنا، گھر بنانا سیکھا۔ کپڑا بُننا ہمیں بیے نے سکھایا۔ ہمنگ برڈ کی پرواز نے ہیلی کاپٹر کی طرف مائل کیا۔ کھٹ بڑھئی نے درختوں میں سوراخ کرنا سکھایا۔ رقص کے نرت بھاؤ مور نے بتلائے، پانی میں غوطہ لگانا ہم نے کنگ فشر سے سیکھا۔

ہماری کائنات میں سات رنگوں کی حکمرانی ہے۔ ہر رنگ اپنی جگہ منفرد اور متوالا ہے۔ اور جب یہ رنگ اِک خاص ترتیب اور سلیقے سے ہم آہنگ ہو کر کہیں اپنی جھلک دکھلاتے ہیں تو بصارتوں کو اسیر کر لیتے ہیں۔ پرندے اُن رنگوں کا دلکش، دلفریب اور دلدار انداز و عکس ہیں۔

پرندے ہمارے گھر آنگن میں اُگے پیڑوں پر بسیرا کر کے صبح شام کے اوقات میں اپنی چہکاروں سے سماعتوں کو انوکھے سُر تال سے، آشنا کراتے ہیں۔ اور نظروں کو نئے منظر دکھاتے ہیں۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ سفر آغاز کرنے والے پرندے بھی چاہت بھرے موسموں کی نوید سناتے ہیں، تو کبھی مہمانوں کی آمد کی خبر دے کر منظر عید دکھاتے ہیں۔

رب تعالیٰ کی اس خوبصورت مخلوق کے گیت ہمارے میت بن کر دلوں میں خوشیاں بھرتے ہیں، مگر ایک ہم ہیں کہ ان کی حیات کے دشمن بنے رہتے ہیں۔ اور جیسے ہی موقع ملے انہیں لقمہ بنا لیتے ہیں۔ لذتِ کام و دہن کی بدولت ہم نے پرندوں کی کئی اقسام کو آخری انجام تک پہنچا دیا ہے اور وہ وقت دور نہیں جب ہم کہانیوں کی کتابوں میں ان پرندوں کی بس

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تصویریں ہی دیکھا کریں گے۔

پانچ موسموں کی سرزمین، پاکستان کے گوشے گوشے میں پرندوں کی موجودگی، ماحول اور منظر کو متوازن رکھتے ہوئے دلکش بناتی ہے۔ ہمارے جنگلوں، میدانوں، صحراؤں، پہاڑوں اور دریائی کناروں پر جہاں ایک جانب مقامی پرندوں کا بسیرا ہے، وہاں ہجرتی پرندے بھی بے حساب مسافتیں طے کر کے ہمارے ماحول کا حسن بڑھانے چلے آتے ہیں۔ کونج، مرغابی، تلیئر، کے ساتھ ساتھ تمبرا کتوبر کے مہینوں میں بٹیر بھی ہجرت کر کے منظر و موسم کی دلکشی بڑھانے چلے آتے ہیں۔ یہ بھورے تیتر کی شکل کا مگر اس سے چھوٹا پرندہ ہے، جب گندم کی فصل پکنے کے قریب ہوتی ہے تو یہ وہاں آن ٹپکتے ہیں، اسی لیے اس کو فصلی پرندہ بھی کہا جاتا ہے۔ فصلی بٹیرہ ایک محاورہ بھی ہے جس کا مطلب ہے، خودغرض انسان جو اپنی ضرورت کے وقت تو دکھائی دیتے ہیں لیکن جب آپ کو ان کی ضرورت ہوتی ہے تو غائب ہو جاتے ہیں۔

بٹیر اکثر زمین پر اور جھاڑیوں میں رہتے ہیں۔ میدانی جنگلوں میں یہ بعض اوقات درختوں کی شاخوں پر بھی رہتے ہیں۔ سردیوں کے موسم میں یہ غائب ہو جاتے ہیں یا پھر گھنی جھاڑیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ دریا کے کنارے رہنا انہیں زیادہ مرغوب ہے کہ وہاں خوراک کثرت سے مل جاتی ہے۔ ان کی خوراک عام طور پر مختلف فصلوں کے دانے اور بیج ہیں، لیکن کیڑے مکوڑے بھی کھا جاتے ہیں۔ پالتو بٹیر کو عام طور پر کنگنی، دلیہ، چاول وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔

لکھنو کے بانکے ہماری تہذیبی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتے ہیں جن کے بے شمار شوق تھے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار کی لکھی ہوئی داستان، ''فسانہء آزاد'' میں ایک کردار خوجی اپنے آپ کو بڑا بٹیر باز تصور کرتا اور لمبی لمبی چھوڑتا ہے۔

بٹیر بازی ایک شوق ہے، اور بٹیر پالنا شوق کی تکمیل کا حصہ۔ شوقین لوگ جو ان کو لڑائی اور مقابلوں کے لیے پالتے ہیں، بٹیر باز کہلاتے ہیں۔ وہ ان کو بادام، پستے، کشمش اور دیگر مغزیات کھلا کر طاقتور بناتے ہیں تاکہ یہ پالتو بٹیر پالی میں اُتر کر مخالف بٹیر کے چھکے چھڑا دیں۔ بٹیر باز ہم پیشہ و ہم مشرب لوگوں سے مشوروں کے طلبگار رہتے ہیں، ان کی صحت اور طاقت کے لیے مختلف نسخے استعمال کرتے ہیں تاکہ جب ان کا بٹیر پالی میں اُتر کر مخالف بٹیر کے سامنے جائے تو مردانہ وار مقابلہ کرے۔ پشت دکھا کر بھاگ نہ جائے۔ بٹیر بازی کا شوق ابھی تک جوان رعنا کی صورت اپنی چھب دکھاتا رہتا ہے۔ ہمارے کلچر کی پہچان میلوں ٹھیلوں میں اب بھی ان کے مقابلے ہوتے ہیں۔

بٹیر عموماً جھنڈ کی صورت میں رہتے ہیں۔ ان کی پرواز زیادہ لمبی اور طویل نہیں ہوتی، اسی لیے شکاری ان کو بہت جلد پکڑ لیتے ہیں۔ گوشت لذیذ ہونے کی بنا پر بٹیروں کی اکثر شامت آئی رہتی ہے۔ خوراک کی ضرورت اور شوق کی تکمیل کے لیے، بٹیروں کی فارمنگ بھی کی جاتی ہے۔ مختصر سی جگہ پر ان کی خاصی تعداد رکھی جا سکتی ہے، پولٹری فارمنگ کی طرح یہ بھی ایک منافع بخش کاروبار ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان کی فارمنگ کریں مگر جنگلی حیات کو خوبصورت اور دلکش بنانے والے جنگلی بٹیروں کو صرف لذتِ کام و دہن کے لیے، بے دریغ شکار نہ کریں۔

جوان جنگلی بٹیر کا وزن گوشت کی صورت میں عام طور پر 35 سے 50 گرام تک ہوتا ہے، زندہ بٹیر 90 گرام تک چلا جاتا ہے۔ جبکہ فارمی بٹیر کا وزن بعض اوقات آدھ پاؤ تک ہوتا ہے۔

عام طور پر ایک بٹیر کی لمبائی اٹھارہ سینٹی میٹرز تک ہوتی ہے۔

رنگ ہلکا بھورا، مٹیالا ہوتا ہے۔ جنگل میں مٹی اور ریت سے ملتا جلتا رنگ اس کو شکاری پرندوں اور لومڑی وغیرہ سے بچاتا ہے، خشک جھاڑیوں میں دبک کر بیٹھا ہو تو اس کی موجودگی کا پتا ہی نہیں چلتا۔ ہر وقت چوکنا اور ہوشیار رہتا ہے۔

فزنٹ فیملی سے تعلق رکھتا ہے، اسی لیے اس کی خوبصورتی بے حساب ہوتی ہے۔ چونچ اور پنجوں سے مٹی اُڑا کر پروں میں ڈال لیتا ہے، اور پھر مٹی جھاڑنے کے لیے، پر پھلاتا ہے تو بہت بھاری بھرکم دکھائی دیتا ہے، پر سمیٹ لے تو چھوٹا سا ہو جاتا ہے۔

ہوٹلوں، ریسٹورانوں، ڈھابوں میں بٹیر کڑاہی، بھنا ہوا بٹیر، تلا ہوا بٹیر اور کئی دوسری ڈشز کی صورت میں عام ملتا ہے۔ یہاں اکثر فارمی بٹیر ہی پکائے جاتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں بٹیر صرف امراء، رؤساء اور بادشاہوں کے دسترخوانوں کی زینت بنتا تھا، لیکن بٹیر فارمنگ نے اس کو سہل الحصول بنا دیا ہے، اب شاہراہوں کے کناروں پر بنے ڈھابوں، ریسٹورانوں اور بڑے ہوٹلوں میں اس کی لذیذ ڈشز کم قیمت پر دستیاب ہو جاتی ہیں۔

بٹیر کا گوشت ذائقہ دار ہونے کی وجہ سے بہت پسند کیا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

جاتا ہے، کھانے والے گوشت کے ساتھ ساتھ اس کی ہڈیاں بھی چبا جاتے ہیں۔ گرما گرم تندوری روٹی اور مصالحے دار تیکھی چٹنی کے ساتھ بٹیر روسٹ، بٹیر کڑاہی سب کی پسندیدہ ڈش سمجھی جاتی ہے۔

جنگلی بٹیر کو پنجرے میں رکھا جائے تو یہ چھلانگیں مار مار کر اپنا سر زخمی کر لیتا ہے، ہم جنس دوسرے پرندوں کے ساتھ پنجرے میں ہو تو ایک پل بھی سکون کی سانس نہیں لیتے، ہر وقت چونچیں چلاتے اور لڑتے رہتے ہیں۔

مقابلوں کے لیے بٹیروں کو تیار کرنے والے شوقین، ان کے پنجروں کے گرد گہرے رنگ کا غلاف چڑھا دیتے ہیں، تاکہ بٹیر کو اندھیرا محسوس ہو اور وہ پنجرے کی تیلیوں سے بار بار آ کر سر نہ ٹکرائے اور زخمی نہ ہو جائے۔ بٹیروں کی لڑائی اور مقابلوں میں شرکت کے لیے بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ لڑانے کے لیے بٹیر پالنے والے نر بٹیر کو ہر وقت ہاتھ پر رکھتے، اسے سہلاتے اور تربیت کرتے رہتے ہیں۔

جس روز مقابلہ ہو اس رات بٹیر کو بھوکا رکھا جاتا ہے اور سونے نہیں دیا جاتا۔ یہ عمل بٹیر کے مزاج میں تلخی اور تندی بھر دیتا ہے، چنانچہ اگلے روز مقابلے سے پہلے ذرا سی خوراک سے بٹیر کی تواضع کر کے اسے مخالف کا سامنا کرنے کے لیے پالی میں چھوڑ دیا جاتا ہے، بھوک اور غصے کے باعث وہ میدان میں اُترتے ہی ہلکہ شیری پا کر مقابل کے سامنے سینہ تان کر ڈٹ جاتا اور بھرپور مقابلہ کرتا ہے۔ ایک دوسرے پر حملے پنجوں اور چونچ سے کیے جاتے ہیں۔

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا، کے مصداق بٹیر ہمت اور جثے سے بڑھ کر مقابلہ کرتے اور لڑتے ہیں، مگر یہ تو طے ہے کہ جیت تو ایک کے حصے میں آنی ہے، سرفراز تو ایک ہی کو ٹھہرنا ہے، جیت کا تاج تو ایک کے سر ہی سجنا ہے، سو طاقتور اور بھاری پڑنے والا بٹیر سخت مقابلہ کر کے بالآخر دوسرے کو پیٹھ موڑ کر بھاگ جانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جیتنے والا انعام کا حقدار بن جاتا ہے۔ اگلے مقابلے میں شرکت کے لیے طاقت والی غذاؤں سے بٹیر کی خاطر مدارات شروع ہو جاتی ہے۔ موسم کی تبدیلی یا کسی دوسری وجہ کے باعث بٹیر اگر بیمار پڑ جائے تو ماہر اور بزرگ بٹیر پالنے والوں سے مشورے کیے اور لیے جاتے ہیں، نسخے پوچھے جاتے ہیں، اور دوائیاں تجویز کرائی جاتی ہیں۔ بچوں سے بڑھ کر ان کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

ایک وقت میں بٹیروں کی لڑائی میلوں ٹھیلوں کا لازمی حصہ تھی۔ دور دور سے بٹیر باز ان مقابلوں میں شرکت کرنے اور دیکھنے کے لیے آتے تھے۔ مقابلے میں شرطیں باندھی جاتیں اور جیتنے پر خوشیاں منائی جاتیں اور ہارنے پر دُکھ کا اظہار کیا جاتا۔ اب ثقافتی رنگوں سے آراستہ میلوں کا کال ہے، تیز رفتار زندگی میں مسائل کا وبال ہے، تو میلوں ٹھیلوں میں شرکت کا شوق بھی نایاب ہوتا جا رہا ہے، زندگی میں خوشیوں کا عکس بھی سراب ہوتا جا رہا ہے۔ اور دوسری جانب۔

ہاں دوسری جانب ان معصوم ہجرتی پرندوں کا مستقبل بے پناہ اور بے دریغ شکار کر کے تباہ کیا جا رہا ہے۔ ہم انسان عجب مخلوق ہیں، نہ اپنی سلامتی کا خیال رکھتے ہیں اور نہ ہی قدرت کے دوسرے شاہکاروں کی بقا کے لیے سوچتے ہیں۔

دُنیا بھر میں ماحولیاتی تبدیلیوں کی بنا پر، انسانوں کے ساتھ ساتھ پرندے بھی ہجرت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ حقیقی اور اپنا ماحول ناسازگار ہو جائے تو ہجرت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ پرندے بھی اس کرب سے گزرتے ہیں وہ ناموافق موسموں کا سامنا کرتے، سختیاں جھیلتے، ہزاروں میل طے کر کے، ہماری جھیلوں، دریاؤں، جنگلوں اور میدانوں میں آن اُترتے ہیں کہ جیسے ہی موسم اجازت دیں گے واپسی کا سفر اختیار کر لیا جائے گا۔ مگر یہاں شکاری پھندے بچھا کر ان کو گرفتار کر لیتے ہیں، آزادی ختم، اُڑانیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ بٹیر بھی اسی ظلم کا شکار ہیں۔ پہلے مارچ اپریل اور پھر اگست ستمبر کے موسموں میں ان پرندوں کو پکڑ کر لقمہ اجل بنا دیا جاتا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر میں بٹیر کی آواز ریکارڈ کر کے، جال بچھا کر ان معصوم پرندوں کو دھوکے اور چالاکی سے گرفتار کر لیا جاتا ہے اور بالآخر یہ پرندے ذبح ہونے کے بعد لذتِ کام و دہن کا سامان کرتے ہیں۔

پرندے ماحول کو معتدل رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، ان کے گیتوں، پروازوں اور رنگوں کی بدولت انسانی ذوق کی تسکین کا سامان بھی ہوتا ہے، اور زندگی بے شمار مشکلات کے باوجود خوبصورت لگتی ہے۔ مگر ہم اس خوبصورتی کو ختم کرنے پر لگے ہوئے ہیں، اور دیگر بے شمار پرندوں کے ساتھ ساتھ بٹیر بھی تیزی سے صفحۂ ہستی سے مٹتا جا رہا ہے۔ ہمیں آگہی و شعور کی منزل سے ہمکنار ہوتے ہوئے، اپنے فرض کو پہچاننا ہے اور اللہ کی اس خوبصورت مخلوق کو معدوم ہونے سے بچانا ہے کہ اسی میں ہماری بقا کا راز بھی ہے اور یہی وقت کی آواز بھی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

ہمیں بھی وقت کی آواز کا ادراک کرتے ہوئے پرندوں کی اس خوبصورت قسم بٹیر کے تحفظ اور بقا کو یقینی بنانے کے لیے اقدامات کرنے ہیں، تا کہ دھرتی کا حسن بڑھانے والے پرندے ہمارے ماحول اور منظر سے کوچ نہ کر جائیں۔

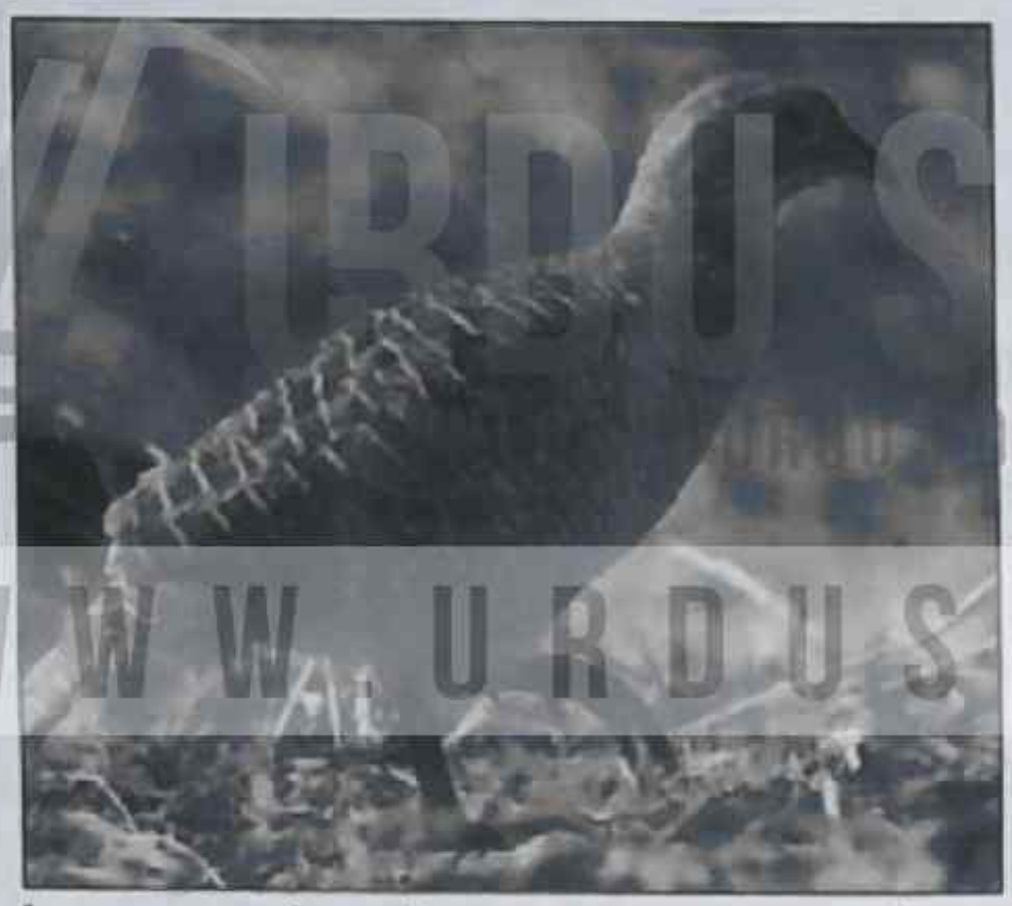

تیتر

صبح دم سبحان تیری قدرت کی من موہنی صدا، ہوا کے دوش پہ سوار ہو کر، سناٹوں کا سینہ چیرتی، خاموشی کا طلسم توڑتی، کوہ و بیاباں میں اترتی ہے تو اس کی گونج چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور سب سننے والوں کی زبانیں سوہنے رب کی ثناء میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ برگ گل ہو کہ برگ حنا، اس دلآویز صدا سے یوں مسحور ہوتی ہے کہ اپنے جمال کے سارے رنگ بہ چھلکانے لگتی ہے، اور ماحول رعنائی سے معمور ہو کر روحوں کی تسکین کا سامان کرنے لگتا ہے۔

یہ انمول صدا ایک ایسے پرندے کی ہے، جس کے پروں کے بے شمار رنگ عجب دل آویز انداز میں دیکھنے والوں کی آنکھوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ لشکتا ہوا سیاہ سینہ، سرخی مائل چونچ، گول بدن، چھوٹی دم، زردی مائل پنجے، بے شمار رنگوں سے آراستہ خوبصورت نقش و نگار والے پر، گردن کے گرد ایک دلکش ہالہ جیسے آبدار موتیوں کی مالا پہنی ہوئی ہو۔ یہ تیتر ہے۔ دنیا بھر میں پایا جانے والا یہ پرندہ کہیں مقامی ہے تو کہیں ہجرتی، کہیں اپنائیت کے ساتھ رہتا ہے تو کہیں بس سخت موسم گذارنے کے لیے وقتی طور پر آتا ہے۔ مگر جہاں رہتا ہے، اپنی خوبصورتی اور دلکشی کے سبب سے ماحول کو آباد اور شاد رکھتا ہے، اس کے ترانے صبح گونجیں یا شام کو، اپنے اندر ایک عجب طرب انگیز کیفیت رکھتے ہیں۔

تیتر کہیں بٹیر کی طرح بھورا ہے، کہیں کسی خطے میں تیز رنگوں کی آمیزش لیے فیزنٹ کی طرح ہے۔ جغرافیائی اور موسمیاتی تغیرات کی بنا پر ہر جگہ اس کی جسامت، قامت، وزن اور رنگوں میں کہیں زیادہ کہیں ہلکا پھلکا فرق پایا جاتا ہے، مگر نسل ایک ہی کہلاتی ہے۔

کالا تیتر بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ اس کے کالے سیاہ پروں پر بھوری اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں، اور سر پر سفید لکیریں اور گردن کے اردگرد سرخی مائل بھورا طوق ہوتا ہے۔ مادہ کا رنگ ہلکا سرخ ہوتا ہے۔ نر کی طرح اس کا جسم بھی خاکستری ہوتا ہے۔ اس پر سفید دھاریاں اور دھبے ہوتے ہیں۔

ان رنگوں کے باعث وہ زمین پر بیٹھی ہوئی دور سے پہچانی نہیں جاسکتی۔

جنگلی پرندوں کو قدرت نے اپنے تحفظ کے لیے خاص صلاحیتیں عطا کر رکھی ہیں۔ نر یا مادہ تیتر اردگرد اپنے ماحول میں کسی قسم کا خطرہ محسوس کریں تو خاص آواز نکالتے ہیں، جن کو سن کر بچے فوراً ہی دبک کر زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اور بے حس و حرکت پڑے رہتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے پھیکے رنگوں کے باعث آسمان پر منڈلاتی، شکار ڈھونڈھتی چیلوں، کوؤں، اور دوسرے شکاری پرندوں کی تیز نگاہوں سے اوجھل ہو کر بچ جاتے ہیں اور یوں ان کی زندگی ماحول کو آباد رکھتی ہے۔

ہم گھروں اور علاقوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ تیتر کا آبائی گھر ایشیا ہے، یہ فیزنٹ فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ موسم گرما میں اپریل سے جون تک کے مہینوں میں مادہ تیتر تین سے پانچ انڈے دیتی ہے، جنگلی حیات کے ماہرین کے مشاہدات میں نو انڈے بھی دیکھے گئے ہیں جن کو نر اور مادہ دونوں مل کر سیتے اور ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان انڈوں سے چوبیس دنوں میں بچے نکل آتے ہیں، اور بہت جلد دوڑنا بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ گھنے جنگلوں میں رہنے والے تیتروں کے بچے کتنے دنوں میں انڈوں سے باہر آجاتے ہیں، اس بارے میں مستند معلومات دستیاب نہیں۔

تیتر عام طور پر جوڑوں کی صورت میں یا زیادہ سے زیادہ دس کی تعداد کے جھنڈ کی شکل میں رہتے ہیں جو ایک ہی خاندان ہوتا ہے، یہ عموماً زمین پر گھنی جھاڑیوں کے نیچے گھونسلا بناتے ہیں، جو پیالہ نما ہوتا ہے۔

پرواز پرندوں کی پہچان ہے، تیتر بہت کم اڑان بھرتا ہے، خطرے کی صورت میں ضرور اڑتا ہے، مگر زیادہ دیر تک اور دور تک پرواز نہیں کر سکتا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نر تیتر کے سر پر دلکش اور دلفریب رنگوں کی پھوار اک خاص ترتیب کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے، سر کے انہی رنگوں اور نقش و نگار کی بنا پر تیتروں کو چار ضمنی اقسام میں بانٹا جاتا ہے۔ عام طور پر نر تیتر کا قد گیارہ سے بارہ انچ (ستائیس سے تیس سینٹی میٹر) ہوتا ہے۔

نقش و نگار کی عطا نر تیتر کے مقدر میں ہے، مادہ تیتر سادہ رنگوں کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ نر تیتر کا وزن البتہ مادہ تیتر سے کم ہی رہتا ہے۔ نر اور جوان تیتر کا وزن دو سو تیس گرام سے تین سو گرام تک چلا جاتا ہے جبکہ بڑی چربیلی مادہ کا وزن تین سو نوّے گرام تک پہنچ جاتا ہے۔

تیتروں کی خوراک عام طور پر مختلف بیج بنتے ہیں، بیج دستیاب نہ ہوں یا موسمی حالات کی بنا پر نایاب ہو جائیں تو تیتر کیڑے مکوڑوں کو بھی اپنی غذا بنا لیتے ہیں، جن کو وہ پودوں کے پتوں سے چنتے ہیں۔ دانہ دنکا چگتے ہوئے، کیڑے مکوڑے کھاتے ہوئے، پیٹ بھرتے ہوئے، تیتر پالتو مرغیوں کی طرح مسلسل بولتے رہتے ہیں اور کسی پل خاموش نہیں رہتے۔

عام پہاڑی تیتر مغربی ہمالیہ کی گود سے ویتنام کے شمال کی آغوش تک ملتے ہیں، اس کے علاوہ انڈیا، بھوٹان، نیپال، تبت، میانمار اور پاکستان میں ملتے ہیں۔

قدرتی طور پر اس کی افزائش کے لیے، ٹراپیکل یا سب ٹراپیکل مرطوب خطوں کے جنگلات، میدان اور پہاڑی علاقے مخصوص ہیں۔ مگر یہ صحراؤں اور میدانی جنگلوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

تیتر، بٹیر کی طرح مگر اس سے بڑا پرندہ ہے، ہمارے ہاں تیتر کو پالنے کے علاوہ شکار بھی کیا جاتا ہے۔ ہمارے جنگلوں میں تیتروں کی کئی اقسام ملتی ہیں، بھورا تیتر شکار کے شوق کی بھینٹ چڑھتا ہے، جبکہ کالا یا مشکی تیتر مقابلوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے، یہ مقابلے بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ تیتر پالنے کے شوقین خوبصورت پنجروں میں انہیں رکھتے ہیں۔

سر، گردن اور جسم پر زیورات کی شکل کے نمونے اوڑھے نر کالے تیتر کو قیمتی پنجروں میں رکھا جاتا ہے، جس کا گرد پوش انہیں باہر کی چیزیں دیکھنے سے محروم رکھتا ہے۔ کالے یا مشکی تیتروں کے پنجروں کو غلاف سے ڈھک کر رکھنے کے پس منظر میں یقینی طور پر منطقی سوچ موجود رہتی ہے۔ تیتروں کے شوقین کے مطابق مقابلے کے لیے سب مل کر ایک تاریخ متعین کرتے ہیں، جہاں تیتروں کو بلوانے کا مقابلہ منعقد کرنا ہو، وہاں کچی مٹی کے چبوترے بنائے جاتے ہیں، ان پر صبح سویرے چھڑکاؤ کیا جاتا ہے، کچی مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو ابھرتی ہے تو وہ انسانوں کے ساتھ پرندوں کو بھی مسحور کر دیتی ہے، پھر ان تیتروں کے پنجروں سے ایک ساتھ غلاف ہٹا دیئے جاتے ہیں، ہانکا لگایا جاتا ہے اور تیتر بولنا شروع کر دیتے ہیں، ہر طرف سبحان تیری قدرت کی دل نوا گونج ابھرتی، پھیلتی اور سمٹتی رہتی ہے، مصنفین بھرپور توجہ اور ہوشیاری کے ساتھ اپنا فریضہ نبھاتے ہیں، جو تیتر سب سے آخر میں بولنا بند کرتا ہے، فاتح ٹھہرتا ہے، اوّل آنے والے کے ساتھ ساتھ دوسری اور تیسری پوزیشنوں کا بھی اعلان کیا جاتا ہے، فاتح مالکان کو ٹرافیاں اور انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔

تیتر بہاول پور ڈویژن کے تینوں اضلاع کے مصنوعی اور قدرتی جنگلوں میں بھی ملتا ہے اور صحرائے چولستان میں بھی پایا جاتا ہے۔ جنگلوں میں کالے تیتر اور بھورے تیتر دونوں ملتے ہیں، البتہ صحرا میں پایا جانے والا تیتر بھورا ہوتا ہے۔ لوک ورثہ اسلام آباد کی چھاپی ہوئی تحقیقی کاوش ''چولستان'' میں جناب احمد غزالی لکھتے ہیں۔

یہ پرندہ پانی نہ ملے تو شبنم کی نمی سے اپنی پیاس بجھا کر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی عمر پانچ اور سات سال کے درمیان ہوتی ہے۔ مادہ سال میں دو دفعہ انڈے دیتی ہے۔ یہ زیادہ تر آباد علاقوں کے قریب پایا جاتا ہے۔ باز، چرخے سے اس کا شکار کیا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چولستان کے کناروں پر پائے جانے والے اس پرندے کی تعداد تقریباً چار ہزار ہو گی۔ زیادہ تر بھگوے کے ذریعے پکڑتے ہیں اور لڑاتے بھی ہیں۔ مشکی یا کالا تیتر زیادہ خوبصورت، طاقتور اور قیمتی ہوتا ہے، اسے شکاری سدھا کر بطور لاوے کے استعمال کرتے ہیں، مستی میں آ کر خاص موسم میں بولتا ہے۔ ورنہ اکثر شکاری اسے پنجرے میں بند کر دیتے ہیں اور اوپر چولی ڈال دیتے ہیں۔ جنگل میں چولی اتار کر رکھتے ہیں تو یہ بولنا شروع کر دیتا ہے۔ گویا اپنے حریفوں کو چیلنج دیتا ہے اور وہ دور دور سے اڑ کر اس پر جھپٹتے ہیں۔ دونوں تیتروں کو کوڑ کی کے ذریعے پھنسا کر پکڑتے ہیں۔ شکاری چھوٹے کتوں کے ذریعے جھاڑیوں سے نکال کر یا جھاڑیاں ڈنڈوں سے پیٹ کر شکار کرتے ہیں۔

''کہیں پرندوں کی نسلیں نہ ختم ہو جائیں۔ کیونکہ درختوں پہ اب گھونسلے نہیں ملتے''

گھونسلے اس لیے نہیں ہیں کہ ماحول میں آلودگی کا راج

URDUSOFTBOOKS.COM

ہے، یہی ہمارا آج ہے، اور ہم اپنے آج کو آنے والے کل کے لیے محفوظ کرنے اور رکھنے پر سنجیدہ ہی نہیں ہیں، ایسا ہوتا رہا تو مؤرخ جو تاریخ لکھے گا، اس میں نوحے ہوں گے۔ آہوں اور آنسوؤں کے فسانے ہوں گے۔

بات ہم کر رہے تھے تیتر کی، ایک نظر نواز خوبصورت پرندے کی۔ لشکتا ہوا سیاہ سینہ پھلا کر، بیچ اٹھا کر، اک باکمال شان اور آن کے ساتھ سرخی مائل زرد چونچ سے جب یہ پرندہ آواز لگاتا ہے تو اس کی آواز کی لہریں بہت دور دور تک رسائی حاصل کر لیتی ہیں۔ ماحول سے سناٹے ختم ہو جاتے ہیں، اداسیاں کوچ کر جاتی ہیں، بہاریں گنگنانے لگتی ہیں، فضائیں مسکرانے لگتی ہیں۔

ضروری تو یہ ہے ہمارے ہر طرف دلکش پرندوں کی آوازوں کے سندیسے ہوں، گیتوں کی رعنائیاں اور انگڑائیاں ہوں، مگر اب ایسا نہیں ہوتا، ہاں اب ہمارے چاروں طرف سناٹے اور خاموشیوں کا راج ہے، جو دکھ بھرے فسانے سناتی ہے، تجی بہت رلاتی ہے۔

سنئے! جب خاموشی نوحہ کرنے لگتی ہے تو کھلتا ہے ہم نے چہکاروں اور مہکاروں کے کتنے جہان ناسمجھی کے ہاتھوں گنوا دیئے۔ کتنے قیمتی خزانے لٹا دیئے۔

آج ہمارے ماحول سے خوشبو، خواب اور خوشیوں کے رنگ روٹھ گئے ہیں، دھند، دھوئیں اور دھول کی چادر نے سارے حسن کو گہنا دیا ہے۔ آنکھیں ہیں کہ بے بصارت ہو گئی ہیں، دماغ ہیں کہ بے بصیرت ہو گئے ہیں۔ شکوہ کریں تو کس سے کریں!!! کہ یہ ساری کمائی اپنے ہی ہاتھوں کی ہے۔ ہم نے برگد، پیپل اور آم کے درخت کاٹ کر چائے خانے بنا دیے، ہم نے شیشم، شہتوت اجاڑے کہ گھر سجا سکیں، ہم نے نہروں کے منہ بند کر دیئے کہ مکان آباد کر سکیں، ہم نے جھیلیں نایاب کر دیں کہ انسانی آبادیوں کو پھیلا سکیں۔

مگر افسوس توجہ اس جانب سفر کرنے سے محروم ہی رہی، خیال نے وہاں خیمے ڈالنے سے اجتناب ہی کیا، جہاں آگاہی میسر آتی کہ زندگی تو کائنات کے سارے سبز اور سنہرے رنگوں کے سہارے تروتازہ اور شاداب رہتی ہے، درخت کٹ جائیں، جنگل جل جائیں، جھیلیں خشک ہو جائیں، چشمے گانا، گنگنانا چھوڑ دیں، نرم ہوائیں مسکرانا چھوڑ دیں تو پرندوں کا رزق ختم ہو جاتا ہے، ان کی مدھر متوالی صدائیں ختم ہو جاتی ہیں۔

بہت ناراض ہیں مجھ سے پرندے
مرے گھر میں شجر کوئی نہیں ہے

انسانی تاریخ بتلاتی ہے، پرندے صداؤں سے محروم ہو جائیں تو انسانی زندگی کے سارے پیارے رنگ معدوم ہو جاتے ہیں، ہمارا سفر بھی تیزی سے معدومیت کی طرف جاری ہے۔

اور ہمارے شوق شکار کے ہاتھوں، معدوم ہوتے تیتر بھی یہی نوحہ پڑھ رہے ہیں، کیا ہم ان کی روتی ہوئی صداؤں پہ توجہ دیتے ہوئے، اپنی اداؤں پہ غور کرنے کی سعی فرمائیں گے!

بلبل

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی

سبز سنہری رُتوں، زرد ہوتے موسموں میں، برف اوڑھتے دنوں میں، آگ میں لپٹی دوپہروں میں، بادلوں سے بھرے مہینوں، خوشبوؤں سے بھری صبحوں میں، سر پہ ننھا سا تاج سجائے، پنکھ پھیلائے، گلستاں گلستاں گھومنا، ڈالی ڈالی بیٹھنا، آنگن آنگن اُترنا، اس پرندے کا قدیم شیوہ، پُرانی عادت ہے اور عادتیں کب بدلتی ہیں۔ جوڑوں کی صورت میں درختوں در درختوں بیٹھتے، لحہ لحہ اُڑتے، ایک دوسرے کا تعاقب کرتے یہ ننھے ننھے پرندے ہمارے اردگرد پھیلے، بکھرے دلکش و دلدار ماحول کا اثاثہ ہیں، تو ہماری شعری اقلیم کا سنگھار بھی۔ سیاہی مائل بھورا سا تاج، سُرخی مائل بھورے پر، سفید سینہ، زرد پنجے، کالی چونچ، اور دُم کے پاس نچلی طرف بیر بہوٹی کے رنگ ایسا، پُرانی اٹھنی برابر گول دائرہ ان کی پہچان ہے۔

یہ بلبل ہے۔ شاعرانہ زبان میں اس کو ہزار داستان بھی کہتے ہیں۔ عندلیب بھی اسی سوہنے، من موہنے پرندے کا نام ہے۔

آ اے عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تُو ہائے گُل پکار میں ہائے دل کہوں

بلبل ایک تشبیہ ہے، اِک استعارہ ہے۔ اک کہانی ہے، اِک ستارہ ہے، کہانی سنائی جاتی ہے تو عجب دلفریب و دلنواز منظر آنکھوں کے روبرو چلے آتے ہیں۔

یہی زندگی کا حسن و جمال ہے، یہی قدرت کی فیاضیوں کا کمال ہے۔ ہمارے اردگرد کا ماحول دلکش، پُرسکون، ہریالی سے اٹا، خوشنما رنگوں سے سجا، دل لبھانے والی خوشبوؤں میں بسا ہوا ہو تو چار جانب اُگے درختوں، پودوں اور

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

جھاڑیوں پر پرندے اپنے آشیانے ضرور بناتے ہیں۔ ماحول میں شور وغل کا چرچا، گرد وغبار اور دھوئیں کا غلبہ نہ ہو تو گھونسلے ہر حال سجاتے ہیں، جہاں کبھی بڑے پرندوں کی چہکاریں ماحول کو موسیقی سے مست رکھتی ہیں، تو کبھی اُن کے بچوں کی آوازوں سے زندگی کا احساس تازہ و شگفتہ رہتا ہے۔ ان پرندوں میں بلبل بھی نمایاں مقام رکھتا ہے۔

بلبل مقامی بھی ہے اور ہجرتی بھی۔ پالتو بھی ہے اور آزاد فضاؤں میں اپنی مرضی کا مالک بھی۔ شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اس پرندے کے بارے میں لکھی گئی ولیم کوپر کی ایک نظم سے مرکزی خیال اخذ کر کے موضوع بنایا اور ہمدردی کے عنوان سے نظم لکھی جو اگرچہ بچوں کے لئے ہے مگر اس میں چھپا پیغام سب کے لئے ہے۔ آپ بھی پڑھیے۔

ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا بلبل تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی اُڑنے چگنے میں دن گزارا
پہنچوں کس طرح آشیاں تک ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا
سُن کر بلبل کی آہ و زاری جگنو کوئی پاس ہی سے بولا
حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا
کیا غم ہے جو رات ہے اندھیری میں راہ میں روشنی کروں گا
اللہ نے دی ہے مجھ کو مشعل چمکا کے مجھے دیا بنایا
ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے آتے ہیں جو کام دوسروں کے

علامہ اقبال کو اس پرندے کے آہ و نالہ اور شیون سے بھی اک تعلق ہے، اس کی ادا و صدا سے بھی پیار ہے جبھی وہ اک خاص محبت سے اپنی اکثر نظموں اور غزلوں میں بلبل کو موضوع بناتے ہیں۔

کس زباں سے اے گلِ پژمردہ تجھ کو گل کہوں
کس طرح تجھ کو تمنائے دلِ بلبل کہوں

☆

اُجالا جب ہوا رُخصت، جبینِ شب کی افشاں کا
نسیمِ زندگی پیغام لائی صبح ِ زنداں کا

☆

جگایا بلبل ِ رنگیں نوا کو آشیانے میں
کنارے کھیت کے شانہ ہلایا اُس نے دہقاں کا

☆

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیء قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

ذکر ہوا اردو شاعری کا، اردو شاعری میں ہمیں ہر ایک شاعر کے ہاں اس روایتی پرندے کے تذکرے اور دلکش اشعار

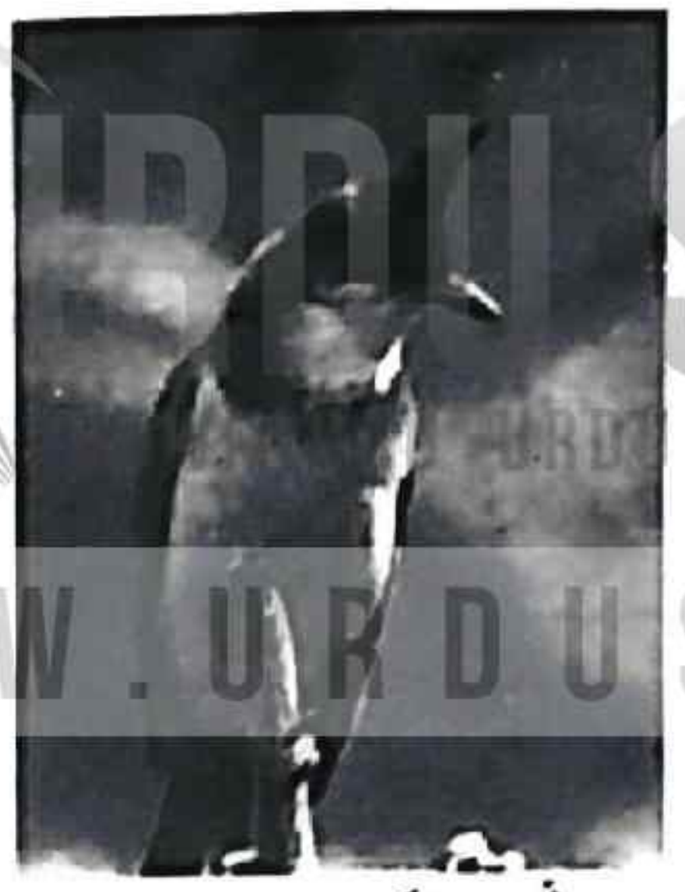

ملتے ہیں، مرزا رفیع سودا کا کہنا ہے،

پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل
ورنہ یاں کون سا اندازِ فغاں ہے کہ نہیں

سخن سراپا لوگوں نے بُلبل کو بہت زیادہ شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ اس لیے کہ یہ محبت کرنے والا، گیت سنانے والا اور ماحول و منظر کی رونقیں بڑھانے والا پرندہ ہے۔

بُلبل کو ہر جگہ ہر مقام پر پسند کیا جاتا ہے، اس کی عادتیں کمال ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ اُڑ کر چلے جانا، مختصری اُڑان بھرنا، اِس کا مشغلہ ہے۔ اس روایتی پرندے کو کہیں سچا عاشق تصور کرتے ہیں، کہیں اِس کو ہرجائی کا خطاب دیتے ہیں جو بھونرے کی طرح ڈال ڈال اُڑتا اور پھولوں کا رس چوستا رہتا ہے۔

بُلبل مختلف اوقات میں اکثر گیت گاتا رہتا ہے۔ اس کے گیت اپنی موسیقیت اور نغمگی کی بدولت دل کھینچ لینے والے ہوتے ہیں، اور وہ اہلِ ہُنر جن کی باتوں میں تاثیر ہو بُلبلِ شیراز کہلاتے ہیں، گلستان و بوستان کے خالق شاعرِ شیریں مقال حضرت شیخ سعدیؒ بُلبلِ شیراز کے لقب سے دُنیا بھر کے اہلِ ہُنر میں معروف ہیں۔ اردو غزل کے باوا آدم ولی دکنی کہتے ہیں،

بلبلِ شیراز کوں کرتا ہوں یاد
حسن کوں تیرے گلستاں پُوجھ کر

باکمال مقررہ سروجنی نائیڈو کو بُلبلِ ہند کا خطاب ملا تھا۔ عصرِ حاضر میں باکمال شاعرہ، کالم نگار، ناول نویس اور سیاستدان محترمہ بُشریٰ رحمان صاحبہ بلبلِ پاکستان کہلاتی ہیں۔

بلبل کا گیت قدرت کی خوبصورت آوازوں میں شمار ہوتا ہے، دل موہ لینے والا۔ سماعتوں پہ جادو کر دینے والا، اسی

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

لیے یورپ میں اس کو نَو بَرڈ بھی کہا جاتا ہے۔

انسائیکلو برٹانیکا کے مطابق دُنیا بھر میں اِس کی ایک سو چالیس کے قریب اقسام پائی جاتی ہیں۔ چین، جاپان، انڈونیشیا، ملائیشیا، سری لنکا کے برساتی جنگلوں میں پایا جانے والا یہ پرندہ یورپ اور سب صحارا افریقا میں بھی ملتا ہے لیکن امریکا میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

بُلبل کا قد پندرہ سینٹی میٹر تک اور جوان بلبل کا وزن عموماً بیس گرام تک ہوتا ہے۔ یہ گھونسلوں اور گھنی سبز جھاڑیوں میں رہتا ہے۔ موسمی تغیرات کے تحت اس کی افزائش اور بڑھوتری ہوتی ہے۔

مادہ بلبل تین سے پانچ تک گلابی اور جامنی رنگ کے انڈے دیتی ہے اور وہی ان کو سیتی ہے، ان انڈوں سے گیارہ سے چودہ دن میں بچے نکلتے ہیں جو بارہ سے سولہ دن میں پر نکلنے کے بعد پرواز کرنے لگتے ہیں۔ سرخ دم والی بلبل پاکستان سے جاوا تک کے جنگلوں میں پائی جاتی ہے۔

بلبلوں کی خوراک پھل، بیج اور میوے وغیرہ ہیں اور اگر یہ دستیاب نہ ہوں تو کیڑے مکوڑے بھی کھا لیتے ہیں، چوہوں، بلیوں، لومڑیوں اور سانپوں کی یہ خوراک بنتے ہیں۔ عموماً انسانوں سے دور گھنے جنگلوں میں رہنا پسند کرتے ہیں اپنے مختصر قامت کی بنا پر جلدی شکار ہو جاتے ہیں۔ ہجرتی پرندے ہیں، مناسب جگہ ڈھونڈنے کے لیے طویل سفر بھی کر لیتے ہیں، جب تک مناسب جگہ نہ ملے اُڑتے رہتے ہیں۔ جنگلوں، پارکوں اور میدانوں میں ملتے اور گھونسلے بنا کر رہتے ہیں۔ اس پیارے پرندے کے ساتھ رومان جُڑا ہوا ہے، کہ گیت گانے والا ہے۔ اکثر نر بلبل گاتے ہیں، یہ کام مادہ کو رجھانے کے لیے ہوتا ہے۔

بلبل کا نام ایک ہزار سال سے زائد عرصہ سے لیا جا رہا ہے۔ یونانی شاعر ہومر نے اپنے ایپک (طویل رزمیہ) اوڈیسی میں اس کا ذکر کیا ہے۔ شیکسپیئر، ورڈز ورتھ، کالرج، جان کیٹس، شیلے، نے بھی اپنی شاعری میں اس کو موضوع بنایا ہے۔ پریوں کی کہانیوں میں بھی اس کے تذکرے ملتے ہیں۔

شہروں کے قریب رہنے والے بلبلوں کی آواز خاصی بلند ہوتی ہے تاکہ پس منظر کے شور پر غلبہ حاصل کیا جا سکے۔ یہ صبح شام اور رات کو گاتے ہیں۔

گل و بُلبل کی ترکیب سے تو آپ واقف ہوں گے۔ داستانوں اور کہانیوں میں، غزلوں اور نظموں میں ان دونوں کا ہمیشہ ایک ساتھ تذکرہ ہوتا ہے۔ تحقیقی کاوش کلاسیکی اردو شاعری میں ڈاکٹر تنویر احمد علوی فرماتے ہیں۔

مغلوں کے زمانے میں باندیوں کے نام اکثر پھولوں پر رکھے جاتے تھے اسی لیے فارسی اور اردو شاعری کو گل و بلبل کی شاعری کہا جاتا تھا کہ اس میں پھولوں اور بُلبلوں کا ذکر اکثر آتا تھا۔ اکثر بُلبلیں گھروں پر بھی رہتی تھیں۔ ایسا بھی لوگ کرتے تھے کہ ان کے پیر میں ایک چھلا ڈال دیا جاتا تھا۔ اور اس چھلے میں ریشم کی ڈوری باندھ دی جاتی تھی۔ اور بُلبل کو اپنے ساتھ رکھنے والا اسے اپنے ہاتھ پر بٹھائے رکھتا تھا، اس زمانے کے کلچر کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو پھول اور بُلبل زندگی میں داخل تھے۔ اور اسی لیے وہ ذہن اور ذہنی کاوشوں میں بھی شریک رہتے تھے۔

ڈاکٹر تنویر احمد علوی ہماری معلومات میں مزید اضافہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہماری اردو شاعری میں گل و بُلبل کو پھول کے رشتے سے بھی لیتے ہیں اور عاشق و معشوق کے رشتے سے بھی۔ یہ ایک تہذیبی اور نفسیاتی عمل ہے کہ ہم جس طرح خود دوسروں سے اور خاص طور پر جنسِ لطیف سے محبت کرتے ہیں اسی کا تصور پرندوں اور پھول پتیوں کی زندگی میں بھی دیکھتے ہیں۔ مثلاً قمری سرو کی عاشق ہے، چکور چاند سے عشق کرتا ہے، مور گھٹاؤں کو دیکھ کر بولنے اور ناچنے لگتا ہے، اسی طرح بُلبل بھی پھول کے لیے بیقرار رہتی ہے۔ نغمے الاپتی ہے اور فریاد کرتی ہے۔ ہمارے شعرا نے اسی تصور کو اپنی شعری تصویروں میں بدلا ہے جیسا کہ یہ شعر بلبل کی نالہ کشی کی طرف اشارہ کرتا ہے،

بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

اردو فارسی میں صدہا شعر ہیں جو لالہ و گل اور عشقِ بلبل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کا جو تعلق لالہ و گل سے ہے یا عشق بلبل سے ہے وہ بھی انسان کی اپنی نفسیات اور محبت و تعلق کے جذبات کی ترجمانی اور احساسات کی عکاسی ہے۔

بُلبل، عندلیب، ہزار داستان کوئی سا نام لے لیں، پرندہ ایک ہی ہے، ملک ملک میں اس کا نام مختلف بھی ہو سکتا ہے، کہیں اس کی رنگت، بناوٹ، وزن، قامت میں فرق ہو سکتا ہے، لیکن بلبل ہمیشہ گیت گانے والا ہوگا، دل لبھانے والا ہوگا۔ انگریزی زبان کی ایک کہانی میں بلبل کے ساتھ ہمدردی بھی منسلک ہے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

کہانی یوں ہے کہ ایک نوجوان طالبعلم کا دل ایک لڑکی پر آجاتا ہے، اس لڑکی کے گھر میں ایک تقریب منعقد ہوتی ہے اور لڑکی نے لڑکے سے سُرخ گلاب لانے کی فرمائش کر دی۔ برف موسموں میں جب ہر طرف سفیدی کا راج ہو سُرخ گلاب کا ملنا ناممکن ہوتا ہے، یہ حقیقت نوجوان عاشق طالبعلم کو اداس کر دیتی ہے، اور وہ آہیں بھرنے، آنسو بہانے لگتا ہے، بلبل سے نوجوان کی اداسی و آہ و زاری دیکھی نہیں جاتی، چنانچہ وہ اس کی مدد پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کے لیے وہ گلاب کے پودے کے پاس سُرخ پھول لینے کے لیے چلا جاتا ہے۔ گلاب کا پودا فرمائش کرتا ہے کہ اپنے محبت بھرے گیت گاتے ہوئے میری رگوں میں اپنے بدن کا لہو داخل کر دو تو شاید سفیدی سُرخی میں بدل جائے اور میں سُرخ پھول دے سکوں۔ بلبل پودے کی خواہش پر سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے، آسمان سے گرتی ہوئی برف کو جھیلتے، گیت گاتے، بلبل اپنا سینہ گلاب کے ایک تیز کانٹے سے ملا دیتا ہے، گیت کی لے کے ساتھ بلبل کی رگوں سے خون نچڑتا ہوا پودے کی رگوں میں داخل ہوتا رہتا ہے، پھول سفید سے ہلکا گلابی، سُرخ اور تیز سُرخ ہو جاتا ہے، اور بلبل آخری گیت ہچکی لے کر سناتا اور عدم آباد کو سدھارتا ہے۔ اگلی صبح نوجوان کی نظر پائیں باغ میں پڑتی ہے تو سُرخ گلاب اُس کی نگاہوں کے روبرو جگمگا رہا ہوتا ہے، وہ اسے توڑ کر محبوبہ کے پاس لے جاتا ہے، آگے کیا ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے مگر اس کہانی سے ہمیں بلبل کی ہمدردی کے جذبے سے آشنائی ضرور ہوتی ہے۔

پرندے ہوں کہ قدرتی منظر، جنگل اور دریا ہوں کہ آبشاریں، ندی نالے ہوں کہ سمندر، جگنو ہوں کہ ستارے، چاند ہو کہ سورج، ہمارے اہلِ قلم اور اہلِ ہُنر نے ان سب کو استعاروں، تشبیہوں اور دیگر وسیلوں کے ذریعے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا فریضہ نبھایا۔ بلبل بھی انہی وسائل میں شامل ہے اور جذبات و محبت کے اظہار کا بہترین ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم اپنے اردگرد کے ماحول میں جھانکیں، سنجیدگی سے غور و فکر کریں اور پھر تجزیہ کریں تو چند ایک تلخ حقائق ہمارا منہ ضرور چڑائیں گے، ان میں سے ایک ماحول کی آلودگی، درختوں کی کمی، جنگلات کے بے تحاشہ کٹنے اور عمارتوں کے جنگل اُگنے کے ساتھ ساتھ شور و غل میں بے پناہ اضافے کے سبب سے ماحول کو معتدل رکھنے والے پرندوں کا برق رفتار تیزی سے منظرِ عام سے غائب ہونے کا تلخ مگر سچا منظر نامہ بھی ہے۔ بلبل کی نسلیں بھی تیزی سے ختم ہو رہی ہیں، WWF کو چاہیے کہ اس مسئلے پر سنجیدگی سے توجہ دے تاکہ پرندوں کی ایک اور قسم معدوم ہونے سے محفوظ رہے، کہ یہی وقت کا تقاضا ہے اور یہی وقت کی آواز! محکمہ تحفظ جنگلی حیات ہو کہ دوسرے متقدر ادارے، ان سب کے ساتھ ساتھ یہ ہمارا بھی فریضہ ہے کہ ہم حقائق کا ادراک کریں اور منظر سے معدوم ہوتی پرندوں اور جانوروں کی نسلوں کے تحفظ کو یقینی بنائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت کہے۔

دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

اور ہماری آئندہ نسلیں ان پرندوں کی بس کہانیاں ہی سنتی رہیں!!

فاختہ

پھر یوں ہوا کہ جب چالیس دن گزر گئے تو اللہ کے نبی نوح علیہ السلام نے پانی کے طوفان سے گھری ہوئی زمین پر خشکی کا ٹکڑا تلاش کرنے کے لیے اُس پرندے کو بھیجا اور جب وہ پرندہ واپس لوٹا تو اُس کی چونچ میں زیتون کی شاخ تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ اب رب کی بنائی ہوئی دھرتی پر امن وامان کا دور دورہ شروع ہو چکا ہے اور کشتی کے سوار سب مسافر خشک زمین پر اُتر کر اِک نئے عہد کا آغاز کر سکتے ہیں۔

روایات کے مطابق طوفانی پانی میں ڈوبی زمین پر خشکی کی خبر لانے والا یہ پرندہ فاختہ تھی، جس کی چونچ میں زیتون کی شاخ دبی ہوئی ہو تو یہ امن اور سلامتی کی علامت ہے۔ اقوامِ عالم کی نمائندگی کرنے والے ادارے اقوامِ متحدہ کی پہچان بھی زیتون کی شاخ چونچ میں تھامے فاختہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

زندگی میں رعنائی و زیبائی بھرنے والے مختلف رنگوں کی پہچان کے لیے ایک رنگ فاختئی بھی شمار ہوتا ہے۔ فاختہ ایسا دلفریب، دلکش، دلنواز پرندہ ہے جس کی بہت بڑی پہچان بولتے ہوئے، حق ہُو حق ہُو کا اثر آفریں ورد بھی ہے۔ صبح کا سنہرا وقت ہو کہ دوپہر کے تیکھے لمحے، شام کی آرام کرتی گھڑیاں ہوں کہ رات کی پُرسکون ساعتیں، فاختہ کی آواز ہمیشہ کانوں میں رَس گھولتی ہے، زندگی کے انوکھے بھید کھولتی ہے۔

اگر آج سے چالیس پچاس برس پہلے کی یادوں کو سمیٹیں تو ہمارے گھروں میں کچے کمروں کو ہوا سے معمور رکھنے والے روشندان ان جون جولائی کے مہینوں میں فاختاؤں کے گھونسلوں سے آباد ہو جایا کرتے تھے۔ گھر آنگن میں اُگے کیکر، ٹالی، بیری، آم، انجیر، توت، نیم وغیرہ کے درختوں پر ان کے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آشیانے کثرت سے ملا کرتے تھے، یہاں تک کہ انار، امرود، مالٹے اور لیموں کے جھاڑ بھی ان معصوم پرندوں کے گھونسلوں اور انڈوں بچوں سے شاد اور آباد رہتے تھے۔

کبوتر اور فاختہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ دونوں ہی کی خوبصورتی بے مثال اور باکمال ہوتی ہے، فاختہ جب اپنے پر پھیلا کر اُڑان بھرتی ہے تو نگاہیں اُس کی برق رفتاری کی اسیر ہو جاتی ہیں... مسلسل میلوں سفر کرنے سے بھی نہیں تھکتی، اور دم لے کر پھر آگے کی منزلوں کی طرف رواں دواں ہو جاتی ہے۔

دُنیا بھر میں فاختہ کی تین سو سے زائد اقسام پائی جاتی ہیں، قُمری، فاختہ، Dove، گھگی اس کے مختلف زبانوں میں نام ہیں ایک نسل ٹوٹرو بھی کہلاتی ہے۔ فاختہ اگرچہ پالتو پرندہ نہیں ہے مگر اس کو گھروں میں پنجرے میں رکھا جا سکتا ہے، روٹی کے ٹکڑے، باجرہ اور کنگنی اس کی پسندیدہ کھا جا ہیں۔ چڑیا گھروں میں اس کے جوڑے بڑے بڑے پنجروں میں قید کر کے رکھے جاتے ہیں۔

فاختائیں زیادہ تر زمین پر فصلوں اور کھیتوں اور سبزہ زاروں میں اپنی خوراک تلاش کرتی ہیں۔ بنیادی طور پر یہ بیجوں، پھلوں اور پودوں کو اپنی خوراک بناتی ہیں، زمین پر گھومتے ہوئے یہ جگہ جگہ چونچ سے مٹی کریدتے بیج تلاش کرتی اور اُن کو اپنے پوٹے میں محفوظ کرتی رہتی ہیں، گھونسلے میں جا کر اس کو ہضم کرتی ہیں۔ فاختہ اپنے وزن کی مناسبت سے عمومی طور پر کم خوراک استعمال کرتی ہے۔ جس کی مقدار بارہ سے بیس فیصد تک روزانہ ہوتی ہے۔

فاختہ جنگلوں، درختوں، نہروں کے کنارے اُگے پیڑوں کے علاوہ پہاڑوں، میدانوں اور سبزہ زاروں کے ساتھ ساتھ صحراؤں میں بھی بسیرا کر سکتی ہے۔ وجہ شاید یہ ہو کہ یہ بارشوں کا کھڑا اور رُکا ہوا نمکین پانی بھی پی لیتی ہے اور انسانوں کی طرح ڈی ہائیڈریشن کا شکار نہیں ہوتی۔ ہاں البتہ شکاری پرندوں، بلیوں، لومڑیوں کے ہتھے ضرور چڑھ جاتی ہے جو اس کو اپنے پیٹ کا ایندھن بنانے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتیں۔ دوران پرواز عقاب ان پر بہت جھپٹتے ہیں، اور پنجوں میں اُچک کر لے جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں پائی جانے والی فاختہ کا رنگ خاکی اور بھورے کی آمیزش لیے ہوتا ہے، جو گرمیوں میں ہلکا اور سردیوں میں تیز ہو جاتا ہے۔ سفید فاختائیں بھی ہماری اس دھرتی کا حسن بڑھانے میں مصروف ہیں۔ نیوزی لینڈ میں

چتیوں والی فاختہ بھی پائی جاتی ہے۔

کالی کالی، چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں، سفید سینہ، کالے پنجے، کالی چونچ، ہلکے نیلے اور بھورے رنگ کے پر جن کا پھیلاؤ اُڑان کے وقت سترہ اعشاریہ سات انچ تک چلا جاتا ہے، یہ فاختہ ہے جو اٹھاسی کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار تک سفر کرتی ہے۔

نر اور مادہ فاختہ کی لمبائی نو اعشاریہ ایک سے تیرہ اعشاریہ چار انچ تک پہنچ جاتی ہے۔ نر فاختہ کا وزن عموماً چھیانوے سے ایک سو ستر گرام تک ہوتا ہے۔ البتہ مادہ فاختہ کا وزن نر سے مختلف اور نسبتاً کم ہوتا ہے۔ ماہرین کے مطابق مادہ فاختہ 86-156 gram کی ہوتی ہے، جب کہ لمبائی یعنی قد اور پروں کے پھیلاؤ میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ مادہ اکثر دو انڈے دیتی ہے، چھوٹے سے گھونسلے کی تعمیر میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا، انگریزی حرف وی کی بناوٹ رکھنے والی پتلی سی مگر مضبوط شاخ پر اوپر تلے چند تنکے گول پیالے کی شکل میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ گھونسلا تیار ہو گیا، ان گھونسلوں میں فاختہ سال میں کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ مرتبہ دو دو انڈے دیتی ہے جن کو نر اور مادہ مل کر سیتے ہیں، دو ہفتوں میں ان انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں جن کی حفاظت اور خوراک کی ذمہ داری نر اور مادہ دونوں مل کر نبھاتے ہیں۔

فاختہ اپنا گھونسلا اگرچہ درختوں کی شاخوں پہ بنانے کو ترجیح دیتی ہے، لیکن کبھی کبھی زمین پر گھنی جھاڑیوں کے نیچے بھی گھونسلے بنا لیتی ہے۔ اور وہیں انڈے دیتی اور سیتی ہے۔ لیکن یہاں اس کو شکاری جانوروں، لومڑیوں، گیدڑوں اور بلیوں وغیرہ سے ہر وقت جان کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔

درختوں کی شاخوں پر بنے گھونسلے تیز ہواؤں اور طوفانوں کی زد میں آجائیں تو سب سے پہلے فاختاؤں کے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

گھونسلے ہی نشانہ بنتے ہیں کیونکہ فاختائیں دوسرے پرندوں کی طرح اپنے گھونسلے حفاظتی اقدامات کر کے تعمیر نہیں کرتیں، اسی لیے ان کے گھونسلے سب سے پہلے اُجڑ جاتے ہیں، یا اُن میں سے انڈے لُڑھک کر زمین پر آن گرتے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں۔ یوں نیا خاندان بننے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔

فاختہ بہت حساس پرندہ ہے۔ گھروں میں بنے گھونسلوں میں موجود انڈوں کو اگر کوئی ہاتھ لگا دے، یا اُٹھا کر دوبارہ واپس رکھ دے تو فاختہ اُن انڈوں کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھے گی، یا تو اُن کو زمین پر گرا کر دوبارہ انڈے دے گی یا پھر گھونسلا چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے گی۔ یہی حال بچوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے، اگر آپ فاختہ کے بے پر بچوں کو ہاتھ لگا دیں، ایک بار اُٹھا کر واپس رکھ دیں تو وہ اُن بچوں کو گھونسلے سے گرا دے گی جہاں زمین پر اِدھر اُدھر گھومتی بلیاں ان کو شکار کر لیتی ہیں اور اپنی بھوک مٹاتی ہیں۔ گویا فاختاؤں کو اپنی گھریلو زندگی میں ہر طرح کی بیرونی مداخلت سخت ناپسند ہے اور اگر کوئی اُن کی دُنیا میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو یہ وہاں سے کوچ کر جاتی ہیں۔

فاختہ کا بھولپن بھی مثالی ہے، بلکہ یہ صفت اس پرندے کی خاص خوبی تصور کی جاتی ہے۔

فاختائیں دنیا بھر میں پائی جاتی ہیں، البتہ جغرافیائی حالات اور موسمی تنوع کی بدولت ہر جگہ ان کی رنگت اور قامت میں فرق ضرور پیدا ہو جاتا ہے، جس کی بنا پر فاختہ کے علاقے کی پہچان کی جا سکتی ہے۔

ماہرین کی ایک تحقیق اور مشاہدے کے مطابق افزائش کے دنوں میں عام طور پر تین پرندوں (فاختاؤں) کو بے چین، پریشان اور مضطرب کیفیت میں ایک دوسرے کے پیچھے اُڑتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ اُن میں سب سے آگے انڈے دینے کے لیے تیار جوڑے کا نر ہوگا، اُس کے پیچھے دوسرا پرندہ بھی نر ہوگا جس کو اپنی مادہ کی تلاش ہے اور اس کو اپنا گھونسلا اِس جوڑے سے بچانا ہے، جبکہ تیسری مادہ ہوگی جس کا نر اُس کی رہنمائی کرنے کے علاوہ اُس کے لیے گھونسلے کی جستجو میں ہے۔ یہ ایک سماجی منظرنامہ ہے۔ یہ تحقیق ظاہر کرتی ہے کہ انڈے دینے کے لیے تیار فاختاؤں کا نر پہلے گھونسلا تعمیر کرنے کی بجائے مادہ کو رجھانے اور جوڑا بنانے پر زیادہ توجہ دیتا ہے، اور جب اپنی مادہ ڈھونڈھ لیتا ہے تب گھونسلے کی جستجو کرتا ہے۔

فاختہ اُڑان بھرتی ہے تو اُس کے پروں سے پیدا ہونے والی سرسراہٹ ماحول میں دلکش آہٹ بھر دیتی ہے۔ رفتار ایسی جیسے بندوق سے گولی نکلے اور نشانے پہ جا لگے۔ سینکڑوں کلومیٹر کا فاصلہ ایک ہی اُڑان میں کر سکتی ہے۔

فاختہ کا گوشت بہت لذیذ اور ذائقے دار ہوتا ہے اسی لیے یہ پرندہ عموماً شکاریوں کے شوق کا نشانہ بنا رہتا ہے۔ لذتِ کام و دہن اور شوقِ شکار کے لیے، شمالی امریکا، میکسیکو، نیوزی لینڈ کے علاوہ برِ صغیر میں اس کا بہت زیادہ شکار کیا جاتا ہے۔

فاختہ ایک نرم دل اور ہمدرد پرندہ ہے۔ بچپن کی یادیں ہوں کہ واقعات ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں، گردِ فراموشی میں گم ہی کم ہوتے ہیں۔ تیس چالیس برس پہلے کے بچپن کی یادوں کو سمیٹیں تو احسان کا بدلہ احسان کا درس دیتا ہوا ایک واقعہ چراغ بن کر جگمگاتا، مسکراتا ملتا ہے۔ جو کہانی کی صورت میں چھوٹی کلاسوں کی اردو کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ کہانی کچھ یوں تھی۔

ایک دفعہ ایک شکاری جنگل میں شکار کرنے آیا۔ اُس نے درخت کی شاخ پر فاختہ کو بیٹھے دیکھا تو بندوق سے نشانہ باندھنے لگا۔ فاختہ بے خبر تھی۔ ایک چیونٹی نے ماجرا دیکھا تو شکاری کے پاؤں پر کاٹ کھایا، نشانہ خطا ہو گیا، فاختہ اُڑ گئی۔ چند دن بعد چیونٹی نہر کنارے پانی پینے گئی تو پانی میں گر گئی، فاختہ دیکھ رہی تھی اُس نے فوراً ایک پتا توڑا اور چیونٹی کے آگے لا کر پانی میں ڈال دیا، یوں چیونٹی کی جان بچ گئی۔ فاختہ نے چیونٹی کی جان تو بچالی، مگر وہ شکاری جو اُس کو شکار کرنے آیا تھا، بار بار جنگل میں، نہروں کے کناروں پر، کھیتوں میں، سبزہ زاروں میں گھومتا رہا، گھومتا رہا، ہر نظر آنے والی فاختہ کو اپنی بندوق کا نشانہ بناتا رہا اور یوں ہوا کہ فاختاؤں کی نسل ہی معدوم ہونے لگی۔

اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ ہماری سماعتیں فاختہ کے رس بھرے گیتوں سے اور آنکھیں دلکش اُڑانوں سے محروم ہو چکی ہیں، درخت اور پرندے لازم و ملزوم ہیں، پرندوں کو شکار کرنے کی لت اور عادت اس پر مستزاد ہے، ماحولیاتی آلودگی ایک اور خطرناک مسئلہ ہے جس نے نازک، نفیس اور خوبصورت فاختہ کو منظر اور ماحول سے گم کرنا شروع کر دیا ہے۔

اس سے پہلے کہ معصوم، دلکش اور حسین پرندے کہانیوں اور عجائب گھروں میں رہ جائیں ہمیں سوچنا ہے کہ ان کی حفاظت کیسے کریں کہ ان کی حفاظت اپنی ہی بقا اور سلامتی ہے۔

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

فلم نگری

بابائے سندھی فلم

انور فرہاد

برصغیر کی پہلی فلم "علی بابا" کوقرار دیا جاتا ہے جسے ہیرا لال سین نے 1903ء کوکلکتہ میں تیار کیا تھا پھر 1913ء میں دادا صاحب پھالکے نے "راجا ہریش چندر" بنائی جسے برصغیر کی پہلی فیچر فلم کہا جاتا ہے لیکن بولتی فلموں کا دور 1931ء سے شروع ہوا'عالم آراء جسے اردشیر ایرانی نے امپریل فلم کمپنی کے بینر پر بنایا تھا'پھر 1932ء میں پہلی پنجابی فلم "ہیر رانجھا" بنی لیکن سندھی زبان کی جانب کسی کی توجہ نہ تھی ایسے میں ایک غیر سندھی نے پہلی سندھی فلم "عمر ماروی" بنا کر تاریخ رقم کردی۔

ایک معروف ہدایت کار کی دکھ بھری روداد

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ڈھاکے میں صرف بنگالی فلمیں بنتی تھیں اوران میں بیشتر فلمیں بہت اچھی، خوب صورت اور معیاری ہوتی تھیں۔ فلم والوں کے بے حد اصرار پر حکومت نے فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا ایک ادارہ قائم کر کے اس کے زیر نگرانی ایک فلم اسٹوڈیو F.D.C تعمیر کردیا تھا، جو فلمسازی کے جدید ساز وسامان سے آراستہ تھا۔

اس دور میں ایک بنگالی کو خیال آیا کہ وہ یہاں ایک اردو فلم بنائے۔ اسے یہ خیال اس لیے آیا کہ ڈھاکے کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

بنگالی فلمیں اچھی ہونے کے باوجود صرف مشرقی پاکستان کی حدود میں ہی چلتیں اور بزنس کرتی تھیں جب کہ اس دور میں لاہور اور کراچی میں بننے والی فلمیں پورے پاکستان میں دیکھی اور دکھائی جاتی تھیں اور ان کا کاروباری سرکٹ مشرقی پاکستان بھی تھا۔ اس بنگالی نے سوچا اگر میں یہاں اردو فلم بناؤں گا تو اسے بھی پورے پاکستان میں ریلیز کرسکوں گا۔ یہ بنگالی بے بی اسلام تھا جو کلکتے سے ہجرت کر کے ڈھاکے آیا تھا اور کلکتے کی فلم انڈسٹری کا ایک منجھا ہوا اور باصلاحیت کیمرامین تھا۔

اس نے اردو فلم بنانے کا ارادہ کیا تو سرور بارہ بنکوی سے اس کا اسکرپٹ لکھوایا اور ''تنہا'' کے نام سے اس کی فلم سازی اور ہدایت کاری کا کام شروع کر دیا اور اس فلم کے کلیدی کرداروں کے لیے کراچی سے شیخ حسن اور شمیم آراء کو کاسٹ کیا اور ہیرو کے لیے ایک نئے پشاوری لڑکے ہارون کو بطور ہیرو متعارف کرایا۔

میں نے سرور بارہ بنکوی سے پوچھا۔ ''سرور صاحب! یہ شیخ حسن اور شمیم آراء کو آپ لوگوں نے کیوں کاسٹ کیا ہے؟''

واضح رہے کہ ان دنوں فلم یا فلم والوں کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھی۔ میں ایک ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر و ادیب کی حیثیت سے سرور صاحب یا اس دور کے ڈھاکے کے ادیبوں اور شاعروں سے قرابت رکھتا تھا۔

''ارے بھئی! ہم جو فلم بنا رہے ہیں اس کی کہانی کے کرداروں کی مناسبت سے آرٹسٹوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔''

''تو کیا یہاں ڈھاکے میں ایسے اداکار یا اداکارہ نہیں تھے کہ کراچی سے لانا پڑا؟''

''یہاں بھی بہت اچھے آرٹسٹ ہیں مگر بے بی اسلام نے شیخ حسن اور شمیم آراء کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ شمیم آراء ایک ابھرتی ہوئی باصلاحیت اداکارہ ہے جب کہ شیخ حسن ایک بہت پختہ کار اداکار ہیں۔ وہ ہماری کہانی کے کردار کو اپنی اداکاری سے چار چاند لگا دیں گے۔ اس کی شوٹنگ جب شروع ہوگی تو آکر دیکھنا کہ کس پائے کے اداکار ہیں۔ ان کی اداکاری حقیقت سے بہت قریب ہوتی ہے۔''

اور پھر جب ایف ڈی سی اسٹوڈیو میں ''تنہا'' کی شوٹنگ شروع ہوئی اور اس میں شیخ حسن بھی حصہ لے رہے تھے تو ایک دن وہاں جا کر میں نے بھی شیخ حسن کو اداکاری کرتے دیکھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اپنے پلے کچھ نہیں پڑا۔ سینما کے اسکرین پر مختلف مناظر آ آ کر گزر جاتے ہیں۔ یہاں یہ تماشا دیکھا کہ ایک ایک منظر کے متعدد ٹکڑے ایک ایک کر کے فلمبند کیے جا رہے ہیں۔ جلد ہی میں وہاں سے بور ہو کر واپس آ گیا۔

میں وہاں شیخ حسن کی اداکاری دیکھنے گیا تھا مگر وہاں جو اداکاری ان سے کرائی جا رہی تھی وہ اپنی سمجھ سے بالاتر تھی۔ ایک دو جملے کچھ کرتے ہوئے ان سے کہلوائے جاتے تھے جس کے بعد بے بی اسلام ان سے کہتے۔ ''شیخ صاحب۔ اس سے تھوڑا اور بہتر۔''

''ٹھیک ہے۔''

شیخ صاحب کو تو اس بات پر برا نہیں لگا تھا مگر مجھے برا لگا۔ اچھا خاصا تو شاٹ دیا تھا شیخ صاحب نے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''اس سے اور بہتر کی فرمائش چہ معنی دارد؟''

شیخ حسن کی ایک فلم ''برکھا'' میں نے دیکھی تھی مگر مجھے وہ فلم کہانی اور اس کے گانوں کی وجہ سے اچھی لگی تھی۔ میں نے کسی کی بھی اداکاری پر توجہ نہیں دی تھی۔ ''تنہا'' کے سیٹ پر میں نے شیخ حسن اور شمیم آراء کو دیکھا تو بس یہ سوچا تھا؟ اداکار و ہدایت کار بھی تو ہمارے ہی جیسے ہوتے ہیں مگر سینما کے اسکرین پر کتنے مختلف نظر آتے ہیں۔

یہ تھی شیخ حسن سے میری پہلی ملاقات ایسی ملاقات جس میں میں نے انہیں بس تھوڑے فاصلے سے دیکھا تھا اور ان سے کچھ کہنے سننے کی نوبت نہیں آئی تھی مگر جب وہ ''جھک گیا آسمان'' اور ''گاتا جائے بنجارہ'' بنا رہے تھے ان دنوں میں کراچی میں تھا اور ایک فلم جرنلسٹ کی حیثیت سے جانا پہچانا جاتا تھا تو ان سے کئی بار ملنے کا موقع ملا۔

مجھے یاد ہے پہلی بار دکھی پریم نگری نے مجھے ان سے یہ کہتے ہوئے ملوایا تھا۔ ''شیخ صاحب! یہ میرا بڑا لائق فائق شاگرد انور فرہاد ہے۔''

انہوں نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا تھا۔ ''آپ کا نام میرے لیے انجانا نہیں۔ آپ بھی شاید بھائی الیاس کے اخبار نگار سے وابستہ ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''میں ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ آپ سے مل کر بھی مجھے بہت خوشی ہوئی ہے اُمید

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہے کہ آئندہ بھی ملنے ملانے کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔"

دکھی پریم نگری صاحب سے وقتاً فوقتاً شیخ حسن کے بارے میں باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ "یار! اتنا بڑا آدمی ہے مگر....."

"آپ سے بڑا تو نہیں۔ آپ تو اس سے بھی کچھ زیادہ قد کاٹھ کے ہیں۔" میں نے ازراہ تفنن کہا۔

دکھی صاحب نے ہنس کر کہا۔ "یار! قد کاٹھ سے بھی کوئی بڑا ہوتا ہے۔ اپنی فنی خوبیوں اور کارکردگی سے بڑا مانا جاتا ہے۔ شیخ حسن ایک بڑی فلمی شخصیت ہیں۔ ان کے کارنامے انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔ تم بھی کبھی ان کے بارے میں لکھو۔"

"ٹھیک ہے، لکھوں گا۔"

مگر میں نے ان پر کچھ نہیں لکھا۔ ان کی وفات کے بعد ایک واجبی سی سرسری... تحریر لکھی اور بس۔ پھر کچھ دنوں کے بعد مجھ سمیت سارے ہی لکھنے والوں نے انہیں فراموش کر دیا۔

بحیثیت قوم ہم لوگ اتنے ہی احسان فراموش ہیں۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے ہیروز کو اپنے ادیبوں، شاعروں، فنکاروں، کھلاڑیوں اور سائنس دانوں کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں مگر ہم لوگ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مصداق اپنے ہیروز کو جلد ہی بھول جاتے ہیں۔

گزشتہ دنوں کہیں ایک گانا بج رہا تھا

دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں

اس سدا بہار گیت کو سن کر دکھی پریم نگری یاد آ گئے اور ان کے ساتھ ہی شیخ حسن کی یاد بھی آ گئی۔ اس شخص نے اپنی فلم کے لیے کیسا امر گیت لکھوایا تھا۔ شیخ حسن واقعی بہت بڑی فلمی شخصیت تھی۔ میں نے دکھی صاحب سے وعدہ کیا تھا کہ شیخ حسن کی شخصیت اور فن پر کبھی تفصیلی تحریر لکھوں گا مگر دکھی صاحب کی زندگی میں یہ وعدہ ایفا نہ ہو سکا۔ ان کے اس نالائق شاگرد نے ان کے قابل قدر استاد پر کچھ نہیں لکھا۔ شاید اس لیے نہیں لکھا کہ اخبارات میں بھرپور انداز کی تحریر کے لیے جگہ بنانا ممکن نہ تھا اور میں شیخ حسن کی پوری زندگی کو سامنے لانا چاہتا تھا لیکن جب سرگزشت کے لیے لکھنا شروع کیا تو یہ موقع مل گیا اور میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ اب مجھے وہ قرض ادا کر ہی دینا چاہیے۔ دکھی پریم نگری کی روح کو سکون پہنچانے سے زیادہ اب یہ میری اپنی ضرورت تھی۔ میرا ضمیر بچھو بن کر جو نیش زنی کر رہا تھا اس سے نجات حاصل کرنے

زندگی نامہ

نام: شیخ حسن

پیدائش: 1912ء

مقام ولادت: دادر (بمبئی)

ابتدائی تعلیم: دادر ہی کے تعلیمی اداروں میں حاصل کی۔

فلمی کیریئر: اپنی کمسنی ہی سے بمبئی کے نگار خانے رنجیت مودی ٹون سے وابستہ ہو گئے اور فلم سازی کے مختلف شعبوں میں ورکر کی حیثیت سے تربیت حاصل کرتے رہے۔ اس دوران مختلف فلموں میں اداکاری بھی کی اور ہدایت کاری بھی سیکھی۔ بعد ازاں رنجیت مودی ٹون کے سب سے بڑے ہدایت کار ایس پی ایرانی نے انہیں اپنا مستقل اسسٹنٹ بنا لیا۔ 1946ء میں بمبئی میں اپنی پہلی فلم "شہناز" بنائی۔

ہجرت: قیام پاکستان سے چند روز پیشتر ہی پاکستان (کراچی) آ گئے۔

پاکستان میں پہلی فلم: پاکستان میں پہلی فلم اردو زبان میں "برکھا" بنائی۔

دیگر قابلِ ذکر فلمیں: عمر ماروی (پہلی سندھی فلم)، ہماری زبان (اردو زبان پر بنائی جانے والی فلم)، جاگ اٹھا انسان (بلوچی ہیرو قادر بخش بلوچ عرف کادو مکرانی پر اردو زبان میں معرکۃ الآرا فلم)، جھک گیا آسمان (اردو فلم)، نوری جام تماچی (سندھی)، شاہ رو فیروز (سندھی)، گاتا جائے بنجارہ (اردو)، لاکھوں فسانے (اردو)۔

آخری فلم: مہران جاموتی (سندھی)۔

آخری ایام: آخری ایام بیماری اور کسمپرسی کی حالت میں گزارے بینائی چلی گئی تھی۔

انتقال: طویل علالت... کے بعد 80 سال کی عمر میں 25 جولائی 1992ء۔

بطور ہدایت کار فلمیں

اداکار و ہدایت کار شیخ حسن کی بطور ہدایت کار کل چودہ فلمیں تھیں۔ جن میں اردو فلمیں 8، سندھی فلمیں 5 اور پنجابی زبان کی ایک فلم شامل ہے۔ سندھی زبان میں بننے والی فلم "مہران جاموتی" بطور ہدایت کار ان کی آخری فلم تھی۔ پاکستان میں ان کی پہلی فلم "برکھا" تھی۔ جب کہ ہندوستان میں انہوں نے شہناز نامی فلم اردو زبان میں ڈائریکٹ کی تھی۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کے لیے صفحات بھی مل گئے ہیں۔

شیخ حسن محض ایک اداکار اور ایک ہدایت کار ہی نہیں تھے۔ ایک تاریخ ساز شخصیت کے مالک بھی تھے۔ ان کے کارنامے ایسے ہیں جنہیں پاکستانی فلمی مؤرخ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ انہوں نے کراچی میں بننے والی پہلی فلم ''ہماری زبان'' بنائی۔ ہماری زبان اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے تناظر میں بنائی گئی تھی۔ شیخ حسن کو اردو زبان سے جو محبت تھی اس کے اظہار کے لیے انہوں نے یہ فلم بنائی تھی۔ سوچنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ ایک ہدایت کار جو کراچی میں فلم بنا کر اپنے آپ کو روشناس کرا رہا ہے اس نے کسی روایتی اور چالو سبجیکٹ پر فلم بنانے کی بجائے ایک ڈاکومنٹری ٹائپ کی فلم بنائی جس میں قدرے کمرشل انداز کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس فلم کے نغمات آغا حشر کاشمیری، داغ دہلوی، عطا محمد، انیس رند کیفی اور رشید لاشاری نے لکھے تھے۔ ان میں عطا محمد کا تحریر کردہ نغمہ ''ہماری زباں اردو قومی زبان اردو'' جسے گلوکارہ نذیر بیگم کی آواز میں ریکارڈ کیا گیا تھا جب کہ اس فلم کے یہ دو نغمے اس دور میں مقبول ہوئے تھے۔

رخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

(شاعر داغ دہلوی موسیقی غلام نبی عبدالطیف)

تیری دنیا سے بہت دور چلی جاؤں گی

(شاعر رند کیفی موسیقی غلام نبی عبدالطیف)

اس فلم میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تصویر کو بھی نمایاں انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ ان کی زبانی ایک پیغام بھی دیا گیا تھا۔ اس فلم کے فلم ساز محمد خان تھے۔ جو برصغیر کے شہرۂ آفاق ہدایت کار محبوب خان کے حقیقی بھائی تھے۔ یہ فلم کراچی کے ایسٹرن اسٹوڈیو میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ واضح رہے کہ پہلے اس فلم کا نام ''سدا سہاگن'' رکھا گیا تھا۔

شیخ حسن کے کریڈٹ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ انہوں نے پہلی سندھی فلم ''عمر ماروی'' بنائی۔ کیسا عظیم شخص تھا وہ کہ اس نے اردو زبان پر فلم بنا کر نہ صرف اردو زبان سے محبت کا بھرپور اظہار کیا بلکہ علاقائی زبان سندھی کو بھی اپنی فلم کے ذریعے نئی زندگی دی۔

ہر زبان کی پہلی فلم کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ سندھی زبان کی پہلی فلم ''عمر ماروی'' سندھ کی ایک رومانوی داستان پر بنائی گئی تھی۔ فاضلانی فلمز کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے فلم ساز سید حسن علی فاضلانی تھے جو سندھ کے ایک باذوق زمیندار تھے۔ ادب اور ثقافت سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔ اس فلم میں انہوں نے بطور اداکار فلم کا کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ ان کے مقابل نگہت سلطانہ فلم کی ہیروئن تھیں۔

ہدایت کار شیخ حسن نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا جب کہ چارلی بھی اس کی کاسٹ میں شامل تھے۔ اس رومانوی فلم کی موسیقی غلام نبی عبداللطیف کی موسیقار جوڑی نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم 12 مارچ 1956ء کو نمائش پذیر ہوئی اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ بطور ہدایت کار شیخ حسن نے اس فلم سے اپنی ساکھ مستحکم کر لی تھی۔

شیخ حسن کی پاکستان میں پہلی فلم ''ہماری زبان'' کی مزید تفصیل یہ ہے کہ یہ فلم محبوب پکچر کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ اس کے فلم ساز ایم آر خان تھے۔ اس کی کاسٹ میں شیخ حسن، وینا، رشیدہ اور لڈن قابلِ ذکر آرٹسٹ شامل تھے۔ غلام نبی عبداللطیف کو بطور موسیقار ہدایت کار شیخ حسن نے پہلی بار متعارف کرایا تھا۔ یہ فلم 1955ء میں ریلیز کی گئی تھی۔ اس کی نمائش صرف کراچی میں ہوئی تھی۔ ڈاکومنٹری نوعیت کی فلم ہونے کی وجہ سے باکس آفس پر کامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی اہمیت بس اس لحاظ سے تھی کہ قومی زبان اردو کے بارے میں تھی۔

اس سے پہلے کہ شیخ حسن کی پاکستان میں بنائی گئی دیگر فلموں کا ذکر کروں بہتر ہوگا کہ اس عظیم فنکار کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتاؤں۔ وہ کون تھے اور انہوں نے اپنی فنی زندگی کب اور کیسے شروع کی؟ وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو اپنی پہلی فلم سے ہی کامیاب فلمی زندگی کا آغاز کر دیتے ہیں۔

شیخ حسن بمبئی کے ایک محلے دادر میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے دادر کے ایک اسکول سے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ قدرت کو آگے چل کر چونکہ ان سے ثقافت کے میدان میں بہت اہم کام لینا تھا۔ اس لیے ابتداء ہی سے انہیں مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ کتابیں پڑھنا ان کا بہترین مشغلہ تھا۔ فکشن اور شاعری سے انہیں زیادہ دلچسپی تھی اس لیے افسانے ناول اور شعر و شاعری کی کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہتیں۔

بمبئی جو ان دنوں ممبئی نہیں کہلاتا تھا۔ اس کی اصل شناخت فلم نگری کی حیثیت سے تھی۔ متعدد نگار خانے وہاں موجود تھے۔ جن میں بڑی تعداد میں ہندی اور دیگر زبانوں

کی فلمیں بنتی تھیں۔

جس جگہ شیخ حسن کی رہائش تھی وہیں قریب ہی دو فلم اسٹوڈیوز بھی واقع تھے جن میں ایک کا نام رنجیت اسٹوڈیو اور دوسری کا نام شری ساؤنڈ اسٹوڈیو تھا۔ شیخ حسن کے ایک بھائی بطور ہیرو فلموں میں کام کرتے تھے۔ ان کا فلمی نام پرکاش تھا۔ شیخ حسن کے بہنوئی اسٹیج آرٹسٹ تھے۔ موصوف کی حیثیت بارہویں کھلاڑی جیسی تھی۔ اسٹیج کا کوئی اداکار جب کبھی کسی وجہ سے غیر حاضر ہوتا تو یہ صاحب اس کی جگہ جاکر کام کردیا کرتے تھے۔ وہ ایک منجھے ہوئے ڈراما آرٹسٹ تھے۔ انہیں آغا حشر کاشمیری کے بیشتر ڈرامے زبانی یاد تھے۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ شیخ حسن ایک فنکار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک عام ورکر کی حیثیت سے کیا۔ کچھ سیکھنے اور کچھ حاصل کرنے کا جذبہ ان میں موجود تھا۔ چنانچہ وہ فلم کے ہر شعبے میں قسمت آزمائی کرنے لگے۔ کبھی وہ کیمرے کے ساتھ لگے ہوتے اور فوٹوگرافی کے اسرار و رموز حاصل کرتے، کبھی میک اپ کرکے شاٹ دیتے، کبھی وہ فلموں میں فائٹ کرنے والوں کا ساتھ دے رہے ہوتے۔ اس طرح وہ اسٹوڈیو میں فلم میکنگ کی عملی تربیت حاصل کرتے رہتے۔ وہ ہدایت کاروں کے ساتھ بھی رہ کر ان کی معاونت کرتے رہے اور ہدایت کاری کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے کہ فلم کا کوئی شعبہ بھی ان کی دسترس سے دور نہ ہو۔ فلم بنانا کسی ایک شخص کا کام نہیں ہوتا، متعدد افراد اپنے فنی جوہر کا مظاہرہ کرکے فلم کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ ٹین ایجر شیخ حسن چاہتے تھے کہ وہ ہر شعبے سے متعلق واقف ہوں تاکہ اگر زندگی میں کبھی فلم بنانے کا موقع ملے تو فلم میکنگ کے بارے میں ہر زاویے سے اپنی گرفت مضبوط رکھ سکیں۔ ان کا ایک بھائی پرکاش فلموں کا مقبول ہیرو تھا۔ بہنوئی اسٹیج کے جانے مانے آرٹسٹ تھے۔ شیخ حسن چاہتے تو ان دونوں کی مدد اور سفارش سے شارٹ کٹ کا راستہ اختیار کرکے اپنے مستقبل کے لیے کوئی آسان طریقۂ کار اپنا سکتے تھے مگر اس حقیقت پسند نوجوان نے ایسا نہیں کیا بلکہ اپنی بنیادوں کو مضبوط کیا وہ کام کیا جو زندگی بھر ان کا سرمایہ ثابت ہو۔ سفارش کو وہ بیساکھی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔

نگار خانے میں ایک عام ورکر کی حیثیت سے شیخ حسن کی دلچسپی لگن اور جدوجہد کو دیکھتے ہوئے انہیں بطور اداکار

بطور اداکار

بطور اداکار شیخ حسن نے بمبئی کی متعدد فلموں میں پرفارم کیا جن میں شہنشاہ بابر، چین لے آزادی، واسکوڈی گاما اور کوالن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جب کہ پاکستان میں اپنی تقریباً تمام فلموں کے علاوہ دوسرے ہدایت کاروں کی فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ مادام نور جہاں کے ساتھ ہیرو کا کردار بھی کیا فلم تھی ٹوٹے تارے۔

جنہیں فلمی دنیا سے متعارف کرایا

شیخ حسن کا یہ کارنامہ بھی کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا کہ انہوں نے فلم کے ہر شعبہ کے لیے نئے چہرے متعارف کرائے۔ جن میں سے بیشتر نے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ بمبئی میں اپنی بنائی جانے والی فلم ''شہناز'' میں انہوں نے مشہور گلوکار امیر بائی کرناٹکی کو بطور میوزک ڈائریکٹر متعارف کرایا۔ اسی فلم میں صحافی دکھی پریم نگری کو بطور فلمی کہانی نویس، مکالمہ نگار اور نغمہ نگار پیش کیا۔ پاکستان میں بنائی جانے والی فلم ہماری زبان میں گلوکارہ نذیر بیگم اور موسیقاروں کی جوڑی غلام نبی عبدالطیف کو فلم انڈسٹری سے روشناس کروایا۔ اپنی پہلی سندھی فلم ''عمر ماروی'' میں نگہت سلطانہ کو بطور ہیروئن پیش کیا۔ سندھی فلم ''پرائی زمین'' میں بھی اداکارہ سوزی ڈینئل اور اداکار سلطان کو متعارف کرایا۔ اردو فلم ''لاکھوں فسانے'' میں اردو ادب کے نامور افسانہ نگار ابراہیم جلیس کو بطور فلمی کہانی نویس متعارف کرایا۔ شاہ رو فیروز میں مدد قلی مرن کو بطور عکاس اور غلام علی کو بطور موسیقار انٹروڈیوز کرایا۔ اسی فلم شاہ رو فیروز میں مشتاق چنگیزی، مہ پارہ اور ملک انوکھا کو بھی پہلی بار پیش کیا۔ ''جھک گیا آسمان'' میں محمود خان مودی کو بطور ہیرو چانس دیا۔ اسی طرح گاتا جائے بنجارہ میں آغا سجاد کو متعارف کرایا۔ گاتا جائے بنجارہ میں صحافی یونس ہمدم کو بھی پہلی بار گیت نگاری کا موقع دیا۔ اسی طرح انہوں نے سندھی ادیبوں رشید لاشاری اور امر جلیل کو بھی فلمی دنیا سے متعارف کرایا۔ انہوں نے زاہد شاہ صمد شیخ اور شکیل لاسی کو بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر اپنی فلموں کے ذریعے ہدایت کاری کی تربیت دی۔ ان کے یہ شاگرد بعد میں کامیاب ہدایت کار بنے۔

کاسٹ کیا جانے لگا۔ انہوں نے اس دوران جن فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ان میں رنجیت فلم کمپنی کی فلم نرس، کارواں، شہنشاہ، باہر، پربھو کا گھر، گوالن، چھین لے آزادی، واسکوڈی گاما اور سہرا قابل ذکر ہیں۔

شیخ حسن کی بطور اداکار فلم ''نرس'' کے ہدایت کار چتر بھوج روشی تھے۔ موسیقی گیان دت نے کمپوز کی تھی۔ شیخ حسن نے اس فلم میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ دیگر کاسٹ میں خورشید، انیل کمار، اردن پربھا اور اندرا شامل تھے۔ یہ فلم 1943ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

''کارواں'' شیخ حسن کی دوسری فلم تھی۔ یہ بھی رنجیت فلم کمپنی کی فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار ایس پی ایرانی تھے۔ موسیقار بلوسی رانی تھیں۔ اس فلم کی دیگر کاسٹ میں کملا چٹرجی، کیسری، پریم لتا، شیخ حسن اور اردن شامل تھے۔ یہ فلم 1944ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اس دور میں آج کی طرح اداکار اور اداکارائیں اپنی مرضی سے ہر فلم ساز و ہدایت کار کی فلم میں کام نہیں کر سکتے تھے۔ اس زمانے میں ہر فلم کمپنی کے اپنے ہدایت کار اور فنکار ہوا کرتے تھے جو باقاعدہ ان فلم کمپنیوں کے ملازم ہوا کرتے تھے۔ انہیں ہر ماہ تنخواہ ملتی تھی۔ فلم بنے یا نہ بنے وہ اس کے حقدار ہوتے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے اپنی کمپنی چھوڑ کر کسی اور کمپنی میں نہیں جا سکتے تھے۔ نہ ہی کوئی فنکار کسی دوسری کمپنی کی فلموں میں کام کر سکتا تھا۔ نہ ہی کوئی ہدایت کار کسی اور کمپنی کی فلم ڈائریکٹ کر سکتا تھا۔

شیخ حسن رنجیت فلم کمپنی کے ملازم تھے۔ اس دور میں رنجیت فلم کمپنی میں سب سے زیادہ فلمیں بنا کرتی تھیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ رنجیت فلم کمپنی فلموں کی فیکٹری تھی۔ اس فلم کمپنی میں سب سے زیادہ ہدایت کار اور فنکار ملازم تھے۔ رنجیت فلم کمپنی سے وابستہ ہونے کے بعد شیخ حسن نے یہاں کی فلموں میں اپنی اداکاری کے جوہر بھی دکھائے اور خدمت خلق کا کام بھی سرانجام دیا۔ جہاں بھی وہ محسوس کرتے کہ ان کی مدد اور تعاون کی کسی ہنر مند کو ضرورت ہے ترنت اس کی مدد کو پہنچ جاتے۔ کبھی لیبارٹری میں فلم دھلوانے کے موقع پر، کبھی رشش یا پرنٹ نکلوانے کے مرحلے پر حاضر ہو جاتے اور بغیر کہے متذکرہ ہنر مند کا ہاتھ بٹاتے۔ وہ ہر طرح کے کام کرنے والی مشین کی طرح ہر وقت حاضر خدمت رہتے۔ ان کی یہ خوبی سب کو پسند آتی کہ وہ بغیر صلے و ستائش کے اور لالچ سے بالاتر ہو کر سب کے کام آتے تھے۔

ان کی اس خوبی نے رنجیت فلم کمپنی کے صف اوّل کے ہدایت کار ایس پی ایرانی کو اتنا متاثر کیا کہ انہوں نے شیخ حسن کو مستقل طور پر اپنا چیف اسسٹنٹ بنا لیا۔ نیکی چاہے جس صورت میں ہو کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ شیخ حسن کو ان کی اس نیکی کا قدرت کی طرف سے بہت بڑا انعام ملا تھا۔ رنجیت فلم کمپنی کے بہت بڑے ہدایت کار کے نائب کے طور پر کام کرنے کا یہ اعزاز کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ شیخ حسن کو ڈائریکشن کے اسرار و رموز سیکھنے کا اس سے زیادہ بہتر اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ اس نوجوان نے ایک اچھے شاگرد کی حیثیت سے ایس پی ایرانی کی کئی فلموں میں انہیں اسسٹ کر کے ہدایت کاری کے ضمن میں بہت قیمتی معلومات حاصل کیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ اداکاری بھی کرتے رہے۔ ایس پی ایرانی کی فلموں میں بھی اور رنجیت موی ٹون کی دیگر فلموں میں بھی۔

ایس پی ایرانی کی فلم ''کارواں'' کے بعد شیخ حسن کی بطور اداکار فلم ''شہنشاہ بابر'' ریلیز ہوئی۔ یہ بھی رنجیت موی ٹون کی فلم تھی۔ اس کے ہدایت کار وجاہت مرزا اور موسیقار کھیم چندر پرکاش تھے۔ یہ فلم بھی 1944ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔ اس کی کاسٹ میں شیخ مختار، خورشید، مجید، سلوچنا چٹرجی، شیخ حسن، سوشیل کمار اور لالہ یعقوب شامل تھے۔

شیخ حسن کی اداکار کی حیثیت سے ایک منفرد فلم ''گوالن'' تھی جو 1946ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں شیخ صاحب کو ایک غیر معمولی کردار میں پیش کیا گیا تھا۔ جس میں ان کی اداکاری کو سب نے پسند کیا تھا جب کہ یہ فلم بھی عوامی معیار پر پوری اتری تھی۔ امر پکچرز کے بینر تلے بننے والی اس کامیاب فلم کی موسیقی ہنس راج بہل نے ترتیب دی تھی جب کہ اس کے ہدایت کار بابو راؤ پٹیل تھے۔ سوشیلا رانی، ترلوک کپور، مادھوری اور ڈیوڈ نے بھی اس فلم میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔

شاید یہ پڑھتے وقت آپ سوچ رہے ہوں گے کہ وہ شخص جس نے ایک ہدایت کار کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوایا۔ اسے آخر اداکاری میں اتنے دنوں تک کیوں جان ماری کرنی پڑی؟ وہ اپنی ساری توجہ ہدایت کاری پر مرکوز رکھتا۔ آپ کی یہ سوچ غلط نہیں ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ برصغیر میں کم و بیش تمام نامور اور شہرت یافتہ ہدایت کاروں

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے اپنے فنی سفر کا آغاز اداکاری سے کیا تھا۔ مثال کے طور پر ایس ایم یوسف، ضیاء سرحدی، محبوب خان، سدمیر، ڈی شانتارام، مسعود پرویز، سہراب مودی، رفیق غزنوی، راج کپور، کاردار اور اپنے ہاں شان کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس کی وجہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک ہدایت کار کو جہاں فلم کے دیگر شعبوں کو کنٹرول کرنا پڑتا ہے وہاں آرٹسٹوں سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینا سب سے اہم ہوتا ہے۔ اس لیے ایک کامیاب ہدایت کار کے لیے یہ بات از بس ضروری ہے کہ وہ ایک اچھا اداکار بھی ہو اور ضرورت پڑنے پر اداکار یا اداکارہ کو خود پرفارم کر کے بتائے کہ اس طرح کرو۔

1947ء میں رنجیت مووی ٹون کی فلم ''چھین لے آزادی'' ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار بھی ایس پی ایرانی تھے۔ موسیقی ہنس راج بہل نے ترتیب دی تھی۔ اس کی کاسٹ میں غلام محمد، وینا، امرناتھ، شیخ حسن الطاف، ایس حسین اور راجندر سنگھ شامل تھے۔

شیخ حسن نے کچھ اور فلموں میں بھی اداکاری کی تھی جن میں ''واسکوڈی گاما'' اور ''سہرا'' قابل ذکر ہیں۔

فلم ''سہرا'' 1948ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کے ہدایت کار ڈی پی جوشی اور موسیقار ایس مہندر تھے۔

شیخ حسن فلموں میں اداکاری ضرور کر رہے تھے مگر ان کی منزل اداکاری نہیں ہدایت کاری تھی۔ ان کے دل میں یہ خواہش تھی کہ وہ کوئی فلم ڈائریکٹ کریں اور اپنے آپ کو ایک باصلاحیت ہدایت کار کے طور پر منوائیں تاکہ ان کے جوہر سب کے سامنے کھل کر آئیں۔

وہ جو کہتے ہیں کہ لگن سچی ہو تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔ اللہ رب العالمین بھی اس کی مدد کرتا ہے جو اپنے لیے جدوجہد کرتے ہیں۔ اپنی ذاتی فلم بنانے کے سلسلے میں انہوں نے جدوجہد شروع کی تو انہیں ایک صاحب محبوب میاں بالے مل گئے جو ان کی فلم کے لیے سرمایہ کاری پر رضامند ہو گئے۔

کسی بھی فلم کی تیاری کے لیے سب سے اہم چیز سرمایہ ہوتا ہے، قدم قدم پر پیسے کی ضرورت پڑتی ہے۔ روکڑا مہیا ہو جائے تو فلم شروع کر دی جاتی ہے۔ شیخ حسن نے بھی محبوب میاں بالے کے مالی تعاون سے فلم کی تیاری شروع کر دی۔ فلم کا نام ''شہناز'' رکھا۔ اس فلم کی کہانی، مکالمے اور نغمات دکھی پریم نگری سے لکھوائے۔ دکھی پریم

عمر ماروی۔ تاریخ ساز فلم

یوں تو شیخ حسن نے اپنی فلمی زندگی میں کئی کارنامے انجام دیئے مگر پہلی سندھی فلم ''عمر ماروی'' کی تخلیق ان کا وہ کارنامہ ہے جو فلمی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف میں جگمگاتا نظر آئے گا۔ وہ سندھی نہیں تھے مگر سندھ کی سرزمین اور اس کی ثقافت سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کی انہی خوبیوں کی وجہ سے انہیں بابائے سندھی فلم کا خطاب بھی دیا گیا۔

عمر ماروی سندھی زبان کی مشہور لوک داستان تھی جس پر شیخ صاحب نے فلم بنا کر نہ صرف سندھی فلموں کی ابتدا کی بلکہ اس کی کامیابی سے سندھی فلموں کو استحکام عطا کیا۔ یہ فلم پاکستان کے علاوہ بھارت میں بھی دکھائی گئی اور پسند کی گئی۔ اس فلم میں عمر سومرو کا کردار فاضلانی اور ماروی کا کردار نگہت سلطانہ نے ادا کیے جب کہ شیخ حسن نے ماروی کے منگیتر کا کردار ادا کیا۔ اس سندھی فلم کو 1963ء میں ماروی کے نام سے اردو زبان میں بھی بنایا گیا مگر اسے سندھی عمر ماروی جیسی پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔ سندھی عمر ماروی ایک یادگار فلم کا درجہ رکھتی ہے۔

ناکام اداکار

شیخ حسن نے جن آرٹسٹوں کو متعارف کرایا ان میں سے چند ایسے بھی گزرے ہیں جو اپنی نااہلی یا کسی اور وجہ سے فلمی کیریئر برقرار نہ رکھ سکے۔ ان میں محمود خان مودی، آغا سجاد، سلطان اور سندھ باد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نگری اس دور میں بمبئی میں ایک شوبز صحافی کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ شیخ حسن سے صاحب سلامت تھی۔ لہٰذا انہوں نے ان سے کہا۔ ''یار! تم کب تک دکھی بن کر دکھ بھری زندگی گزارتے رہو گے؟''

''شیخ صاحب جو تقدیر میں لکھا ہے۔''

شیخ حسن نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے سنا نہیں علامہ اقبال نے کیا کہا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

''جی ہاں سنا ہے۔''

''تو اپنی تقدیر خود بدلو۔ آگے بڑھو۔ جدوجہد کرو۔ محض صحافت ہی کو کب تک اوڑھنا بچھونا بنائے رہو گے؟''

''تو پھر.....اور کیا کروں شیخ صاحب؟ آپ ہی بتایئے۔''

''میرا خیال ہے تم میں بڑی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ انہیں باہر لاؤ۔ میں نے سوچا ہے تم میری پہلی فلم کے لیے لکھو۔''

''کیا لکھوں؟''

''ارے یار! میں اس پر کوئی فیچر لکھنے کو نہیں کہہ رہا ہوں۔ تم میری فلم کی کہانی لکھو۔ اس کے مکالمے لکھو اس کے گیت لکھو، تم شاعری بھی تو کرتے ہو ناں؟''

''جی ہاں مگر.....!''

''تم یہی کہنا چاہتے ہو ناں کہ مگر مجھے تو فلم رائٹنگ کا کوئی تجربہ نہیں۔''

''جی ہاں۔ یہی بات ہے۔''

''تمہیں لکھنا تو آتا ہے ناں؟''

''جی ہاں۔''

''بس اتنا ہی کافی ہے۔ میں تمہیں گائیڈ کروں گا۔ جیسا کہوں گا ویسا ہی لکھنا۔''

اور ایسا ہی ہوا۔ دکھی پریم نگری ایک پڑھے لکھے اور قلم کے دھنی تھے۔ شیخ حسن کی رہنمائی میں انہوں نے لکھا اور ایسا لکھا کہ انہیں فلم رائٹر کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔

شیخ حسن نے دکھی پریم نگری کی پیٹھ ٹھونک کر کہا۔

''کوئی بھی شخص ماں کے پیٹ سے سب کچھ سیکھ کر دنیا میں نہیں آتا۔ یہاں اسے سیکھنا پڑتا ہے۔ کچھ بننے کچھ حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے۔ جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اگر بندے میں سیکھنے کی لگن ہو، جوش اور جذبہ ہو۔ اپنی کوشش سے اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر دیتا ہے۔ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ میں یہ کر سکتا ہوں۔ جس طرح تم نے ثابت کر دیا کہ تم ایک اچھے صحافی ہی نہیں ایک اچھے فلمی مصنف بھی ہو، ایک کامیاب نغمہ نگار بھی ہو۔''

''آپ نے غلط نہیں کہا ہے مگر اس میں، میں یہ اضافہ کروں گا کہ اگر آپ کی نگرانی اور رہنمائی حاصل نہیں ہوتی تو میرے لیے یہ کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔''

''تمہاری بات میں، میں اپنی یہ بات بھی شامل کروں گا کہ اگر تم میں سیکھنے کا جذبہ اور لگن نہ ہوتا تو میری رہنمائی کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔''

''شہناز'' میں دکھی پریم نگری کی کہانی اور مکالموں ہی کی پذیرائی نہیں ہوئی۔ ان کے لکھے گیتوں کو بھی پسند کیا گیا۔ یہ گیت تو بہت مشہور ہوا۔

''تقدیر نے ہنسا کے ہمیں پھر رلا دیا''

جسے اس دور کی مشہور گلوکارہ امیر بائی کرناٹکی نے اپنی آواز میں ریکارڈ کروایا تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خوب صورت آواز کی یہ ملکہ ہی تھی جس نے اس گیت کی دھن تیار کی تھی۔ اس گانے کے علاوہ دیگر تمام گیتوں کی کمپوزیشن کی تھی۔ آپ درست سمجھے۔ امیر بائی کرناٹکی ہی نے بطور موسیقار ''شہناز'' کی موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس لحاظ سے یہ ان کی پہلی فلم تھی اور اس کا کریڈٹ بھی شیخ حسن کو جاتا تھا کہ انہوں نے اپنی فلم کے ذریعے اس گلوکارہ کے سر پر موسیقار کا تاج رکھ دیا۔ یعنی شیخ حسن نے دکھی پریم نگری کی طرح امیر بائی کرناٹکی کو بھی بطور موسیقار فلم انڈسٹری سے متعارف کرایا۔ وہ پہلی خاتون موسیقار نہیں تھیں۔ ان سے پہلے بھی کئی خواتین فلموں کی موسیقی ترتیب دیتی رہی تھیں۔ بہرحال یہ شیخ حسن کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے ایک گلوکارہ کو موسیقار بنا دیا۔ اپنی اس فلم میں شیخ صاحب نے ایک نوجوان نہال کو بھی بطور اداکار پیش کیا تھا۔

واضح رہے کہ بہت سے ہدایت کار نئے لوگوں کو متعارف کرانے کا رسک نہیں لیتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایک تو ان کے نئے ہونے کی وجہ سے فلم کی اسٹار ویلیو متاثر ہوتی ہے۔ دوسرے ان پر بڑی محنت کرنی پڑتی ہے تب کہیں وہ مطلوبہ پرفارمنس دے پاتے ہیں مگر یہ اچھا رجحان نہیں، اگر نئے آرٹسٹ اور ہنرمند متعارف نہ کرائے جائیں تو آنے والے دنوں میں اچھے پرفارمر کیسے سامنے آسکتے ہیں؟ شیخ حسن اس سلسلے میں بڑے کشادہ قلب تھے۔ انہوں نے بطور ہدایت کار اپنی پہلی فلم سے لے کر بعد کی فلموں میں بھی نئے لوگوں کو متعارف کرانے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔

ان کی پہلی فلم ''شہناز'' جو 1946ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ وہاب پروڈکشنز کے بینر تلے بنائی گئی تھی بیگم پارہ جو اس دور کی مشہور اداکارہ تھیں۔ اس فلم کی ہیروئن تھیں۔ ان کے مقابل الطاف نامی اداکار نے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ شیخ حسن نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

ایک سال بعد یعنی 1947ء میں تقسیم ہند کے بعد

پاکستان بن گیا۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح بمبئی سے بھی لوگ ہجرت کر کے پاکستان آنے لگے تھے۔ وقت اور حالات کے دھارے کو دیکھتے ہوئے شیخ حسن نے بھی متعدد سینئر فلمی شخصیات کی طرح پاکستان آنے کا فیصلہ کیا اور اپنی پہلی فلم ''شہناز'' کی نمائش کے بعد بمبئی سے کراچی آگئے۔ ان کی آمد سے پہلے ان کی فلم شہناز کراچی آچکی تھی اور ناز سنیما میں ریلیز ہو کر شیخ حسن کو اچھی طرح متعارف کرا چکی تھی۔ یوں بھی وہ بطور اداکار پاکستانیوں کے لیے کوئی نئے نہیں تھے۔ ان کی بمبئی میں بننے والی فلمیں پاکستان میں دیکھی اور دکھائی جاتی رہی تھیں۔

پاکستان آنے کے بعد شیخ حسن کو بطور ہیرو ایک فلم ''ٹوٹے تارے'' میں کاسٹ کیا گیا جس میں ان کی ہیروئن گلوکارہ و اداکارہ نور جہاں تھیں۔ یہ 1949ء کی بات ہے کہ جب یہ فلم بن کر تیار ہوگئی تو اس فلم کے سارے نیگٹیو نگار خانے میں جل کر خاکستر ہو گئے اور شیخ حسن کی پاکستان میں پہلی فلم ''ٹوٹے تارے'' کبھی ریلیز نہ ہو سکی۔ اس بات کا انہیں بہت دکھ تھا کہ ملکۂ ترنم کے ساتھ انہیں ہیرو کے طور پر پرفارم کرنے کا موقع تو ملا مگر ان کی یہ فلم اسکرین کی زینت نہ بن سکی۔ یہ سوچ کر انہوں نے صبر کر لیا کہ شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ شیخ حسن پاکستانی فلم بینوں اور فلم والوں کے لیے اجنبی نہیں تھے، بطور اداکار اور بطور ہدایت کار ان سے آشنا تھے۔ اس لیے انہیں اس نئی جگہ اپنے دوسرے فلمی دور کا آغاز کرنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان ہی دنوں کراچی میں فلم سازی کی ابتداء ہوئی تھی۔ لہٰذا کراچی کے ایک فلم ساز خادم حسین نے اپنی رومانوی فلم ''برکھا'' کے لیے انہیں ہدایت کار منتخب کیا۔ پاکستان میں بطور ہدایت کار شیخ حسن کی یہ پہلی فلم تھی۔ ایور گرین کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے موسیقار طفیل فاروقی تھے جب کہ اس کی کاسٹ میں مسعود، صبیحہ خانم، نذر، شمی، آشا پوسلے، شیخ حسن، سندباد اور سلطان کھوسٹ شامل تھے۔ نئی نسل کو یہ بتانا ضروری ہے کہ ٹی وی اور فلم کے ورسٹائل فنکار عرفان کھوسٹ، سلطان کھوسٹ کے فرزند ارجمند ہیں جب کہ ایک خوبرو نوجوان گل یوسف نے سندباد کے فلمی نام سے اس فلم میں کام کیا تھا اور روایتی ولن کے رول میں بڑی عمدہ اداکاری کی تھی۔ اس فلم کے گیت مشیر کاظمی نے لکھے تھے۔ جب کہ اس کا ایک نغمہ

شیخ حسن کی بطور ہدایت کار فلموں کی تفصیلات

''شہناز'' (اردو) 1946ء، موسیقار: امیر بائی کرناٹکی، کاسٹ: بیگم پارہ، الطاف، نہال، شاما۔ ''برکھا'' (اردو) 1952ء، موسیقار: طفیل فاروقی، کاسٹ: صبیحہ مسعود، آشا پوسلے، نذر شیخ حسن۔ ''ہماری زبان'' (اردو) 1955ء، موسیقار: غلام نبی عبدالطیف، کاسٹ: شیخ حسن، بینا، رشیدہ، لڈن۔ ''عمر ماروی'' (سندھی) 1956ء، موسیقار: غلام نبی عبدالطیف، کاسٹ: فاضلانی نگہت سلطانہ، چارلی شیخ، حسن۔ ''پرائی زمین'' (سندھی) 1958ء، موسیقار: غلام نبی عبدالطیف، کاسٹ: سلطان، سوزی، چارلی۔ ''لاکھوں فسانے'' (اردو) 1961ء، موسیقار: دیبو بھٹا چاریہ، کاسٹ: درپن، کملا کماری سوزی، احمد رشدی۔ ''ماروی'' (اردو) 1963ء، موسیقار: غلام نبی عبدالطیف، کاسٹ: فاضلانی، نگہت سلطانہ، ناصرہ رخسانہ۔ ''جاگ اٹھا انسان'' (اردو) 1966ء، موسیقار: لال محمد اقبال، کاسٹ: وحید مراد، زیبا، محمد علی، سیما، ابراہیم نفیس۔ ''شاہرو فیروز'' (سندھی) 1968ء، موسیقار: غلام علی، کاسٹ: ماہ پارہ، مشتاق چنگیزی، ملک انوکھا، سلیما شاہ۔ ''نوری جام تماچی'' (سندھی) 1970ء، موسیقار: غلام علی، کاسٹ: مشتاق چنگیزی، عشرت جہاں۔ ''جھک گیا آسمان'' (اردو) 1970ء، موسیقار: لال محمد اقبال، کاسٹ: محمود خان مودی، ترنم ترانہ، نرالا۔ ''گاتا جائے بنجارہ'' (اردو) 1972ء، موسیقار: لال محمد اقبال، کاسٹ: آغا سجاد، زمرد، فرخندہ، رنگیلا۔ ''ٹرک ڈرائیور'' (پنجابی) 1976ء، موسیقار: نیاز احمد باجی، کاسٹ: سلطان راہی، آسیہ۔ ''مہران جا موتی'' (سندھی) 1988ء، موسیقار: غلام علی، کاسٹ: شیراز، ریٹا، زاہدہ نور، ملک انوکھا، محمود لاسی۔

''یہ چاند تارے جھوٹے سہارے'' علامہ لطیف انور کا لکھا ہوا تھا۔ واضح رہے کہ یہ فلم ''برکھا'' کراچی فلم انڈسٹری کے ابتدائی دور کی فلم تھی جو مکمل طور پر لاہور میں مکمل کی گئی تھی۔ اس کی نمائش 1953ء میں ہوئی تھی اور اس لیے اس نے تماشائیوں کی توجہ حاصل کی تھی کہ یہ کراچی کے ایک فلم ساز کی پہلی فلم تھی۔ اس دور میں کراچی کی فلم انڈسٹری چونکہ نئی تھی اس لیے اس میں تقریباً سارے ہی آرٹسٹ لاہور سے لیے گئے تھے اور اسے لاہور کے نگار خانے میں مکمل کیا گیا تھا۔

شیخ حسن بمبئی جیسی فلم انڈسٹری سے آئے تھے۔ جہاں نگار خانوں کی بہتات تھی اور بے شمار فلمیں بنا کرتی تھیں جب کہ کراچی کی فلمی صنعت نہ ہونے کے برابر تھی مگر شیخ صاحب یہاں کے ماحول اور حالات سے گھبرائے نہیں۔ بلکہ اسے بنانے سنوارنے اور اس کی ترقی و ترویج میں مثبت کردار ادا کرنے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔ وہ چاہتے تو لاہور جا کر زیادہ بہتر ماحول میں کام کر سکتے تھے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اپنی بہتری کی بجائے کراچی کی نوزائیدہ فلم انڈسٹری کی بہتری اور بہبود کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

کراچی میں ان کی دوسری فلم ''ہماری زبان'' بطور ہدایت کار 1955ء میں ریلیز ہوئی جس کے بارے میں بتا چکا ہوں کہ یہ ڈاکومنٹری ٹائپ کی فلم تھی اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے پیشِ نظر بنائی گئی تھی۔ اس فلم کے ذریعے شیخ صاحب نے موسیقاروں کی نئی جوڑی غلام نبی عبداللطیف کو متعارف کرایا تھا۔ ڈاکومنٹری فلم کے ذکر پر یاد آیا کہ شیخ حسن نے ''جہاد کشمیر'' کے نام سے بھی ایک دستاویزی فلم بنائی تھی۔

اردو زبان کی ترویج و تشہیر سے متعلق فلم ''ہماری زبان'' کی نمائش کے بعد کی بات ہے کہ شیخ صاحب کے بہنوئی نے سندھ کے اندرونی علاقوں کا ایک دورہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ سندھ میں اسٹیج ڈراموں کے انعقاد کے لیے حالات کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔ سندھ کے دورے پر جاتے وقت انہوں نے شیخ حسن کو بھی اپنے ساتھ لے لیا کہ ایک سے دو بھلے۔ لہٰذا شیخ حسن کئی مہینوں تک اپنے بہنوئی کے ساتھ سندھ کے قصبوں اور دیہاتوں کا دورہ کرتے رہے۔ انہوں نے اس دوران سندھی زبان و ادب اور شاعری سے واقفیت بھی حاصل کی اور سندھیوں کے آرٹ اور کلچر کا مطالعہ بھی کیا۔ سندھی کی لوک کہانیوں کو لوگوں کی زبانی سنا اور ان کہانیوں کے مبینہ مقامات کو بچشم خود جا کر دیکھا اور پھر وہیں ایک سندھی فلم بنانے کی منصوبہ بندی بھی کر لی۔

اسی دوران شیخ صاحب کی ملاقات سید حسن علی فاضلانی سے ہوئی۔ فاضلانی صاحب سندھ کے ایک بہت بڑے زمیندار تھے اور صاحب ذوق بھی تھے۔ انہیں ڈراموں اور فلموں میں اداکاری کا شوق تھا۔

جب زمیندار صاحب کو معلوم ہوا کہ دارالخلافہ سے (کراچی ان دنوں پاکستان کا دارالخلافہ تھا) کچھ فنکار لوگ ادھر آئے ہیں تو انہوں نے ان سے ملاقات کی۔ انہیں اپنے اوطاق میں بلایا اور ان کی خوب آؤ بھگت کی اور کہا۔ ''میں اگرچہ اس دور دراز علاقے میں رہتا ہوں اور زمینداری کرتا ہوں مگر دوسرے زمینداروں سے قدرے مختلف ہوں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ ادب، آرٹ اور کلچر کا دلدادہ ہوں۔ مجھے بھی ڈراموں اور فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے۔''

''ماشاءاللہ! یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ آپ اس دور افتادہ جگہ رہنے کے بعد بھی اس قدر کلچرڈ ہیں۔''

''پتا نہیں یہ میری اچھائی ہے یا برائی۔'' فاضلانی صاحب بولے۔ ''آپ لوگوں کے بارے میں سنا تو ملاقات کے لیے بے چین ہو گیا اور یہاں آنے کی زحمت دی۔''

''جی نہیں، یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آپ ایک باذوق آدمی ہیں۔ آپ سے مل کر ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے گاؤں دیہات میں بھی ادب اور آرٹ کے دلدادہ لوگ بستے ہیں۔''

''عزت افزائی کا بے حد شکریہ۔''

''آپ کو علم ہو گا کہ ہمارے پاکستان میں اردو اور پنجابی میں فلمیں بنتی ہیں۔''

''جی ہاں معلوم ہے۔''

''آپ سندھ میں رہتے ہیں۔ سندھی ہیں۔ آپ چاہیں تو سندھی فلم بنا کر اپنے آرٹ اور کلچر کو فروغ دے سکتے ہیں۔''

''کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہو سکتا۔''

''مگر..... میں تو.....''

''ظاہر ہے آپ کو فلم اور فلم سازی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔'' شیخ صاحب نے کہا۔ ''اگر آپ کمربستہ ہوں تو ہم آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ بس آپ کا بنیادی کام فلم

URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

کے لیے سرمایہ کاری ہوگا۔"

"ہاں ہاں یہ کام تو میں بخوبی کرسکتا ہوں۔ میرے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں۔ بتائیے کتنے سرمائے سے فلم بن جائے گی؟"

اس طرح سندھی زمیندار سید حسن علی فاضلانی فلم بنانے پر بخوشی رضامند ہوگئے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے تو شیخ حسن کے لیے اندرون سندھ کا یہ سفر حقیقتاً وسیلۂ ظفر ہوا۔ انہیں ایک فلم پروڈیوسر مل گیا اور انہوں نے جو سندھی فلم بنانے کی منصوبہ بندی کی تھی اس پر عمل درآمد شروع کردیا۔ انہوں نے سندھی کی مشہور لوک داستان "عمر ماروی" پر فلم سازی کی تیاریاں شروع کردیں۔

اس سندھی لوک داستان کو فلم کے اسکرپٹ کی شکل دینے کے لیے ایک صاحب کو ڈھونڈ نکالا جو مسٹر بہوت کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ (قاضی عبدالرحیم) اس نوجوان نے نہ صرف شیخ حسن کی رہنمائی پر اس لوک داستان کو فلم کے اسکرپٹ کا روپ دیا بلکہ اس کا اسکرین پلے بھی تحریر کیا۔ موسیقی غلام نبی عبداللطیف سے ترتیب دلوائی۔ گانے لاشاری نے لکھے۔ فاضلانی نے جو اس فلم کے پروڈیوسر تھے، شیخ صاحب نے انہیں ہیرو کے روپ میں پیش کرکے انہیں اداکاری کا شوق پورا کرنے کا موقع دیا۔ نگہت سلطانہ نے ان کی ہیروئن کا کردار ادا کیا۔ چارلی اور شیخ حسن نے بھی اہم کردار ادا کیے۔

فاضلانی فلمز کے بینر تلے بننے والی یہ فلم 1956ء میں ریلیز ہوئی اور پہلی سندھی فلم ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ لوک کہانی چاہے جس زبان کی ہو، جب اس پر فلم بنتی ہے تو بہت پسند کی جاتی ہے۔ عمر ماروی کو بھی زبردست عوامی پذیرائی حاصل ہوئی۔ سندھ میں ہی اس نے پسندیدگی کی سند حاصل نہیں کی۔ بھارت میں بھی سلور جوبلی منائی۔ واضح رہے کہ بمبئی اور اس کے گردونواح میں بہت سے سندھی آباد ہیں۔

یہاں پاکستان میں بھی عمر ماروی کو صدارتی ایوارڈز سے نوازا گیا۔ اسے دو صدارتی ایوارڈز ملے ایک اس کے شعبۂ آرٹ پر اقبال صاحب کو دوسرا سہیل ہاشمی کو اس کی فوٹو گرافی پر۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اقبال شہزاد اور سہیل ہاشمی کو اسی فلم کے ذریعے شیخ حسن نے پہلی بار کام کرنے کا موقع دیا تھا۔

شیخ حسن کی نجی زندگی

شیخ حسن کی ہدایت میں بننے والی فلمیں دو یا تین سال کے وقفے سے عام طور پر ریلیز ہوئیں۔ جس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ جب وہ فعال تھے کام کررہے تھے۔ اس وقت بھی ان کی معاشی حالت زیادہ مستحکم نہیں تھی۔ لہٰذا فلم انڈسٹری سے کنارہ کشی کے بعد آزمائشی دور شروع ہونا لازمی تھا۔ چونکہ وہ ایک اچھے اور باضمیر انسان تھے اس لیے روایتی فلم والوں کی طرح انویسٹرز یا فلم سازی کی تلاش میں انہوں نے بھی کوئی نامناسب راستہ اختیار نہیں کیا اس لیے ان کی فلموں کی تعداد بہت کم ہے۔ انہوں نے اپنے 60 سالہ فلمی کیریئر میں خوش حالی کا دور بہت کم دیکھا۔ ان کی اولادوں نے ان کی زندگی میں یا ان کے بعد اسی لیے فلمی زندگی اختیار نہیں کی کہ وہ باپ کی طرح زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے تھے۔

عمر ماروی کی زبردست کامیابی کے بعد شیخ صاحب نے ایک اور سندھی فلم بنائی۔ اس بار کسی لوک کہانی کو فلمانے کی بجائے ایک سوشل سبجیکٹ پر فلم بنانے کی منصوبہ بندی کی۔ شیخ صاحب کا یہ اقدام قابل غور وفکر بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اگر کوئی فلم کامیاب ہوگئی تو پھر اسی قسم کی دوسری اور تیسری فلم بھی بنائی جاتی ہے۔ کامیاب فلم میکر خود بھی اسی نوعیت کی اگلی فلم بناتا ہے اور دوسرے فلم ساز وہدایت کار بھی اسی جیسی فلم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر شیخ حسن کی سوچ اور وژن کی تعریف کرنا پڑتی ہے کہ انہوں نے اپنی کامیاب فلم عمر ماروی کے بعد کسی دوسری لوک داستان پر فلم بنانا مناسب نہ سمجھا۔

انہوں نے اندرون سندھ جو کئی ماہ گزارے تھے اور وہاں کے حالات وواقعات سے جو واقفیت حاصل کی تھی۔ اس کے تناظر میں ایک معاشرتی فلم بنانے کا پروگرام بنایا۔ یہ ہاریوں (کسانوں) کے مسائل پر بننے والی سوشل فلم تھی جو "پرائی زمین" کے نام پر انہوں نے بنائی۔ اس کی کہانی انہوں نے دکھی پریم نگری سے لکھوائی جسے مسٹر بہوت نے سندھی زبان میں منتقل کروایا۔ یہ وہی مسٹر بہوت تھے جنہوں نے عمر ماروی کا اسکرپٹ اور اسکرین پلے لکھا تھا۔ سندھ فلم کارپوریشن کراچی کے بینر تلے بننے والی اس فلم کے فلم ساز

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

اے جی مرزا، ہدایت کار شیخ حسن موسیقار غلام نبی عبدالطیف تھے جب کہ اس کی کاسٹ میں سوزی ڈینل، سلطان، شیخ حسن اور چارلی نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ سلطان نامی نوجوان کو شیخ صاحب نے بطور ہیرو متعارف کرایا تھا۔ یہ فلم 1958ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اپنے سبجیکٹ اور تھیم کے پیشِ نظر اسے پذیرائی ملی تھی مگر عمر ماروی کی طرح باکس آفس پر کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ عمر ماروی کے بعد پرائی زمین جیسی سندھی فلمیں بنانے پر شیخ حسن کو بابائے سندھی فلم کے خطاب سے نوازا گیا۔

شیخ حسن ایک وسیع النظر شخصیت کے مالک تھے اس لیے عام فلم میکرز سے قدرے مختلف تھے۔ محض کاروباری مفاد کے پیشِ نظر فلمیں نہیں بناتے تھے جب جہاں اور جس وقت جس نوعیت کی فلم کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور یجنل فلم بناتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کی تقلید نہیں کی نہ ہی کبھی کوئی چربہ فلم بنائی۔ اردو فلم سے انہوں نے فلم میکنگ کا آغاز کیا تھا مگر سندھی فلمیں بھی بنائیں اور کامیابی حاصل کی مگر سندھی فلموں ہی کے نہیں ہو رہے اردو فلمیں بھی بناتے رہے۔

دو کامیاب سندھی فلموں عمر ماروی اور پرائی زمین کے بعد انہوں نے ایک اردو فلم ''لاکھوں فسانے'' تو می زبان میں بنائی اس کی کہانی نامور ادیب ابراہیم جلیس سے لکھوائی۔ نشاط پروڈکشنز کے بینر تلے بننے والی اس فلم کی کاسٹ میں درپن، سوزی، احمد رشدی اور بملا کماری نے اہم کردار ادا کیے تھے۔ بملا کماری بھارتی اداکارہ تھیں جنہیں اس فلم میں بطور ہیروئن پیش کیا گیا تھا۔ جب کہ گلوکار احمد رشدی نے درپن کے مقابل ایک منفی کردار ادا کیا تھا۔ ''لاکھوں فسانے'' کی موسیقی دیبو بھٹا چاریہ نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے کئی گیت مشہور ہوئے تھے۔ اس فلم میں بھارتی گلوکارہ ایچ آتما نے بھی اپنی آواز کا جادو جگایا تھا۔ یہ فلم 1961ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی مگر باکس آفس پر درمیانہ درجے کی ثابت ہوئی۔

سندھی فلمیں چونکہ سندھ کے محدود سرکٹ ہی میں بزنس کرتی تھیں جب کہ اردو فلمیں پورے پاکستان میں دیکھی اور دکھائی جاتی تھیں۔ اس لیے فاضلانی صاحب کے اصرار پر شیخ حسن نے اسے اردو ورژن میں بھی پیش کیا۔ یہ فلم بھی فاضلانی فلمز کے بینر پر بنائی گئی اور اس میں چند ایک تبدیلیوں کے بعد کاسٹ اور کریڈٹ میں سندھی فلم کے ہی لوگ شامل رہے۔ نگہت سلطانہ، فاضلانی اور ناصرہ نے کلیدی کردار نبھائے۔ موسیقی غلام نبی عبدالطیف ہی کی رہی۔ اگرچہ اسے پورے پاکستان میں نمائش کا موقع ملا مگر سندھی عمر ماروی کی طرح مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جس زبان کی لوک داستان ہوتی ہے۔ اسی زبان کے تماشائی اس میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ عمر ماروی کا اردو ورژن 1963ء میں ریلیز ہوا تھا۔

شیخ حسن جو نئی سوچ اور نئی جہت پر کاربند فنکار تھے۔ انہوں نے بلوچوں پر ایک فلم بنانے کی منصوبہ بندی کی مگر بلوچی زبان میں فلم بنانے پر بڑی دشواری تھی اس لیے اسے اردو زبان ہی میں بنایا۔ یہ فلم بلوچوں کے ایک ہیرو قادر بخش بلوچ عرف کادو مکرانی کی زندگی پر تھی۔ اس فلم کی تکمیل کے لیے شیخ صاحب کو کسی بلوچ پارٹی کی ضرورت ہوئی جو تھوڑی جستجو کے بعد انہیں مل گئی۔ یہ بہار علی بلوچ تھے۔ بہار علی بلوچ کا حبیب پکچرز کے نام سے اپنا ایک تقسیم کا ادارہ تھا۔ اس ادارے سے وہ کئی فلمیں ریلیز کر چکے تھے۔

شیخ حسن نے ان سے ملاقات کی۔ وہ شیخ حسن کو ایک کامیاب اداکار اور ہدایت کار کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے تھے۔ بہار علی بلوچ نے انہیں اپنے دفتر آنے پر ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور کہا۔

''زہے نصیب کہ آپ نے مجھے اور میرے دفتر کو یہ عزت افزائی بخشی۔ اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا جھجک ارشاد فرمائیے۔''

''بھائی بہار علی بلوچ صاحب بات یہ ہے کہ میں نے ایک بلوچی ہیرو قادر بخش بلوچ عرف کادو مکرانی پر فلم بنانے کا ارادہ کیا ہے۔''

''اوہو! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ آپ جیسا بڑا اور روشن خیال فلم میکر ہی ایسی منفرد فلم بنا سکتا ہے۔ بتائیے اس ضمن میں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟ کس طرح آپ کے کام آسکتا ہوں؟''

''میں اسی مقصد سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ

قدر گوہر شاہ داند یا بدانہ جوہری

بلوچی ہیرو پر فلم بنانے کی اہمیت کو کوئی بلوچ ہی سمجھ سکتا ہے۔''

بجا فرمایا آپ نے۔ مجھے یہ جان کر بے حد مسرت

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوئی کہ آپ نے ایک بلوچ ہیرو کو اپنی فلم کے ذریعے حیات دوام بخشنے کا پروگرام بنایا ہے۔ میں ہر طرح سے آپ کے اس مشن کو کامیاب کرنے پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں۔''

''میری خواہش ہے کہ آپ اس فلم کو پروڈیوس کریں۔ اس کے لیے سرمایہ کاری کریں۔''

''یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں شیخ صاحب!''

اس طرح بلوچ ہیرو پر فلم بنانے کے منصوبے پر عملدرآمد کا مرحلہ آیا۔ شیخ صاحب نے اس فلم کی کہانی کے لیے مخدوم حسن کا انتخاب کیا۔ انہیں قادر بخش بلوچ عرف کادو مکرانی کے کارناموں کے تناظر میں کہانی لکھنے کو کہا۔ جب وہ کہانی لکھ چکے تو اس کے مکالمے اور گیت دکھی پریم نگری سے لکھوائے۔ اور ''جاگ اٹھا انسان'' کے نام سے یہ فلم سیٹ کی زینت بنی اور بڑے زور و شور سے شوٹنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کہانی کی ضرورت کی مناسبت سے بہترین فنکاروں کا انتخاب کیا گیا۔ محمد علی کو کادو مکرانی کے کردار میں پیش کیا گیا جس نے اس کردار کو اپنی لافانی کردار نگاری سے امر کر دیا۔ زیبا، وحید مراد، سیما، ابراہیم نفیس، جاوید شیخ، کامران، مقصود اور بدر منیر نے دیگر کردار ادا کیے اس کی موسیقی لال محمد اقبال سے کمپوز کروائی۔

اس فلم کی کہانی اداکاری اور ہدایت کاری نے جہاں زبردست عوامی مقبولیت حاصل کی وہاں اس کے گیتوں نے بھی دھوم مچا دی۔ ان گیتوں کے رنگ اور رانگ ملاحظہ کیجیے۔

☆ او گوری ذرا پھر سے بجا بانسریا۔ (آوازیں: نسیمہ شاہین، افراہیم اور ساتھی، بول دکھی پریم نگری)

☆ جب ساون گھر گھر آئے کو لیا گائے۔ (آواز: مالا اور ساتھی، بول دکھی پریم نگری)

☆ بھنویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں۔ (آواز: نور جہاں، بول: داغ دہلوی)

☆ دنیا کسی کے پیار میں جنت سے کم نہیں۔ (آواز: مہدی حسن، بول: دکھی پریم نگری)

☆ بنسی بجائے کوئی ندیا کے پار۔ (آواز: مالا، بول: دکھی پریم نگری)

☆ دل میں بسایا پیار سے۔ ہم نے تم کو اپنا جان کے۔ (آوازیں: مالا، مسعود رانا، بول: دکھی پریم نگری)

☆ چھپا گھونگھٹ میں مکھڑا گلاب سا۔ (آوازیں: عشرت جہاں، خورشید بیگم، کورس بول: دکھی پریم نگری)

☆ میری گگری کا پانی چھلک چھلک کیوں جائے۔ (آوازیں: آئرن پروین وساتھی، بول: دکھی پریم نگری)

اس فلم کی موسیقی اور گانوں کی مقبولیت سے موسیقار لال محمد اقبال کی حیثیت فلم انڈسٹری میں بہت مضبوط ہو گئی۔ مقصود حسین کو اس فلم کی تدوین پر بہترین تدوین کار کا نگار ایوارڈ ملا۔ جان محمد کو جو کیمرا مین کے اسسٹنٹ ہوا کرتے تھے۔ شیخ حسن نے اس فلم میں چیف کیمرا مین مقرر کر دیا۔ یہ فلم جو حبیب پکچرز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ 1966ء میں ریلیز ہوئی اور اس نے بہار علی بلوچ کو مالا مال کر دیا۔ جہاں انہوں نے بلوچ ہیرو کو عوام الناس میں زبردست مقبول کرایا، وہاں شیخ حسن کی معاونت کرنے پر بھی خاصی مالی منفعت حاصل کی۔

''جاگ اٹھا انسان'' کی بلاک بسٹرڈ کامیابی کے بعد شیخ حسن نے ایک سندھی فلم بنانے کی منصوبہ بندی کی اور اس کی سرمایہ کاری کے لیے بہار علی بلوچ کو ہی دعوت دی۔ بہار علی بلوچ جو بلوچی ہیرو کادو مکرانی پر فلم پروڈیوس کر کے مالا مال ہو چکے تھے۔ سندھی فلم پر بھی سرمایہ کاری پر فوراً رضا مند ہو گئے۔ یہ سندھی فلم شاہرو فیروز کئی لحاظ سے بہت اہم ثابت ہوئی۔ حبیب پکچرز کے بینر تلے بننے والی یہ فلم سندھی فلموں کے کئی آرٹسٹوں اور ہنرمندوں کی پہلی فلم تھی جنہوں نے بعد میں فلم انڈسٹری میں بہت نام کمایا۔ بہت شہرت حاصل کی۔ بطور فنکار بھی اور بطور ہنرمند بھی۔ ان میں اس فلم کے ہیرو ہیروئن مشتاق چنگیزی اور ماہ پارہ سرفہرست ہیں۔ مشتاق چنگیزی کو سندھی فلموں کا دلیپ کمار کے لقب سے بھی نوازا گیا۔

شیخ حسن نے نئے چہروں کو پیش کرنے کی روایت کا اس فلم کے ذریعے کھل کر مظاہرہ کیا۔ میوزک ڈائریکٹر غلام علی کو بھی اس فلم کے ذریعے متعارف کرایا تھا۔ اس فلم کی کاسٹ میں مشتاق چنگیزی، ماہ پارہ، ملک انوکھا، محمود لاسی، شکیل لاسی، نور بانو، صمد شیخ، یاسمین، احمد علی، سید سلمان شاہ، نسیم، ایس مغل، گل منیر اور شیخ حسن نے کلیدی کردار ادا کیے تھے۔ شیخ حسن نے فلم کے ہیرو کے باپ کا رول ادا کیا تھا۔ شاہرو فیروز کے عکاس مدد علی مدن تھے۔ واضح رہے کہ یہ مشہور اداکارہ سومی علی کے والد محترم ہیں۔ سومی علی نے متعدد بھارتی فلموں میں اداکاری کی ہے۔

محمود لاسی اور شکیل لاسی نے بطور اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے بھی اس فلم میں کام کیا۔ اس فلم میں نئے چہروں کے طور پر پیش ہونے والوں میں زاہد شاہ، صمد شیخ کے علاوہ فائز حمید

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

جوش ملیح آبادی

ولادت: 5 دسمبر 1894ء ملیح آبادی (برٹش انڈیا)
وفات: 22 فروری 1982ء (اسلام آباد، پاکستان)
عمر: 83 سال
تخلص: ''جوش''
قومیت: پاکستانی
پیشہ: شاعر
ایوارڈ: پدما بھوشن ایوارڈ (1954ء)
تصانیف: جوش صاحب کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''روح ادب'' 1903ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ نقش ونگار، شعلہ وشبنم، فکرونشاط، حرف وحکایت، جنون وحکمت، سیف وسبو، سنبل وسلاسل، ابہام وافکار، عرش وفرش، آیات ونغمات، آوازِ حق، جوش کے سو شعر، پیغمبر اسلام، طلوع فکر، حسین اور انقلاب، موجود ومفکر، نوادر جوش، جوش کے مرثیے، نجوم وجواہر، عفائیات جوش، سرور وخروش، عروس ادب حصہ اوّل ودوم، محراب ومغراب، دیوان جوش، قطرہ قلزم، سموم وصبا اور یادوں کی برات (خودنوشت سوانح

انصاری بھی شامل ہیں۔ جن میں شکیل لاسی، صمد شیخ اور زاہد شاہ نے آنے والے دنوں میں بطور ہدایت کار بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ اداکارہ ماہ پارہ نے بھی شاہر و فیروز کے بعد کئی فلموں میں کامیاب اداکاری کر کے عوامی مقبولیت حاصل کی۔ بعد ازاں نامور ہدایت کار اقبال یوسف سے شادی کر کے گھر گرہستی کی ہو رہیں۔

شاہر و فیروز 2 اگست 1968ء میں ریلیز ہوئی اور اس نے سلور جوبلی کا اعزاز حاصل کیا۔ سندھ بھر کے تمام بڑے شہروں میں اس کی کامیاب نمائش ہوئی اور جہاں یہ فلم کامیابی سے ہمکنار ہوئی وہاں اس کے آرٹسٹوں اور ہنر مندوں کو بھرپور عوامی پذیرائی بھی حاصل ہوئی۔

اس فلم کے ہیرو مشتاق چنگیزی نے جن کی یہ پہلی فلم تھی اس فلم سے شہرت حاصل کر کے سندھی فلموں کے دلیپ کمار کہلائے جب کہ انہوں نے اپنے عروج کے دور میں کئی سندھی فلمیں ڈائریکٹ بھی کیں۔

رشید احمد لاشاری نے اس فلم کی کہانی لکھ کر سندھی فلموں کے مصنفوں میں اپنی حیثیت منوائی اور ایک کامیاب اور مستند کہانی نویس اور نغمہ نگار کی حیثیت سے ایک ممتاز مقام حاصل کیا۔

اس فلم کی موسیقی غلام علی نے ترتیب دی تھی۔ ان کی بھی یہ پہلی فلم تھی۔ اس کے کئی گیتوں نے مقبولیت حاصل کی تھی۔

جو ہدایت کار محض اپنی سہولت کے لیے منجھے ہوئے اور تجربہ کار فنکاروں اور ہنر مندوں سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے لیے تو آسان راستہ اختیار کر لیتے ہیں مگر فلم انڈسٹری کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ جب کہ شیخ حسن ان فلم میکرز میں شامل تھے جنہوں نے ہمیشہ نئے چہرے پیش کر کے فلمی صنعت کو روشن، ذہین اور متین آرٹسٹ اور تکنیک کار دیے۔ شیخ حسن کا یہ کارنامہ بھی ان کے دیگر کارناموں کی طرح پاکستانی فلمی تاریخ میں لکھا جائے گا۔

شیخ حسن سندھی نہیں تھے مگر انہیں سندھ اور اس کے کلچر و ثقافت سے بڑا پیار تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک اردو اسپیکنگ تھے۔ اردو ادب اور ثقافت سے گہرا لگاؤ تھا مگر اپنی پسند پر ہمیشہ وقت اور ضرورت کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ جس سرزمین سے آپ وابستہ ہوں اس سے اپنی چاہت کا رشتہ استوار رکھیں۔ بہت سے ادیب و شاعر اور فلم والے ہندوستان سے ہجرت کرنے کے باوجود دہلی اور لکھنؤ کی ثقافت کے رنگ میں رنگے رہے۔ جو حقیقتاً ایک غلط رجحان ہے۔ شیخ حسن اس حقیقت سے بخوبی واقف تھے اس لیے اپنی مٹی اور اس کی شناخت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جہاں انہوں نے کامیاب اردو فلمیں بنائیں وہیں علاقائی زبانوں پر بھی قابل ذکر فلمیں بنا کر ایک بڑے اور روشن خیال فلم میکر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔

شاہر و فیروز کے بعد انہوں نے ایک اور سندھی فلم ''نوری جام تماچی'' بنائی۔ یہ فلم ایک سچی اور حقیقی عشقیہ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

عمری) شامل ہیں۔

شبیر حسن خان (جوش ملیح آبادی (برٹش انڈیا) میں پیدا ہوئے، آپ نے ST پیٹر کالج آگرہ سے تعلیم حاصل کی اور سینئر کیمبرج کا امتحان 1914ء میں پاس کیا۔ آپ نے 1918ء میں عربی و فارسی کی اضافی تعلیم بھی حاصل کی اور اس کے بعد 6 مہینے، شیگور یونیورسٹی میں گزارے۔ 1924ء میں جوش اسلامیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ میں ملازم ہوگئے۔

شاہی ریاست حیدرآباد میں آپ کا قیام اس وقت اختتام پذیر ہوا جب آپ (نظام آف حیدرآباد) کے خلاف نظم لکھنے سے خود کو باز نہ رکھ پائے۔ آپ کچھ عرصے دہلی سے اپنا ایک ادبی رسالہ ''کلیم'' شائع کرتے رہے جس میں برطانوی راج سے آزادی کے حصول کے حوالے سے آرٹیکل لکھتے رہے جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ عوامی حلقوں میں آپ کی مقبولیت بڑھنے لگی اور آپ ''شاعر انقلاب'' کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ جوش آزادی کی جدوجہد میں متحرک ہوتے ہوئے اس دور کے کچھ دیگر اہم سیاسی لیڈروں سے قریب تر ہوتے گئے۔ جن میں اہم ترین نام ''جواہر لعل نہرو'' کا ہے جو انڈیا کے پہلے وزیراعظم تھے اس کے بعد ہندوستانی رسالے ''آج کل'' کی ادارت بھی فرمائی۔ 1956ء میں جوش ہجرت فرما کر پاکستان آئے اور کراچی میں رہائش پذیر ہوئے۔ کراچی میں جوش نے مولوی عبدالحق کے ساتھ مل کر ''انجمن ترقی اردو'' کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ فیض احمد فیض اور فخرالدین Balley دونوں آپ کے اور آپ کے صاحبزادے سجاد حیدر خروش کے قریبی حریف اور دوست تھے۔

شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کو شاعری ورثے میں ملی ان کے والد شبیر احمد خان اور دادا دونوں صاحب دیوان شاعر تھے وہ

داستان پر مبنی فلم تھی۔ اس فلم میں شیخ صاحب نے بابا بلھے شاہ کا کلام بھی شامل کیا تھا۔ معروف سندھی ادیب امر جلیل سے اس فلم کے مکالمے تحریر کروائے گئے تھے۔ مشتاق چنگیزی اور عشرت جہاں نے اس فلم میں ٹائٹل رول ادا کیے تھے۔ اس فلم کے فلم ساز بھی بہار علی بلوچ تھے۔ یہ فلم رومانوی، اصلاحی اور معیاری فلم کی حیثیت سے پسند کی گئی تھی۔ ''نوری جام تماچی'' 1970ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی اور حبیب پکچرز کی کامیاب فلم ثابت ہوئی تھی۔

وہ بھی بڑا عجیب دور تھا۔ فلم والے بھی پیار محبت نبھانے والے لوگ ہوتے تھے۔ بہار علی بلوچ بلوچی نژاد ہونے کے باوجود شیخ حسن سے ٹوٹ کر پیار کرتے تھے جو بلوچی نہیں تھے۔ ''جاگ اٹھا انسان'' کے بعد انہوں نے شیخ حسن کی دوسری فلموں کی بھی سرمایہ کاری کی جو سندھی فلمیں تھیں۔ ان کا حبیب پکچر ہمیشہ شیخ حسن کی خدمت کے لیے تیار رہتا تھا۔

1970ء ہی کی بات ہے کہ اداکارہ ترنم نے ایک اردو فلم ''جھک گیا آسمان'' بنانے کا پروگرام بنایا تو اس کی ہدایت کاری کے لیے شیخ حسن ہی کا انتخاب کیا۔ یہ فلم بڑے بجٹ کی تھی۔ اس کی پروڈیوسر اداکارہ ترنم تھیں۔ شیخ حسن نے اپنی روایت کے مطابق اس فلم میں بھی ایک نیا چہرہ متعارف کرایا۔ یہ محمود احمد مودی تھا جسے شیخ صاحب نے ترنم کے مقابل ہیرو کے طور پر پیش کیا تھا۔ موسیقی کے لیے دیپو بھٹا چاریہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جن کی خوب صورت کمپوزیشن پر اس فلم کے متعدد گیت مقبول ہوئے تھے اور اس دور کے علاوہ آج بھی شوق سے سنے جاتے ہیں۔ اس فلم میں یہ تجربہ بھی کیا گیا کہ کسی ایک شاعر سے سارے گیت لکھوانے کی بجائے مختلف شعراء سے نغمہ نگاری کروائی گئی۔ گیت ملاحظہ کیجیے۔

☆ چاند کی سیج پہ تاروں کا سجا کر سہرا۔ (آواز: رونا لیلیٰ و ساتھی، بول: صہبا اختر)

☆ ہوا آنچل اڑاتی ہے اڑانے دو۔ گلے ہم کو لگاتی ہے لگانے دو۔ (آواز: رونا لیلیٰ۔ بول: حمایت علی شاعر)

☆ ساقی ہے نام میرا۔ پیاسے رک جا۔ (آواز: رونا لیلیٰ۔ بول: صہبا اختر)

☆ چمن میں گلوں کو نہ ہنس ہنس کے دیکھو۔ (آواز: مہدی حسن۔ بول: دکھی پریم نگری)

☆ یہ دل اپنا نہ وہ اپنے۔ (آواز: رونا لیلیٰ۔ بول: صہبا اختر)

کئی علاقائی زبانوں کے بعد شیخ حسن کی یہ اردو فلم بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اس کی مکمل کاسٹ یہ ہے۔ ترنم، محمود خان مودی، ترانہ، نرالا، حنیف اور کمال ایرانی۔ اس فلم کی پروڈیوسر اداکارہ ترنم اس فلم کی کامیابی پر بہت شاد اور آباد تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ شیخ حسن کی ڈائریکشن میں فلم بنے اور کامیاب نہ ہو؟ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ میں نے ان کا انتخاب یونہی نہیں کیا تھا۔

''جھک گیا آسمان'' کی کامیاب نمائش کے بعد بہار

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خود کہتے ہیں۔

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
یہ امراض خاندانی ہے

گویا شروع ہی سے جوش کے رگ وریشے میں شاعری کے عناصر موجود تھے، یہی وجہ ہے کہ اس میدان میں وہ انتہائی بلندیوں تک پہنچے۔

حوریں ہزار دل سے قربان ہوگئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر انسان ہوگئی ہیں

جوش نے شاعری کی ابتداء غزل سے کی لیکن غزل میں ان کی دھواں دھار شخصیت سما نہ سکی اس کے لیے بہت جلد اسے ترک کرکے آپ نے نظم کو اختیار کیا جس میں ان کی شخصیت کے پہلو، ان کے مزاج کی تندی و تیزی، ان کے لب و لہجے کی تمازت، ان کے حریت پسند خیالات اور ان کی انقلاب پسند طبیعت سب سما گئی۔ آپ نے ایک طویل عرصہ اس صنف سخن کو اپنائے رکھا اور بلاشبہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس صنف میں ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس صدی میں دور دور تک کوئی ان کا مدِ مقابل نظر نہیں آتا۔

جوش کی نمایاں ترین خوبی قدرت زبان و بیان ہے، ان کا ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع ہے۔ جوش اردو کے ان چند شعراء میں سے

علی بلوچ نے بھی ایک اردو فلم بنانے کا پروگرام بنایا اور ظاہر ہے کہ اس کی ہدایت کاری کے لیے شیخ حسن کو ہی لیا۔ جن سے ان کا پیار محبت اور عقیدت کا رشتہ استوار تھا۔ یہ فلم تھی ''گاتا جائے بنجارہ''۔

شیخ حسن نے اس فلم میں آغا سجاد کو بطور ہیرو پیش کیا تھا جب کہ دیگر کاسٹ میں زمرد، فرخندہ اور رنگیلا نے اہم کردار ادا کیے تھے۔

لال محمد اقبال اس فلم کے موسیقار تھے۔ ان کی مسحور کن دھنوں میں اس فلم کے کئی گیت مقبول ہوئے تھے۔

☆ بندیا جو چمکی تو ہائے میں سمجھی۔ (گلوکارہ رونا لیلیٰ۔ شاعر: دکھی پریم نگری)

☆ پتا جو کھڑکا تو دل میرا دھڑکا۔ (گلوکار: احمد رشدی۔ شاعر: صہبا اختر)

☆ اڑوس پڑوس چاہے جو بھی کہے۔ (گلوکارہ رونا لیلیٰ۔ شاعر: کیف رضوانی)

یہ فلم 1972ء میں سنیماؤں کی زینت بنی تھی اور باکس آفس میں اس نے اوسط درجے کا بزنس کیا تھا۔

اس اردو فلم ''گاتا جائے بنجارہ'' کے بعد شیخ حسن کو خیال آیا کہ میں نے پنجابی زبان میں تو کوئی فلم نہیں بنائی۔ یہ بھی تو ہماری علاقائی زبان ہے۔ بس پھر انہوں نے پنجابی فلم بنانے کی منصوبہ بندی شروع کردی۔ جب ساری تیاری ہوگئی تو اس کے لیے انہیں لاہور جانا پڑا کیونکہ کراچی میں رہ کر وہ کوئی پنجابی فلم نہیں بنا سکتے تھے۔

لاہور جا کر انہوں نے حاجی سلطان راہی سے رابطہ کیا اور کہا۔

''راہی صاحب! میں ایک پنجابی فلم بنا رہا ہوں۔ اس میں کام کرو گے؟''

''کیوں نہیں کروں گا؟ آپ کی فلم میں کام کرنا تو میرے لیے اعزاز ہوگا۔ یہ آپ کی شاید پہلی پنجابی فلم ہو گی؟'' ''جی ہاں۔''

''آپ کی فلم کا کیا نام ہے؟''

''ٹرک ڈرائیور۔''

''بہت خوب۔ گویا عوامی جذبات و احساسات پر مبنی فلم ہوگی۔''

''آپ تو جانتے ہیں۔ میں خود عوامی آدمی ہوں۔ اس لیے عام لوگوں کی کہانیوں پر فلم بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

ان دنوں کسی بھی پنجابی فلم کی اوّلین ضرورت سلطان راہی تھے۔ اس لیے سب سے پہلے شیخ صاحب نے یہ کام کرلیا کہ سلطان راہی کو اپنی فلم کے لیے کاسٹ کرلیا۔

شیخ حسن نے اس فلم کی کہانی دکھی پریم نگری سے لکھوائی تھی جب کہ اس کے مکالمے انہوں نے ناصر ادیب سے لکھوائے۔ موسیقی نیاز احمد ناجی سے کمپوز کروائی۔ نغمات عابد علی، اختر کاشمیری اور حزیں قادری سے تحریر کروائے۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ایک ہیں جنہوں نے شاعری میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کیے ہیں، ان کی زبان دانی مسلم ہے اور ان کی اس خوبی کو تمام ناقدین نے سراہا ہے۔ جوش الفاظ کے اثرات اور کیفیات سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں لفظی تناسب کی صفت پائی جاتی ہے اور موسیقیت کی ایک لہر شروع سے آخر تک ملتی ہے۔

بلاشبہ جوش الفاظ کے بڑے خازن ہیں اور ان کی اس دولت کے آگے بلاشبہ قارون کے خزانے بھی گرد ہیں۔

الامان والحذر، میری کڑک، میرا جلال
خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں کٹار
بیرقلیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے، شہ سوار
باندھتی ہوشہریوں کے سر پہ یہ کہہ کر کفن
تم ہو شجع، ناوک افگن، صف شکن، شمشیر زن

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جوش کے آگے الفاظ دست بستہ کھڑے رہتے ہیں جن کو وہ موقع محل کی مناسبت سے باندھتے چلے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کا ایک ربط ہے یا وہ انمول خزانہ ان کے قبضہ قدرت میں ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا۔

اقتباس: نائمہ خان، کراچی

اس فلم کا یہ گیت جسے ملکہ ترنم نور جہاں نے گایا تھا بہت مشہور ہوا تھا۔

''سوہنا لگتا ایں پیارا لگتا ایں''

آسیہ اس فلم کی ہیروئن تھیں جنہوں نے سلطان راہی کے مقابل پنجابی فلموں کی ہیروئن کی نمائندگی کی تھی۔

پنجابی فلموں کا تجربہ نہ ہونے کے باوجود یہ فلم ناکام ثابت نہیں ہوئی تھی جس کی ایک وجہ سلطان راہی تھے۔ ان دنوں کسی بھی فلم میں سلطان راہی کی شمولیت کامیابی کی ضمانت تھی اس کے بے شمار چاہنے والے صرف اس کا نام دیکھ کر فلم دیکھتے تھے۔

متذکرہ پنجابی فلم ''ٹرک ڈرائیور'' کے بعد شیخ حسن نے پھر ایک سندھی فلم ''مہران جاموتی'' بنائی۔ اس سندھی فلم کے فلم ساز شوکت زمان خان تھے۔ اس کی موسیقی غلام علی نے ترتیب دی تھی۔ اس کی کاسٹ میں شیراز، ریٹا، زاہدہ نور، محمود لاسی، بابر بلوچ، ملک انوکھا اور نور محمد لاشاری شامل تھے۔

مہران جاموتی، بابائے سندھی فلم شیخ حسن کی ڈائریکشن میں بننے والی آخری فلم تھی۔ یہ 1988ء میں سندھ بھر میں نمائش پذیر ہوئی۔

یہ دنیا بڑی بے درد ہے اور فلم نگری اور اس سے وابستہ افراد تو بے مروتی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہ چڑھتے سورج کے پجاری ہوتے ہیں جو انہیں نما کر دیتا ہے اس کے گن گاتے ہیں، اس کے لیے تن من نچھاور کرتے ہیں۔ جو وقت اور حالات کا شکار ہو کر ان کے کام کا نہیں رہتا اس سے نگاہیں پھیر لیتے ہیں۔ شیخ حسن جب اپنے آخری ایام میں بیمار ہو کر بستر سے لگ گئے تو انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہ طویل عرصے تک بیماری اور کسمپرسی کی حالت میں رہے مگر فلم انڈسٹری نے پلٹ کر ان کی خبر نہ لی۔ انہیں اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ جس فلم انڈسٹری کو انہوں نے اتنا کچھ دیا اس نے ان کے برے وقت میں ان کا ساتھ نہیں دیا۔ حکومت نے ان کی کسمپرسی کے دور میں اگرچہ ان کے لیے کچھ سرکاری وظیفہ مقرر کر دیا تھا مگر اس سے نہ ان کی تنگدستی دور ہو سکتی تھی نہ ان کا بھرپور علاج ہو سکتا تھا۔ بہت سے فلم والے جنہیں اس شخص نے فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا تھا۔ انہوں نے یہ جاننے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ ان کا محسن کس حال میں ہے۔ ترقی یافتہ قومیں اپنے ہیرو کو کبھی اس حال کو پہنچنے نہیں دیتیں۔ انہیں اپنا قیمتی اثاثہ سمجھ کر ہمیشہ شاد اور آباد رکھتے ہیں مگر افسوس صد افسوس کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی رواج نہیں۔ کوئی ریت نہیں۔ شیخ حسن جیسا نابغۂ روزگار فنکار اپنی کسمپرسی کے دن کراچی کے پس ماندہ علاقے کورنگی کے ایک مکان میں گزارتا رہا اور وہیں ایک طویل علالت کے بعد اپنے بے مروت دوستوں اور ساتھیوں کی بے رخی کا دکھ لے کر اس جہان فانی سے کوچ کر گیا۔ 25 جولائی 1992ء کو جب اس مہران کے موتی کو سپرد خاک کیا جا رہا تھا تو وہاں اس کے کچھ عزیزوں اور چند

چاہنے والوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اس کے نور سے چاند سورج بن کر چمکنے والوں کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

شیخ حسن کی حسرت ناک موت کے بعد جہاں فلم انڈسٹری نے انہیں بھلا دیا۔ وہاں سرکاری طور پر ان کی عظیم خدمات کا کوئی صلہ نہ دیا گیا۔ سرکاری سطح پر انہیں کسی اعزاز کے قابل نہ سمجھا گیا۔

صرف ایک فلمی شخصیت دکھی پریم نگری کو شیخ حسن کی موت کے بعد بہت دکھی دیکھا۔ دکھی پریم نگری فطرتاً بڑے ہنستے مسکراتے ہوئے شخص تھے مگر اپنے محسن کے انتقال پُرملال کے بعد وہ ہفتوں سوگوار اور ملول رہے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے۔ غم کی تصویر بن جاتے۔ ہم لوگ جو ان کے قریب تھے انہیں سمجھاتے۔ دکھی صاحب بڑے دکھی انداز میں کہتے۔ ''جانے والا کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ کراچی کی فلم انڈسٹری کا بہت بڑا محسن تھا۔ پہلی سندھی فلم ''عمر ماروی'' بنانے والا ایک تاریخ ساز شخصیت کا مالک تھا۔ اردو زبان و ادب کی ترویج کے لیے ''ہماری زبان'' جیسی فلم کا تخلیق کار تھا۔ ''جاگ اٹھا انسان'' جیسی معرکۃ الآرا اردو فلم بنا کر بلوچ ہیرو کو حیات جاودانی بخشنے والا فنکار تھا۔ ہائے اسے اس انڈسٹری والوں نے کس طرح بے بسی کی موت مرنے پر مجبور کر دیا۔'' دکھی پریم نگری سینے پر ہاتھ مار کر بھرائی ہوئی آواز میں کہتے۔ ''مجھے آج بھی ان کا یہ ماتمی انداز یاد آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔''

یہ بات سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ہے کہ شیخ حسن جنہوں نے 60 سال تک فلم انڈسٹری اور اس سے وابستہ افراد کی بے لوث خدمت کی، انہیں ان کے آخری ایام میں بالکل بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ بیماری کے دنوں میں ان کی بینائی بھی چلی گئی تھی مگر کسی نے ان کی کوئی مدد نہیں کی جب کہ ایک نہیں متعدد فلم والے ایسے تھے، اس پوزیشن میں تھے جو با آسانی ان کا بھرپور علاج کرا سکتے تھے۔ ان کی تنگ دستی کا مداوا کر سکتے تھے اور یہ لوگ کوئی اور نہیں، وہ لوگ تھے جنہیں اسی شیخ حسن نے فلمی دنیا میں لانے اور قدم جمانے کا سنہری موقع دیا تھا۔ اس موقع پر میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ میڈیا اور اس کے نمائندوں نے بھی شیخ حسن کے سلسلے میں اپنا مثبت کردار ادا نہیں کیا۔ میڈیا کا سلوک تو ان کے اچھے دور میں بھی بہت اچھا نہیں تھا۔ ان کے بڑے بڑے کارناموں پر بھی ان کے شایانِ شان ان کی پذیرائی نہیں کی۔ انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ نہ ہی ان کی آخری ایام کی کسمپرسی اور بیماری کے بارے میں عوام اور خواص تک یہ افسوسناک خبر پہنچانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ جب کہ وہی میڈیا وحید مراد اور محمد علی کی وفات کے بعد کئی دہائیوں سے ان کی ہر برسی پر ضخیم ایڈیشن چھاپتے ہیں اور ٹی وی چینلز پر خصوصی پروگرام پیش کر کے اپنی ریٹنگ اور دولت میں اضافہ کرتے ہیں۔

شیخ حسن ایک اچھے اداکار اور ہدایت کار ہی نہیں تھے۔ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ وہ زبان، ادب اور ثقافت کی قدر کرنے والے تھے۔ پاکستان اور قائداعظم سے انہیں بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ وہ پیدا تو بمبئی میں ہوئے تھے غالباً 1912ء میں وہیں تعلیم حاصل کی اور پروان چڑھے۔ اداکاری اور فلم سازی و ہدایت کاری کی تربیت حاصل کی مگر جب پاکستان عالم وجود میں آیا تو انڈیا کی فلم انڈسٹری کا بھرا میلہ چھوڑ کر پاکستان آ گئے۔ پاکستان کی محبت میں 14 اگست 1947ء سے کچھ روز پہلے ہی کراچی آ گئے اور جب 13 اگست 1947ء کو قائداعظم ماڑی پور کے ایئرپورٹ پر اترے تو ان کے استقبال کی تصویر کشی انہوں نے ہی کی۔ پاکستان سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ یہاں آتے ہی فلم بنا کر پاکستانی فلم انڈسٹری کی بنیاد مضبوط کرنے کا پروگرام بنایا اور اپنی پہلی فلم ''برکھا'' لاہور جا کر بنائی جس میں صبیحہ خانم اور مسعود جیسے معیاری آرٹسٹوں کو کاسٹ کیا۔ یہ فلم 1952ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ پھر کراچی آ کر اردو زبان سے اپنی محبت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ''ہماری زبان'' کے نام سے ایک ڈاکومنٹری نوعیت کی فلم بنائی۔ انہوں نے اس فلم میں اردو زبان کی کہانی کرداروں کی زبانی بڑے خوب صورت انداز میں پیش کی۔ انہوں نے اس فلم میں بابائے اردو مولوی عبدالحق سے بھی چند مکالمے بلوائے اور ان کا ایک پیغام بھی شامل کیا۔

شیخ حسن کا یہ کارنامہ بھی کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے اپنی فلم کے ذریعے متعدد آرٹسٹوں اور ہنرمندوں کو فلم انڈسٹری سے متعارف کرایا جنہوں نے بعد میں بڑا نام کمایا۔ شہرت حاصل کی۔ شیخ حسن اپنی بہت سی خوبیوں کی وجہ سے فلمی تاریخ میں ہمیشہ زندہ و تابندہ رہیں گے

سدابہار صداکار

شکور پٹھان

کبھی اسے پی ٹی وی کا روشن ستارا کہا جاتا تھا کہ وہ پی ٹی وی کی پہچان تھا۔ اس نے کئی دہائی تک خود کو چھوٹی اسکرین سے جوڑے رکھا لیکن افسوس صد افسوس کہ اسے ویسی پذیرائی نہ ملی جس کا وہ حقدار تھا۔

زبیرالدین کی کچھ یادیں کچھ باتیں

رب کا بڑا کرم ہے کہ آج میں اور آپ گزرے دنوں سے کہیں بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ میں اور میرے اکثر دوست وہی ہیں جو کبھی کراچی کی بسوں میں لٹک کر کالج جایا کرتے تھے۔ ایک چائے یا کوکا کولا پینے کے لیے ایک دوسرے کی جیبوں کی طرف دیکھتے تھے۔ جب ٹیلی فون گھر تو کیا، محلے میں بھی بمشکل ہوتا تھا۔ مگر آج الحمدللہ ہم میں سے تقریباً ہر ایک کے پاس اپنی کار ہے، اچھے ریسٹورنٹ اور ہوٹلوں میں کھانے بھی کھا لیتے ہیں۔ ہر کسی کے پاس کم از کم

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

ایک موبائل فون تو ضرور ہے، کئی دوست تو دو دو، تین تین فون لیے پھرتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر دنیا یوں گھومتے ہیں جیسے شہر کے ایک محلے سے دوسرے محلے میں آجا رہے ہوں۔ لیکن نجانے کیا بات ہے کہ جب بھی آپس میں ملتے ہیں تو یادِ ماضی دنوں کو کرتے ہیں۔

اس وقت ریڈیو اور ٹیلی ویژن مواصلات کا اہم ذریعہ تھے اور یہ کراچی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی خوش بختی تھی کہ اسے ابتدا ہی سے ذوالفقار علی بخاری جیسا ماہر براڈ کاسٹر اور منتظم میسر آیا۔ بخاری صاحب اور ان کے رفقا نے نشریات، ابلاغ اور صدا کاری کے ایسے اعلیٰ معیار قائم کیے کہ کسی معمولی صلاحیت والے کا ان اداروں میں گزر نا ممکن تھا۔ یہی معیار خبروں کے شعبے کا تھا جہاں اردو خبریں پڑھنے والوں میں اساطیری حیثیت رکھنے والے شکیل احمد، انور بہزاد، شمیم اعجاز اور وراثت مرزا جیسے بھاری بھرکم نام موجود تھے اور یہی حال ٹی وی کا تھا جہاں طارق عزیز، قربان جیلانی اور وراثت مرزا جیسے خبریں پڑھنے والے موجود تھے۔

ایسے قد آور اور جفادر ناموں کے ہوتے ہوئے ایک دبلے پتلے، سیدھے سادے نوجوان نے پہلے ریڈیو پھر ٹیلی ویژن پر اپنا جلوہ ایسے دکھایا کہ اگلے بتیس سال تک وہ ہر گھر کے ڈرائنگ روم بلکہ بیڈ روم کا حصہ بنا رہا۔ یہ نوجوان تھا زبیر الدین، جو آج نشریات کے شعبے اڑتالیس سال مکمل کرنے کے باوجود بھی اٹھارہ بیس سالہ نوجوان ہی نظر آتا ہے اور آواز کا سونا آج بھی اتنا ہی کھرا ہے جیسا 70ء اور 80ء کے عشروں میں ٹیلی ویژن پر دکھائی اور سنائی دیتا تھا۔ وہ نوجوان جسے فلموں میں کام کرنے کا شوق خبروں کے شعبے تک لے آیا، یہ سب کیسے ہوا، آج اسی کی زبانی سنتے ہیں۔

بات چیت آج سے ایک سال قبل ہوئی تھی اور زبیر الدین صاحب چاہتے تھے کہ میں اسے اپنے انداز میں لکھوں لیکن سال بھر تک میں زبیر الدین صاحب کے الفاظ سے زیادہ بہتر الفاظ یا جملے نہیں سوچ سکا چنانچہ یہ بات چیت حرف بہ حرف وہی ہے جیسی ہمارے درمیان ہوئی اور اس میں میری جانب سے کلی پھندنے ٹانکنے کی کوئی گنجائش نہ نکل سکی۔ زبیر صاحب کے پاس کراچی ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے متعلق یادوں کا انمول خزینہ ہے جو اس مختصر سی تحریر میں سمیٹنا ممکن نہیں۔ آیئے ان سے ریڈیو سے ٹی وی تک کے سفر کی داستان سنتے ہیں۔

مجھے اشعار یاد نہیں رہتے، لیکن ایک شعر سنانا چاہوں گا۔

سکون دل کی خاطر اتنا تو اہتمام کروں
ذرا نظر ملے تو انہیں سلام کروں
مجھے تو ہوش نہیں آپ ہی مشورہ دیجیے
کہاں سے شروع کروں اور کہاں پہ تمام کروں

یہ پل دو پل کی بات نہیں 47 سال کا قصہ ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ اتنی میری عمر نہیں جتنی خبریں میں نے پڑھی ہیں۔ ایک یا دو سال بعد پچاس برس مکمل ہو جائیں گے خبریں پڑھتے ہوئے۔

یہ اٹھارہ سال کی بالی عمریا تھی، 68 میں ریڈیو اور 69 میں ٹی وی سے خبریں پڑھنا شروع کیں اور بتیس سال لگاتار خبریں پڑھیں۔

2000ء میں ٹی وی چھوڑ دیا تھا، امریکا اور کینیڈا آتا جاتا رہا، وہاں کے مقامی ٹی وی پر بھی خبریں پڑھتا رہا۔ شروع کے پانچ چھ سال جب بھی جاتا تھا تو کراچی ٹی وی والے اصرار کرتے کہ ایک بلٹن تو پڑھ دو۔

نیوز ریڈنگ کوئی آسان راستہ نہ تھا۔ شکیل احمد، انور بہزاد، شمیم اعجاز، وراثت مرزا اور انگریزی میں رضوان واسطی، انور حسین جو ڈاکٹر محمود حسین کے صاحبزادے تھے۔ انیتا غلام علی جو انگریزی کی استاد بھی تھیں، خدیجہ نقوی اور ایڈورڈ کی ریپیڈ جیسوں کی موجودگی، پھر ایک ریڈیو اور ایک ہی ٹی وی اسٹیشن تھے۔

ہوا کچھ یوں کہ سترہ اٹھارہ سال کی عمر تو ایسی ہی ہوتی ہے، لاابالی سی۔ پڑھنے وڑھنے کا شوق تو مجھے تھا نہیں۔ میٹرک کر لیا تھا اور کالج میں پڑھ رہا تھا۔ ان دنوں فلموں کا بڑا شوق تھا بلکہ ہمارے ایک دوست تو پہلے دن کے پہلے شو کی بکنگ کرا لیا کرتے تھے۔ ہم بھی وحید مراد وغیرہ کو دیکھتے اور ان جیسا بننا چاہتے تھے۔ ہمیں بھی ہیرو بننے کا شوق ہوا تو کسی نے کہا کہ یار یہ کوئی ایسے ڈائریکٹ تھوڑی ہیرو بن جاتا ہے۔ پہلے کچھ تجربہ حاصل کرو، نام بناؤ۔ ڈرامے وغیرہ میں کام کرو پھر فلمی اداکاری کا سوچو۔ ہم نے سوچا کہ ریڈیو سے شروع کرتے ہیں کیونکہ ٹی وی اس وقت نیا نیا آیا تھا۔

خبریں پڑھنے کا خیال تو ذہن میں بھی نہیں تھا۔ ڈرامے کا شوق البتہ تھا۔ ریڈیو میں آڈیشن دیا اور الحمدللہ پہلے ہی آڈیشن میں کامیاب ہو گیا کیونکہ بنیادی طور پر وہاں آواز کی ضرورت ہوتی ہے اور اللہ کا کرم ہے کہ آواز اس نے بہت اچھی دی ہوئی تھی۔ لوگ بھی یہی کہتے تھے۔ اس کے بعد کوئی

چھ مہینے ریڈیو اسٹیشن کے چکر لگاتا رہا کہ کہیں کوئی کسی ڈرامے میں آواز لگانے ہی کا موقع مل جائے جہاں وہ میری شکل دیکھیں تو کہیں، میاں اسکول براڈ کاسٹ یا بزم طلبہ میں چلے جاؤ۔ ہم اسکول براڈ کاسٹ میں جاتے رہے لیکن وہاں کوئی لفٹ ہی نہیں کراتا۔ یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ آڈیشن میں کامیاب ہوگئے تو اب ڈرامے کے ہیرو بھی بن جائیں گے۔ جبکہ آڈیشن ڈرامے کے لیے دیا تھا۔ مجھے کیونکہ ڈراموں کا شوق تھا لیکن یہاں تو کوئی پوچھتا ہی نہیں تھا۔ جان پہچان کے لوگوں سے ملتا رہا۔ ایک صاحب تھے ہمارے جاننے والے وہ نیوز سیکشن میں کنٹرولر کے قریبی تھے، انہوں نے کچھ لوگوں سے ملوایا۔ ہر کوئی کہتا ہاں میاں، کچھ کریں گے تمہارے واسطے۔

دراصل اٹھارہ سال کی عمر کچھ ایسی تھی کہ لوگ بچہ ہی سمجھتے تھے۔ جو حلیہ تھا وہ بھی بچوں ہی جیسا تھا۔ اب وہ کہتے تھے کہ بچہ ہے، اگلے ہفتے آنا، اگلے مہینے آنا۔ یہ سارا سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ میں ایک مہینے بعد ان کے پاس گیا کہ یہاں تو کوئی گھاس ہی نہیں ڈالتا۔ انہوں نے کہا ہاں میاں، بس یہاں ایسا ہی کچھ سلسلہ ہے، تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ خبروں میں آڈیشن دے دو۔ میں نے کہا آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔ کہنے لگے نہیں، آواز تمہاری اچھی ہے۔ یہاں آڈیشن ہونے والے ہیں اور انہیں ضرورت بھی ہے، تم آڈیشن دے دو۔ میں نے دل میں سوچا کہ خبریں پڑھنا تو دور کی بات ہے، میں تو خبریں سنتا تک نہیں ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ تم یوں کرو کہ ریڈیو سنا کرو۔ بی بی سی سنو اور دوسرے اسٹیشن سنا کرو۔ ناموں کو ذہن میں رکھو اور مجھ سے روزانہ بلیٹن لے جایا کرو۔ خبریں سنو اور اس کی پریکٹس کیا کرو۔ مجھے خبروں کی الف ب کا بھی نہیں پتا تھا، پھر میں نے سوچا کہ سال بھر ہوگیا، ڈراموں میں تو کوئی چانس نہیں دے رہے، چلو یہاں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ اب میں نے مشق شروع کردی۔ بی بی سی اور دنیا جہان کے اسٹیشن سنتا۔ اب ایک جستجو سی ہوگئی تھی۔

بہرحال خبریں پڑھنے کا آڈیشن ہوا اور اتفاق کی بات کہ میں یہاں بھی کامیاب ہوگیا۔ کچھ لوگ کامیاب ہوئے تھے، جن میں، میں تھا، افتخار عارف تھے، ایک تھے فضیل الدین۔ ایک بنگ کے نیوز کاسٹر تھے امین الحق۔ یہ نام مجھے اس وقت یاد آرہے ہیں۔ ہاں عابدہ جاوید بھی تھیں۔

میں نے ان سے کہا کہ بھئی اب میں خبریں کب پڑھوں گا، کہنے لگے ٹھہرو، وہ مجھے ایک صاحب کے پاس لے گئے جو شاید نیوز ایڈیٹر تھے۔ نام ان کا "زد" تھا۔ مجھے پورا نام یاد نہیں آرہا۔ ان سے پوچھا کہ وہ جو آڈیشن ہوئے تھے ان کا کیا بنا۔ کہنے لگے ہاں ایک دو لڑکے سلیکٹ ہوئے ہیں۔ انہوں نے پوچھا زبیر الدین کا کیا ہوا۔ کہنے لگے ہاں آواز اچھی ہے لے آؤ۔ کہنے لگے یہ کھڑے ہیں آپ کے پیچھے۔ انہوں نے اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھا اور بولے، یار یہ تو بچہ ہے، یہ کیا پڑھے گا خبریں۔

کہنے لگے آپ نے آڈیشن سن لیا، آواز دیکھ لی، بچے میں جستجو ہے، شوق ہے، یہ کرلے گا۔ وہ کچھ متذبذب نظر آئے۔ کہنے لگے ہم نے دس بارہ لڑکوں کو سنا ہے۔ اس سے کہو کہ دو تین ہفتے پریکٹس وغیرہ کرے۔

ان دنوں غالباً ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار ایک ٹریننگ سیشن شروع کیا گیا، خبروں کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے کے لیے۔ روزانہ دو تین گھنٹے کا سیشن ہوتا۔ لیکچر ہوتے۔ اسلم اظہر ایم ڈی تھے، وہ آتے، دادا شکیل احمد اور ریجنل ڈائریکٹر شمس الدین بٹ آتے، برہان الدین حسن صاحب بھی آتے۔

ان سب نے آٹھ دس دن لیکچر دیے۔ بس اللہ نے خبریں پڑھوانی تھیں۔ اس میں کامیاب ہونا تھا۔ اللہ کا نام لے کے آڈیشن دیا۔

سب سے پہلے پانچ منٹ کی خبریں پڑھیں فوجی بھائیوں کے پروگرام میں، اور پون گھنٹے بعد کراچی کی خبریں پڑھیں۔ ایک وقت میں دو بلیٹن پڑھنے ہوتے تھے اور دس روپے ملتے تھے۔ خبریں پڑھیں اور ستیاناس کیا۔ آپ یقین کیجیے کہ اس سے پہلے میں کبھی آن ایئر گیا ہی نہیں تھا۔ میرا تو گلا خشک ہوگیا، دل حلق میں آگیا، جیسے تیسے خبریں پڑھیں۔ برہان صاحب نیوز ایڈیٹر تھے، انہوں نے مجھے بلوایا اور کہا کہ یہ کیا کیا تم نے بلیٹن کا ستیاناس مار دیا ہے، کس نے تمہیں اپائنٹ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر اتنی مشکلوں سے تو آڈیشن پاس کیا اور ٹریننگ بھی کی۔ کہنے لگے، ہاں میاں، تمہارے اندر ٹیلنٹ تو ہے۔ تمہاری آواز بھی اچھی ہے، بس اپنا انداز بناؤ۔ ان دنوں شکیل احمد، انور بہزاد وغیرہ کا بڑا نام اور خاص انداز تھا۔ برہان صاحب کہنے لگے کہ یاد رکھو تمہارا اپنا انداز ہونا چاہیے، لوگ سنیں تو یہ نہ کہیں کہ یہ شکیل احمد یا انور بہزاد کی طرح خبریں پڑھنے والا زبیر الدین ہے بلکہ یہ کہیں کہ یہ خبریں زبیر الدین پڑھ رہا ہے۔

یہ بات میرے ذہن میں بیٹھ گئی۔ کہنے لگے بلیٹن مجھے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

سناؤ، اب تلفظ غلط، نام غلط انہوں نے باقاعدہ میری تربیت کی، گرومنگ کی۔ چھ ماہ بعد وہ ٹی وی کے نیوز ایڈیٹر ہو گئے۔

دادا شکیل احمد، بڑے مزے کے آدمی تھے۔ کینیا مشرقی افریقا وغیرہ کے لیے رات کو گجراتی خبریں ہوتیں، میں ایک بلیٹن اردو کا رات کو پڑھتا، ایک صبح کے وقت۔ صبح کے بلیٹن میں دادا کی بھی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ دادا کو گپ شپ کا بڑا شوق تھا۔ وہ روز کینٹین میں بیٹھ جاتے، دو چائے منگواتے اور گرم پانی منگواتے، وہی پانی دو چائے میں ملا کر سب میں تقسیم کرتے اور گپ شپ کرتے رہتے۔

شکیل صاحب کو میں نے دیکھا کہ خبریں پڑھتے تو مائیک ان کی داہنی جانب ہوتا۔ ہم سے تو کہا جاتا کہ منہ مائیک کے سامنے ہو اور مائیک ہی میں بولو۔ لیکن دادا کی آواز بڑی زوردار تھی چنانچہ مائیک کو ایک جانب کر دیا جاتا۔

شکیل احمد ڈراموں میں بھی کام کر چکے تھے۔ انہوں نے آغا حشر کے کئی ڈرامے کیے تھے۔ وہ خبریں مل مل کر پڑھتے تھے جیسے تلاوت کرتے ہیں۔ اللہ مغفرت کرے، بہت شاندار آدمی تھے۔

اور دوسرے تھے وراثت مرزا۔ بڑے ہی نفیس آدمی تھے۔ سردی ہو یا گرمی، ہمیشہ شیروانی میں نظر آتے۔ حیدر آبادی تھے۔ میں نے بھی انہیں ہمیشہ شیروانی ہی میں دیکھا۔

پان کھاتے تھے، نہ سگریٹ پیتے تھے۔ ایک تجارتی خبریں ہوا کرتی تھیں۔ وراثت مرزا صاحب مین بلیٹن پڑھتے اور میں تجارتی خبریں پڑھتا۔ میں اس زمانے میں سگریٹ پیا کرتا تھا۔ مرزا صاحب کہتے یار سگریٹ پلاؤ۔ میں کہتا آپ تو سگریٹ نہیں پیتے، کہتے بس یار، تمہارے ساتھ پینے کو جی چاہتا ہے۔ وہ حیدر آباد کالونی میں رہتے تھے۔ میرے پاس موٹر سائیکل ہوتی تھی، میں جہانگیر روڈ پر رہتا تھا، انہیں جیل روڈ پر حیدر آباد کالونی چھوڑتا ہوا جاتا۔

ہاں یہ بھی بتا دوں کہ میرا خاندان دہلی کا تھا۔ میری پیدائش البتہ کراچی کی ہے لیکن میں نے ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں لیکن لفظ اور لہجہ اہل زبان سے بھی بہتر ہوتا تھا۔ ایک صاحبہ تھیں، سلطی جبیں پنجابی تھیں لیکن بڑی شستہ اردو بولتی تھیں۔ اصل میں کراچی کا ماحول ایسا تھا کہ پنجاب اور سرحد کے لوگ اس میں ڈھل جاتے تھے۔ اس کے لیے وہ بھرپور محنت کرتے تھے کیونکہ اس وقت معیار سخت ہوا کرتا تھا۔ نہ سفارش چلتی تھی اور نہ تعصب کی عینک۔

جس میں ٹیلنٹ ہوتا وہی آگے بڑھتا تھا۔ سخت معیار تھا، ایسا ویسا آدمی تو وہاں گھس بھی نہیں سکتا تھا۔ یہی حال ٹی وی کا تھا۔ وہاں بھی معیار پر کوئی سمجھوتا نہیں ہوتا۔ ریڈیو پر جب سال بھر ہو گیا تو میں نے برہان صاحب کو فون کیا کہ اب تو میں نیوز کاسٹر ہو گیا ہوں، مجھے ٹی وی پر بھی موقع دیں۔ ہنسنے لگے، ان دنوں ٹی وی پر طارق عزیز، وراثت مرزا اور قربان جیلانی خبریں پڑھتے تھے۔ دو، دو دن پڑھا کرتے، پیر کو ٹی وی نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برہان صاحب بلا جھجک بولے ابھی تو بالکل گنجائش نہیں ہے۔ کسی دن آؤ، آڈیشن لے لوں گا۔

میں ان کے پیچھے لگا رہا۔ میری قسمت اچھی تھی۔ ہوا یہ کہ طارق عزیز لاہور شفٹ ہو گئے اور میرے لیے جگہ بن گئی۔ برہان صاحب نے فون کیا کہ میرے پاس آؤ۔ تاکہ تمہیں آزما سکوں اس لیے کہ یہاں کیمرے کو بھی فیس کرنا ہوتا ہے۔ میں نے کہا وہ بھی کر لیں گے۔ انہوں نے اہم نکتے سمجھائے کہ کیمرے پر کیسے نظر رکھنی ہے، خبروں میں کہاں، پاز دینا ہے۔

پھر مجھے ایک صاحب کے پاس بھیج دیا۔ انہوں نے آڈیشن لیا اور پھر برہان صاحب اور اسلم اظہر صاحب نے سمجھایا کہ ٹی وی پر خبریں کیسے پڑھنی ہیں۔

اسلم اظہر صاحب براڈ کاسٹنگ کی دنیا کا بہت بڑا نام تھے۔ بہترین منتظم بہتوں کو علم ہوگا کہ وہ خبریں بھی پڑھا کرتے تھے۔ مجھے انہوں نے بھی بہت گروم کیا۔ مجھے یاد ہے اسلم اظہر صاحب نے ایک اہم بات سمجھائی تھی کہ جیسے موسیقی میں سر ہوتے ہیں، سا رے، گا، ما، پا، اسی طرح خبروں میں الفاظ کی اور آواز کی ٹائمنگ ہوتی ہے۔ خیر اسلم اظہر صاحب نے بھی پاس کر دیا۔ یہ 69 کی بات ہے۔

ریڈیو پر تو آواز اور تلفظ کی ضرورت ہے مگر ٹی وی پر شکل وصورت، لباس اور پرسنالٹی بھی ضروری ہوتے ہیں۔

میرا کام یہ تھا کہ سارا دن اخبار پڑھتا، ساری خبریں سنتا، اس طرح جب میں خبریں پڑھنے جاتا تو مجھے علم ہوتا کہ کیا پڑھنا ہے۔ اس طرح مجھے بہت آسانی ہو گئی تھی۔

ایک خاتون ہوتی تھیں، نام نہیں بتاؤں گا۔ ایک دن کہنے لگیں، میرے گھر تو اخبار بھی نہیں آتا۔ بعض نام مشکل ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے ایسی پریشانی نہیں ہوئی تھی کیونکہ خبریں سننے سے وہ نام لینا آسان ہو جاتا تھا۔ ورنہ برہان صاحب سے پوچھ لیتے تھے۔ وہ خود کہتے تھے کہ پوچھ لیا کرو بجائے اس کے کہ غلط نام پڑھ دو۔

اوپر بتا ہی چکا ہوں کہ خبریں پڑھنے کے لیے ریاض

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ضروری ہے لیکن نہیں، میں ریاض وغیرہ تو نہیں کرتا تھا لیکن کوشش کرتا تھا کہ ٹھنڈی بوتل، کھٹاس اور اچار وغیرہ سے بچا رہوں۔ ہر دوسرے دن خبریں پڑھنے سے ریاض تو یوں ہی ہو جاتا اور یقین کیجیے، نیوز کاسٹر کوئی سال دو سال میں نہیں بنتا۔ اس کے لیے دو چار سال لگتے ہیں کہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں یہ صحیح انداز میں خبریں پڑھ رہا ہے۔

آج کل تو پچاسوں چینل ہیں۔ اس زمانے میں ایک ہی ٹی وی چینل تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ نو بجے ہر گھر کے ڈرائنگ روم یا بیڈروم میں موجود ہوتا تھا۔ تیس سال خبریں پڑھیں۔ لوگ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جب میں ماں کی گود میں ہوتا تھا تب سے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ ایک منسٹر صاحب ملے تو کہنے لگے کہ بچوں سے کہتا ہوں زبیر خبریں پڑھے تو غور سے سنا کرو، تمہاری اردو اچھی ہو جائے گی۔ یہ میں غرور سے نہیں کہہ رہا، لیکن فخر کی بات تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ شروع میں ہم بھی بہت غلطیاں کرتے تھے۔

لیکن ہمارے سینئر مذاق اڑانے کی بجائے بٹھا کر سکھتے بتایا کرتے تھے۔ جیسے وراثت مرزا۔ وہ ہمیشہ شفقت سے پیش آتے۔ بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ دادا کا بھی یہی حال تھا۔ انور بہزاد صاحب سے ویسا تعلق نہیں تھا جیسا وراثت مرزا صاحب کے ساتھ تھا لیکن بہرحال انسان اپنے سینئرز سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ انور بہزاد کا اپنا ایک انداز تھا جو شکیل دادا کی طرح منفرد تھا اسی طرح شمیم اعجاز بہت اچھی اور نفیس خاتون تھیں۔ ان سب کے نقوش ریڈیو پر بڑے گہرے تھے۔

جب میں ٹی وی پر آیا تو کچھ حاسد بھی ملے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا کہ کسی اور کا خبریں پڑھنے کا دن ہوتا اور اس سے کہا جاتا کہ آج آپ کی بجائے زبیر الدین پڑھیں گے تو ظاہر ہے انہیں یہ پسند نہ آتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ سینئرز کو مجھ پر اعتماد تھا۔ ہم محنت بھی کرتے تھے۔ وہ بھٹو صاحب اور ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ بعض اوقات ان کے باہر کے دورے کی نیوز فیڈ آتی۔ اتنا وقت نہیں ہوتا کہ خبر میں کہاں بولنا ہے، کہاں رکنا ہے۔ ریہرسل تو کوئی ہوتی ہی نہیں تھی۔ بہرحال انہیں مجھ پر کانفیڈنس تھا۔ کہتے تھے اسے زبیر سے پڑھوالو، وہ سنبھال لے گا۔ ایک وقت تو اللہ کا شکر ہے کہ ایسا آ گیا تھا کہ ان کی غلطی بھی میں نکالنے لگا تھا۔

میں وراثت مرزا سے بہت متاثر تھا یا پھر خالد حمید تھے۔ جن کی بہت اچھی آواز اور پرسنالٹی تھی۔ ہم کراچی سے خبریں پڑھتے تھے۔ پھر جب نیٹ ورک شروع ہوگیا تو مجھے اسلام آباد، کوئٹہ، پشاور وغیرہ بھی بھیجا جانے لگا۔ میں نے چاروں اسٹیشنوں سے خبریں پڑھیں۔ سب سے ملاقات رہتی تھی۔

ریڈیو پر میں نے ڈرامے وغیرہ کیے تھے لیکن پھر یہ ہوا کہ جب خبریں پڑھنا شروع کیں تو سوچا کہ ایک کام تو بہتر کرلوں پھر دیکھا جائے گا اور میں خبروں کی دنیا میں اپنی پہچان بنانے لگا۔ الیکشن ٹرانسمیشن بھی کیے، ستر کے اور ستتر کے الیکشن میں غزالہ یاسمین وغیرہ کے ساتھ بہت عمدہ ٹرانسمیشن دی۔

شادی کے بعد غزالہ یاسمین، راحت سعید ٹی وی پر نہیں آئیں۔ جب میں ٹورنٹو گیا تو وہاں نگہت آفرین، حریم عارف وغیرہ سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ایک سعید احمد تسیم ہوا کرتے تھے۔ ہفتے دس دن میں آج بھی ان سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ نگہت آفرین تقریباً چالیس سال بعد ملنے آئی تھیں۔

جیاں گاؤژنگ

چین کے ممتاز نوبیل انعام یافتہ ادیب۔ وہ گینزو (Ganzhoo) صوبہ جیانگ میں ایک آفیسر کے ہاں پیدا ہوئے۔ والدہ اداکارہ تھیں۔ 1962ء میں بیجنگ یونیورسٹی سے فرانسیسی زبان کی ڈگری لی۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے بھی رکن تھے، تاہم 1969ء میں مستعفی ہوگئے۔ 1981ء سے 1987ء تک مختلف ادبی رسالوں میں مضامین لکھتے رہے۔ اس دوران انہوں نے ڈراما نگاری کی جانب بھی توجہ دی اور 1986ء میں "The Other Shore" کے عنوان سے ان کا ڈراما اسٹیج پر دکھایا گیا۔ اس ڈرامے میں انہوں نے ثقافتی انقلاب کو ہدف تنقید بنایا تھا۔ لہٰذا حکومت نے ڈرامے پر پابندی لگا دی۔

چونکہ وہ پابندی کے ماحول میں لکھنے لکھانے سے قاصر تھے، لہٰذا 1987ء میں ہجرت کرکے پیرس کو اپنا وطن ثانی بنایا۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے مصور بھی ہیں اور ان کے فن پاروں کی نمائشیں دنیا بھر میں منعقد کی جا چکی ہیں۔ 12 اکتوبر 2000ء کو سویڈش اکیڈمی نے ان کے لیے ادب کے نوبیل انعام کا اعلان کیا۔

مرسلہ: سحرش، شیخوپورہ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خبریں پڑھتے ہوئے غلطی ہو جاتی ہے لیکن مجھے یاد نہیں کہ میرے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہو۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ہمارے دوست، اللہ ان کی مغفرت کرے، اکرام علی شمسی تھے، وہ اور میں خبریں پڑھ رہے تھے۔ لاہور کے کسی مذہبی جماعت کے جلسے کی فلم چل رہی تھی جس میں ایک مولانا آئے، ان کی اتنی سی داڑھی تھی، دوسرے مولانا آئے تو ان سے بڑی داڑھی تھی اور تیسرے آئے تو بہت ہی بڑی داڑھی تھی۔ جیسے ہی فلم کٹ ہوئی اور کیمرا شمسی پر آیا تو وہ کہہ رہے تھے۔ ''ابے! اس کی تو سب سے بڑی ہے۔'' لیکن لوگوں نے اسے نوٹ کیا۔ میں نے وقفے میں بتایا کہ ان کا جملہ آن ایئر چلا گیا ہے۔ کہنے لگے نہیں یار۔ ابھی آدھا گھنٹا بھی نہ گزرا تھا کہ ٹی وی اسٹیشن کے باہر پچاس ساٹھ لوگ جمع ہو گئے کہ اس 'کافر' شمسی کو باہر نکالو۔ اس نے شعائر اسلامی کا مذاق اڑایا ہے۔ اس بے چارے کو دو تین ماہ کے لیے ہٹا دیا گیا تھا۔

اتفاق ہے کہ اب تک مجھ سے ایسی کوئی غلطی نہیں ہوئی کیونکہ اگر خبر غلط لکھی ہے اور میں نے ویسا ہی پڑھا ہے تو ظاہر ہے میرا قصور نہیں۔ صرف ایک بار ایسی غلطی ہوئی جس کے لیے طعنے ملے تھے۔

ایم کیو ایم کی ہڑتال ہوتی تھی اور شہر بند ہوتا تھا لیکن ہمیں خبریں دی جاتیں کہ جزوی ہڑتال ہوگی اور دکانیں کھلی رہیں۔ اب ایسے ہی ایک بار گوشت کی دکان کھلی دکھائی گئی جب کہ وہ منگل کا دن تھا۔ ان دنوں منگل کو گوشت کا ناغہ ہوتا تھا۔ ایم کیو ایم والے طعنے دیتے کہ یار تم جھوٹی خبریں پڑھتے ہو۔ اب آپ ہی بتائیں بھلا اس میں میرا کیا قصور، مجھے جیسی خبر دی، پڑھ ڈالی۔

ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ خبر آپ کو کروڑوں لوگوں تک پہنچانی ہے۔ جذبات کا مظاہرہ یا ڈرامے بازی نہیں کرنی۔ ہمیں تو مسکرانے تک کی اجازت نہیں تھی۔ ہاں، اب ذرا ویژن میں اضافہ ہوا تو دیکھا کہ بی بی سی، سی این این وغیرہ پر لوگ خبروں پر تبصرہ بھی کر لیتے ہیں۔ آپس میں ہنسی مذاق بھی کر لیتے ہیں۔

ان دنوں خبروں میں چیخ پکار نہیں ہوتی تھی مگر پچھلے دنوں کراچی جانا ہوا تو پی ٹی وی پر بھی گیا۔ جیو اور اے آر وائی کے بھی ایک دو نیوز کاسٹر موجود تھے۔ خبروں کو چیخ و پکار کی بات ہو رہی تھی۔ وہ ظاہر ہے اس کی حمایت کر رہے تھے۔ دراصل ریٹنگ وغیرہ کا چکر ہوتا ہے جبکہ ہمیں تو سکھایا گیا تھا کہ اس طرح کا چیخنا چلانا تو بی بی سی اور سی این این پر بھی نہیں ہوتا ہے۔

میں نے کرنٹ افیئرز کے پروگرامز بھی کیے۔ آپ کو یاد ہوگا، سنیما ہالوں میں پاکستان کا تصویری خبرنامہ ہوتا تھا، وہ بھی میں کیا کرتا تھا۔

میرے علاوہ طلعت حسین اور عبدالماجد بھی کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اسلم اظہر، ضیاء محی الدین، عبدالماجد، ایس ایم سلیم، محمود خان مودی بھی کیا کرتے تھے۔ وہ بڑا پاپولر تھا۔ میں نے بیس سال یہ کام کیا۔ بہت ساری ڈاکومنٹری بھی کیں۔

جب میں پاکستان سے نکلا تو اس وقت پرائیوٹ چینل شروع ہوئے تھے۔ دو ہزار پانچ میں کینیڈا چلا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب تو پیسے کمانے کا وقت آیا ہے۔ لیکن پیسا ہی تو سب کچھ نہیں۔ بچے ہیں، فیملی ہے۔ اب پوتے پوتیاں ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں ناں، اصل سے سود زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ بس اب انہی کے ساتھ وقت گزرتا ہے۔ چار بیٹے ہیں۔ سب کی شادی ہو گئی ہے۔ سب ساتھ رہتے ہیں اور الحمدللہ برسر روزگار ہیں۔ میں اب ٹورنٹو میں خبریں پڑھتا ہوں۔

میں تین دفعہ پی ٹی وی ایوارڈز کے بہترین نیوز کاسٹر کے لیے نامزد ہوا اور دو بار مجھے ایوارڈ ملا۔ اس کے علاوہ نگار ایوارڈ کی تاریخ میں شاید پہلی اور آخری بار بہترین نیوز ریڈر کا ایوارڈ دیا گیا جو مجھے ملا۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار ایوارڈ ملے جن میں سندھ اسمبلی کا ایوارڈ، وحید مراد ایوارڈ، لہری ایوارڈ وغیرہ بھی ملے۔ لیکن صدارتی ایوارڈ نہیں ملا۔ حالانکہ اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے دو نیوز ریڈرز کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی دیا گیا ہے۔ شاید کراچی، اسلام آباد سے بہت دور ہے اور ارباب اختیار کی نظریں ان تک نہیں پہنچتیں۔

ذرا سوچیں کہ یہ ستم ظریفی نہیں ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بیس سال تک مسلسل خبریں پڑھنے والا اور آج بھی امریکا اور کینیڈا میں پاکستانی اور اردو بولنے والوں کے لیے خبریں پڑھنے والے جنہوں نے اس شعبے میں تقریباً گولڈن جوبلی ہو چکی ہے ہماری وزارت اطلاعات اور براڈ کاسٹنگ کے کرتا دھرتاؤں کی نظروں سے اوجھل ہوں۔

بہرحال یہ پاکستان ہے اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں ہے کہ حقدار کو اس کا حق نہ دیا گیا ہو۔ شاید کسی کے دل میں اتر جائے مری بات۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دیو مالائی کہانیوں کا خطہ بلتستان جو اپنی رسم و روایات اور ثقافت کی بنا پر انفرادیت کا حامل ہے، وہیں اس کی سحر انگیز وادیوں میں زمانہ نامعلوم کی تاریخ سے انسان کے ارتقائی سفر کے شواہد ملے ہیں جس نے زبانوں، مذہبی عقائد اور ثقافتوں کو تنوع بخشا اور وہیں اس سے فن کے ایسے نادر نمونوں نے جنم لیا جو صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی بے نشاں ہو جانے والے فنکاروں کے فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

بلتستان کی تاریخ میں ایسے تین مذہبی ادوار ملتے ہیں جس نے فنکاروں سے فن کے ایسے نادر نمونے تخلیق کروائے جو آج بھی لوگوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔ ان میں پہلا دور "بون مت" دوسرا "بدھ مت" اور تیسرا "اشاعتِ اسلام" سے وابستہ ہے جس کی تاریخ گزشتہ سات صدیوں پہلے ملتی ہے۔ شگر بلتستان کی وہ وادی ہے جہاں ان تینوں ادوار کے آثار پائے جاتے ہیں جن کی غالباً اکثریت مسلم فنِ تعمیر سے منسلک ہے۔ ان میں آستانے، امام بارگاہیں اور خانقاہیں شامل ہیں جن میں فن چوب کاری بام عروج پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ بلتستان میں چوب کاری کے اس فن کو ایرانی مبلغین اسلام اور ان کے ہمراہ آنے والے کشمیری ہنرمندوں سے منسوب کیا جاتا ہے جن کا آغاز اپنے وقت کے اہم مبلغ امیر کبیر سید علی ہمدانی سے وابستہ ہے۔

لوک روایتوں کے مطابق امیر کبیر سید علی ہمدانی چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر سے اسکردو اور پھر یہاں سے شگر پہنچے اور اشاعتِ اسلام کا سلسلہ شروع کیا۔ اس وقت شگر پر

معمولی لکڑیوں پر جو نقش و نگار تخلیق ہوئے اس کا ذکرِ خاص

فن پارے

مختار آزاد

تخلیقِ فن کے لیے دماغ سوزی کے ساتھ ساتھ، ہاتھ کا کمال .... بھی لازمی ہے۔ برف پوش وادیوں میں جہاں کی راہیں بھی دشوار ہیں وہاں جا بجا فن پارے بکھرے ہوئے ہیں لیکن ان فن پاروں کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہیں اگر وقت رہتے ان کی حفاظت کا خاطر خواہ انتظام نہ کیا گیا تو آنے والی نسلیں .... ہمیں معاف نہیں کریں گی۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

راجا غوری تھم کی حکومت تھی جب کہ رعایا بدھ مت کے پیروکار تھے۔ ایک دن راجا پولو گراؤنڈ میں پولو کھیل رہا تھا کہ امیر کبیر سید علی ہمدانی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ یہاں آن پہنچے۔ راجا کو یہ تو علم تھا کہ حضرت ایک ایسے دین کی تبلیغ میں مصروف ہیں جو اس خطے میں پہلے موجود نہیں تھا۔ جب امیر کبیر سید علی ہمدانی نے راجا کو پہچان کر اسے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو اس نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا اور کچھ تامل کے بعد یہ شرط رکھی کہ اگر وہ پولو گراؤنڈ کے ایک حصے میں موجود بڑے سے پہاڑی پتھر کو یہاں سے غائب کر دیں تو وہ اسلام قبول کر لے گا۔ کیوں کہ اس پتھر کے باعث کھلاڑیوں کو کافی دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے اور لاکھ کوششوں کے بعد بھی لوگ اس پتھر کو یہاں سے ہٹانے میں ناکام رہے تھے۔

امیر کبیر سید علی ہمدانی نے اس شرط کو قبول کیا اور اپنے ہاتھ میں موجود عصا کو پتھر پر مارا۔ پتھر زمین میں دھنستا چلا گیا اور آخر کار غائب ہو گیا۔

راجا نے یہ دیکھ کر اپنی زبان کا پاس رکھا اور اسلام قبول کر لیا۔ قبول اسلام کے بعد راجا کا نام غازی میر رکھا گیا۔ راجا کی دیکھا دیکھی یہاں کے باشندے تیزی سے مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔

فروغ اسلام کے سبب یہاں پہلی دینی ضرورت ایک مسجد کی تعمیر محسوس کی گئی۔ روایات کے مطابق امیر کبیر سید علی ہمدانی کے ہمراہ بڑی تعداد میں ایسے ہنرمند اور فنکار موجود تھے جن کا وصف چوب کاری کے فن میں طاق ہونا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امیر کبیر سید علی ہمدانی نے اشاعتِ اسلام کے ساتھ ہی یہاں دو مسجدوں کی بنیاد ڈالی۔ ان میں ایک امبوڑک مسجد اور دوسری چھ بروچی مسجد ہے۔ کتاب زادالجنان کے مطابق امیر کبیر سید علی ہمدانی کی بلتستان میں آمد کا سال 782 ہجری ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بلتستان کی اولین مساجد ہیں۔

امیر کبیر سید علی ہمدانی کے یہاں سے واپس چلے جانے کے بعد بھی بلتستان میں فن چوب کاری کا وہ سلسلہ پنپتا رہا۔ امیر کبیر سید علی ہمدانی نے جس کا آغاز کیا تھا۔

فن چوب کاری کو مذہبی تعمیرات کے حوالے سے دیکھیں تو اسلام سے قبل یہاں موجود بدھ مت کی مذہبی اہمیت کی حامل عمارتوں میں بھی چوب کاری کا فن نظر آتا ہے جس کے نمونے آج بھی تبت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ امیر کبیر سید علی ہمدانی نے جس فن تعمیر کو یہاں رواج دیا اگرچہ اس میں ایرانی اور کشمیری رنگ نمایاں ہے تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ انہوں نے مقامی ثقافتی رنگ لیے طرز تعمیر کو بالکل نہیں چھیڑا بلکہ اسے ایرانی اور کشمیری اسلوب کے امتزاج سے مزید جلا بخشی۔

اسکردو سے کے ٹو کو جانے والے راستے پر واقع قصبہ شگر میں ایک قلعہ اور کم از کم سات مساجد، خانقاہیں، آستانے اور مزارات ایسے ہیں جن کا فن تعمیر امیر کبیر سید علی ہمدانی سے منسوب ہے اور اس پر کشمیری اور تبتی انداز تعمیر نمایاں ہے۔ ان میں قلعہ پھونگ کھر، امبوڑک مسجد، خانقاہ میر یحییٰ، آستانہ یحییٰ، چھمروچی مسجد، قلعہ مسجد، مقبرہ میر نجم الدین ثاقب، خانقاہ میر نجم الدین ثاقب شامل ہیں۔

ان تعمیرات میں سے تین کو (قلعہ پھونگ کھر، امبوڑک مسجد اور آستانہ میر یحییٰ) کو گزشتہ چند برسوں کے دوران اقوام متحدہ کے ادارہ برائے سائنس، ثقافت اور تعلیم (یونیسکو) کی جانب سے ایشیا پیسفک ہیریٹج ایوارڈ حاصل ہو چکے ہیں جس کے سبب فن تعمیر کے اس ورثے کو عالمی ستائش حاصل ہوئی۔

چوب کاری کے فن کے تحت بنائے گئے نقش و نگار کے حوالے سے کی گئی راقم کی تحقیق کے مطابق بلتستان میں ایسے نمونوں کی تعداد پندرہ سو سے بھی زائد ہے جو یہاں کندہ نظر آتے ہیں۔ ان نمونوں کے باقاعدہ نام ہیں۔ نیز مغلیہ نقش و نگاری کے اثرات بھی یہاں تک پہنچے جنہیں علیحدہ نام دیے گئے ہیں۔ ان ناموں میں موج کوثر، موج حیدر، موج حسن، موج اصغر، موج دریا، بادا، آبشار، نسنگ، گزتیں، گنجار، عنکبوت، تیر، کندرومی، سادہ کندوری، یون درونگ، اشکم، چندن، سرشت رومی، جان شیریں سمیت متعدد شامل ہیں جن کے تذکرے کے لیے خاصی جگہ درکار ہوگی، جو فی الوقت یہاں دستیاب نہیں۔ یہاں مغلیہ طرز تعمیر سے وابستہ چوبی نمونوں کے ناموں کا تذکرہ بھی کرتے چلیں۔ ان میں دروازہ سر، شش سر، شش دو سر ہشت زاویہ، شش ماہی، بندرومی قابلِ ذکر ہیں۔

یہاں ایک قدیم نشان، سواستیکا سے مشابہت رکھتا ہے۔ جس کو جرمنی کے حکمران ایڈولف ہٹلر کے نشان کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہوئی اور ہندوؤں کا بھی یہ متبرک نشان ہے۔ بلتستان کے فن تعمیر میں اس نشان کی تاریخ صدیوں پرانی ہے جسے یونگ درونگ کہا جاتا ہے۔ بعض محققین کے مطابق بلتی تاریخ میں اس نشان کو بلتستان کے قومی نشان کی حیثیت حاصل رہی ہے جو امن و سلامتی کی علامت تھا۔

سادہ سی لکڑی پر فنکار کے ہاتھوں نے جو نقش تراشے۔ وہ آج تاریخ اور تہذیب و ثقافت کی علامت ہیں۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر۔جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا چودھواں حصہ

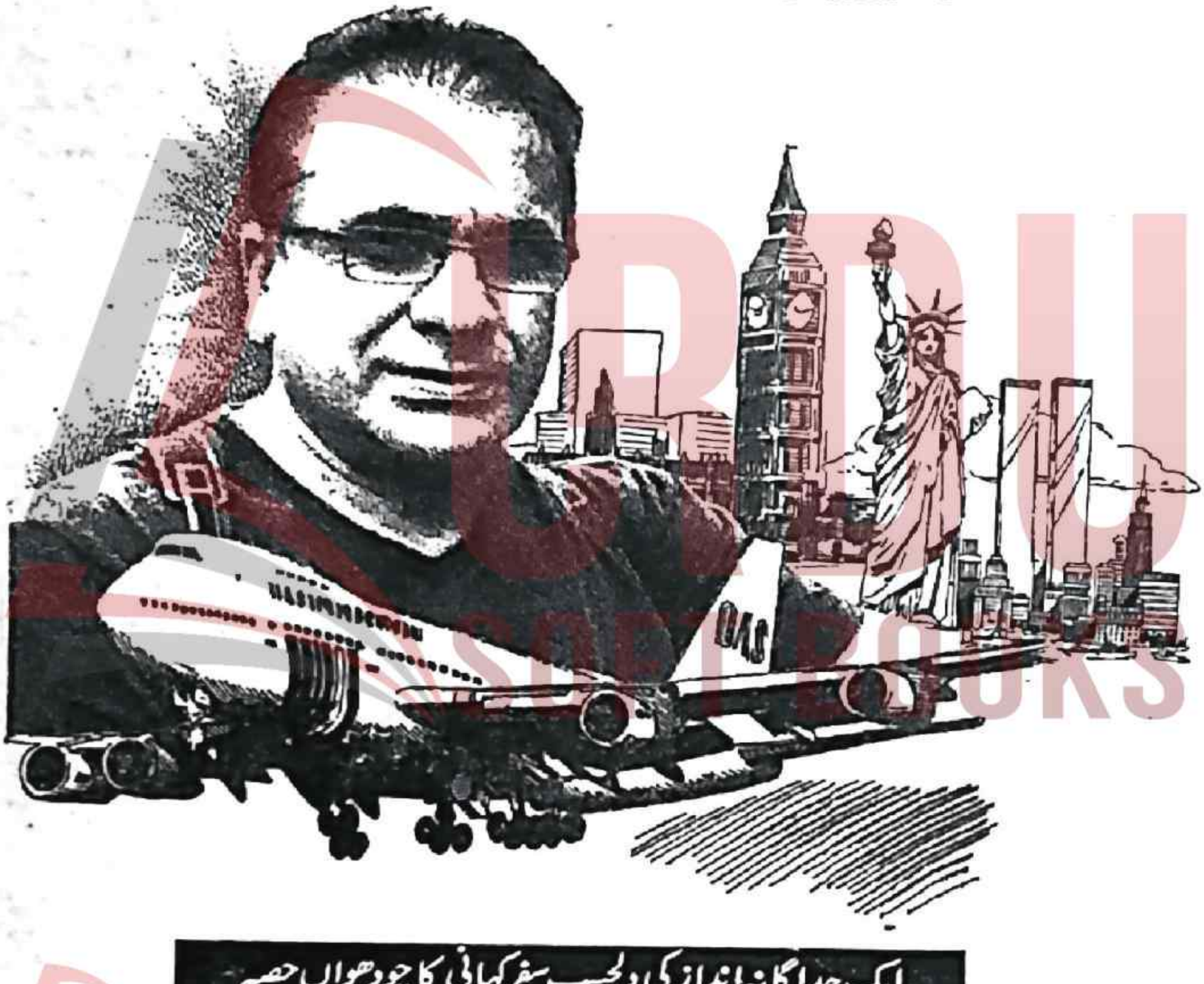

ہم سب مجسمہ آزادی پر جانے والی سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔باقی سب تو ایک ایک کر کے سیڑھی چڑھ رہے تھے لیکن سرجی کو جوش آ گیا تھا اور وہ جلد اوپر پہنچنے کی کوشش میں اچک اچک کر دو دو سیڑھیاں پھلانگ رہے تھے اسی کوشش میں سرجی کا پیر پھسلا۔ وہ ڈگمگائے اور پیچھے آتے غول پر گر پڑے۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ جس پر گرے اس کی سریلی چیخ نے ہلچل مچا دی اگر اس کے پیچھے دوسرے لوگ نہ ہوتے تو وہ بری طرح زخمی ہو جاتی۔ وہ غول انڈین سیاحوں کا تھا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

بھارتیوں کی ایک بری عادت ہے کہ وہ امریکا آتے ہی خود کو سب سے اعلیٰ سمجھنے لگتے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن صرف رنگ دار لوگوں کے سامنے۔ یورپیوں کے سامنے تو وہ نظریں بھی اٹھاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ انہوں نے ہمیں بھی انڈین سمجھا تھا اسی لیے سب ایک ساتھ غصے کا اظہار کررہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سرجی کافی دیر سے اس لڑکی کو گھور رہے تھے پھر جیسے ہی انہیں موقع ملا یہ اس پر گر گئے۔ حالانکہ انہیں معلوم نہ تھا کہ سرجی کبھی بھی دیکھ کر نہیں گرتے بلکہ گر کر دیکھتے ہیں۔

میں نے بڑی مشکل سے انہیں مطمئن کیا کہ ایک تو یہ عمر میں اس لڑکی کے باپ جیسے ہیں پھر انہیں دکھائی بھی کم دیتا ہے۔ تبھی سرجی بولے۔ ''اللہ قسم میں نے بیٹی سمجھ کر گرتے ہوئے اس کا سہارا لینا چاہا تھا۔ قسم کھانے پر وہ لوگ پھر چلانے لگے کہ تم لوگ پاکستانی ہو اس لیے انڈین کو دیکھتے ہی اسے زک پہنچانے سے باز نہیں آتے۔ وہ سب غصے سے لال پیلے ہورہے تھے کہ میں نے جلدی سے کہا۔ آپ لوگ انہیں بزرگ سمجھ کر معاف کردیں۔'' میرے بزرگ کہنے پر وہ سب شک میں پڑ گئے تھے کیونکہ سرجی کسی بھی زاویے سے اس لڑکی کے بزرگ نہ لگتے تھے۔

میری التجا پر ان میں سے ایک آدمی جو خاصا عمر دراز تھا، بولا۔ ''آپ کے کہنے پر اسے معاف کردیتے ہیں لیکن یاد رہے کہ آیندہ یہ کسی انڈین سے بدتمیزی نہ کرے۔'' یہ سن کر مجھے یقین ہوگیا کہ یہ ٹورسٹ ہی ہوسکتے ہیں۔ ورنہ یہاں رہنے والے انڈین کبھی اس طرح سے بدلحاظی نہیں کرتے۔ دل میں اگر کچھ ہو تو اور بات ہے مگر آمنے سامنے ایک دوسرے سے بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ حالانکہ سرجی کسی طور پر نہ باپ لگتے تھے اور نہ باپ جیسے۔ مقصود انہیں بچانا تھا اور میں نے انہیں باپ کے برابر عزت و مرتبے پر فیض کردیا تھا۔ بعد میں وہ میری اس ''گستاخی'' پر ناک بھوں چڑھاتے رہے۔

شہباز جو اب تک خاموش تھا اس نے حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے کہنے پر اسے معاف کردیا ورنہ ہم گھر پہنچ کر اس کی دھنائی کرتے تاکہ یہ پھر کسی انڈین لڑکی پر نہ گرے۔ یوں بھی ہم پاکستانی انڈینوں پر قہر بچھی گراتے رہتے ہیں۔''

بڑی مشکل سے انہیں ٹھنڈا کیا اور کراؤن پر پہنچنے کے لیے اوپر چڑھنے لگے۔ کراؤن پر پہنچے اور وہاں سے دریا ہڈسن کا چمکتا پانی دیکھنے لگے۔ اس میں چلتی فیری کشتیاں نظر آرہی تھیں۔ سامنے منہٹن کی خاموش عمارتیں کھڑیں یہ سارا منظر دیکھ رہی تھیں۔ اندر سے یہ مجسمہ اتنا کھلا تھا کہ پچاس بندے بھی باآسانی کھڑے ہوسکتے تھے۔ کراؤن میں لگی کھڑکیوں سے مشعل قریب سے نظر آرہی تھی۔ سات شعاعیں میرے سامنے تھیں۔ خوش قسمتی سے مشعل پکڑے ہاتھ کی سیڑھیاں آج کھلی تھیں۔ اسی لیے ہاتھ تک پہنچ گئے تھے مگر مشعل تک جانے کی سیڑھیاں 1916ء میں بند کردی گئی تھیں، اس لیے آگے نہیں گئے۔ میں بیالیس سیڑھیاں چڑھ کر مشعل پکڑے ہاتھ تک پہنچا۔ وہاں سے لیڈی لبرٹی کا تاج مجھ سے نیچے تھا۔ میں اس کے سر کو اوپر سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ خوشی آج بھی ہے کہ میں نے وہاں سے نیویارک کو دیکھا جو اب سب کے لیے بند ہے کیونکہ ہاتھ تک جانی سیڑھیاں اب سیاحوں کے لیے مکمل طور پر بند کردی گئی ہیں۔

وہاں سے اترے تو ایلس آئی لینڈ جانے والی فیری میں بیٹھے۔ اس فیری پر بیٹھنے سے پہلے ہم میں بہت تند و تیز بحث ہوئی تھی۔ شہباز کہہ رہا تھا کہ وہاں کوئی پرانا میوزیم دیکھ کر وقت کیوں ضائع کیا جائے؟ اسی دوران ٹائم اسکوائر دیکھ لیتے ہیں، کم از کم رونق تو ہوگی۔ سرجی نے اپنے آپ کو ہمارے فیصلے پر چھوڑ دیا تھا اور وہ اپنی ''رونقیں'' آس پاس دیکھ رہے تھے۔

میں نے شہباز سے کہا۔ ''ذرا تصور کرو کہ سو سال پہلے تارکین وطن کس طرح آتے ہوں گے۔ ان کو کیسے رکھا جاتا ہوگا اور وہ اپنے ساتھ کیا کیا سامان لاتے ہوں گے۔ کیا یہ دیکھ کر تمہیں تعجب اور حیرت نہ ہوگی؟''

اس نے کہا۔ ''کیا لائے ہوں گے، وہی جو ہم لائے ہیں۔ کون سی انوکھی چیزیں ان کے پاس تھیں جو تم دیکھنا چاہتے ہو۔''

سرجی نے بحث میں اپنے آپ کو اس طرح سے غیر جانبدار رکھا کہ کبھی میرا ساتھ دیا اور کبھی شہباز کی ہاں میں ہاں ملائی۔ میں نے شہباز سے کہا۔ ''تم کو منہٹن میں جو کچھ دیکھنا ہے، وہاں بھی چلیں گے اور ہمارے پاس وقت بھی ہے مگر جب یہاں آپہنچے ہیں تو ایلس آئی لینڈ بھی دیکھ لیں ورنہ پھر وہاں کبھی نہیں جاسکیں گے۔'' آخر ایک بحث کے بعد ہم ایلس آئی لینڈ والی فیری میں بیٹھے تھے اور وہ ہمیں اتنا دور نہیں لگ رہا تھا۔

بادل بھر آئے تھے۔ ہوا میں شدت در آئی تھی۔ اب باقاعدہ سردی سے میں کپکپا رہا تھا۔ سرجی اوئی اوئی کر کے کانپتا

شروع ہو گئے تھے۔ شہباز نے اپنی اونی ٹوپی اور نیچے کر کے کسی کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کھڑا مجھ ہی کو برا بھلا کہہ رہا ہوگا۔ شہباز نے اپنا غصہ سرجی پر نکالا اور کہنے لگا۔ ''ویسے تو ہر وقت تم برف باری برف باری کرتے رہتے تھے اور آج سردی سے مرے جا رہے ہو۔''

سرجی نے معصومانہ انداز میں کہا۔ ''تم کیوں مجھے ویدے دکھا رہے ہو۔ میں سردی کی وجہ سے تو نہیں کانپ رہا۔ اس ٹھنڈی ہوا سے مجھے الرجی ہے۔''

اتنے میں فیری کنارے آ لگی اور ہم ایک لائن میں لگ کر اس میں سوار ہوئے۔ ٹھنڈ کی وجہ سے ہم نیچے والے بند حصے میں مقید ہو گئے۔ میں واش روم گیا اور جب واپس نکلا تو فیری ایلس آئی لینڈ کے سامنے لنگر انداز ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ سامنے چار منزلہ ایک خوبصورت عمارت تھی جو اینٹوں اور چونے کے پتھروں سے بنی انتہائی دلکش لگ رہی تھی۔ اس پر بنے گنبد اس کو اور جاذب نظر بنا رہے تھے۔ عمارت اور پانیوں کے درمیان گھاس کے قالین بچھے تھے جو اس سردی میں بھی اپنا سبز رنگ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ جتنے درخت تھے، سب کے سب بے برگ تھے۔ یہ عمارت کوئی عام جگہ نہ تھی۔ پچاس سال کے عرصے میں سوا کروڑ تارکین وطن یورپ سے امریکا اسی عمارت سے ہو کر داخل ہوئے تھے۔ ان میں ہنرمند، آرٹسٹ، سائنس دان، پروفیشنل اور مزدور سب شامل تھے۔ ان کے آنے کے بعد امریکا گریٹ ڈپریشن سے گزرا۔ وسائل یہاں بہت تھے اور پھر یہی لوگ پورے امریکا میں پھیل گئے۔ پھر یہاں انہوں نے اپنے جوہر دکھلائے۔ زندگی کے ہر شعبے سے لوگ یہاں آئے تھے اور انہوں نے اپنے ہنر یہاں آزمائے تھے جس کی وجہ سے امریکی ترقی کو پر لگے تھے اور پھر امریکا ایک سپر پاور بننے لگا۔ اگر میں اس ترقی کی تفصیل میں جاؤں تو ایک پوری کتاب درکار ہوگی لیکن اس کو پڑھ کر قاری اتنا زیادہ خوش نہیں ہوں گے۔ اس لیے صرف اتنا کہوں گا کہ پھر امریکا کی زمین سونا اگلنے لگی۔ لیبارٹریوں میں ریسرچ شروع ہو گئی اور نت نئی ایجادات آنے لگیں۔ میڈیکل کے شعبے میں بے تحاشا ترقی ہوئی۔ فلم کے شعبے میں نمایاں کام ہوا۔ مصور، پینٹر اور فنکار اپنی اپنی تخلیقات دنیا کے سامنے رکھ کر امر ہو گئے۔ موٹر انڈسٹری اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ صاحب کمال لوگوں نے کمال کر دکھایا۔

میں اس عمارت میں داخل ہوا تو اپنے آپ کو ایک بڑے ہال میں کھڑا پایا جس کی چھتوں پر دلکش نقش و نگار بنے تھے۔ جو سامان تارکین وطن اپنے ہمراہ لائے تھے وہاں انہیں سجا کر رکھا گیا تھا۔ ان کے بکس، ریڑھیاں، بستر اور کپڑے رکھے تھے۔ ان ریڑھیوں پر ہی وہ بھاری بکسے اٹھا کر لائے تھے۔

میں یہ سامان دیکھ کر اپنے آپ کو سو سال پیچھے کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ سرجی غائب تھے۔ جب مڑ کر دیکھا تو وہ کاؤنٹر پر کسی لڑکی سے باتیں کر رہے تھے۔ شہباز سخت بوریت کی حالت میں اپنی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ اپنے سرجی کہیں پھر کسی چکر میں نہ پھنس جائیں اور شہباز ان سے یہ کہہ رہا ہو کہ تم نے یہ کیسا سیاپا کھڑا کر دیا ہے۔ وہ میرے پاس تقریباً دوڑتے ہوئے آئے اور پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولے۔ ''کام ہو گیا ہے۔ اب میرے ساتھ چلو۔''

میں نے حیرت سے کہا۔ ''کون سا کام؟''

''میں نے تمہارے بارے میں انہیں کہا ہے کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں اور امریکا کے امیگرنٹس پر کوئی ریسرچ کر رہے ہیں۔''

''ایسا آپ نے کیوں کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت رعب پڑتا ہے اور اب وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''یار! کہیں مروا نہ دینا۔''

''بس تم نے ذرا میری طرح ''وقار'' سے رہنا ہے تاکہ انہیں لگے کہ کوئی بہت بڑا دانشور آیا ہے۔''

میں ان کی اس بات پر ہنسا تو وہ بولے۔ ''دانش ورہنتے نہیں ہیں۔ کہیں میری عزت کا جنازہ نہ نکال دینا۔'' میں نے پوچھا۔ ''تو پھر کیا کرتے ہیں۔'' تو ان کا متانت بھرا جواب آیا۔ ''چہرے پر سنجیدگی اور تناؤ ہوتا ہے اور نظر اپنی سیدھی رکھتے ہیں۔ آس پاس نہیں جھانکتے جیسے آپ تاڑتے رہتے ہیں۔'' میں نے اسی بردباری سے سر ہلایا جس کا انہوں نے مشورہ دیا تھا۔

میں ان کے ساتھ چل پڑا بلکہ وہ اب میرے پیچھے چل کر مجھے ہدایات دے رہے تھے کہ کس طرح سے میں نے بات کرنی ہے تاکہ ہمارا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔

میں کاؤنٹر کے قریب پہنچا بھی نہ تھا کہ اس کے پیچھے سے ایک آدمی اور دو لڑکیاں میرے استقبال کے لیے نکل آئے۔ مجھ سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ پھر اپنی قسمت پر ناز کیا کہ پاکستان سے ایک محقق صرف تارکین وطن پر کتاب

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

لکھنے کے لیے امریکا آیا ہے۔

اتنے زوردار استقبال پر پہلے تو میں گھبرایا اور پھر اپنے آپ کو تاریخ دان سمجھ کر سنجیدگی کا ایک خول اپنے آپ پر چڑھا کر سختی سے کس لیا۔

ایک لڑکی جس نے کالی اسکرٹ کے نیچے کالے رنگ کا تھرمل پہنا تھا اور سفید شرٹ میں اپنے بلانڈ بالوں اور چمکیلے دانتوں کے ساتھ ایک شہزادی لگ رہی تھی، مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''سر! ہم آپ کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟''

میں نے بھرپور متانت اختیار کر کے ایک طویل سوال پوچھا۔ ''یورپ کے کن کن ممالک سے تارکین وطن یہاں پہنچے، ان کے آنے کی وجوہات کیا کیا تھیں اور یہاں وہ کن مراحل سے گزر کر امریکا میں داخل ہوئے؟ مجھے ان کا سال بہ سال کا مکمل ڈیٹا مل جائے تو میں آپ کا بہت مشکور ہوں گا۔''

سرجی کو میرے اس سوال کی توقع نہ تھی۔ ان کی توقعات سے بڑھ کر میں پوچھ بیٹھا تھا اور اب وہ حیرت سے منہ کھولے ہم دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ وہ رضامندی سے سر ہلا کر بخوشی راضی ہوئی۔ مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا۔ سرجی اور شہباز بھی ساتھ آنے لگے تو میں نے مڑ کر اسی متانت سے حکم دیا۔ ''آپ لوگ ہر فلور پر جا کر اپنے اپنے نوٹس لیں اور فارغ ہو کر اسی جگہ پہنچ جانا۔'' پھر میں لڑکی کے ساتھ چل پڑا۔ تبھی میں نے شہباز کی ایک کثیف گالی سنی وہ اب سرجی سے یہی کہہ رہا تھا تم نے یہ کیسا سیاپا کھڑا کر دیا ہے۔ سرجی کی ایک مخنی سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ''یہ تو ایسے ہی ہوا کہ ہماری بلی ہمیں ہی میاؤں!''

پہلے وہ مجھے پیچھے ایک بڑی لائبریری میں لے گئی۔ فرش سے چھت تک دیواروں کے ساتھ لگی الماریوں میں سینکڑوں کتابیں، رجسٹر اور رسالے پڑے تھے۔ میں تو دیکھتے ہی گھبرا گیا کہ کہیں وہ مجھے کتابیں دے کر اس سے نوٹس لینے کا نہ کہہ دے پھر وہ بولی۔ ''ان کتابوں میں تارکین وطن کا سارا ریکارڈ موجود ہے۔ آپ کے تھیسس کے لیے بہت کچھ آپ کو ان میں مل جائے گا۔''

میں سخت بوکھلا چکا تھا اور سرجی کی شان میں اندر ہی اندر ''قصیدے'' پڑھ رہا تھا کہ مجھے کہاں لا پھنسایا؟ اگر میں ایسے نوٹس لینا بھی چاہتا تو مجھے کئی ہفتے انہیں کھنگالنے میں لگ جاتے مگر اس نے یہ کہہ کر میری پریشانی کم کر دی کہ ''مجھے معلوم ہے کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے۔ ہم ضروری ریکارڈ کی فوٹو کاپی کر کے آپ کو دے دیں گے۔'' پھر یہ بھی کہا۔ ''اگر آپ کو کسی اور میٹریل کی ضرورت ہو تو آپ ہمیں ای میل کر دیں یا فون کر دیں۔ ہم پاکستان میں آپ کو پوسٹ کے ذریعے بھیج دیں گے۔''

میں نے مدبرانہ انداز میں اپنا سر ہلا دیا اور سرجی کے بارے میں اپنے الفاظ واپس لے لیے۔

پھر وہ مجھے لائبریری کے پیچھے ایک بڑے ہال میں لے آئی۔ ہمارے علاوہ کوئی تیسرا نہ تھا۔ جو ٹورسٹ آتے تھے شاید باہر ہی باہر دیکھ کر واپس چلے جاتے ہوں گے۔ اس ہال میں مختلف فگرز ایک ترتیب سے رکھیں تھیں جن میں تارکین وطن کی حالت زار بتائی گئی تھی۔ تھکے ہارے جسم اور پُراُمید چہرے تھے۔ ایک نئی زندگی شروع کرنے کی تمنا بھی تھی اور ساتھ اپنے دکھ بھی اٹھائے کھڑے تھے۔ بچے، بڑے، بوڑھے، مرد اور عورتیں سب، خاندان کے خاندان ایک ساتھ آئے تھے۔

اس کے بعد وہ مجھے دوسری منزل پر سیڑھیوں سے لے آئی۔ یہ ایک بڑا ہال تھا جہاں قطاروں میں بہت ساری بنچیں پڑی تھیں۔ دیوار کے ساتھ کاؤنٹر تھے۔ تصویروں میں مجھے بتا رہی تھی کہ اُن دنوں یہ بنچیں آنے والوں سے بھری ہوتی تھیں۔ سب اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔ اپنی باری آنے کے بعد وہ اپنا سامان پکڑے کاؤنٹر پر پہنچ جاتے۔ ان کے کاغذات تیار ہوتے۔ پھر کچھ تصاویر دکھاتے ہوئے بولی۔ ''اس کے بعد ان کا طبی معائنہ ہوتا تھا اور انہیں ویکسین دی جاتی۔ کچھ اور تصاویر دکھائیں جس میں بحری جہازوں سے تارکین وطن سینکڑوں کی تعداد میں بھرے نظر آ رہے تھے۔ عورتوں نے اسکارف سے سر ڈھانپے ہوئے تھے۔ مردوں نے اپنے سروں پر ہیٹ پہن رکھی تھیں۔ کسی نے بچہ اٹھایا ہوا تھا اور کسی نے اپنا سامان۔ وہ سب ایک لائن میں کھڑے تھے۔ مجھے حیرت اس چیز پر ہو رہی تھی کہ ان تصویروں کے پس منظر میں اس وقت بھی منہٹن کم و بیش ایسا ہی تھا جیسے آج تھا۔ ایسی ہی بلند اور اونچی اونچی عمارتیں ان تصویروں میں نظر آتی تھیں جیسے ہم آج دیکھ رہے تھے۔

پھر مجھے وہ ایک اور ہال میں لے آئی۔ جہاں تارکین وطن کو کھانا دیا جاتا تھا۔

تصویریں دیکھیں جن میں اس بڑے ہال میں کئی ایک میزیں ترتیب سے رکھی تھیں، جن پر صاف و شفاف پلیٹیں سجی تھیں۔ باوردی خانسامے انہیں کھانا پیش کر رہے تھے۔ ہم دوسرے کمرے میں آئے جہاں شوکیسوں میں ان کا پاسپورٹ اور دوسری قانونی دستاویزات رکھی تھیں۔ ان کے

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

جوتے، کپڑے اور دوسرا سامان پڑا تھا۔ جو خوراک ان کو دی جاتی تھی، وہ بھی پلیٹوں میں سجی تھی۔ مصنوعی پھلوں کے نمونے رکھے تھے جو ان دنوں اصل میں دیے جاتے تھے۔ ڈبل روٹیاں، آملیٹ، ابلے چاول تک رکھے تھے۔

تیسری منزل پر ہولڈنگ سینٹر تھا۔ بڑے بڑے کمرے جن میں بنک بیڈ اوپر تلے رکھے تھے جو اس وقت استعمال ہوتے تھے۔ یہ سونے کی جگہ تھی۔ اس وقت کے واش بیسن دیواروں سے لگے چمک رہے تھے۔ گویا زندگی کی ضرورت کا ہر سامان انہیں مہیا کیا جاتا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ مجھے ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا تھا۔ میرا یہاں آنا رائیگاں نہ گیا تھا۔ سرجی کا مذاق میرے لیے باعث رحمت بن گیا تھا۔ تاریخ میں میری دل چسپی تو ہمیشہ سے رہی ہے اور آج تو مجھے گائیڈ بھی ایسا ملا تھا جس سے خوشبو پھوٹتی تھی۔ وہ مجھے جو عزت دے رہی تھی وہ بہت کم دیسیوں کو یہاں ملتی ہوگی۔ یہ سرجی کا کمال تھا۔ وہ مجھے ایسی تعظیم دے رہی تھی کہ جیسے میں اسٹیٹ گیسٹ ہوں اور میں بھی تھوڑا سا اپنے آپ کو ایسا سمجھنے لگا تھا۔ میری عادت رہی ہے کہ اپنے ساتھ والے کسی بھی انسان سے مذاق کرتا ہوں مگر یہاں مجھے اپنے ''مرتبے'' کا لحاظ بھی رکھنا پڑ رہا تھا۔

ہم نیچے ہال میں آئے تو کاؤنٹر پر ایک بڑا دستہ فوٹو کاپی کا میرے اعزاز میں رکھا تھا۔ مجھے اس لڑکی نے وہ کاغذات دیتے ہوئے اپنا کارڈ بھی دیا کہ کسی قسم کی معلومات کی جب بھی ضرورت پڑے تو میں اس سے رابطہ ضرور کروں۔ مجھے بڑے احترام سے رخصت کیا گیا اور جاتے جاتے یہ گزارش بھی کی کہ اپنے تھیسس کی ایک کاپی ان کو بھی بھیجوں تاکہ وہ اسے اپنی لائبریری کی زینت بنا سکیں۔ میں نے وہ کاغذات اپنے دوستوں کے سپرد کیے جیسے وہ میرے اسسٹنٹ ہوں۔ وہ کاغذات سرجی اور شہباز نے مل کر اٹھائے اور ہم باہر کھڑی فیری میں آ بیٹھے۔ بیٹھتے ہی شہباز کا اپنا بوجھ مجھ پر پھینکتے ہوئے کہا۔ ''اپنی ردی کو اپنے پاس رکھو۔ ہم کو تو تم نے اپنا منشی بنایا ہوا ہے۔'' سرجی بھی شکایت کندہ تھے اور منہ بسور کر بولے۔ ''حالانکہ ہم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں مگر آپ نے تو اپنا مزاج ساتویں آسمان پر رکھ لیا تھا۔''

''مجھے معلوم تھا کہ میرے دوست جانتے ہیں کہ میں نے یہ سب حرکتیں ہلکی مذاق میں کی تھیں اور وہ اب میرے ساتھ تفریح کر رہے تھے۔''

بعد میں ان کاغذات کا جب مطالعہ کیا تو بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مشرقی اور جنوبی یورپ میں وہ لوگ جو بھوک اور افلاس کے مارے ہوئے تھے یا مذہبی یا پھر سیاسی دہشت گردی کا شکار تھے، وہ سب ٹرینوں، گھوڑوں یا پیدل کسی سمندری بندرگاہ پہنچتے۔ وہاں سے کسی اسٹیمر پر دو ہفتے میں بحر اوقیانوس عبور کر کے ایلس آئی لینڈ پر اترتے۔ جو امیر ہوتے وہ کسی پرائیویٹ کیبن میں سفر کرتے۔ زیادہ تر شپ کے نچلے حصے میں ہزاروں کی تعداد میں بھرے ہوتے تھے۔ شپ ہمیشہ پرانا اور بوسیدہ ہوتا۔ دو ہفتے کے سفر میں تھرڈ کلاس کے مسافر بدحال ہو جاتے۔ وہ جیسے ہی لیڈی لبرٹی کو دیکھتے تو کئی خوشی سے رونے لگتے۔ دور سے اس مجسمے کو ہاتھ ہلا ہلا کر اس کا شکریہ ادا کرتے۔ پھر محکمہ صحت کے افسران جہاز پر آ کر ان کا چیک اپ کرتے۔ پہلے فرسٹ اور سیکنڈ کلاس مسافروں کی باری آتی۔ ان کو چند گھنٹوں میں فارغ کر دیا جاتا۔ تھرڈ کلاس کے مسافر کئی کئی دن اپنے چیک اپ کا انتظار کرتے رہتے۔ ان کو خوش نصیب گردانا جاتا جن کا چیک اپ جلد ہو جاتا۔ اس کے بعد انہیں لانچوں میں سامان سمیت بھر کر ایلس آئی لینڈ لایا جاتا۔ امیگریشن افسر انہیں نمبر لیک دیتے اور چیخ چیخ کر انہیں بلڈنگ میں جانے کا کہتے۔ بہت سے انگلش نہیں سمجھتے تھے اور وہ پریشان ہر ایک سے پوچھتے کہ یہ آفیسر کیا کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ پولینڈ، اٹلی، رشیا اور مشرقی یورپ کے ہوتے تھے (آج ان کی اولادیں اب نئے آنے والوں کو نفرت سے دیکھتی ہیں کہ انہیں انگلش نہیں آتی۔ جب ان کے باپ دادا آئے تھے تو وہ انگلش کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتے تھے)۔ سرخ اینٹوں والی عمارت کے مین فلور پر اس کا سامان بے یار و مددگار پڑا ہوتا اور وہ اوپر کی منزل پر رجسٹریشن کروانے کے لیے پورا دن یا دو دن تک بیٹھے رہتے۔ ایک جہاز میں تین ہزار تک مسافر بھرے ہوتے۔ عام طور پر اگر ایک شپ آتا تو وہ ایک دن میں فارغ ہو جاتے تھے۔ رجسٹریشن والے ہال کو گریٹ ہال کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک دوسرا ڈاکٹر آنے والوں کو دوبارہ چیک کرتا۔ خاص کر آنکھوں کو چیک کیا جاتا۔ جس کی بینائی بہت کمزور ہوتی یا انہیں کوئی خاص بیماری ہوتی تو اس کو واپس یورپ بھیج دیا جاتا تھا۔ میڈیکل سب سے اہم تھا اگر میڈیکل میں پاس ہو جاتے تو آگے رجسٹریشن کے لیے بھیجا جاتا ورنہ واپس اسی جہاز میں روتا چیختا انہیں واپس کر دیتے۔ اس ہال میں تین چار ہزار لوگوں کا شور برپا ہوتا اور کان پڑی آواز بھی بمشکل سنائی دیتی تھی۔

ہر ایک سے چند مخصوص سوالات پوچھے جاتے کہ کہاں سے آئے ہو، کس شہر جانا ہے، کسی جرم میں کبھی پکڑے گئے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

ہو، کتنی رقم ساتھ ہے، شادی شدہ ہو اور ہو تو کتنے بچے ہیں اگر کوئی جواب غلط پایا جاتا تو اس کو واپس بھیج دیا جاتا۔ حیرت ہے کہ یہ سوالات اسی طرح اب بھی پوچھے جاتے ہیں اور غلط بیانی پر وہی سلوک ہوتا ہے جو پہلے ہوتا تھا۔

جن کو امریکا میں رہنے کی اجازت مل جاتی تو وہ خوشی خوشی ایک اور کمرے میں لائے جاتے۔ اجازت ملنے پر بھی تو مہینے لگ جاتے اور وہ اسی دوران ہولڈنگ سینٹر میں اوپر قید رہتے تھے۔ اجازت ملنے پر وہ نیچے آتے۔ مدد گار موجود ہوتے۔ منی ایکسچینج (Exchange Money) والے ان سے ان کی کرنسی کے بدلے امریکن ڈالر دیتے۔ وہیں ڈاکخانہ بھی تھا اور ٹرین کے ٹکٹ بھی وہیں سے ملتے جنہیں کسی اور شہر کو جانا ہوتا۔ یہاں سے وہ اس ہال میں آتے جہاں ان کے وہ عزیز انتظار میں کھڑے ہوتے، جو ان سے پہلے امریکا آچکے تھے۔ اس ہال کو کسنگ ہال کا نام دیا گیا تھا۔ جب یہ بچھڑے آپس میں گلے ملتے تو خوشی سے نعرے لگاتے اور ظاہر ہے چوما چاٹی بھی کرتے تھے، اسی لیے تو اس ہال کا نام کسنگ ہال پڑ گیا تھا اور پھر یہ سفر اختتام پذیر ہوتا اور وہ شادمان ہوتے کیونکہ وہ اب امریکا میں تھے۔ میں یہ لکھتے ہوئے اب بھی سوچ رہا ہوں کہ سو ڈیڑھ سو سال پہلے بھی امریکا آنا بہت سے لوگوں کا خواب تھا اور آج بھی ہے۔ کل رہتا ہے یا نہیں یہ اللہ ہی جانتا ہے۔

مجھے چھ بجے سے پہلے طارق کی فارمیسی پہنچنا تھا۔ میں سرجی اور شہباز کو بھی لے آیا تھا اور ان کے ساتھ منٹھن کی ایک سب وے پر کھڑا تھا۔ چھ پہلے ہی بج چکے تھے۔ مجھے طارق کے گھر تک ویلی اسٹریم پہنچنا تھا وہیں کھڑے کھڑے ان دونوں سے کہا کہ کل دس بجے سینٹرل پارک ویسٹ اور 77th اسٹریٹ کے کارنر پر ملیں گے۔ ان کو نہیں بتایا تھا کہ میرا نیچرل ہسٹری میوزیم دیکھنے کا ارادہ ہے ورنہ وہ دونوں بھڑک جاتے اور ساتھ جانے سے انکار کر دیتے۔ سرجی نے ایک بار پوچھا بھی۔ ''کیا وہ رونق شونق والی جگہ ہے؟''

میں نے جواب دیا تھا۔ ''وہاں سینٹرل پارک ہے، جہاں اس موسم میں بھی لڑکیاں نیکریں پہنے گھومتی ہیں۔''

سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے انہوں نے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ''انہیں سردی تو لگتی ہوگی؟''

میں نے جواب دیا۔ ''وہ دراصل اسکن کلر کا تھرمل پہنتی ہیں اور پتا بھی نہیں چلتا کہ کچھ پہنا ہوا ہے۔''

یہ سن کر وہ کہنے لگے۔ ''پھر تو بہت زیادہ رونق ہوگی اگر برف باری ہوتی تو اور زیادہ مزہ آتا۔''

ٹرین پر سوار ہوتے ہوئے میں نے ان دونوں سے کہا۔ ''اپنے رات کے کپڑے اور ضروری سامان بھی لیتے آئیں، شاید رات ڈاؤن ٹاؤن میں گزارنا پڑے۔''

یہ سن کر وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔ ''وہ کیوں؟''

میں نے کہا۔ ''رات کو ٹائم اسکوائر کی رونقیں کیا نہیں دیکھنی؟ اور کل ویک اینڈ بھی ہے۔''

دونوں کی نظروں میں ایک چمک سی آگئی تھی۔

میں ایلس آئی لینڈ میں پیش کیے گئے نوٹس لیے جب طارق کے گھر پہنچا تو وہ پریشان بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''کہاں رہ گئے تھے؟ کم از کم فون تو کر لیتے۔'' پھر میرے ہاتھوں میں کاغذوں کا بوجھ دیکھا تو پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

میں نے جب تفصیل بتائی تو بگڑ گیا اور کہنے لگا۔ ''تمہارا تو دماغ خراب ہے۔ لوگ تفریح گاہوں میں گھومنے جاتے ہیں اور تم کہاں پھر رہے ہو؟'' پھر پوچھنے لگا۔ ''یہ ایلس آئی لینڈ کہاں پر ہے؟'' میں نے جب بتایا تو ہنس کر کہنے لگا۔ ''خدا کی قسم، میں نے آج تک اس کا نام بھی نہیں سنا۔ معلوم نہیں تم کو کون ان جگہوں کے بارے میں بتاتا ہے؟''

جب میں نے پوچھا۔ ''تم لبرٹی آئی لینڈ کتنی بار گئے ہو تو جواب دیا۔ ''بارہ سال پہلے جب نیا نیا آیا تھا، تب ایک بار گیا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا اوپر چڑھے تھے؟''

''میرا دماغ خراب تھا؟ بس دور سے دیکھا اور واپس آگیا۔ بہت بور جگہ تھی۔'' پھر ایک لمبی چھینک مار کر کہنے لگا۔ ''تم کو اٹلانٹک سٹی کے کیسینو لے جاؤں گا۔ کچھ دیکھنے کی جگہ تو دیکھو۔ معلوم نہیں کیا کیا دیکھ رہے ہو؟''

جب میں نے یہ بتایا کہ کل میں نیچرل ہسٹری میوزیم دیکھنے جاؤں گا۔ تو وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور تمنا بھابی کا قہقہہ کچن سے آیا جو وہاں کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھیں۔

طارق کہنے لگا۔ ''میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ پچھلے ستر سال سے جتنے بھی پاکستانی یہاں آئے، کسی نے بھی ایلس آئی لینڈ کی عجائب گھر جانے کا اظہار نہیں کیا۔''

پھر بولا۔ ''تم پہلے پاگل ملے ہو جو ایسی بور جگہوں پر جا رہے ہو۔''

جب میں نے یہ بتایا کہ شاید کل رات ہم ڈاؤن ٹاؤن میں گزاریں تو وہ اور زیادہ بگڑنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''ہم رات کو ٹائم اسکوائر دیکھنا چاہتے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

ہیں۔"

وہ جھنجلا کر بولا۔ "وہ میں تمہیں لے جاؤں گا۔ رات کو وہاں خطرہ ہوتا ہے، تم اکیلے مت جاؤ۔" اس نے مجھے ڈرایا، سمجھایا اور دھمکایا۔ پھر جب یہ دیکھا کہ میں ٹس سے مس نہیں ہو رہا تو آخر میں ہتھیار ڈال کر کہنے لگا۔ "تمہارے اور تمہارے دوستوں کے لیے میں ٹائم اسکوائر کے ساتھ کوئی ہوٹل بک کروا دیتا ہوں۔" میں نے اس سے کہا کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو تو جواب میں مجھے سرخ آنکھوں سے صرف گھورتے رہ گیا۔

پھر اس نے انٹرنیٹ پر 8th اونیو، سینتالیس اسٹریٹ پر تین بیڈ کا ایک کمرا بک کروا دیا۔ کہنے لگا۔ "آخر تم میوزیم وغیرہ کیوں دیکھتے ہو؟ اور بھی بہت سی جگہیں ہیں جہاں تم اور تمہارے دوست بھی جا کر خوش ہوں گے۔"

انہیں معلوم نہ تھا کہ میری دلچسپی تاریخ سے کتنی زیادہ ہے۔ میں عام طور پر ان جگہوں سے دور رہتا ہوں جہاں بہت زیادہ شور شرابہ ہو۔ ایک ہی بار ایسی جگہ کو دیکھنے جاتا ہوں مگر دوبارہ جانے سے ہمیشہ کتراتا ہوں۔ ایک بار صرف اس لیے جاتا ہوں کہ اگر کچھ لکھنا چاہوں تو مستند معلومات میرے پاس ہوں۔

ہسٹری گو کہ میرا مضمون نہ تھا۔ میں نے میڈیکل کے سبجیکٹ پڑھے تھے مگر ہر علاقے کی تاریخ سے مجھے بہت دلچسپی رہی ہے۔

میرے کینیڈا آنے سے چند ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ میرے شہر ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ساتھ ٹانک شہر ہے۔ اس کے بعد ساؤتھ وزیرستان ہے۔ مجھے کہا گیا کہ ٹانک، جنڈولہ اور وانا کے کیمسٹ شاپ کے مالکان کو ایک ورک شاپ دینی ہے۔ فارمیسی کونسل نے میرا انتخاب کیا ہے۔ ورک شاپ کے بعد ان کا ٹیسٹ ہونا تھا اور جو پاس ہو جاتا اسے میڈیکل اسٹور کا لائسنس مل جانا تھا۔ میں روزانہ ٹانک جاتا اور سو سے زائد میڈیکل اسٹور کے مالکان کو لیکچر دیا کرتا تھا۔ سب امتحان میں پاس ہونے کے لیے میرے لیے تحائف لانا شروع ہو گئے۔ کوئی کپڑے لے کر آ رہا تھا اور کوئی جرسیاں اور کوئی ڈرائی فروٹ۔ میں نے انکار کر دیا۔ ایک دو تو پستول اور کلاشنکوف بھی لے آئے۔ میں نے پہلی بار ہینڈ گرنیڈ اس دن دیکھا جب ایک صاحب نے کہا۔ "سر یہ آپ رکھ لیں، کام آئے گا۔" گرنیڈ دیکھ کر ہی میری روح فنا ہو گئی۔ قلم سے دلچسپی رکھنے والے کے لیے گرنیڈ کو چھونا ایک عذاب سے کم نہیں۔

میں نے سب کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ آخر تنگ آ کر ان کا نمائندہ بولا۔ "یہ سب بطور تحائف کچھ دینا چاہتے ہیں۔ آپ خود بتائیں کہ آپ کو آخر کیا پسند ہے؟"

مجھے معلوم تھا کہ آس پاس آثار قدیمہ کی کچھ دریافت ہوئی تھیں۔ میں نے ان کے لیڈر سے کہا کہ اگر ہو سکے تو ان مقامات پر مجھے لے جائیں۔ وہ پٹھان تھے سب کے سب ہکا بکا رہ گئے کہ یہ کون سی فرمائش ہے؟

دوسرے دن تین بڑی بڑی گاڑیاں آ گئیں۔ بندوق بردار گارڈز بھی تھے۔ مجھے ایک گاڑی کے آگے بٹھایا گیا اور شہر سے دور ایک ٹیلے پر لے جا کر بولے۔ "یہاں پر بارش کے بعد علاقے والوں کو اکثر پرانے برتن ملتے رہتے ہیں۔" باقی سب نیچے کھڑے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر مسکرا رہے تھے اور میں ٹیلے پر چڑھا مٹی کھود کر ٹھیکریاں اکٹھی کر رہا تھا۔ وہ حیرت سے کبھی اپنے کان کھجاتے، کبھی منہ پھیر کر تھوڑا سا مسکرا دیتے اور پھر ایک دوسرے کو خاموش رہنے کے اشارے کرتے۔ دو گھنٹے میں اس ڈھیری سے کچھ تلاش کرتا رہا۔ کوئی خاص چیز نہ مل سکی مگر میرا شوق پورا ہو گیا۔

دوسرے دن میں کلاس میں آیا تو ہر کوئی میرے پاس آ کر مجھے نوادرات پیش کرنے لگا۔ یہ ان کے گھروں میں رکھی تھیں۔ بہت سے لوگ پتھروں کے چھوٹے بت لائے تھے۔ کچھ لوگ مٹی اور کاپر کے پرانے برتن گھروں سے اٹھا لائے تھے جن پر پرانے بادشاہوں کی تصویریں اور جانوروں کی شکلیں کندہ تھیں۔ کچھ لوگ پرانے سکے لے آئے جن پر شیر شاہ سوری کی تصویریں تھیں۔ غرض کہ میرے پاس قیمتی نوادرات کا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ مجھ سے اپنی خوشی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ وہ سب اس بات پر خوش تھے کہ قیمتی تحفوں کے بدلے یہ ناکارہ اشیاء دے کر ان کی جان چھوٹ گئی ہے۔ وہ سارا سامان انہوں نے میرے گھر پہنچا دیا۔

بیوی نے جب بت اور پرانے برتن دیکھے تو فساد ڈال دیا کہ میں کفر کی علامتیں گھر میں کیوں لے آیا ہوں۔ میں انہیں کینیڈا اس لیے نہ لا سکتا تھا کہ قیمتی نوادرات کو ملک سے باہر لے جانا جرم ہے۔ پھر میں نے سب چیزیں چھپا کر کہیں رکھ دیں۔ میں کینیڈا آیا تو بیوی نے میرا وہ قیمتی اثاثہ میرے بھتیجے کو دے کر دریا سندھ میں بہا دیا تاکہ اگر کوئی بدروح یا نحوست ان سے جڑی ہو تو ہمیشہ کے لیے غرق ہو جائے۔ یعنی ایک ہی جھٹکے میں بیگم نے قیمتی نوادرات سے محروم کر دیا۔

خیر اب دوبارہ نیویارک چلتے ہیں جہاں طارق میرے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کل کے پروگرام سے پریشان بیٹھا مجھے منہٹن میں رات کے خطرات سے آگاہ کررہا تھا۔ میں پورے دن کا تھکا ہوا تھا۔ صبح پھر جلدی اٹھنا تھا اور اسی لیے میں سونے کے لیے تہہ خانے میں چلا گیا اور پھر اسی مشینی شور کی وجہ سے اوپر ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر آسویا۔

دوسرے دن میں میوزیم کے سامنے اپنی متفقہ جگہ پر کھڑا ان دونوں کا انتظار کررہا تھا۔ میرے بیک پیک میں میرا رات کا لباس تھا۔ پانی کی بوتل تھی اور تمنا بھابی نے آلو کے پراٹھے بھی بنا کر بیگ میں رکھ دیئے تھے۔ آج بھی موسم کل کی طرح تھا۔ زیادہ سردی نہ تھی جو بے آرام کرتی۔ سب سے پہلے سرجی خراماں خراماں آتے نظر آئے۔ آتے ہی سلام دعا کے بعد بولے۔ ''لگتا ہے شہباز کھسک گیا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟''

''کل بھی وہ بڑبڑا رہا تھا کہ ندیم بھائی ہمیں عجائب گھر دکھانے لے جاتے ہیں۔ پرانی چیزوں سے ہم نے کیا لینا؟'' وہ شہباز کے قصیدے پڑھ رہے تھے کہ اسے کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی نہیں ہے اور مجھے دیکھو، میں تو یہ سب دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ وہ یہی باتیں کررہے تھے اور شہباز پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔ یہ سب سن کر بولا۔ ''سرجی! خدا کا خوف کرو۔ یہ سب تو آپ کہہ رہے تھے۔''

سرجی اسے اچانک پا کر گڑبڑا گئے اور بولے۔ ''میں تو تمہارا دل رکھنے کے لیے تمہاری ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔''

سرجی نے بات کا رخ بدلا اور کہنے لگے۔ ''وہ راجا اندر کا اکھاڑہ کہاں ہے؟''

شہباز تلملا کر بولا۔ ''ہم کوئی گوجرانوالہ کی سیر کو آئے ہیں جہاں اکھاڑے ہوں گے؟''

اس پر سرجی کہنے لگے۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ وہ جگہ کہاں ہے جہاں میمیں اس موسم میں، نعوذ باللہ ننگی گھومتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ دوپہر کے بعد آتی ہیں۔ اس سے پہلے انہیں آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔''

سرجی چلا کر بولے۔ ''تو اس دوران کیا کریں گے؟ وہ چلا اس لیے رہے تھے کہ آتی جاتی بسوں کا شور تھا۔ ہمارے سامنے چار بڑے ستونوں کے بیچ ایک بڑا دروازہ میوزیم کا تھا۔ اس دروازے تک متعدد سیڑھیاں جاتی تھیں۔ ہر ستون کے اوپر ایک پتھر کا مجسمہ تھا۔ دروازے کے عین سامنے ایک چبوترے پر کسی گھڑسوار کا مجسمہ تھا اور مین گیٹ کے دونوں جانب ایک لمبی اور پُروقار عمارت کھڑی تھی۔ میں اسی میوزیم کا پھیلاؤ دیکھ کر حیران ہورہا تھا۔ ہمارے پیچھے سینٹرل پارک تھا۔ پارک کے درخت بغیر پتوں کے اجڑے اور اداس کھڑے تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جس نے سینٹرل پارک نہیں دیکھا اس نے نیویارک نہیں دیکھا۔ مگر میری اپنی نظریں میوزیم پر تھیں۔ ان دونوں کو ابھی تک اندازہ نہ ہوسکا تھا کہ وہ دنیا کے مشہور اور تاریخی عجائب گھر کے باہر کھڑے ہیں۔ مجھے ادھر دیکھتے ہوئے سرجی بولے۔ ''یہ کوئی بڑا ہوٹل لگتا ہے؟''

شہباز نے اب ذرا غور سے دیکھا تو چیخ پڑا۔ ''یہ تو میوزیم ہے۔''

اب سرجی بھی میوزیم کا نام سن کر لرز گئے اور ان کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ سوالیہ نظروں سے پوچھنے لگے۔ ''ہمیں یہ دکھانے تو نہیں لے آئے؟''

میں مجرموں کی طرح خاموش کھڑا تھا اور وہ مجھے گھورے جارہے تھے۔ میں ان سے مخاطب ہوا اور بولا۔ ''آپ دونوں کو معلوم ہے کہ ہم نیویارک کیوں آئے ہیں؟''

شہباز بولا۔ ''مگر ہم صرف میوزیم دیکھنے نہیں آئے۔ اب اصل بات کرو۔''

سرجی کہنے لگے۔ ''ہمیں تو تم نے بتایا تھا کہ یہاں میمیں ایسے لباس میں پھرتی ہیں کہ منہ میں پانی آجاتا ہے اور یہاں آپ ہمیں عجائب گھر لے آئے ہیں۔''

میں نے سرجی کے کندھے پر نرمی اور خوشامدی انداز سے ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''پہلے میری بات مکمل سنو اور پھر جو مرضی ہوگی دوستوں کی میں وہی کروں گا۔''

وہ دونوں خاموشی سے میری بات سننے لگے۔ میں نے کہا۔ ''نیویارک صرف منہٹن ہے اور باقی کچھ نہیں۔ ہم نے اس کو کھنگالنا ہے۔''

شہباز بولا۔ ''وہ بھی ایک دن میں اور سارا دن اسی کے اندر گزر جائے گا۔''

میں نے لہجے میں کچھ بھکاری پن ڈالا اور بولا۔ ''ہم ایک یا دو رات ڈاؤن ٹاؤن میں کسی ہوٹل میں ٹھہریں گے۔''

اور اب میں نے اصل پتا پھینکا اور کہا۔ ''میرے کزن نے آپ دونوں کے لیے ہوٹل کی دو رات کی بکنگ بھی کروالی ہے۔ ہم ٹائم اسکوائر کے علاوہ سینٹرل پارک بھی دیکھیں گے۔ رات کو آپ کو ریڈ ایریا بھی دکھاؤں گا اور میڈیسن اسٹریٹ پر دیسیوں کی ہول سیل کی دکانیں بھی آپ دیکھیں گے۔''

حالانکہ طارق نے ایک رات کی بکنگ کروائی تھی۔ میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نے سوچا کہ اگر دوسری رات رکے تو میں خود ادائیگی کردوں گا۔ مفت کے ہوٹل پر ان دونوں کے چہرے کا تناؤ کم ہوا مگر شہباز نے کہا۔ ''پیٹ بھی تو بھرنا ہے۔ کھانا کہاں سے کھائیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''اس کا انتظام بھی ہوجائے گا۔ یہاں حلال کھانا بھی مل جاتا ہے اور سستا ملتا ہے۔''

سرجی بولے۔ ''سستا کیسے ملے گا؟ یہاں کیا کوئی چوکوں پر ٹھیلے لگے ہوتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں حلال کھانوں کے ٹھیلے بھی چوکوں میں لگے ہوتے ہیں اور آپ لوگوں کو لاہور یاد آجائے گا۔''

وہ مجھے بے یقینی سے دیکھنے لگے۔ مجھے طارق بتا چکا تھا کہ ڈاؤن ٹاؤن میں پاکستانی ریڑھیوں پر بہترین کھانا لگاتے ہیں۔ گرم نان، تکے اور کباب بہت سستے ریٹ پر مل جاتے ہیں۔

شہباز اب مجھے بلیک میل کر رہا تھا بولا۔ ''کھانا بھی تمہارے ذمے ہوگا۔'' میں نے ہامی بھرلی۔

سرجی بولے۔ ''اور وہ میمیں؟''

میں نے کہا۔ ''وہ سب کا اپنا اپنا نصیب۔''

اس طرح وہ رام ہوئے۔

سرجی بولے۔ ''جلدی کریں۔ رات تھوڑی اور سوا نگ بہت ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب تو سمجھائیں۔'' تو بولے:

''آپ لوگوں نے سارا وقت انگریزی سیکھنے میں لگا دیا اسی لیے اردو کا ایک لفظ بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آتا۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وقت کم ہے اور جگہیں بہت دیکھنی ہیں۔ جلدی کریں۔''

اب وہ میرے رحم و کرم پر تھے لیکن میں نے ان کو پھر منہٹن کے وہ رنگ دکھائے کہ اب بھی یہی کہتے ہیں کہ جو مزہ اس وقت گھومنے کا آیا تھا، پھر کبھی نہیں آیا۔

ہم چلتے ہوئے میوزیم کے مین گیٹ کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ ہم اس کی ساخت، رعب و دبدبہ دیکھ کر مرعوب ہوگئے۔ اتنی بڑی اور شاندار عمارت اور اس کی بناوٹ دیکھ کر ہم حیرت زدہ کھڑے تھے۔ وکٹورین گوتھک ڈیزائن پر بنی یہ عمارت 1874ء میں تعمیر ہوئی جب ہم اپنی جنگ آزادی ہار کر مکمل غلامی میں آچکے تھے۔ اس وقت ہماری جدید ایجاد پہیا تھی۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے قلعے اور تاج محل تو تھے مگر عجائب گھر اور تعلیمی ادارے ناپید تھے۔ جن دنوں تاج محل بن رہا تھا، انہی دنوں بریڈفورڈ یونیورسٹی بن کر تیار ہوگئی تھی۔ اب بھی اگر ہم اپنے پیارے ملک پاکستان میں دیکھیں تو اس وقت موجود سارے میوزیم انگریزوں نے بنائے تھے۔ بات بڑھ کر کہیں اور نہ نکل جائے، اسی لیے میں واپس نیویارک آپ لوگوں کو لے آتا ہوں۔

اس شاندار عمارت کو دیکھ کر اب مجھے یقین ہو رہا تھا کہ واقعی یہ دنیا کا سب سے بڑا ہسٹری میوزیم ہے۔ ویسے تو شکاگو کا فیلڈ ہسٹری میوزیم میں کئی بار دیکھ چکا ہوں مگر جو بات نیو یارک کے میوزیم کی ہے، وہ کسی اور ہسٹری میوزیم کی نہیں ہو سکتی۔ مجھے پیرس کے ڈی لورے میوزیم نے اس سے زیادہ متاثر کیا مگر وہ آرٹ کے شہ پاروں سے بھرا پڑا ہے۔

سولہ لاکھ مربع فٹ پر محیط نیویارک کے ہسٹری میوزیم کی یہ وسیع و عریض عمارت اپنی بناوٹ میں اتنی شاندار دکھتی ہے کہ دل چاہتا ہے کہ اس کے سامنے بیٹھ کر اس کو دیکھتے رہیں۔ مین گیٹ پر گھوڑے پر سوار مجسمہ امریکی صدر روز ویلٹ کا ہے جو خود قدرت کی نیرنگیوں کا شوق رکھتا تھا۔ مجھے آج ایک فلم یاد آرہی ہے جس کا نام ''نائٹ ان میوزیم'' ہے۔ ایک سیکیورٹی گارڈ رات کو اس میوزیم کی چوکیداری پر آتا ہے اور رات کے آخری پہر اس میوزیم کے سب کردار زندہ ہو جاتے ہیں۔ سب جانور اور پرانی تہذیبوں کے کردار گھوڑے دوڑاتے اس کے برآمدوں میں بھاگے پھرتے ہیں۔ ڈائنو سارز زندہ ہوجاتے ہیں اور تو اور روز ویلٹ بھی گھوڑے سے اتر کر گارڈ سے محو گفتگو ہوجاتا ہے۔ صبح نکلنے سے پہلے وہ سب دوبارہ شوکیسوں میں سج جاتے ہیں اور سب کچھ پہلے جیسا ہوجاتا ہے۔

سرجی اور شہباز بھی میری طرح حیرت سے اس کی بیرونی بناوٹ کو دیکھ رہے تھے۔ پتھروں سے بنی اس عمارت کے اونچے اونچے برج اور ان میں سے باہر نکلتی بالکونیاں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی تھیں۔ محرابیں اور کشادہ سیڑھیاں اور لمبی کھڑکیوں نے ہمیں مسحور کردیا تھا۔ بہت سے لوگ سیڑھیوں پر بیٹھے تھے کچھ سگریٹ پی رہے تھے۔ کچھ نے کتابیں کھولی ہوئی تھیں اور اس میں غرق تھے۔ کچھ ایسے ہی بیٹھے دھوپ سینکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب دنیا و مافیہا سے بے خبر مطمئن اور خوش بیٹھے تھے۔ سرجی کہیں بھی خاموش نہ رہ سکتے تھے۔ سیڑھیوں پر بیٹھے ان بے فکروں کو دیکھ کر مجھ سے پوچھا۔ ''یہ لوگ عجائب گھر دیکھ آئے ہیں یا ابھی اندر جائیں گے؟''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

میں نے کہا۔ ''معلوم نہیں، پر لگتا ہے کہ دیکھ آئے ہیں ورنہ اتنے آرام سے نہ بیٹھے ہوتے۔''

سرجی انہیں طنزیہ انداز سے دیکھ کر بولے۔ ''آسودہ تو ایسے بیٹھے ہیں جیسے زعفران کے کھیت دیکھ آئے ہوں۔''

شہباز ہمیں ہنکار کر یہ کہتے ہوئے اندر لے گیا۔ ''جگہ اچھی لگتی ہے، دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

ہم لابی میں داخل ہوئے تو اس میں ڈائنو سارز کے زمین سے لے کر بلند چھت کو چھوتے پنجر کھڑے تھے۔ ارد گرد کاؤنٹر پر مستعد عملہ کھڑا ہر ایک سے خوشگواری سے پیش آرہا تھا۔ ایک کاؤنٹر پر بروشر اور میوزیم کے نقشے بنائے جا رہے تھے۔ میں نے پہلے وہ پکڑے۔ سرجی شہباز سے پوچھ رہے تھے۔ ''یہ ڈائنو سارز انڈے دیتے تھے یا بچے؟''

شہباز نے ان کی انجینئرنگ کو گالیاں دیں اور کہا۔ ''تمہارے سائز سے بھی دوگنا بڑے انڈے دیتے تھے۔''

سرجی بولے۔ ''یہی کہو نا کہ تمہارے اپنے سائز جتنے بڑے انڈے دیتے تھے۔ بات کو گھما کیوں رہے ہو؟'' یہ کہہ کر سرجی کسی سوچ میں ڈوب گئے اور جب باہر نکلے تو بولے۔ ''ان کے ایک انڈے کا کتنا بڑا آملیٹ بنتا ہوگا؟''

شہباز بولا۔ ''ڈائنو سارز کا انڈا حرام ہوتا ہے۔''

سرجی کہاں ماننے والے تھے۔ طنزیہ انداز میں کہنے لگے۔ ''حرام کیسے ہوگئے؟ اس وقت تو اسلامی نظام بھی نہیں آیا تھا۔''

میں نے دیکھا کہ اگر اسی طرح وقت ضائع ہوتا رہا تو ہم یہ میوزیم ایک دن میں آدھا بھی نہیں دیکھ سکیں گے۔

میں نے انہیں وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ اپنے بیک پیک سے ڈائری اور پین نکالا اور چھتوں پر لگے منقش شیشوں سے آتی سورج کی روشنی کو ایک نظر دیکھ کر پھر نقشے کو دیکھا اور اندر داخل ہوگیا۔

اس میوزیم کے پینتالیس نمائشی بڑے بڑے ہال ہیں۔ ان کے پاس تین کروڑ سے زیادہ چیزیں ہیں جن کی نمائش کی جاتی ہے۔ ایک وقت میں بیس لاکھ چیزیں نمائش کے لیے رکھی جاسکتی ہیں۔ کچھ دنوں بعد ایک کی جگہ دوسری اقسام لے لیتی ہیں۔ اتنی بڑی عمارت میں اتنی جگہ نہیں ہے جس میں تمام اقسام ایک ساتھ رکھی جاسکیں اور بیس لاکھ میں سے آپ دو ہزار چیزیں بھی ایک دن میں دیکھ لیں تو بہت بڑی بات ہے۔ دیکھ دیکھ کر انسان تھک جاتا ہے۔ کم از کم دو مکمل دن آپ کو چاہئیں، اس میوزیم سے کچھ آگاہی حاصل کرنے کو۔

ایک جانب تتلیوں کی نمائش لگی تھی۔ ہم اسے چھوڑ کر سامنے ایک نیم تاریک ہال میں داخل ہوئے۔

اس نیم تاریک ہال میں ہم جیسے ہی داخل ہوئے تو بیچ میں لکڑی کے ایک بڑے پلیٹ فارم پر آٹھ افریقن ہاتھی تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا۔ جیسے کسی جنگل کو مسمار کرنے جا رہے ہوں۔ آنکھوں میں غصہ، سونڈیں تنی ہوئیں اور کان کسی کے کھلے اور کسی کے لپٹے ہوئے تھے۔ محسوس بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ اصلی ہیں یا نقلی۔ ہم ان کے قدموں میں بونے لگ رہے تھے۔ سرجی گھگھیا کر بولے۔ ''قسم سے پورا جسم لرز رہا ہے۔''

ہلکی ہلکی روشنی تھی اور وہ بھی ان شوکیسوں سے باہر آتی ہوئی جو ہال کے دونوں جانب تھے۔ ان میں افریقا کے جانوروں کو ان کے قدرتی ماحول میں دکھایا گیا تھا۔ روشنیوں کے صوتی اثرات نے ایک قدرتی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ ہم ایک لمحے میں نیویارک سے کسی ٹائم مشین کے ذریعے افریقا کے جنگلات اور وسیع صحراؤں میں جانوروں کے بیچ آگئے تھے۔ صحراؤں اور جنگلات میں جنگلی حیات کو اپنے قدرتی ماحول میں اس اچھے انداز میں دکھایا گیا تھا کہ انسان دیکھتے ہی خود کو وہیں محسوس کرنے لگے۔

ایک لق و دق بیاباں میں شیروں کا ایک غول کھڑا ہے۔ ایک نر اور باقی مادہ تھے۔ بہت سے شیروں کے بچے ارد گرد گھومتے نظر آ رہے تھے۔ سرجی بولے۔ ''شیر کی زندگی ہر انسان کو جینی چاہیے۔''

شہباز نے پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

وہ بولے۔ ''ایک مرد ہے اور کتنی بیویاں اور بچے ہیں۔'' پھر رشک کرتے ہوئے بولے۔ ''شکار بھی شیر کی بیویاں کرتی ہیں، خود تو پورا دن مکھیاں اڑاتا رہتا ہے۔''

میں نے دیوار پر معلوماتی تحریر پڑھتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے تو پندرہ سال ہی زندہ رہ سکتا ہے اور آخری عمر میں تو مکھی بھی نہیں اڑا سکتا۔''

یہ سن کر شہباز کی طرف بغور دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اسی لیے تو کہتے ہیں کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

اس بات پر شہباز کو جھگڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر وہ اس لیے پھٹ پڑا کہ گیدڑ کہتے وقت سرجی اسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

پھر کہیں دکھایا گیا تھا کہ کلی منجارو پہاڑ کے پس منظر میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کئی گینڈے کھڑے ہیں۔ بارش ہورہی ہے اور ہوائیں بھی چلتی دکھائی دیتیں ہیں۔ صوتی اثرات سے پانی ٹپکنے کی اور ہواؤں کے چلنے کی آوازیں ہم بھی سن رہے تھے۔ روشنیوں کی امتزاج سے شام کا منظر اور دھواں دھار ماحول دکھایا گیا تھا اور ہم حیرت سے کلی منجارو کے سائے میں خود کو کھڑا محسوس کررہے تھے۔ لیبیا کا صحرا تھا جہاں بگولے اٹھ رہے تھے۔ کہیں سرسبز و شاداب جنگلوں میں گوریلے کھڑے تھے۔ سر جی نے پھر شرارت کی اور شہباز سے پوچھا۔ ''یہ گوریلے جنگلوں میں کیوں رہتے ہیں؟''

شہباز انہیں گھور کر بولا۔ ''تو کیا ہمارے ساتھ آرہیں؟''

اپنی نظریں اب انہوں نے شوکیس میں کھڑے گوریلے پر رکھیں اور منہ پھیر کر دبے لفظوں میں بولے۔ ''ہم بھی تو اکٹھے رہ رہے ہیں، میں نے تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔''

میں نے شہباز کو اشارہ کیا کہ وہ کچھ نہ کہے اور خاموش رہے۔ وہ خاموش رہا تو سر جی اب حیران کھڑے تھے کہ جواب کیوں نہیں آیا۔ انہوں نے متعدد بار شہباز کو دیکھتے ہوئے گوریلا گوریلا کہا پھر بھی جواب نہ آیا تو حیران ہوکر مجھے دیکھنے لگے۔ میں خود بھی خاموش تھا اس لیے وہ بلند آواز میں نیچے لگے پلیٹ پر لکھی تحریر پڑھتے ہوئے بولے۔ ''یہ آٹھ فٹ لمبا ہوتا ہے، چار سو پاؤنڈ وزنی ہوتا ہے، پانی نہیں پیتا بلکہ پتوں اور پھلوں سے پانی حاصل کرلیتا ہے۔''

شہباز تلملا کر بولا۔ ''ذرا نیچے دیکھو، یہ بھی لکھا ہے کہ گوریلے کا پوتا دودھ میں جلیبیاں بھی ڈال کر کھاتا ہے۔''

یہ سن کر تو انہوں نے اس بات کی بنیاد بنا کر فساد شروع کردیا کہ میرے دادا کو شہباز نے گوریلا کہا ہے۔

بمشکل انہیں خاموش کرا کر آگے بڑھا۔ مختلف شوکیسوں میں شتر مرغ، زیبرے، ہرن، بارہ سنگھے اور دوسرے افریقی جانور اپنے قدرتی ماحول میں اس خوبصورتی سے دکھائے گئے تھے کہ ہم انگشت بدنداں رہ گئے۔

یہ جانور افریقا سے لائے گئے تھے اور پھر انہیں اسٹف کیا گیا تھا۔ یہاں تک تو بات ٹھیک تھی مگر پھر جس ماحول اور آب وہوا میں یہ رہتے تھے اور اردگرد کا جو منظر تھا، اسے دیکھنے کے لیے سائنسدان، فوٹوگرافر اور آرٹسٹ افریقا بھیجے گئے۔ انہوں نے ریسرچ کی۔ پورے سال کی موسمی تبدیلیوں کو پرکھا گیا اور اسی مناسبت سے ایک مصنوعی منظر کشی تخلیق کرکے ان جانوروں کو اپنی معمولات میں دکھایا گیا اور یہی اس کا حسن تھا۔

وکٹوریہ جھیل کے مشرق میں تنزانیہ کے جنگلات میں پائے جانے والے جانور اپنے قدرتی ماحول میں ہر ایک کو اپنی جانب دیکھنے پر مجبور کررہے تھے۔ سیاحوں کا رش تھا۔ ہر کوئی تصویریں بنا رہا تھا۔ بچے کیا، بڑے بھی خوش ہورہے تھے۔ کرۂ ارض کے مختلف حصوں کو جس خوب صورتی سے یہاں دکھایا گیا تھا اس سے کسی کو بھی اس علاقے کی بنیادی معلومات فراہم ہوجاتی ہیں۔

رین فارسٹ کے گھنے اور سرسبز و شاداب جنگلات کا نقشہ اور منظر ایسی ذہانت اور کاریگری سے بنایا گیا کہ ہم اپنے آپ کو وہیں محسوس کررہے تھے۔ کینیا کا جنگلات اور ان میں شیروں کا اپنے فطری ماحول میں نظر آنا ہم سب کے لیے دل چسپی کا باعث تھا۔

ایک ایسا منظر آیا کہ میں اس میں الجھ گیا۔ میں ایک نیلگوں جھیل کے کنارے کھڑا تھا۔ شام کے رنگ اتر رہے تھے مگر جھیل کی نیلاہٹ آسمان میں بھی گھل گئی تھی اور اس نیلگوں منظر میں آسمان تلے پرواز کرتے پرندے اور مہیب خاموشی اور دل میں بیٹھتی تنہائی، گو میرے اردگرد شور شرابہ تھا مگر میں خود کو جھیل کنارے تنہا کھڑا محسوس کررہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں بھی ان پرندوں کے ہمراہ فضا میں پرواز کررہا ہوں۔ یہ منظر میرے لیے کوئی انعام تھا۔ میں ایسے منظروں کا شیدائی رہا ہوں، جو لوگ میری فوٹوگرافی دیکھتے ہیں وہ بہتر جان سکتے ہیں کہ میری کھینچی ہر تصویر عام طور پر فطری مناظر اور تنہائی میں گھری ہوتی ہے۔ گو میں کیمرے کے پیچھے ہوتا ہوں مگر جب اس تصویر کو بعد میں دیکھتا ہوں تو اس منظر میں میرے علاوہ کوئی نہیں ہوتا۔ میں بھی آج اسی منظر میں کھو گیا تھا کہ اتنے میں سر جی میری جانب آکر بولے۔ ''لگتا ہے، جھیل میں مچھلیاں پکڑنے کا پروگرام بنا رہے ہیں؟''

سر جی کی مداخلت نے تصور کا تیا پانچہ کردیا۔

وہاں سے نکلے تو ایک اور بڑے ہال میں آگئے۔ یہاں افریقا کے لوگوں کی تہذیب، قدیم مصر سے لے کر آج کے دور تک کی دکھائی گئی تھی۔ ان کی تہذیب، طرز رہائش اور اُن روایتوں کو عمدہ طریقے سے منظر کشی کی گئی تھی۔ یہ تہذیب اب ختم ہوگئی ہیں یا بمشکل نظر آتی ہیں۔

ان مناظر سے سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ چار قسم کے ماحول میں رہتے تھے۔ سرسبز چراہگاہوں کے آس پاس، صحراؤں میں یا جنگلوں میں اور پھر دریاؤں کے کنارے ان کی بستیاں ہوتی

تھیں۔ اس ماحول میں ان کی رسم ورواج، رہائش اور خوراک کی عکاسی میں حقیقت پسندی کے ساتھ کی گئی تھی۔ ان کی مذہبی، سیاسی، معاشی اور گھریلو زندگی کو دکھایا گیا تھا۔ کھیتی باڑی، شکار اور جنگوں میں استعمال ہونے والے ہتھیار رکھے تھے ساتھ ہی استعمال کے جوتے پڑے تھے۔ ان کی موسیقی کے آلات سجائے گئے تھے جن میں ڈرم، دف اور منہ سے بجانے والے مختلف آلات تھے۔ ان کی بستیاں، جھونپڑے، جانور، کھانا بناتی عورتیں، کھیتوں میں کام کرتے مرد نظر آرہے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سب اپنے کام پر آرہے تھے اور ہمیں قریب پاکر وہیں ساکت ہوگئے ہوں۔

ایک چیز نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ یہ کہ بعد میں جس تہذیب یا علاقے کو میں نے دیکھا تو سب میں مشترک چیز بیلوں کے پیچھے ہل جوڑ کر کھیتی باڑی کرنا تھا۔ وہ ہزاروں سال پہلے کی تہذیب دکھا رہے تھے جب آمدورفت کے ذرائع نہ ہونے کے برابر تھے۔ ایشیا ہو کہ افریقا ہر جگہ کھیتی باڑی کا یہی طریقہ تھا۔ ہمارے علاقوں میں اب تک کچھ مقامات پر بیلوں کے پیچھے ہل باندھ کر زمین بنائی جاتی ہے۔ میرے بچپن میں تو یہ طریقہ عام تھا اور میں نے کئی بار اسے دیکھا۔ میں اس دن نیویارک کے میوزیم میں کھڑا حیران تھا کہ میں نے ہزاروں سالہ پرانی تہذیب کو جیتے جاگتے اپنے سامنے دیکھا ہے۔ لوگ ہمارے علاقے ڈیرہ اسماعیل خان میں ویسے ہی رہتے تھے جیسے ہزاروں سال پہلے کے لوگ رہا کرتے تھے۔ اپنے اوزار ویسے ہی بنتے میں نے دیکھا جیسے ہزاروں سال پہلے بنتے تھے۔ فصل کی کٹائی ویسے ہی میں نے دیکھ رکھی تھی جیسے قدیم دور میں ہوا کرتی تھی۔ گھر اور بستیاں وہی ہیں جیسے ماضی میں ہوتی تھیں۔ میں یہ کیوں سوچوں کہ ہزار سال پہلے کے لوگ کیسے زندگی گزارتے ہوں گے؟ کیونکہ میں اس زندہ تہذیب کو اپنی آنکھوں سے بیسویں صدی میں دیکھ چکا ہوں۔ صرف فرق یہ تھا کہ اس دور میں تلواریں، ڈھالیں، تیر کمان استعمال ہوتے تھے اور اب بات پسٹل تک آپہنچی ہے۔ دوسرا قدیم دور کے زیورات آج سے مختلف تھے۔ ان دنوں وہ لوگ شغل یا مذہبی رسومات کے لیے چہرے پر ماسک چڑھایا کرتے تھے۔ وہاں ڈراؤنے اور ہنسنے والے تاثرات کے کئی ماسک رکھے تھے۔ قدیم مصر کے آثار، زوگی اور کانگو کے جنگلوں کی قدیم تہذیب کو نہایت ہی خوب صورتی سے دکھایا گیا تھا۔ جانوروں کے سینگ، مورتیاں، پتھروں کے ہار رکھے تھے۔ کئی جگہوں پر ان کا روایتی ڈانس دکھلایا گیا تھا۔ ایک بھول بھلیاں تھیں جہاں ہم دوسرے لوگوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ شکر یہ تھا کہ میرے ساتھی بھی ابھی تک دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور ان میں کوئی بحث نہ ہوئی تھی۔

میں ایک راہداری سے مڑا اور وہیں الحمد للہ کہہ کر رک گیا کیونکہ وہاں لکھا تھا۔ ''پاور آف اسلام۔'' ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی افریقا آمد کی تمثیل تھی۔ جنگل و بیاباں میں مسلمان خانہ بدوشوں کا قافلہ تھا۔ جھونپڑے تھے اور باہر قہوہ بناتی ایک عورت تھی، سجدے کی حالت میں اپنے رب کے حضور ایک مومن تھا۔ ہتھیار اٹھائے پہرہ دیتا ایک جری تھا۔ لکڑی پر عربی میں لکھے کچھ الفاظ تھے۔ میری تصور چشم مجھے اس دور میں لے گئی جب اسلام حجاز سے پھیل کر یمن، شام اور پھر مصر سے ہوتا ہوا افریقا میں داخل ہوا تھا۔

عرب بدوں کے خیمے کا اندرونی منظر مجھے کسی اور دور اور وقتوں میں پیچھے لے آیا۔ باہر اونٹ بندھے ہیں۔ زمین پر دریاں اور چمڑے کے تکیے رکھے ہیں، قہوہ کے برتن ہیں اور ساتھ بانسری کی مدھر آواز آرہی ہے۔ ہم کسی بھی تہذیب کے حصے میں آئے تو ہمیں وہاں کی موسیقی سنائی دیتی تھی۔ دمشق کے پرانے بازاروں میں ریڑھے، ٹھیلے، گدھا گاڑیاں اور آتے جاتے لوگ۔ بازاروں اور محلوں کے مناظر اور گھروں کے باہر بندھی سواریاں۔ اس کے علاوہ چوکوں میں بیٹھے فقیر اور پاس سے گزرتے مرد وزن۔ سلطنت اومان کی منظر کشی، قرآن پاک کے قدیم نسخے، خانہ کعبہ کے صدیوں پہلے کے مناظر مجھے اپنوں میں لے آئے۔ میں دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میں اکیسویں صدی میں موجود نہ تھا۔ میں اپنے آپ کو صدیوں پہلے کی اسلامی تاریخ میں گھومتا پھرتا محسوس کررہا تھا۔ میرے سامنے سب مناظر آرہے تھے کہ جیسے میں ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے اسلامی ماحول میں جی رہا ہوں۔ تبھی سر جی کے دل میں پتا نہیں کیا آیا وہ بلند آواز میں بولے۔ اگر انہیں دیکھ دیکھ کر تھک گئے ہیں تو آگے بڑھیں۔ ان کی آواز مجھے گردن سے پکڑ کر دوبارہ نیویارک میں کھینچ لائی اور میں جھنجلا اٹھا۔

اس کے بعد ہم اس حصے میں آئے جہاں ایشیا کا بسنے والوں کا تہذیب وتمدن دکھایا گیا تھا۔ اس میں چائنا، سینٹرل ایشیا، برصغیر، تبت، سائبریا، روس کے علاوہ وادی سندھ کی تہذیب دکھائی گئی تھی۔ سینٹرل ایشیا کی تہذیب میں وہی برتن میں نے دیکھے جو پچھلے سال شمشال کے ایک بوسیدہ میوزیم

URDUSOFTBOOKS.COM
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

میں دیکھ آیا تھا۔ شمشال کے نوادرات جو مٹی میں اٹے پڑے تھے، وہ یہاں قیمتی شوکیسوں میں بند تھے۔ شمشال میں تو تارڑ صاحب موسیقی کے آلات کو بجانے کی کوشش کرتے تھے اور یہاں چھونے کی اجازت نہ تھی۔ جو چیزیں ہنزہ کے بلتت فورٹ میں دیکھیں وہ یہاں چین اور سینٹرل ایشیا کی تہذیب میں شامل تھیں۔ ہندوستان کی پرانی بستیوں کے مناظر، مغل دور کے حالات، وادی سندھ میں سندھ کنارے بستے مچھیروں کی کشتیاں اور دریا کے خوبصورت مناظر بود و باش اور آلات جراحی و اصولِ طب مجھے پاکستان میں اپنے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کھینچ لائے۔

مغرب میں اصولِ طب نے بہت بعد میں ترقی کی لیکن برصغیر و چائنا اور خطۂ عرب میں اصولِ طب کئی سو سال پہلے بھی عروج پر تھا۔ ہر بیماری کا علاج دریافت ہو چکا تھا۔

طب کا جب بھی ذکر ہوتا مجھے کراچی کے ڈاکٹر عزیز اللہ یاد آ جاتے ہیں۔ بڑے قابل ڈاکٹر تھے۔ یہ شاید اسّی کی دہائی کا ذکر۔ ڈاکٹر صاحب اسپتال میں گئے تھے۔ غم و الم میں الجھے ڈرائنگ روم میں سر پکڑے بیٹھے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ایک شخص فون اٹھانے بڑھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اسے روک دیا اور خود اٹھ کر فون تک گئے۔ ریسیور اٹھا کر دوسری جانب کی آواز سننے لگے پھر بولے۔ ''فکر نہ کریں، میں آدھے گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔'' پھر انہوں نے گاڑی نکالی اور اسپتال پہنچ گئے۔ ایکسیڈنٹ کا کیس تھا۔ مریض کے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر عزیز پر جملے کسنا شروع کر دیے کہ حکومت نے لوگوں کی جان بچانے کے لیے نوکری دی ہے لیکن یہ ڈاکٹرز تنخواہ حکومت سے لیتے ہیں اور پریکٹس کلینکوں پر کرتے ہیں۔ مریض مر رہا ہے لیکن انہیں پروا نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اچٹتی نظر ان لوگوں پر ڈالی اور آپریشن روم میں داخل ہو گئے۔ کافی دیر آپریشن میں گزر گیا۔ جب باہر آئے تو مطمئن نظر آ رہے تھے۔ باہر جمع بھیڑ کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''فکر نہ کریں مریض خطرے سے باہر ہے۔''

ڈاکٹر صاحب اپنی کار پر واپس جا چکے تھے لیکن تبصرہ کرنے والے لفظوں، طعنوں کی شکل میں اپنا غصہ نکال رہے تھے۔ تب ایک نرس ان کے پاس آئی اور بولی۔ ''آپ نے ڈاکٹر صاحب کو جتنی گالیاں دینی تھی دے لیں۔ اب میں ایک خبر آپ کو دینا چاہتی ہوں۔ آج ڈاکٹر صاحب کا اکلوتا بیٹا روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا ہے۔ ظہر کے بعد نماز جنازہ تھی لیکن آپ کا کیس آ جانے پر انہوں نے وقت تبدیل کر دیا۔ اب مغرب کے وقت جنازہ پڑھایا جائے گا۔ انہیں بیٹے کے آخری رسوم ادا کرنے تھے لیکن مریض کا سن کر وہ اسپتال چلے آئے۔''

تمام لوگ خاموش ہو گئے۔ نرس نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب جیسا جگر آپ میں سے کسی کے پاس ہے تو ان کو گالیاں دینے کا اسے حق ہے۔'' اس وقت مجھ سمیت تقریباً بیس افراد وہاں تھے لیکن ایسی خاموشی چھا گئی تھی کہ بتا نہیں سکتا۔ پہلے ہمارے ہاں طبیب کا رویہ یہی تھا۔ وہ اپنے غم کو چھپا کر مریضوں کو زندگی دینا فرض سمجھتے تھے۔ میں ڈاکٹر عزیز اللہ کو یاد کرتا ہوا۔ آگے بڑھ گیا۔

مجھے اصفہان شہر کا منظر اور اسکندریہ کی تہذیب کے منظر بہت اچھے لگے۔ چھ سو سال پہلے پیکنگ شہر کا مناظر اور نقشہ بہت ہی معلوماتی تھا، صحرائے گوبی کے مناظر دیکھنے کے قابل تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ میں ان مقامات کی سیر کر رہا ہوں۔ ان کے آلات، اوزاروں، رہن سہن میں یکسانیت تھی۔

سینٹرل اور جنوبی امریکا کی تہذیبوں میں مماثلت تھی۔ امریکا کے ریڈ انڈین اور جنوبی امریکا کی تہذیب میں کچھ زیادہ فرق نہ تھا۔ جنوبی امریکا کے بھاری بھرکم پرندوں کو سب حیرت اور خوشی سے دیکھ رہے تھے۔ یورپ میں داخل ہوئے تو آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ حسین جھیلیں، جنگلات، رنگین پرندے، کوہ الپس کے خوبصورت برفانی مناظر، بہتے چشمے، جھرنے، آبشاریں، میٹر ہارن کی برفانی چوٹی، جس کی مشابہت مشہور پاکستانی مشاہرم سے ملتی ہے، اسکاٹ لینڈ کا ہائی لینڈ ایریا اور ہر سو پھیلا سبزہ۔ میں یہ سب دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ آج میں نے گیارہ ڈالر میں پوری دنیا گھوم لی۔

ایمیزون کی تہذیب دیکھیں تو ننگ دھڑنگ عورتیں اور مرد کھیتوں میں کام کرتے نظر آ رہے تھے۔ ہر جگہ پروجیکٹر لگے تھے جہاں ان تہذیبوں کی فلمیں چل رہی تھیں۔ آپ کو ہر طرح کی معلومات دے رہے تھے کہ آپ تشنہ نہ رہ جائیں۔ کبھی ہم تھکتے تو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھ کر فلمیں دیکھنے لگتے۔ ہم کبھی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کے فلور پر آتے اور کبھی نیچے اتر آتے۔ ایک ہال میں گئے تو بیالوجی کے ہر نظام کو تفصیل سے بتایا جا رہا تھا۔ یہ میوزیم نہ تھا بلکہ ایک یونیورسٹی تھی، جہاں لیکچر روم تھے۔ IMAX تھیٹر تھے جہاں ہر چیز کے شو ہوتے رہتے ہیں۔ کہیں نظام فلکی پر کوئی فلم چل رہی ہے اور کہیں زمینی اور آسمانی حقیقتوں کو دکھایا جا رہا ہے۔ کائنات کے ایک ایک نظام کو ہر طرح سے دکھایا جا رہا

تھا۔ میں نے یہ شو اپنے بعد کے دنوں میں دیکھ لیے تھے۔ میں ایک ایک چیز کو بیان کروں تو پڑھنے والے اکتا جائیں گے اس لیے چیدہ چیدہ چیزیں لکھ رہا ہوں۔ آپ خود سوچیں کہ پینتالیس ہال ہیں اور ہر ہال میں کم از کم ایک گھنٹا لگتا ہے اور دن میں آٹھ گھنٹوں کے لیے یہ میوزیم کھلتا ہے، تو اسے دیکھنے کے لیے چھ دن درکار ہیں۔

مجھے ڈارون کے سیکشن میں بہت معلومات ملیں اور شاید دنیا کے کسی میوزیم میں اس سلیقے یا طریقے سے نہ دکھایا گیا ہو جس طرح یہاں بتلایا گیا تھا۔ انسانی زندگی کے ارتقا کے عمل کو بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ بندر نما انسانوں سے آج کے مکمل انسان تک پہنچنے کی تکمیل تک ہر مراحل کو دکھایا گیا ہے۔ پرانے زمانے کا انسان جب کے جانوروں کی طرح غاروں میں رہتا تھا سے لے کر آج کے انسان کے رہن سہن، اٹھنا بیٹھا، اشکال، کھانا پینا سب ایک تفصیل سے دکھایا گیا تھا۔

ان غاروں کا ماحول بھی دیکھا جب انسان جانوروں سے چھپ کر رہتا تھا۔ پرانے زمانے کے انسان کی ہڈیاں، اعضا اور کھوپڑیاں بھی رکھیں تھیں۔ پھر انسان نے ترقی کی۔ آگ جلالی، ہتھیار بنالیے، زراعت سیکھ لی اور دریاؤں کے کنارے ایک دوسرے سے مل کر بستیاں بنالیں۔ جانوروں کے حملوں پر ان کا مقابلہ اپنے بنائے گئے ہتھیاروں سے کرنے لگا۔ اپنی خوراک زمین سے بھی حاصل کرنے لگا۔ پھر ایک تہذیب و تمدن میں رہنا سیکھ گیا۔ وہ غور و فکر کرنے لگا، سوچنے لگا اور ترقی کرتا چلا گیا۔

بات انسان کے اپنے ارتقا کی ہوتی تو ذہن مان بھی لیتا۔ میں کوئی بیالوجسٹ یا انتھراپالوجسٹ نہیں کہ اپنا کوئی نظریہ پیش کرسکوں۔ ڈارون کہتا ہے کہ اربوں سال پہلے پانیوں کے اوپر ایک کائی پیدا ہوئی۔ کروڑوں سال پہلے اس کائی سے ایک قسم کا جرثومہ پیدا ہوا اور اسی سے مختلف جرثومے والی زندگی کا آغاز ہوا۔ پھر اس زندگی نے اپنے ماحول میں علیحدہ علیحدہ مختلف شکلیں اختیار کیں۔ اسی سے سب نباتات حیوانات پیدا ہوئے۔ ان سب کو مختلف ماحول ملا اور مختلف شکلیں اختیار کرنے لگے۔ ڈارون کا کہنا ہے کہ وہ بندر سے آج کے مہذب انسان تک ایک ارتقائی عمل سے تبدیل ہوتا گیا۔ اس نظریے کو جھٹلایا بھی گیا اور مادہ پرستوں نے پذیرائی بھی دی۔ جو ایک خالق کے وجود سے انکاری تھے ان کے لیے ایک جواز مہیا ہوگیا کہ کوئی رب نہیں (نعوذ باللہ)۔ ڈارون کے پاس اپنے نظریے کا کوئی ثبوت نہیں۔ بس اس نے پانچ سال تک جنوبی امریکا سے افریقا اور آسٹریلیا کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات کو نظریے میں تبدیل کر کے ہمیں دے دیا۔ اگر میں اس کے نظریے کی مخالفت میں اس کے مخالف نظریے دینا شروع کردوں تو اپنے سفرنامے سے ہٹ جاؤں گا۔ میں نے ڈارون کو پڑھا اور اس کی مخالفت میں بھی بہت کچھ سنا اور پڑھا۔ ڈارون کہتا ہے کہ جب کوئی جاندار اپنی بقا برقرار نہیں رکھ سکتا تو وہ دوسری شکل اختیار کرلیتا ہے مگر کوئی قابل قبول مثال نہ دے سکا۔

میری طرح سر جی بھی ڈارون کی مخالفت میں اڑ گئے اور کہنے لگے۔ ”اگر انسان بندر سے اس مقام تک پہنچا ہے اور باقی بندر جو آج موجود ہیں تو وہ کیوں نہیں بدلے؟“

”ان کے بقول امیر بندر انسان بن گئے اور غریب بندر تو بندر ہی رہے؟ کچھ نے بولنا سیکھ لیا اور باقیوں کو نہیں سکھایا؟“ شہباز نے کہا۔ ”یہ سب سیاپا ڈارون کا مچایا ہوا ہے۔ خود کی شکل بندر جیسی تھی تو سب کو بندر کی اولاد بنادیا۔“

سر جی نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ بندر پہلے انسان تھے اور پھر اپنے اعمال کی وجہ سے بندر بن گئے ہوں؟“ پھر شہباز کو دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔ ”میری تو ہر بات سب کو بری لگتی ہے مگر کچھ کہے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔“

مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ شرارت کرنے والے ہیں اسی لیے میں اصرار کرنے لگا۔ ”نہیں آج کچھ کہہ دیں۔ ہم نے پہلے کبھی برا منایا ہے۔“

تو وہ بولے۔ ”شہباز کے اعمال اتنے خراب نہ تھے، اسی لیے بنتے بنتے رہ گیا۔“

میں سمجھا کہ ابھی فساد شروع ہوگا مگر شہباز خلاف توقع ہنس پڑا۔

اس کے بعد ہم سمندری مخلوق دیکھنے فرسٹ فلور پر آئے۔ یہاں سمندری مخلوق کے نمونے اور سائنسی معلومات دی گئی تھیں۔ چھت سے نوّے فٹ سے زیادہ لمبی وہیل مچھلی لٹکی ہوئی تھی۔ ہم سے اس سے زیادہ معلومات ہضم نہیں ہو رہی تھیں۔ ابھی ہم نے میوزیم کا ایک تہائی حصہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ بہت کچھ باقی تھا۔

شہباز شور کرنے لگا تھا۔ ”یہ سیاپا سارا آج ہی دیکھنا ہے، کوئی حد ہوتی ہے۔“

سر جی نے کہا۔ ”سینٹرل پارک کی میمیں بھی آچکی ہوں گی۔“

ہمیں اب نکلنا تھا کیونکہ اب میں خود بھی تھک چکا تھا

اور میوزیم بند ہونے کا وقت بھی ہونے والا تھا۔ بھوک سب کو لگی تھی۔ سر جی بولے۔ ''سب بات کھوئی، پہلے دال روٹی۔''

وہ محاورے بروقت اور ماحول کے مطابق بولتے تھے مگر اکثر بے محل بھی کچھ کہہ جاتے تھے۔ ہم ٹوکتے تو یہی کہتے۔ ''آپ لوگوں نے مجھے استاد مان رکھا ہے تو میں بھی آپ کی تعلیم و تربیت کو اپنا فرض سمجھ کر کچھ نہ کچھ عقل کی باتیں بتاتا رہتا ہوں۔'' وہ اس طرح سے اپنے بے محل کہے محاوروں کا جواز دیتے رہتے تھے۔ یہ بات ہمارے لیے ایک شغل بن گئی تھی کہ سر جی کے فرمودات سن کر ان سے محظوظ ہوں۔

ہم نچلی منزل میں فوڈ کورٹ میں آ بیٹھے۔

ایک بڑے ہال میں رنگین کرسیاں صاف و شفاف میزوں کے گرد لگی تھیں۔ بہت سے تھکے ہارے اور نڈھال ان کرسیوں پر آڑے ترچھے بیٹھے تھے۔ سر جی فش برگر اور آلو کے قتلے لے آئے۔ شہباز وینڈنگ مشین سے کوک کے ٹن پیک نکال لایا اور میں نے بیگ سے آلو کے پراٹھے نکالے۔ پھر سب نے آلو کے پراٹھے کھائے اور فش برگر میرے بیگ میں سما گئے۔

ہم باہر نکلے تو شام اترنے میں کچھ دیر تھی۔ عمارتوں کی روشنیاں ابھی گل تھیں۔ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بھی بجھی تھیں۔ باہر سڑک پر ہم کھڑے تھے اور آتی جاتی ٹریفک کا بے انتہا شور تھا۔

سر جی میرے پاس آئے اور کان میں بولے۔ ''میمیں پارک میں آ گئی ہوں گی؟''

میں نے کہا۔ ''معلوم نہیں۔ شاید آپ کا انتظار کرتے کرتے چلی نہ گئی ہوں۔''

کہنے لگے۔ ''اس معاملے پر مذاق مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔'' پھر کہنے لگے۔ ''جلد ہی پارک میں چلتے ہیں، کہیں چلی نہ گئی ہوں؟''

شہباز دور کھڑا تھا۔ قریب آ کر بولا۔ ''پھر کیا سیاپا ہے؟ میں نے پارک کے علاوہ کہیں نہیں جانا!''

پارک تو دیکھنا تھا مگر میرا خدشہ بھی بے جا نہ تھا کہ وہاں گھمسان کا رن پڑے گا۔ میں نے ان دونوں سے کہا تھا کہ پارک میں شام سے پہلے لڑکیاں نیکریں پہن کر جاگنگ کرنے آتی ہیں۔ میں اسی ترغیب پر انہیں میوزیم لے آیا تھا کہ شام سے پہلے پارک میں بھاگتی اچھلتی اور عریاں لباس پہنے گوریاں دکھلاؤں گا مگر مجھے خود معلوم نہ تھا کہ ایسا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔

اب سینٹرل پارک سامنے تھا اور میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اگر وہاں ان کے مطلب کا کچھ نہ نکلا تو میری تو شامت آ جائے گی۔ اب پارک میں جائے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا اور یہی سوچ کر میں پارک میں داخل ہو گیا کہ اگر کچھ نہ ملا تو کوئی اور کہانی گھڑ لوں گا۔

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ سینٹرل پارک میں کیا خاص بات ہے جو میں اسے اتنی اہمیت دے رہا ہوں تو میں صرف یہ کہوں گا کہ میں جتنا بھی اسے اہمیت دوں وہ اس سے زیادہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ میں یہ سوچ کر بھی حیرت زدہ رہ جاتا ہوں کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ نیو یارک کی بلند و بالا اور آسمان کی بلندیوں میں کھڑی عمارتوں کے درمیان ایک جنگل آباد ہے، جس میں جھیلیں ہیں، گنگناتی ندیاں ہیں، سینکڑوں سالہ پرانے پُروقار درخت ہیں، پرندے ہیں اور یہ کوئی چھوٹا سا پارک نہیں بلکہ نو سو ایکڑ میں پھیلا ایک ایسا ویرانہ جس کے گرد دنیا کا سب سے بڑا شور سڑکوں پر برپا ہے۔ ایسا نہیں کہ اردگرد کا ڈاؤن ٹاؤن اس کی تنہائی کو کھا گیا ہے بلکہ یہ پارک مینہٹن کی چیخ و پکار کو گلا گھونٹ کر دبا دیتا ہے۔ یہ وہ پارک ہے جہاں درجنوں ہالی ووڈ کی مشہور فلمیں شوٹ ہو چکی ہیں جن میں میری پسندیدہ فلمیں home alone2 اور when harry met sally بھی شامل ہیں۔ یہ کوئی پارک نہیں بلکہ میرے لیے جنگل بک ہے جس میں زندگی کا رچاؤ بھی ہے اور تنہائی کے نرم گوشے بھی ہیں۔ سینٹرل پارک میں ٹورسٹ شاید ایک بار گھوم کر واپس چلے جاتے ہیں کیونکہ انہیں اپنے کم دنوں میں اور بھی بہت کچھ دیکھنا ہوتا ہے مگر نیو یارک کی تو یہ جنت ہے۔ ایک سال میں اسی لاکھ لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں۔ برف باری میں اس کا حسن سفید چادر اوڑھ کر اور نکھر آتا ہے۔ لوگ یا تو اسے گرمیوں میں دیکھنے آتے ہیں یا پھر سردیوں کی برف باری میں آ کر یہاں فوٹو گرافی کرتے ہیں، جب درخت برف سے ڈھکے ایک دھند میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ گرمیوں میں یہ پھولوں سے بھرا ہوتا ہے۔ درخت ہوں یا پودے، ہر جانب بہار آئی ہوتی ہے۔ جھلسا دینے والا موسم نیو یارک میں نہیں پڑتا، اسی لیے یہاں بہار اپریل سے اگست تک رہتی ہے۔ خزاں کے رنگ کسی اور طرز میں یہاں دمکتے ہیں جب پتے زرد، گلابی اور سرخ پڑ جاتے ہیں۔

ہم آئے تو ابھی نہ برفیں تھیں، نہ بہار اور نہ ہی خزاں مگر ایک کشش یہاں ہر ایک کو محسوس ہوتی تھی۔ کچھ لوگ موجود تھے مگر پھر بھی سناٹا تھا۔ سائے گہرے اور لمبے ہو رہے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تھے۔ سوکھی ٹہنیوں سے ڈھلتے سورج کی کرنیں زمین پر روشنی نہیں بلکہ ان ٹہنیوں کا سایہ ڈالتی تھیں۔ ایک ویران راستہ تھا جن کے دونوں جانب لاتعداد بنچ خالی پڑے تھے۔ میں سیدھا ایک طوفان بدتمیزی سے گویا ساؤنڈ پروف کمرے میں آ گیا تھا۔

ہم چلتے ہوئے اس معبد خانے میں گھستے چلے گئے۔ سر جی اور شہباز بھی اس طلسم کدے میں خاموش ہو کر ادھر ادھر زیادہ دیکھتے تھے۔ سر جی سے پوچھا "کچھ نظر آیا؟"

جواب نہیں ملا اور مجھے کچھ دیر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہے تھے۔ ختم کیا تو بتایا۔ "آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔" پھر خود کہنے لگے "ان درختوں کو دیکھا ہے جیسے یہ ہمیں ڈرانے کے لیے عجیب و غریب شکلیں بنائے کھڑے ہیں۔"

بات وہ ٹھیک کہہ رہے تھے۔ پھر کہنے لگے۔ "قسم سے ایسے درختوں پر جن نہیں چڑیلیں اپنا گھر بناتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا ڈر لگ رہا ہے۔"

تو بولے۔ "مجھے نہیں مگر لگتا ہے کہ شہباز سہما ہوا ہے، دیکھیں رنگ بھی فق ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آیت الکرسی تو آپ پڑھ رہے تھے۔"

"پڑھ کر شہباز پر پھونک رہا تھا۔" انہوں نے جواب پہلے سے شاید سوچا ہوا تھا۔

شہباز اسی دوران درختوں کے تنوں کو ہاتھ لگائے نجانے کیا محسوس کر رہا تھا۔

ہم چلتے ہوئے ایک بہت پرانے پل تلے سے گزرے۔ وہاں ایک چھوٹی سی جھیل تھی جس کے کناروں کے ساتھ ساتھ بہت سے کچھوے سر اٹھا اٹھا کر ہمیں دیکھتے اور پھر پانی میں اتر جاتے تھے۔ جھیل کے پانیوں پر ٹہنیوں کے سائے ڈراؤنی شکلیں بنا رہے تھے۔ پس منظر میں اونچی اونچی عمارتیں کوئی انوکھا تاثر دیتی تھیں۔ معلوم نہ پڑتا تھا کہ شہر میں کوئی جنگل ہے یا جنگل کے باہر کوئی شہر ہے۔

سر جی کہنے لگے۔ "یہاں گیدڑ بھی ہوں گے؟"

میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ ہوں۔"

وہ بولے۔ "یہاں یہ محاورہ صحیح فٹ ہو سکتا ہے کہ گیدڑ کی جب موت آتی ہے تو شہر کا رخ کرتا ہے۔"

کہہ تو وہ ٹھیک رہے تھے کہ یہاں سے نکلا کوئی بھی جانور گاڑیوں تلے کچلا جا سکتا ہے۔

سامنے ایک پل آیا۔ اس کا نام بالکونی برج تھا۔ نیچے پانی کھڑے تھے اور برج کا عکس ان کے اندر سے ہمیں جھانکتا تھا۔ یہاں سے سٹی اسکائی لائن کا جھیل کے اوپر سے منظر سب سے اچھا دکھائی دیتا ہے۔ ایک فوٹو گرافر کیمرا ایک اسٹینڈ پر لگائے بہت دیر سے ویو فائنڈر سے نجانے کیا دیکھے چلا جا رہا تھا۔

سر جی کو میمیں بھول چکی تھیں۔ وہ اور شہباز اس ماحول سے خاصے متاثر نظر آ رہے تھے۔ ہم ایک اور پل کے نیچے سے گزر رہے تھے جہاں بہت سارے درخت کھڑے تھے اور ایک بڑے پھیلاؤ میں ان کی ٹہنیاں تھیں۔ وہیں ایک لڑکی جاگنگ کرتی قریب سے جب گزری تو سر جی کو اپنی بھولی ہوئیں نیکریں پہنے میمیں یاد آ گئیں۔ پہلے اسے دور تک جاتا دیکھتے رہے پھر مجھ سے بولے۔ "یہ تو پاجامے میں ہے، آپ نے تو کہا تھا کہ نیکر پہنی ہو گی۔"

شہباز نے کہا "اسے روک کر قسم اٹھوا لو، اس نے نیکر بھی پہنی ہو گی۔" اب سر جی سٹپٹا گئے اور کہنے لگے۔ "یہ عورت ذات کی بے حرمتی ہے کہ اسے روک کر پوچھا جائے کہ آپ نے نیکر پہنی ہوئی ہے؟ اور وہ بھی جب وہ معصوم بھاگ رہی ہو۔"

ہر جانب سناٹے کا عالم تھا کہ ہمیں ایک بوڑھی عورت نظر آئی جو رنگین کپڑے پہنے، سر پر سرخ رنگ کی وگ رکھے اور بے تحاشا میک میں جھیل کے اندر اپنا عکس دیکھ رہی تھی۔ پھر اپنے آپ کو دیکھ کر نوخیز لڑکیوں کی طرح مسکرا دیتی۔

میں نے سر جی سے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ آپ کے راجا اندر کا اکھاڑہ ہے۔"

انہوں نے اس عورت کو غور سے دیکھا اور پھر کچھ اور قریب جا کر اسے دیکھا اور مایوس ہو کر واپس آ کر بولے۔ "شوقین بڑھیا، چٹائی کا لہنگا۔"

شہباز سر جی سے بولا۔ "ایک تو مجھے آپ کے یہ سیاپے سمجھ میں نہیں آتے۔ معلوم نہیں کیا کہہ جاتے ہیں کہ اگلا ایک گھنٹا ہمیں سوچنے میں گزارنا پڑتا ہے۔"

اس پر وہ بولے۔ "بوڑھی گھوڑی، لال لگام کا تو پتا ہے ناں۔"

بات ہمیں سمجھ میں آ گئی تھی اور ہم دونوں سر جی کو ان کے اہل زبان ہونے پر مبارک باد دے رہے تھے۔ اس پر وہ بولے۔ "میں تو آپ لوگوں کو کچھ نہ کچھ ہر وقت سکھاتا رہتا ہوں مگر آپ ہیں کہ صدرہ پڑھ کر بھی احمق رہے۔"

شہباز بے بس کھڑا اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے یہ کہہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

رہا تھا۔ "اب یہ کیا بول گئے ہیں؟"

ہم آگے آئے تو پتھر کا بنا ایک عجیب وغریب ساخت کا بنچ بہت سے درختوں کے درمیان رکھا تھا۔ ایک گوشہ تنہائی تھا۔ بنچ کی ساخت ایسی تھی کہ اس کے دونوں کونے اندر کی جانب مڑے ہوئے تھے۔ بیس فٹ کے قریب لمبا تھا۔ بنچ کے ساتھ ایک تحریر لکھی تھی۔ گریٹ ناکا یہ بنچ 1936 میں اس وقت کے میئر نیاپارک کو تحفے میں دیا تھا۔ بنچ کی خاص بات یہ تھی کہ اگر کوئی ایک کونے میں بیٹھ کر سرگوشی کرے تو آواز کی لہریں دوسرے کونے میں سنائی دیتی ہیں۔ اسی لیے اس کو Whisper Bench (سرگوشی والا بنچ) بھی کہتے ہیں۔ اب شہباز کوئی بات ایک کونے میں بیٹھ کر سرگوشی میں کرتا اور میں بیس فٹ دور بیٹھے اسے سن لیتا تھا۔

شہباز نے اپنی جانب سے سرگوشی کی "سرجی کو یہیں چھوڑ جاتے ہیں اور یہ اس پارک سے اکیلا کبھی نہیں نکل سکے گا اور کوئی دیسی بھی ان کی مشکل زبان کی آہ و بکا نہیں سمجھ سکے گا۔"

سرجی دور کھڑے تھے مگر سرگوشی میری بجائے ان کے کانوں تک صاف وشفاف پہنچی اور وہ وہیں کھڑے کھڑے بگڑ گئے۔ اب وہ واویلا کررہے تھے۔

"شہباز کی آنکھوں میں سازش میں نے پہلے ہی دیکھ لی تھی جو وہ میرے خلاف تیار کررہا تھا۔"

شہباز کہنے لگا۔ "کب دیکھی تھی وہ سازش؟"

وہ کہنے لگے "جب میں نے تم کو میوزیم میں ریچھ کہا تھا۔"

اب شہباز بگڑا اور جھگڑا شروع ہوگیا۔ میں بنچ پر بیٹھا ہنسی سے لوٹ پوٹ ہورہا تھا اور سرجی کہہ رہے تھے "لوگوں نے میرے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔ میں تو پہلے سے ہی جانتا تھا کہ کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔"

شہباز گالیاں دے رہا تھا کہ کبھی مجھے ریچھ کہتا ہے اور کبھی کوئی اور...... پھر مجھ سے کہا۔ "آپ بھی اسے نہیں روکتے۔ اسے ایئرپورٹ سے ہم لاتے بھی نہیں۔"

سرجی بھی بولے جارہے تھے "مجھے معلوم ہے، میں سب کو کھٹک رہا ہوں۔ میرا احسان تو آپ دونوں پر ہے کہ لڑکیاں پھنسا کر آپ کو دیں اور آپ الٹا میرے خلاف محلاتی سازشیں کررہے ہیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ شہباز بھی مصنوعی غصہ کررہا ہے مگر اپنے سرجی واقعی روٹھ چکے تھے۔ اب وہ اس بات پر مانے کہ وہ بھی مجھ سے کوئی سرگوشی میں بات کریں گے۔ وہ ایک کونے میں جا بیٹھے اور سرگوشی کی بجائے زور سے بولے۔ "شہباز کو حرام جانور کا کھانا کھلاتے ہیں کیونکہ حرام اسے آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ راضی ہوگئے اور شہباز یہ کہتا ہوا آگے چل پڑا "یہ سیاپا تو کسی جن کی طرح مجھے چمٹ گیا ہے۔"

بائیں جانب جھیل کے سبز پانی تھے اور ساتھ بنے راستے پر ہم چلتے جارہے تھے۔ اب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ پارک کے پار کھڑی بلند عمارتوں کی روشنیاں جگمگا اٹھی تھیں اور ڈاؤن ٹاؤن کا منظر یہاں سے ایک خاموشی لیے دمکتا تھا۔ پارک کا ماحول طلسماتی ہوگیا تھا۔ شام کے سائے جھیل کی سطح پر لہرانے لگے اور میرے ساتھی اپنی جھڑپ بھول کر پھر سے ایک ہوکر خوش گپیاں کرنے لگے۔ اکا دکا لوگ نظر آجاتے مگر جاگنگ کرتے ہوئے جلدی سے غائب ہو جاتے تھے۔ ٹھنڈ کچھ بڑھ گئی تھی اور ہم نے اپنے آپ کو جیکٹوں میں کس لیا تھا۔ سرجی کی پھندنے والی ٹوپی ازلوں سے ان کے سر پر تھی اور ان کی پہچان بن گئی تھی۔ کسی مجمع میں اگر ہمیں سرجی کو ڈھونڈنا ہوتا تو ہم سرجی تلاش نہ کرتے بلکہ بہت سی ٹوپیوں میں پھندنے والی ٹوپی دیکھا کرتے تھے جو ان کی متوالی چال سے دائیں بائیں لہرا رہی ہوتی تھی۔

جھیل کے ساتھ ایک چٹان رکھی نظر آئی۔ جس کے آس پاس بہت زیادہ درخت تھے۔ چٹان کے ساتھ ایک کینوپی بنی تھی۔ اس کو ہرنز ہیڈ راک (بگلے کے سر کی مشابہت والی چٹان) کہتے ہیں۔ ہم اس راک پر کھڑے ہوکر جھیل کا نظارہ کرنے لگے۔ کئی رنگ اس میں اترتے تھے اور وہی رنگ پانی میں گھل کر کوئی انوکھی قوس قزح میں بدلتے تھے۔ اس خاموش منظر میں ہم کھڑے تھے اور خاموشی سے اس جھیل کے پانیوں کو دیکھتے رہے۔ میں شکر کررہا تھا کہ اس وقت یہاں رش نہیں تھا ورنہ اس جگہ کی پُراسراریت میرے سامنے نہ کھلتی۔

آگے ندی بہہ رہی تھی اور اس پر چھوٹے چھوٹے پرانے پل بنے تھے جنہیں درختوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ چہل قدمی کے لیے ٹرائل بنے کہیں ویرانوں کی جانب نکلتے تھے۔ کیا مناظر تھے جن کو میں شہر کے بیچ بنے جنگل میں دیکھ رہا تھا۔ میں اسے پارک لکھتے ہوئے جھجک رہا ہوں کیونکہ پارک سے کسی شور بھرے لان کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے مگر یہاں تو کوئی اور مناظر تھے۔ ایک جگہ گھاس سے ڈھکا دور تک پھیلا میدان تھا جس پر شام کا ملگجا اندھیرا اتر رہا تھا۔ جھیل کے پانی زیادہ گہرے اور شوخ رنگوں میں بدل چکے تھے۔ یہ جگہ ایک بار

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

نہیں بار بار آنے کی تھی مگر میں جب بھی بعد میں یہاں آیا تو دیکھا کہ شور وغل نے اس پارک کے حسن کو روند ڈالا ہے۔ یہ وہ جنگل نہ تھا جو میں نے اپنے دوستوں کے ہمراہ اسے پہلی بار دیکھا تھا۔

آگے چیری ہل فاؤنٹین آیا۔ ایک لمبے گول سرکل کے اندر یہ فوارہ اس لیے مشہور ہوا کہ یہاں بہت سی فلموں کی شوٹنگ ہوئی تھی۔ یہ جگہ فوٹو گرافی کے لیے بہت مقبول رہی ہے۔ یہیں کئی مجسمے جگہ جگہ کھڑے نظر آ رہے تھے، ایک مجسمے نے اپنے دائیں ہاتھ پر عقاب اٹھا رکھا تھا۔ یہ پرندوں اور انسان کی دوستی کی علامت تھا۔ سامنے ایک بارہ دری سی آئی جس کی چھت کو خوبصورت نقش و نگاری سے سجایا گیا تھا۔

پارک کے آخر میں ایک بڑی یادگار بنی تھی۔ ایک بڑا مینار تھا جس کے اوپر سنہری رنگ کے گھوڑوں کے مجسمے تھے اور ایک عورت نے بائیں ہاتھ میں کچھ اٹھایا ہوا تھا، جو مجھے ٹھیک سے نظر نہ آ رہی تھی۔ مینار کے ساتھ بھی کئی مجسمے رکھے تھے۔ یہ یادگار 1898ء میں تیار ہوئی جب کیوبا کی اسپین سے جنگ میں دو سو ساٹھ فوجی ایک دھماکے میں ہلاک ہوئے تھے۔ یہاں کچھ لوگ ارد گرد بیٹھے نظر آئے۔ یہاں سے اب ہم پارک کے باہر نکل سکتے تھے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پارک کو رات کی سیاہی نگلنے کی کوشش میں تھی۔

ہوٹل ہمارا قریب ہی تھا۔ ٹیکسی کیب نے ہمیں گھما پھرا کر پندرہ منٹ لگا دیے۔ ہمارا ہوٹل 8th ایونیو اور 47th اسٹریٹ کے کونے پر تھا۔ یہ ہوٹل ایک تو معیاری بھی تھا اور ساتھ ٹائم اسکوائر سے تین منٹ کی پیدل واک پر تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور پاکستانی تھا۔ میں اس سے کچھ معلومات لیتا رہا۔ وہ ہمیں بتا رہا تھا کہ حلال ریسٹورنٹ کہاں کہاں ہیں، پائے کا ناشتا کہاں سے ملے گا اور ریڈ ایریا کہاں ہے۔ اس نے ہمیں ہوٹل کے سامنے اتارا، اپنا فون نمبر دیا اور پھر میٹر کے لیور کو گھمایا اور ہارن بجاتا نکل گیا۔

ہم اپنے چھوٹے بیگ پکڑے ہوٹل کے سامنے کھڑے تھے۔ مین دروازے کے آگے دو بڑے ستون تھے۔ دیواروں پر شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیاں اور ان پر لگی پرانے طرز کے لائٹ فکسچر تھے۔ پرانے طرز تعمیر پر بنے اس ہوٹل کی عمارت شاید پانچ منزلہ تھی۔ میں نے ارد گرد دیکھا تو ساتھ ایک سرخ رنگ کی عمارت تھی جس میں نیچے ٹریول ایجنسی کا دفتر تھا۔ سامنے کوئی فوڈ مارکیٹ تھی اور باقی اپارٹمنٹ بلڈنگز تھیں۔ ان اپارٹمنٹ بلڈنگز کے باہر لوہے کی سیڑھیاں زگ زیگ میں پہلی منزل سے آخری منزل تک چڑھتی گئی تھیں۔ یہ سب عمارتیں لگ بھگ سو سال پرانی تھیں۔ یہ سیڑھیاں میں نے مینہٹن کی ہر پرانی بلڈنگ کے باہر دیکھی تھیں۔ لوہے کی ان سیڑھیوں نے عمارتوں کے قدیم ہونے کا تاثر اجاگر کیا ہوا تھا۔ سڑک پر ٹریفک اتنی زیادہ نہ تھی اور شور شرابہ وہ نہ تھا جس کا مجھے خدشہ تھا۔

ہم تینوں تھکے ماندے ہوٹل کے استقبالیہ میں داخل ہوئے تو وہ خالی پڑا تھا۔ چھت پر لگے فانوسوں سے لابی جگمگا رہی تھی۔ کرسیاں اور گول میزیں کھڑکیوں کے ساتھ لگی تھیں جن پر بیٹھ کر سڑک پر آتی جاتی ٹریفک کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ استقبالیہ لابی ایک بڑے کمرے میں بنا تھا جس کی دو جانب کاؤنٹر تھے۔ استقبالیہ کے سامنے لابی میں دیوار کے ساتھ ایک بڑا کاؤنٹر رکھا تھا جہاں تازہ جوس، کافی مشین، مائیکرو ویو، چاکلیٹ، چپس، بسکٹ، کیک اور ڈونٹ رکھے تھے۔ ایک ریک پر مینہٹن دیکھنے کے لیے بہت سے بروشر، نقشے، بس ٹرپ کمپنیوں کے پمفلٹ اور ہر مشہور جگہ کی معلومات رکھی تھیں۔ میں نے اپنے کام کے بروشر اٹھا لیے۔ ہم تینوں خوش تھے کہ ہمیں ایک اچھا ہوٹل ایک اچھے مقام پر ملا ہے۔

ہم کھڑے جائزہ لے رہے تھے کہ کاؤنٹر کے پیچھے ایک دروازے سے ایک صاحب نکل کر آئے اور ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگے۔ وہ جواں سال تھا اور کالے سوٹ میں اس کی شخصیت زیادہ نکھر رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ آفاقی صاحب کو تو ہر ہوٹل میں استقبالیہ پر کوئی نہ کوئی لڑکی ملتی ہے اور بٹ صاحب اس کا نام معلوم کرنے کی کوشش میں ہوتے تھے مگر مجھے نارتھ امریکا میں ہوٹل کے پہلے تجربے میں کسی مرد کا سامنا ہوا ہے۔

میں نے اس صاحب کو اپنا نام بتایا اور کہا۔ ”ہمارا تین بیڈ کا کمرا کل بک کروایا گیا تھا۔“

اس نے کمپیوٹر پر کچھ دیکھا اور بولا۔ ”دوسری منزل پر آپ کا کمرا بک ہے اور آپ کے لیے طارق صاحب کا کئی بار فون بھی آ چکا ہے۔ اس نے کچھ کاغذ پرنٹ کر کے میرے سامنے رکھے اور میں نے دستخط کر کے دیے تو اس نے تین کارڈ ہمارے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ کمرے کی تین چابیاں ہیں۔“ میں کریڈٹ کارڈ سائز کے کارڈ لیے حیران کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ کس قسم کی چابیاں ہیں۔

سرجی بولے۔ ”یہ ہمیں بے وقوف پاکستانی سمجھ کر ہمارا مذاق اڑا رہا ہے۔“

URDU SOFT BOOKS — DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS — WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں خود شش و پنج میں تھا۔ وہ ہماری مشکل سمجھ چکا تھا۔ کہنے لگا۔ "میں آپ کو کمرے تک چھوڑ آتا ہوں۔"

ایک لفٹ سے ہم دوسری منزل پر آئے۔ خاموش اور ویران پڑی لمبی لابی میں دونوں جانب کمروں کے دروازے تھے۔ لابی قمقموں کی روشنی سے جگمگا رہی تھی۔ فرش پر ویز سرخ کارپٹ بچھا تھا۔ ایک دروازے کے سامنے وہ رک گیا۔ کارڈ کو دروازے پر لگی ایک سلاٹ میں ڈالا اور کلک کی آواز آئی اور ہینڈل گھما کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ یہ کہتا ہوا وہ واپس چلا گیا کہ "ناشتا صبح سات سے نو بجے تک آپ کو لابی میں فری ملے گا۔"

اب سرجی وہ تینوں کارڈ اپنے ہاتھ میں تھامے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "امریکا نے تو مجھے ششدر کر کے رکھ دیا ہے۔"

ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہ ایک بڑا کمرا تھا جس میں تین سنگل بیڈ ایک لائن میں لگے تھے۔ ہر بیڈ کے بیچ ایک نائٹ ٹیبل تھی جس پر رکھے لیمپ روشن تھے۔ سامنے دیوار کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل تھا جس کے اوپر ٹی وی لگا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل پر فون رکھا تھا اور ساتھ ایک فریج بھی رکھا تھا جسے کھول کر سرجی کہہ رہے تھے۔ "یہ سرکے کی بوتلیں یہاں کیوں پڑی ہیں؟"

شہباز نے دیکھا تو بولا۔ "سرجی! اتنے معصوم نہ بنیں، یہ شراب کی بوتلیں ہیں۔"

وہ کہنے لگے۔ "کیا یہ بھی کرائے میں شامل ہیں؟"

میں نے نائٹ ٹیبل کی دراز کھولی تو وہاں بائبل بھی رکھی تھی۔

دروازے کے ساتھ واش روم کا دروازہ نظر آیا۔ وہ ایک صاف ستھرا اور نفاست سے سجا واش روم تھا۔ نہانے کے لیے ٹب تھا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی تھکاوٹ اتارنے کے لیے گرم پانی سے غسل کیا۔ تازہ دم ہوا تو آسودگی سے اپنے بیڈ پر لیٹ گیا۔ پھر سرجی واش روم میں جا گھسے اور اسی دوران شہباز کے خرانے گونجنے لگے۔

اتنے میں فون بجنے لگا۔ اٹھایا تو طارق تھا۔ کہنے لگا۔

"میں پریشان ہو رہا تھا کہ آپ لوگ کہاں ہیں؟"

میری آج کی روئیداد سنی تو کوسنے لگا۔ "تمہارا دماغ خراب ہے۔ معلوم نہیں کہاں کہاں دھکے کھا رہے ہو۔ میوزیم اور پارکس میں بھی کوئی گھومنے جاتا ہے؟"

فون پر پھر ایک چھینک سنائی دی اور پھر کہنے لگا۔ "کل کس وقت واپس آؤ گے؟"

جب مجھ سے یہ سنا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک رات اور ہوٹل میں ٹھہر جائیں تو پھٹ پڑا۔ "تم کیا مجھ سے ملنے آئے ہو یا درخت اور مجسمے دیکھنے؟ تم پہلے تو پاگل نہ تھے، اب کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

میں نے پوچھا۔ "پاگل سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

وہ بولا۔ "کبھی ویران جگہ پر بیٹھے ہوتے ہو، کبھی سورج کو دیکھنے لگتے ہو اور کبھی کوؤں کو۔ اچھے خاصے تھے، اب فلاسفر بنے پھرتے ہو۔"

اب کی بار وہ چھینکا تو چھینکتا چلا گیا اور جب رکا تو پھر بولنے لگا۔ "مجھے تو ڈر ہے کہ تم اپنے فارمیسی کے لائسنس کے امتحان کیسے پاس کرو گے۔"

دراصل طارق نے تیسری باری پر امتحان پاس کیا تھا اور اسے یہ خدشہ تھا کہ میری دلچسپی اب پڑھائی کرنے کی بجائے گھومنے پھرنے پر زیادہ ہے۔ گو اس کے خدشات میں نے اس وقت دور کر دیے تھے جب سب امتحانات اللہ کی مدد سے پہلی ہی کوشش میں پاس کر لیے۔ آخر میں اپنی نصیحتیں کر کر کے تھک گیا تو فون بند کرنے سے پہلے یہ کہا کہ اگر کل بھی رکنا ہو تو مجھے فون کر دینا، میں حنیف کر دوں گا۔

اتنے میں سرجی نہا دھو کر باہر آ چکے تھے۔ اپنے چند بالوں کو ڈرائی کرنے کے بعد سر سے چپکا رہے تھے۔ پھر اپنی مونچھوں کو ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں غور سے دیکھا، ہلکا سا مسکرائے، پھر کچھ دیر سوچا اور پھر مطمئن ہو کر کہنے لگے۔

"شہباز کے خرانے میرے کانوں میں بم کی طرح پھوٹتے ہیں۔" پھر قریب سے خرانے بھرتے شہباز کو دیکھا اور بولے۔ "قسم سے ایسا لگتا ہے کہ کسی بیل کا نرخرہ ابھی کاٹا گیا ہو۔" یہ کہہ کر پھر فریج کھولے کھڑے یہ دوبارہ پوچھنے لگے۔

"کیا یہ بوتلیں بھی کرائے میں شامل ہیں؟"

میں نے پوچھا۔ "اگر شامل ہیں تو پھر؟"

کہنے لگے۔ "میں نے اس لیے پوچھا ہے کہ اگر فری ہیں تو لاحول تو پڑھ سکوں۔"

کچھ دیر ٹہلتے رہے اور دوبارہ واش روم میں چلے گئے۔ واپس نکلے تو پوچھنے لگے۔ "اب پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "آپ ایک بار پھر واش روم سے ہو آئیں۔ اتنے میں سوچ کر آپ کو بتاتا ہوں۔"

یہ سن کر میرے کہنے کا مطلب تلاش کرنے لگے اور پھر بستر میں گھس کر بیٹھ گئے۔

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

میں نے سوچا کہ آج کی نمازیں پڑھ لی جائیں۔ میں وضو کرنے واش روم میں جانے کے لیے اٹھا تو سر جی نے پوچھا۔ ”پھر کیوں جا رہے ہو؟“

میں بولا۔ ”آج کوئی نماز نہیں پڑھی، سوچا وضو کر کے اپنی قصر نمازیں ہی پڑھ لوں۔“

اس بات پر وہ بستر پر بیٹھے بیٹھے بولے۔ ”سر سجدے میں اور من بدیوں میں۔“

”یا اللہ میرے گناہ بخش دے۔“ شہباز نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

”کیا اسے نیند میں چلنے کی عادت ہے؟“ سر جی نے تشویش سے کہا۔ ان کی نظریں کمبل اوڑھے شہباز پر ٹھہر گئی تھیں۔

”جی ہاں، ایک قتل نیند کی حالت میں کر چکا ہوں، ایسے بے تکے جملے سن سن کر بہت جلد ایک اور قتل کرنے والا ہوں۔“

”یہ پورا نوٹنکی ہے۔“ سر جی نے چیخ کر کہا۔

میں ان دونوں کو نظر انداز کر کے ڈریسنگ روم کی جانب بڑھا۔

ڈریسنگ روم کی دراز میں نئی دھلی چادریں رکھی تھیں۔ ایک کو بچھا کر اندازے سے قبلے کی سمت دیکھی اور پھر نیت کی اور نماز پڑھنے لگا۔

نماز ادا کرنے کے بعد بمشکل شہباز کو اٹھایا۔ اب ہمیں بھوک لگی تھی۔ شہباز نے کہا۔ ”مجھے نیند آ رہی ہے۔ آپ میرے لیے کھانا پیک کروا کر لے آنا۔“ جب سر جی نے کہا کہ آج ویک اینڈ ہے اور خبروں میں بتا رہے تھے کہ ٹائم اسکوائر پر بہت رونق ہو گی تو شہباز بڑبڑاتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ ”یہ ٹائم اسکوائر کا سیاپا بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔“ وہ یہ کہتا ہوا واش روم کی جانب چلا گیا۔

پورا دن عجائب گھر اور جنگل میں گھومتے رہے اب یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ ٹائم اسکوائر میں کون سا تیل نکل رہا ہے جب کہ میں سوچ رہا تھا کہ کون سی خبروں میں سر جی نے یہ سب سنا تھا؟

ہم سب کو زوروں کی بھوک لگی تھی۔ اسی لیے پہلے ہم پینتیس اسٹریٹ کے پاس ایک گلی میں حلال ریسٹورنٹ پہنچے جہاں آس پاس تمام رہائشی عمارتیں تھیں۔ چھوٹی سی دکان تھی۔ ہم شیشے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو اپنے آپ کو ایک کاؤنٹر کے سامنے کھڑا پایا۔ تین چار لکڑی کی میزیں تھیں اور ان کے گرد پلاسٹک کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کچھ پاکستانی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور کچھ پیک کروا کر اپنے ساتھ لے جا رہے تھے۔ سامنے کاؤنٹر کے پیچھے ایک پاکستانی عورت سفید ایپرن باندھے آرڈر وصول کر رہی تھی۔ شوکیس میں تازہ بنے کھانے رکھے تھے۔ سر جی نے شوکیس کے اندر کا جائزہ لیا اور خوش خبری سنائی کہ بریانی، کڑھائی گوشت، چپلی کباب کے ساتھ پائے بھی ہیں۔ اندر تندور سے تازہ گرم روٹیوں کی مہک ہم تک آ رہی تھی۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کے سب گاہک ٹیکسیاں چلانے والے ہیں۔ ان کو جیسے ہی وقت ملتا ہے تو وہ یہاں بیٹھ کر کھانا کھانے کے علاوہ کچھ دیر آرام بھی کر لیتے ہیں اور جو جلدی میں ہوتے ہیں سینڈوچ، چائے یا کولڈ ڈرنک اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

اتنے زیادہ کھانوں کی اقسام دیکھ کر ہماری بھوک بڑھ گئی تھی۔ ہم نے مشورہ کر کے بریانی، چپلی کباب اور کڑھائی گوشت کا آرڈر دیا۔ پھر انتظار میں خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

اتنے میں ایک لڑکی اندر داخل ہوئی اور کاؤنٹر کے پیچھے کھڑی عورت سے باتیں کرنے لگی۔ ان کی باتوں سے جو کچھ معلوم ہو رہا تھا اس کا لب لباب یہ تھا کہ وہ لڑکی بھی اسی ریسٹورنٹ میں کام کرتی ہے۔ اس نے گرین کارڈ کے لیے درخواست دی ہوئی تھی اور اس کے بارے میں پریشان دکھائی دیتی تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے والی عورت اس کو کچھ ہدایات دینے کے علاوہ تسلی بھی دے رہی تھی۔ آنے والی لڑکی بہت پریشان لگ رہی تھی۔ یہ وہ دن تھے جب لوگ سیاحتی ویزے پر یہاں آ کر کسی نہ کسی طرح گرین کارڈ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے اور عمومی طور پر کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔

اتنے میں ہمیں کھانا سرو کر دیا گیا اور ہم بول کم اور اپنا پیٹ بھرنے کی کوشش زیادہ کر رہے تھے۔ حیرت ناک طور پر کھانا بہت ہی اچھا اور تازہ تھا۔ گرم روٹیوں نے ہمیں زیادہ کھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سر جی کھانا کھاتے ہوئے شہباز کو دیکھ کر بولے۔ ”اَن پڑھ ایا مگر تن تو اپنا ہے۔“

شہباز نے اب کی بار کوئی کان نہ دھرا اور کھانے میں مصروف رہا۔

کھانا کھا کر میں نے چائے کا پوچھا تو ایپرن پہنے عورت ..... نے اسی وقت ہمیں گرم چائے اندر سے بنوا کر پیش کر دی۔ چائے پینے کے بعد ہم ہشاش بشاش ہو گئے۔

میں نے اس عورت سے اپنا تعارف کروایا اور کچھ سوالات کیے۔ وہ بھی یہی بتا رہی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیورز زیادہ تر ہمارے گاہک ہیں۔ وہ صبح کا ناشتا بھی مہیا کرتے ہیں اور

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

رات گیارہ بجے تک موجود رہتے ہیں۔ روزانہ کے حساب سے تازہ کھانا تیار کیا جاتا ہے۔

سرجی کھڑے یہ سب سن رہے تھے اور ہاتھ جوڑے کھانے کی تعریف کرتے جارہے تھے اور پھر اس عورت نے چھ سموسے پیک کرکے ہمیں تحفے میں دے دیے۔ سرجی اپنی اس شاندار پرفارمنس پر بہت خوش تھے۔

ہم ریسٹورنٹ سے پیدل چل کر ٹائم اسکوائر پہنچ گئے۔ 7th ایونیو اور براڈوے پر 42 اور 47 اسٹریٹ کے درمیان ٹائم اسکوائر کا علاقہ ہے۔

ٹائم اسکوائر کا نام میں نے پہلی بار طارق سے سنا تھا جب وہ پاکستان آیا تھا۔ جب میں نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ نیویارک کی بلند عمارتیں جو ہم فوٹوؤں میں دیکھتے ہیں، وہ کس جگہ پر ہے؟ تو اس نے جواب میں یہ کہا تھا۔ ''منہٹن میں ہیں۔'' پھر یہ بھی بتایا کہ منہٹن ہی میں ایک جگہ ٹائم اسکوائر ہے جہاں نئے سال کے آغاز پر ایک بال رات بارہ بجے نیچے آتی ہے اور لاکھوں لوگ وہاں موجود ہوتے ہیں۔ یہ بھی بتایا کہ بہت آتش بازی ہوتی ہے اور لوگ بہت خوشیاں مناتے ہیں۔

اسی دن سے میرے ذہن میں دو باتیں بیٹھ چکی تھیں۔ ایک یہ کہ کوئی بال گرتی ہے۔ کہاں سے اور کیسے گرتی ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ دوسری بات ذہن میں یہ بیٹھی کہ لاکھوں لوگ جمع ہوتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔ میں ان دو چیزوں کو اپنے خیالات میں بٹھا کر مختلف مناظر تخلیق کرتا رہتا تھا۔ آج جب میں ٹائم اسکوائر پہنچا تو پہلے مجھے یہ انکشاف ہوا کہ جو مناظر میں اپنے ذہن میں بناتا تھا وہ سب غلط تھے۔ میرے اندازوں کے برعکس ٹائم اسکوائر کہیں زیادہ پُررونق اور پُرروشن جگہ تھی۔ جو دکھلائی دے رہا تھا اور سنائی دے رہا تھا وہ کسی اور جگہ نہ دکھتا ہے اور نہ سنائی دیتا ہے۔ سڑک کے دونوں جانب بڑے بڑے نیون سائن چمک رہے تھے۔ بار اور کیفوں سے قہقہوں کی آوازیں باہر آرہی تھیں۔ ہمیں معلوم نہ ہوتا تھا کہ یہ اسکوائر کہاں سے شروع ہورہا ہے اور کہاں ختم ہورہا ہے۔ ہم کہاں سے چلنا شروع کریں اور کہاں جاکر ختم کریں۔ کون سی جگہ زیادہ اہم ہے جس پر اپنا فوکس رکھیں اور کس جگہ سے سرسری انداز سے گزر جائیں۔ ہمارے چاروں جانب محاورۃً نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں ایک رنگ برنگی روشنیوں کے سیلاب کی کیفیت تھی۔

سرجی چمکتے بل بورڈ دیکھ کر ششدر رہ گئے تھے اور جب میری طرح اپنے ہوش وحواس میں آئے تو شہباز سے

انڈے کی زردی 250 ملی گرام کولیسٹرول فراہم کرتی ہے اور کولیسٹرول کے مضر اثرات سے آج کون واقف نہیں۔ غذا میں اس کی زیادہ مقدار خون کی شریانوں میں جم جاتی ہے جس کی وجہ سے ہائی بلڈ پریشر اور امراض قلب لاحق ہوسکتے ہیں۔ اس لیے ماہرین تغذیہ چار انڈے فی ہفتہ تجویز کرتے ہیں جب کہ چالیس سال کی عمر کے بعد اس تعداد میں اور کمی کردی جائے تو بہتر ہے۔

اناج، دالوں، دودھ اور گوشت وغیرہ سے حاصل شدہ بیشتر غذائی اجزاء کو جسم اسی وقت استعمال کرسکتا ہے جب کہ ساتھ میں سبزیوں اور پھلوں سے حاصل شدہ غذائیت بھی موجود ہو۔ اس لیے سبزیوں اور پھلوں کا غذا میں شامل کرنا بہت ضروری ہے۔ جو بیشتر بیماریوں کے خلاف مدافعت بخش ہے۔ سبز پتوں والی سبزیاں غذا میں ہر دوسرے دن ضرور شامل کرنی چاہئیں۔ یہ گرم ممالک میں با آسانی اور وافر مقدار میں دستیاب ہیں۔ مثلاً پالک، ساگ، میتھی، سویا، چولائی، تلفا۔ ان میں موجود غذائی اجزاء ہماری نشوونما بینائی اور جلد کو صحت مند رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اسی طرح ترش پھل جو حیاتین ج کا ذریعہ ہیں جیسے کہ مالٹے، موسمی، کینو، لیموں، چکوترا وغیرہ پھر خربوزہ، امرود، پپیتا وغیرہ ان کا لازمی روزانہ استعمال بھی ہمیں بیماریوں سے مدافعت بخشتا ہے اور دانت اور مسوڑھے مضبوط رہتے ہیں۔

مرسلہ: آصف خان۔ راولپنڈی

شکر ہمارے جسم کو ایسے حرارے دیتی ہے جن میں دیگر کوئی غذائی اجزاء شامل نہیں ہوتے، یعنی شکر سے وٹامن ملتے ہیں نہ فائبر اور نہ لحمیات۔ زیادہ شکر کھانے کے نتیجے میں دو اہم مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ دوم شکر سے موٹاپے کو تقویت ملتی ہے۔ غذا میں شکر کی شمولیت سے زیادہ مقدار میں خوراک کھائی جاتی ہے۔ میٹھی غذائیں عموماً کم ریشہ دار ہوتی اس لیے وہ معدے کو پُر نہیں کرپاتیں۔

نمک کھانے کا مزہ نمک کے بغیر ادھورا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو نمک درکار ہوتا ہے تاہم یومیہ ایک گرام سے زائد مقدار میں نمک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مختلف اقسام کی غذائیں کھانے سے ہمارے جسم کو نمک کی مطلوبہ مقدار خود بخود حاصل ہوجاتی ہے اور اپنی طرف سے نمک شامل کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اگر ہم اپنے دسترخوان سے نمک دانی ہٹالیں تو رفتہ رفتہ ہم اس کے عادی ہوجائیں گے اور ہماری زبان مزید نمک کا تقاضا نہیں کرے گی۔ زیادہ نمک کھانے سے بعض لوگوں کو ہائی بلڈ پریشر ہوسکتا ہے جس کے نتیجے میں امراض قلب اور فالج کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ بہرحال کھانوں میں نمک کی مقدار کم کرنا ہمیشہ مفید رہتا ہے۔

مرسلہ: احمد سعید عثمانی۔ سکھر

کہنے لگے۔ ”ڈائنوسار سے بھی بڑے بل بورڈ ہیں، دل کرتا ہے کہ انہیں دیکھتا رہوں۔“

بات انہوں نے میرے دل کی کہی تھی اگر ایک دو بل بورڈ ہوتے تو بندہ ایک دو بار دیکھ کر کسی اور جگہ کا رخ کرتا مگر وہاں چاروں جانب روشنیوں کا یہ سمندر رواں تھا۔ ان بے انتہا روشنیوں کے بیچ مسکراتے، قہقہے لگاتے اور حیران چہرے گھومتے پھر رہے تھے۔ بیشتر جوڑے اور فیملیز تھیں۔ بقول سر جی کے یہاں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ یہاں تھیٹر تھے جہاں ڈرامے اسٹیج ہوتے تھے۔

دونوں جانب فٹ پاتھوں پر کوئی کچھ بیچ رہا تھا، کوئی گٹار پر اپنی دھن چھیڑے بھیک مانگ رہا تھا۔ کچھ آرٹسٹ بیٹھے پنسل سے لوگوں کے اسکیچ بنا کر اپنی دیہاڑی لگا رہے تھے۔ فٹ پاتھوں کے ساتھ ریسٹورنٹ، سپر اسٹور، کیفے، پب اور روشنیوں میں نہائی دکانوں کے اندر گاہکوں سے زیادہ ونڈو شاپنگ کرنے والے تھے۔ بس ایک میلہ لگا تھا جہاں ہر ایک نے اپنی دنیا بسا رکھی تھی۔

سامنے وہ بلند ٹاور تھا جہاں نئے سال کی آمد پر ایک بال اوپر سے آہستگی کے ساتھ نیچے آتی ہے۔ 1907ء سے یہ بال باقاعدگی کے ساتھ ہر سال 31 دسمبر کو نیچے گرتی ہے۔ ہر ٹورسٹ ایک بار اس جگہ کو بغور ضرور دیکھتا ہے۔ مسکرا کر فوٹو بنواتا ہے اور پھر ہنستا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ دنیا میں پیدل گھومنے والوں کا سب سے بڑا مقام ٹائم اسکوائر ہے۔ میں کبھی بھی روشنیوں کے بیچ خوش نہیں ہوتا۔ ماحول میں تیرگی اور نیم اندھیرا ہمیشہ مجھے آسودہ رکھتا ہے مگر یہاں آ کر میں بھی خوش تھا کیونکہ ایسی جگہیں ہر وقت آپ کو دیکھنے کو نہیں ملتیں۔ پیرس میں شانزے لیزے ہو یا لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ، سوئٹزر لینڈ میں زیورچ ہو یا ہالینڈ کا ایمسٹرڈیم، شکاگو کی میگنفشنٹ اسٹریٹ ہو یا سان فرانسسکو کی گولڈن گیٹ برج، یہ سب بہت پُررونق مقامات ہیں مگر ٹائم اسکوائر کا ان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ میری رائے میں اس کا مقابلہ کسی اور جگہ سے نہیں ہو سکتا۔ پانچ کروڑ ٹورسٹ ہر سال اس جگہ آتے ہیں اور ایک دن میں ساڑھے تین لاکھ کے قریب لوگ یہاں سے گزرتے ہیں۔ ویک اینڈ پر یہاں سے پیدل گزرنے والے ایک دن میں پانچ لاکھ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے آپ اس جگہ کی شہرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

1904ء میں جب نیویارک ٹائم کا ہیڈ آفس یہاں شفٹ ہوا تو اس کا نام ٹائم اسکوائر پڑ گیا۔ پہلے یہ کسی اور نام سے پکارا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے آخر میں یہاں دو تین منزلہ عمارتیں تھیں، تھیٹر تھے، پختہ اینٹوں سے بنی کھلی سڑک تھی اور اس پر تانگے چلا کرتے تھے۔ بل بورڈ نہ تھے مگر دکانوں کے باہر ہاتھوں سے بڑے بڑے حروف میں ان دکانوں کے نام لکھے ہوتے تھے۔ سو سال سے لاکھوں لوگ نئے سال کی خوشی میں یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ جب سے 9/11 ہوا ہے تو اب نئے سال میں ہر چار بندوں پر سادہ لباس میں ایک پولیس والا مقرر ہوتا ہے۔

ہم تین تھے مگر ہر ایک علیحدہ علیحدہ ہو کر چاروں جانب دیکھ رہا تھا۔ اتنی زیادہ رنگ برنگی روشنیاں تھیں کہ اب ہماری آنکھیں انہیں دیکھ کر خیرہ ہونے لگیں اور پھر ہم ایک دوسرے کی جانب متوجہ ہوئے۔

سر جی بولے۔ ”ہم تو جنگلوں میں گھومتے رہے اور یہاں تو سماں بندھا ہوا ہے۔“ پھر تاسف بھرے لہجے میں بولے۔ ”گیا وقت کبھی لوٹ کر نہیں آتا۔“

ٹھنڈ اتر رہی تھی اور لوگوں نے اپنے آپ کو ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ منظر نہ تھے جو گرمیوں میں نظر آتے ہیں مگر پھر بھی ایک جوش ولولہ تازگی اور طمانیت ہر سو جھلکتی تھی۔ زندگی ایک بھرپور اور پرشور لہر میں نظر آ رہی تھی۔

کچھ بڑے بڑے بل بورڈ نیم عریاں لڑکیوں کے تھے جن میں وہ بھرپور انداز میں جلوہ گر تھیں۔ یہیں سر جی پھنس کر رہ گئے۔ ان بل بورڈز کو بغور دیکھ رہے تھے۔ جب شہباز نے ہنس کر پوچھا۔ ”سر جی! اس کے باقی ماندہ کپڑے تو رہنے دیں۔ کیا پورا کھنگالیں گے اسے؟“

سر جی کہنے لگے۔ ”مجھے تو جھرجھری آ رہی ہے۔ اتنی سردی میں کسی کو کم لباس میں دیکھیں تو خود کو بھی بہت سردی لگتی ہے۔“

شہباز نے مذاق میں ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”مگر آپ تو تپ رہے ہیں۔“

اس پر وہ بہت خفا ہوئے۔ میں نے کان میں پوچھا۔ ”کیا واقعی تپ رہے ہیں۔“

سر جی کہنے لگے۔ ”اتنا بھی نہیں، جتنا شہباز بتا رہا ہے، اسے تو ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی عادت ہے۔“

یہ کہہ کر فٹ پاتھ پر ایک اسکیچ بنانے والے ایک آرٹسٹ کی جانب دوڑ پڑے۔

ہم بھی ان کے پیچھے پیچھے گئے۔ ایک چینی اسکیچ سامنے ایک اسٹول پر کسی خوب صورت لڑکی کو بٹھا کر اس کا اسکیچ بنا رہا

تھا۔لڑکی انتہائی حسین تھی۔سنہری بال، سبز آنکھیں، تاباں چہرہ اور لمبی گردن۔اس کا حسین دیکھ کر تو ہم سے بولا ہی نہ گیا۔سر جی کی نظر جب پڑی تو تبھی ادھر دوڑے چلے آئے تھے۔وہ لڑکی ایک حسین مسکراہٹ سجائے بت بنی بیٹھی تھی اور چینی آرٹسٹ اس پر نظریں گاڑے، اسکیچ پیپر پر اس کا چہرہ بناتا تھا۔ شہباز بولا۔"کون خوش قسمت اس کا ساتھی ہوگا؟"

سر جی اِدھر اُدھر دیکھ کر بولے۔"ماشاء اللہ اکیلی لگتی ہے۔اسے کافی پینے کی دعوت دیں؟"

میں نے سر جی سے کہا۔"آپ کی دعوت پر اگر وہ چلتی ہے تو تمام عمر آپ جتنی کافی پیئیں گے، وہ میری جانب سے فری ہوگی۔"

میری بات نظر انداز کر کے وہ بولے۔"ماشاء اللہ! اس سے خوشبوؤں کے جھونکے آرہے ہیں۔"

چینی آرٹسٹ نے غور سے سر جی کو دیکھا جو اس کے ہاتھوں میں پکڑے اسکیچ پر اب اپنی نظروں کے تیر گاڑے کھڑے تھے۔سر جی ایک دم الجھن میں پڑ گئے اور ایک دم بول اٹھے۔"میں نے اپنا اسکیچ بنوانا ہے۔"

اس چینی نے پینسل سے اس حور پری کی جانب اشارہ کر کے سر جی سے کہا،"اس کا اسکیچ ابھی مکمل کر کے آپ کا بناتا ہوں۔"

اب سر جی کو وہاں کھڑا رہنے کا جواز مل گیا اور ساتھ ہمیں بھی۔میں اور شہباز بھی موقع ملتے ہی اس روشن چہرے کو دیکھ رہے تھے جو سب سے بے نیاز تھا۔اس کا غرور اسے زیادہ جاذب نظر بنا رہا تھا۔ارد گرد چمکتے بل بورڈ اس کے چہرے سے پھوٹتی روشنی کے آگے مدھم پڑتے نظر آرہے تھے۔

سر جی نے مجھے اور شہباز کو اتنا منہمک دیکھا تو شکایت کرنے لگے۔"آپ دونوں اپنی والی ٹورنٹو چھوڑ آئے اور یہاں میری والی پر غلط نظریں رکھ رہے ہیں۔"

ان کے الفاظ ابھی ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ اس کا اسکیچ مکمل ہوگیا۔وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور چینی سے کاغذ لے کر اپنا اسکیچ دیکھ رہی تھی۔سر جی اسے اپنا مال متروکہ سمجھ کر گھمنڈ سے کھڑے ہماری جانب ستائشی نظروں سے دیکھتے رہے۔اتنے میں اس کا بوائے فرینڈ آگیا۔جیسے ہی ہم نے اسے دیکھا تو میں گرتے گرتے بچا۔شہباز کا رنگ پہلے زرد ہوا اور پھر سرخ۔سر جی اپنا منہ کھولے حیرت اور صدمے کی کیفیت میں نظر آئے۔وہ کوئی ساڑھے چھ فٹ کا لحیم و شحیم سیاہ فام تھا۔ جین کی پینٹ اس نے نیچے تک کھسکائی ہوئی تھی اور زیر جامہ بھی نظر آتا تھا۔سر پر سرخ رنگ کی پی کیپ الٹی پہن رکھی تھی۔آتے ہی لڑکی اس کی گردن سے لٹک گئی۔دونوں نے کھڑے کھڑے ایک دوسرے کو بوسے لیے اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔

سر جی اور ہم ابھی تک شاک میں تھے کہ اتنی حسین لڑکی کے ساتھ اتنا بدوضع انسان بھی ہوسکتا ہے۔میں شکل کی بات ہرگز نہیں کر رہا مگر اس کا ہمالیائی موٹاپا اور جسامت کسی طرح اس لڑکی سے میل نہیں کھاتا تھا۔شہباز نے کہا۔"حور کے ساتھ لنگور تو سنا تھا مگر کنگ کانگ نہیں سنا تھا۔"

اتنے میں اس چینی آرٹسٹ نے شدید صدمے میں مبتلا سر جی کو پکڑ کر اسٹول پر بٹھا دیا تھا۔وہ پندرہ ڈالر مانگ رہا تھا اور سر جی اپنی "قیمت" کم کروانا چاہتے تھے۔چینی آرٹسٹ نے دس ڈالر کی حامی بھر لی اور سر جی سے نوٹ لے کر اپنی جیکٹ کی جیب میں ٹھونس لیا۔پھر کاغذ پینسل اٹھا کر لائنیں بنانے لگا۔ سر جی نے مصنوعی مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجانے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام تھے۔میری اور شہباز کی گفتگو کا مرکز وہ جوڑا تھا جو ابھی یہاں سے ہمیں شدید ذہنی دھچکے دے کر رخصت ہو چکا تھا۔سر جی اسٹول پر بے زار بیٹھے مسکرا رہے تھے۔آرٹسٹ نے پانچ منٹ میں اپنا کام ختم کیا اور اسکیچ بنا کر کاغذ سر جی کے حوالے کر دیا۔سر جی کے چہرے کا پہلے رنگ بدلا اور پھر فق ہوگیا۔میں نے کاغذ ان کے ہاتھ سے لیا تو معلوم پڑا کہ اس نے سر جی کا کارٹون بنا ڈالا تھا۔چار گنا بڑا سر، لٹکتی ناک، چھوٹا سا چہرہ اور ناچتی مونچھیں۔میری تو ہنسی نکل گئی۔شہباز بھی ہنس ہنس کر دوہرا ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔"ہے تو کارٹون مگر پھر بھی سر جی لگتا ہے۔"

سر جی چینی آرٹسٹ سے سراپا احتجاج تھے اور چینی کہہ رہا تھا کہ پندرہ ڈالر میں اسکیچ بنتا ہے اور دس میں کارٹون۔یہ سر جی کے لیے دوسرا صدمہ تھا۔پہلا وار وہ لڑکی کر کے جا چکی تھی۔نہ چاہتے ہوئے بھی سر جی نے وہ کارٹون موڑ توڑ کر جیب میں ٹھونسا اور ہمیں وہیں کھڑے چھوڑ کر وہاں سے چلے گئے۔

سر جی صدمے سے باہر اس وقت تک نہیں نکلے جب تک لوگوں کے ہجوم میں سے ایک مکی ماؤس کے حلیے میں کسی نے بڑھ کر سر جی کو گلے لگا کر اٹھا نہیں لیا۔سر جی بھی اسے بری طرح لپٹ گئے۔سر جی کو شاید گدگدیاں ہو رہی تھیں جو وہ بچوں کی طرح ہنس بھی رہے تھے اور مکی ماؤس کی بانہوں میں ہاتھ پاؤں بھی مار رہے تھے۔سر جی کو خوش کر کے مکی ماؤس کے ریچھ نما کارٹون نے ان سے پانچ ڈالر دبوچ لیے اور سر جی کو

ہجوم میں کھڑا کر کے کسی اور شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

سرجی ابھی تک ہنس رہے تھے۔ شہباز نے پوچھا۔

"اس میں ہنسنے والی کیا بات تھی؟"

تو بولے۔ "زنانہ لمس پر گدگدی ہوتی ہے۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ کوئی عورت تھی؟"

اس پر فرمایا۔ "تجربے کی بات ہے! اتنا جاہل بھی نہیں کہ زنانہ اور مردانہ تجھی کو پہچان نہ سکوں۔"

شہباز بولا۔ "اگر کوئی لڑکی ہوتی تو آپ کو ایک کھلونے کی طرح نہ اٹھا لیتی؟"

کہنے لگے۔ "یہاں کی لڑکیاں بھی بہت ورزشیں کرتی ہیں۔ ماشاء اللہ بہت طاقتور ہوتی ہیں۔" پھر شادمانی کی کیفیت میں بولے۔ "مہینوں بعد طبیعت باغ و بہار ہو گئی ہے۔"

سرجی کو بھی معلوم نہ تھا کہ وہ عورت تھی یا مرد مگر وہ اسے لڑکی سمجھ کر تصور میں خوش ہو رہے تھے۔ ہمارے لیے یہی بہتر تھا کہ انہیں خوش ہی رہنے دیں اور ان کے مزے کو کرکرا نہ کریں اور اسی لیے ہم بھی خاموش ہو گئے۔

سامنے ایک یادگاری بنی تھی۔ اس کے سامنے کشادہ سیڑھیاں ایک چبوترے پر جا رہی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر متعدد ٹورسٹ جن میں عورتیں، مرد اور بچے شامل تھے وہ بیٹھے ستا رہے تھے۔ ہم اوپر چڑھے تو نیچے دور تک کا منظر ہمارے نیچے بہہ رہا تھا۔ چند ھیا دینے والے بڑے بڑے بل بورڈز، آسمان کی بلندی کو چھوتی عمارتیں اور نیچے ہزاروں مطمئن لوگوں کا ہجوم اور ان کے قہقہے ہمیں سنائی دے رہے تھے۔ ہم درجنوں اور لوگوں کی طرح ان سیڑھیوں پر بیٹھے وہ سموسے کھا رہے تھے جو سرجی کو ریسٹورنٹ والی عورت نے تحفے میں دیے تھے۔

سرجی ان بلند و بالا جگمگاتی عمارتوں کو دیکھ کر بہت خوشی اور حیرانگی سے یہ کہتے سنے گئے۔ "ان عمارتوں کو بنانا سر سے کنواں کھودنے کے برابر ہے۔"

اب یہ سر سے کنواں کھودنے والی بات ہماری سمجھ میں بالکل نہ آئی تو کسی مڈل اسکول کے استاد کی طرح انہوں نے سمجھایا کہ اس کا مطلب ہے کہ جان جوکھوں کا کام ہے۔

شہباز بڑبڑایا کہ آسان طریقے سے جان جوکھوں کا کام بھی تو کہہ سکتے تھے تو کہنے لگے۔ "سکھائے پوت دا بار نہیں جاتے۔" اب ہم دونوں اپنا سر پکڑے ان سیڑھیوں پر بیٹھے تھے اور وہ اس کا مطلب یہ سمجھا رہے تھے کہ جب اپنی عقل نہ ہو تو استاد کی عقل سے بھی کام نہیں چلتا۔

کچھ دیر ہم یہ نظارے دیکھتے رہے اور پھر شہباز کہتا تھا کہ اس نے خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہ مقام اتنا پُررونق اور اتنی زیادہ روشنیوں سے منور ہوگا۔ میرا اپنا بھی یہی خیال تھا۔ اگر ٹائم اسکوائر کو نکال دیا جائے تو شکاگو کا ڈاؤن ٹاؤن کئی درجے مجھے بہتر لگا۔ شکاگو میں مشی گن لیک کے کنارے سے ڈاؤن ٹاؤن کا منظر اور اس کی اسکائی لائن جتنی خوبصورت نظر آتی ہے وہ سان فرانسسکو میں بھی نظر نہیں آتی اور نہ دریا ہڈسن سے نیویارک میں نظر آتی ہے۔ کم از کم میرا اپنا یہی مشاہدہ ہے۔

رونق ابھی تک ٹائم اسکوائر پر ویسی تھی جیسے تین گھنٹے پہلے نظر آ رہی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا اور ہم تھک بھی چکے تھے۔ شہباز تو سیڑھیوں پر لیٹ گیا۔ سرجی بولے۔ "میرا خیال ہے کہ واپس ہوٹل چلتے ہیں۔" پھر شہباز کو لیٹے دیکھ کر بولے۔ "اس سے پہلے کہ اس کے خراٹے گونجیں اور ہم دھر لیے جائیں، ہمیں جلد یہاں سے کھسک لینا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "اس کے خراٹے لینے پر ہم کیوں دھر لیے جائیں گے؟"

کہنے لگے۔ "آپ کو نہیں لگتا کہ جیسے کوئی بم پھٹنے والا ہو۔"

ہوٹل ہم پانچ منٹ میں پہنچ گئے۔ ٹائم اسکوائر کے پیچھے کا علاقہ ویران پڑا تھا۔ ہو کا عالم تھا۔ ہوٹل میں ہمارے کمرے کے آرام دہ بستر ہمیں ایک انعام اور عنایت کی طرح لگتے تھے اور جب لیٹے تو تھکاوٹ کی وجہ سے نیند میں چلے گئے۔

میری آنکھ لگی ہی تھی کہ سرجی نے جھنجوڑ دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔ وہ حواس باختہ ہو رہے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

ان کی حالت دیکھ کر میں جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ ساتھ ہی ساتھ زبان سے نکلا۔ "خیریت کیا ہو گیا؟"

"برابر والے روم میں تین نہایت حسین و جمیل لڑکیاں ٹھہری ہوئی ہیں۔"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

میں ان سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ پولیس آ گئی۔

پولیس کا نام سنتے ہی میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

(جاری ہے)

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
کتب خانے

ایاز راہی

زندہ قومیں اپنی ایک پہچان رکھتی ہیں۔ علم کا ورثہ محفوظ رکھتی ہیں تاکہ آنے والی نسل اپنی جڑوں، اپنی تاریخ سے آگاہ رہ سکیں لیکن اب کوئی اس نکتے پر غور و فکر ہی نہیں کرتا۔

ایک مختصر سی مگر نہایت اہم تحریر

دین اسلام (سلامتی کی راہ) کی ابتدا اقرا (پڑھیے) سے ہی ہوتی ہے۔ پڑھنا یا مطالعہ کا مفہوم بڑا وسیع اور جامع معنوں کا حامل ہے۔ سرسری مطالعہ، رسمی مطالعہ۔ غور و فکر کے ساتھ مطالعہ۔ تدبر و تحقیق کی نیت سے مطالعہ وغیرہ۔ مطالعہ کتاب کا ہو یا صفحۂ ہستی (کائنات) کا۔ دو آنکھوں کی طرح دونوں ہی لازم و ملزوم ہیں کسی ایک کا نہ ہونا بدصورتی اور کج روی ہی کہلائے گی۔ سو جب تک صحیفۂ ہستی (کائنات) رہے گا کتاب کا وجود اس میں ہیرے کی مانند جگمگاتا رہے گا۔

قرآن حکیم کو پہلے کتاب ہی کی صورت محفوظ کیا گیا بعد میں آج کے جدید ترین ذرائع اپنائے گئے۔

کتاب کا ذکر ہو تو کتب خانے کا خیال لامحالہ ذہن میں آتا ہے کہ تمدنی معاشرت میں جہاں انسانوں کے شہر اور ممالک وجود میں آتے ہیں وہیں حوروں کی بستی (کتب خانہ) بھی حسن و خیر کے لیے نمو پاتی اور گوہرِ شب تاب کی مثل جہالت کے اندھیروں میں جگمگاتی ہے۔ اس ضمن میں قبل از مسیح کے قدیم کتب خانہ سکندریہ (مصر) سے متعلق کچھ معلومات اور ایک دو باتیں نذر قارئین ہیں۔

مقدونیہ (یونان) کے سکندرِ اعظم 356 ق م تا 323 قبل از مسیح) نے جب مصر فتح کیا تو وہاں اپنے نام پر ایک شہر بسایا جسے سکندریہ شہر کہا گیا۔ یہ شہر قاہرہ سے 118 میل دور شمال مغرب میں بحیرہ روم کے کنارے پر بنا۔ یہاں آبی بندرگاہ اور بحری فوج کے لیے اڈا بھی تعمیر ہوا۔ سکندرِ اعظم نے اسی کو مصر کا دارالخلافہ قرار دیا۔ سکندرِ اعظم کے بعد خاندانِ بطالمہ کا دور شروع ہوا جس کے حکم راں علم کی فراوانی اور قدر دانی کے باعث مشہور ہوئے۔ یوں شہر سکندریہ نے بہت ترقی کی اور رونق پائی۔ حکیم بطلیموس (323 ق م تا 283 قبل از مسیح) نے فاروس جزیرہ پر ایک بہت بڑا مینار بنوایا جو دنیا کے سات عجائبات میں گنا جاتا تھا۔ یہ مینار بھی سکندرِ اعظم کی طرف منسوب تھا۔ اس مینار کو فارسی میں آئینہ سکندری کہتے ہیں۔ دوسری طرف حکیم بطلیموس سوطر نے شہر سکندریہ میں ایک بہت بڑا کتب خانہ بنوایا جس میں آگے چل کر سات لاکھ کے قریب کتابیں ذخیرہ ہوئیں یوں سکندریہ شہر اس وقت پوری دنیا میں علم اور سائنس کا مرکز بنا۔ یہاں اپنے وقت کے ذہین ترین عالم۔ حکیم (سائنسدان) ماہر اور فلسفی غور و فکر میں مصروف رہتے تھے جس میں اقلیدس، اپولونیس اور ہیرون زیادہ مشہور ہوئے۔ یہ لوگ سرتاپا علم و کتاب کے آدمی تھے۔ یہاں دور دراز سے کتابیں خرید کر لائیں اور جمع کی جاتی تھیں۔ اس کتب خانے میں دس بڑے کمرے تھے جن میں نباتاتی باغ) فلکی رصدگاہ، چڑیا گھر اور جراحی کے آلات کے لیے الگ الگ کمرے تھے۔ اسی طرح حکمت (سائنس) اور بحث و گفتگو کے لیے بھی علیحدہ کمرے مخصوص تھے۔

اس کتب خانے سے متعلق ایک دو باتوں کا تذکرہ یہاں ایک ماہر ریاضی داں خاتون استاد تھی اس کا نام ہائی پیشیا تھا جسے پہلی ریاضی داں خاتون کہا جاسکتا ہے۔ سکندریہ شہر کے تھیون نامی ایک فلسفی اور ریاضی دان کے گھر 370 عیسوی میں ہائی پیشیا نے جنم لیا جو بے حد خوبصورت اور ذہین بھی تھی۔ جوانی میں ہی اس نے فلسفہ، طبیعات اور علم ریاضی پر عبور حاصل کرلیا، یوں صرف تیس برس کی عمر میں ہی تو افلاطونیت کے ایک مدرسے کی سربراہ بن گئی۔ تیسری صدی عیسوی میں تو افلاطونیت ایک فلسفیانہ اور مذہبی نظام تھا جس میں زیادہ تر افلاطون (423 ق م تا 348 قبل از مسیح) کی تعلیمات، مشرقی نظام اور یونانی تصوف کا آمیزہ تھا جس پر بعد میں عیسائیت اثر انداز ہوئی۔ ہائی پیشیا ریاضی اور فلسفہ پڑھاتی رہی۔ اس کی ذہانت، حسن اور قابلیت نے سینکڑوں شاگرد بنائے جو اس سے باقاعدہ درس لیتے تھے اس کے علم کی شہرت اور حسن کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں اس کے لیے رشتے آئے مگر اس نے سب کو ٹھکرا دیا کہ وہ علم و تحقیق کی دل دادہ تھی۔ وہ شب و روز تحقیق و تعلیم میں مصروف رہی۔ چنانچہ شہرت نے پر پھیلائے اور خوش بو بن کے چاروں طرف پھیل گئی اسے مستند استاد کا درجہ مل گیا لیکن بدقسمتی سے اس وقت ملک پر رومیوں کا راج تھا جہاں مذہبی لوگ بہت طاقت ور تھے اور یہ لوگ عقل و حکمت (سائنس) فلسفہ اور ریاضی کو کفر گردانتے تھے۔ علم و حکمت کا چراغ مذہبی جہالت کی زد میں تھا مگر پروانہ علم ہائی پیشیا شمع علم کے گرد رقصاں رہی۔ درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ حکیم بطلیموس کی کتاب المجسطی پر تبصرہ کیا۔ شرح لکھی دیگر بڑے بڑے ریاضی دان اور فلسفہ کی کتابوں کی شرح بھی لکھی جن میں اپولونیس کی مشہور کتاب کونکس اور ڈائفینس کی کتاب ارتھ میٹیکا شامل ہیں۔ اسی طرح سائیس نامی ریاضی دان سے اس عالمہ کی خط کتابت تھی ان خطوط سے ظاہر ہوا کہ ہائی پیشیا نے اضطراب اور ہائیڈرو اسکوپ بنانے میں سائیس کی مدد کی گویا وہ عملی اور تجرباتی حکمت (سائنس) سے بھی آشنا اور باعمل عالمہ تھی۔ ہائی پیشیا ایک رومی گورنر کی گہری دوست تھی جس سے سکندریہ شہر کے بڑے پادری آرچ بشپ سائرل کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ سو اس نے ہائی پیشیا کے قتل کا منصوبہ بنا کر اپنے کئی لوگوں کو اکسایا کہ ہائی پیشیا ابھی تک کفر و الحاد (ریاضی) کی تعلیم دے رہی ہے اور باز نہیں آرہی لہٰذا اس کی یہی سزا ہے کہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تاکہ مزید بے دینی نہ پھیلے۔

415 عیسوی میں ایک روز ہائی پیشیا اپنی بگھی پر سوار کہیں جارہی تھی کہ عقل کے اندھے مذہبی جنونیوں نے اسے بگھی سے نیچے کھینچ کر اتارا اور سمندری گھونگھوں سے بنے

تیز دار ہتھیاروں سے اس کا گوشت کھرچ کھرچ کے اتار ڈالا۔ ہائی پیشیا بری طرح تڑپتی۔ چیختی چلاتی اور دہائیاں دیتی رہی۔ چشمِ فلک نے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔ جب گوشت ہڈیوں سے اتر گیا تو لاش کو جلا دیا گیا۔ ادھر بڑے پادری آرچ بشپ سائرل کا درجہ بڑھا کر اسے سینٹ (ولی اللہ) بنا دیا گیا۔ ہائی پیشیا کے دو اقوال بڑے خیال افروز ہیں۔

1۔ سوچنے کا حق ضرور استعمال کرو اگر تم غلط بھی سوچو گے تو یہ نہ سوچنے سے بہتر ہوگا۔

2۔ توہمات کو سچ جان کر پڑھنے اور عمل کرنے سے زیادہ خطرناک اور خوفناک بات اور کوئی نہیں۔

اسی کتب خانہ سکندریہ سے متعلق ایک غلط فہمی نے سر اٹھایا جو متعصب مسیحی مؤرخین نے مسلمانوں سے متعلق من گھڑت روایت کے طور پر لکھی اور پھیلائی حالانکہ خود غیر متعصب مسیحی مؤرخین نے اس کی مکمل نفی اور تردید بھی کی مگر اس غلط فہمی سے غیر تو غیر اپنے مسلمان علماء بھی نہ بچ سکے اور عقل سلیم کے باوجود غوغائے رقیباں کی زد میں رہے۔

خامہ انگشت بہ دنداں کہ اِسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بہ گریباں کہ اِسے کیا کہیے

متعصب مسیحی مؤرخین نے افسانہ یہ تراشا کہ حضرت عمر (583 عیسوی تا 644 عیسوی) کے عہد میں مصر فتح ہوا تو مسلمان سپہ سالار عمرو بن العاص (585 عیسوی تا 664 عیسوی) نے حضرت عمر کے حکم پر سکندریہ کا کتب خانہ جلا کے راکھ کر دیا جو سراسر بہتان تھا۔

اس ضمن میں خدائے سخن۔ نظم و نثر کے رب النوع مرزا اسد اللہ خاں غالب کا ایک خط اور مولانا غلام رسول مہر (15 اپریل 1895 عیسوی تا 16 نومبر 1971 عیسوی) کی مدلل تردید پیشِ خدمت ہے۔ مرزا غالب کے خطوط اردو ادب کا طرۂ امتیاز ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے بڑی عقیدت سے خطوطِ غالب۔ مرتب کیے ان کی تشریح و توضیح بھی کی لیکن ساتھ ساتھ مبالغہ آرائی کی نشان دہی اور تصحیح بھی کی۔ یہی ان کا ادبی کارنامہ ہے۔ مرزا غالب کا مذکورہ خط مولوی ضیا الدین خاں ضیا دہلوی کے نام ہے یہ خط غالباً اوائل فروری 1866 عیسوی کو لکھا گیا۔ شمس العلما ڈاکٹر مولوی منشی ضیا الدین خاں ضیا دہلوی۔ (بستی دارا پور تحصیل دہلی) کے جاگیردار خاندان میں سے تھے دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ مولوی مملوک العلی نانوتوی اور مفتی صدرالدین آزردہ سے بھی عربی اور فارسی پڑھی پھر دہلی کالج میں مدرس مقرر ہوئے۔ بالآخر عربی کے

2011ء کا نوبل امن انعام تین خواتین کو مشترکہ طور پر دیا گیا ہے جن میں سے دو لائبیریا کی ہیں ایک موجودہ صدر ایلین جانسن سریلیف ہے۔ دوسری حقوق انسانی کے لیے کوشاں لیما گبودی تیسری توکل کرمان۔ توکل عبدالسلام خالد کرمان معروف بہ توکل کرمان یمن کے صوبے تعز (Taiz) واقع موضع مظلاف میں 7 فروری 1979ء کو پیدا ہوئیں۔ تعز، یمن کا تیسرا بڑا شہر ہے اور یمن جیسے قدامت پسند ملک میں علم و ہنر کا گہوارہ ہے۔ توکل کرمان کے والد عبدالسلام کرمان ایک وکیل ہیں اور علی عبداللہ صالح حکومت میں وزیر قانون بھی رہے ہیں پھر انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ توکل کرمان کا تعلق ایک پڑھے لکھے خاندان سے ہے، ان کا بھائی کرمان شاعر ہے اور توکل بھی شعر کہتی ہیں۔ آپ کے شوہر کا نام محمد اسماعیل الکبھی ہے جن سے آپ کے تین بچے ہیں۔

توکل نے یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی سے بی کام کیا، پھر صنعاء یونیورسٹی سے ایم اے سیاسیات کیا۔ تعلیم و تربیت میں ڈپلوما بھی لیا اور پھر امریکا سے صحافت میں ڈپلوما کیا۔ 2005ء میں انجمن صحافی خواتین بلا قیود Women Journalists without chains کی بنیاد رکھی جو یمن میں نہ صرف حقوق نسواں بلکہ انسانی حقوق کے لیے بھی کوشاں ہے جن میں اظہار رائے کی آزادی، پریس کی آزادی اور احتجاج کی آزادی شامل ہیں۔ توکل 2005ء سے اخبار الشورۃ (انقلاب) سے منسلک ہیں۔

مرسلہ: ڈاکٹر سید خالد محمود ترمذی

پروفیسر ہوگئے۔ 1877 عیسوی میں کالج ٹوٹ گیا تو ایکسٹرا اسسٹنٹ ہوگئے۔ آخر پنشن لی۔ مدت العمر پڑھاتے رہے طویل عمر پائی اور 1909 عیسوی کے قریب انتقال کیا مولوی صاحب موصوف کے نام مرزا غالب کا یہ خط خاصا طویل ہے لہٰذا یہاں خط سے مطلوبہ اقتباس ہی درج کیا جائے گا تفصیل خطوط غالب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اسداللہ خاں غالب لکھتے ہیں بہ خدمت والا جناب معظم۔ مسلم علما عرب وعجم۔ مولوی ضیا الدین خاں صاحب ضیا دہلوی نبیرہ نواب سابق بستی وارا پور۔

جناب مولوی صاحب! دو تین ہزار برس قبل آج سے کہ عرب و عجم بے گانہ ہم دگر تھے۔ اہل پارس اپنے مطالب علم بلکہ علوم متنوعہ کو کس زبان میں شروع کیا کرتے تھے؟ اور تعلیم و تعلم و سوال و جواب کا مدار کن الفاظ پر ہوگا؟ بے شبہ وہ الفاظ پارسی ہوں گے۔ جب خلیفہ ثانی کے عہد میں یزدجرد مارا گیا اور پارس پر اعراب مسلط ہوئے۔ درفشِ کاویانی کا جواہر آمیز چمڑہ پارہ پارہ ہوکر غازیان اسلام میں بٹ گیا۔ کتاب خانے پارس کے۔ کیا بادشاہی۔ کیا رعایا کے چولہے میں جھونکے گئے یعنی ان سے حمام گرم ہوئے جیسا کہ میں نے ایک جگہ اس واقعہ کو فارسی عبارت میں لکھا ہے۔

وہی ہذا، کتاب خانہ ہائے پارسیاں افروزینہ گلخن گرمابہ ہائے بغداد شد۔ ہمانا احکام آتش پرستی ہم با آتش باز گشت۔ یہاں مولانا غلام رسول مہر۔ پاورق میں باقاعدہ مدلل تردید کرتے ہیں کہ یہ بیان بھی سراسر نادرست ہے کیونکہ کوئی کتب خانہ تھا ہی نہیں جو لوٹا، جلایا گیا ہو۔ ایسا ہی ایک افسانہ مسیحیوں نے کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق تراشا تھا حالانکہ مدت سے خود مغربی محققین تسلیم کررہے ہیں کہ اصل کتب خانہ (سکندریہ) جولیس سیزر (13 جولائی 100 ق م تا 15 مارچ 44 قبل از مسیح) نے مسلمانوں سے صدیوں پیشتر جلادیا تھا اس کے بعد جو کتابیں جمع ہوئیں وہ قسطنطنیہ کے شہنشاہ تھیوڈوسیس کے فرمان کے مطابق 389 عیسوی میں تباہ کی جاچکی تھیں یعنی مسلمانوں کے ورود سے کچھ کم تین سو سال پیشتر۔ اس اقتباس میں شامل مرزا غالب کے فارسی جملوں کی توضیح و تصحیح مولانا غلام رسول مہر یوں کرتے ہیں کہ یہ عبارت۔ مہر نیم روز۔ کی ہے لیکن اصل بیان کے غلط ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ایران فتح ہوا تو بغداد موجود ہی نہ تھا جب عباسی برسرِ اقتدار آئے تو منصور عباسی (704 عیسوی تا 770 عیسوی) نے بغداد کی بنیاد رکھی یہ فتح ایران سے ایک سو سال بعد کا واقعہ ہے۔

دراصل مرزا غالب کو اپنی فارسی دانی پر بہت ناز تھا جو بجا بھی تھا وہ ہند میں سوائے امیر خسرو (253 عیسوی تا اکتوبر 1325 عیسوی) کے کسی کو کامل شاعر تسلیم کرنے سے ہچکچاتے تھے چنانچہ فارسی سے متعلق کتاب "قاطع برہان" لکھی جس کا منفی و مثبت ردعمل سامنے آیا لوگوں نے جواباً تردیدی و تائیدی رسائل اور کتابیں لکھیں اور لسانی بحث کا بازار گرم ہوگیا۔ اس سلسلے میں اسی خط سے متعلق مزید وضاحت مولانا غلام رسول مہر یوں کرتے ہیں کہ فاضل جلیل مختار الدین صاحب آرزو کا اندازہ ہے کہ مرزا غالب۔ مولوی ضیا الدین صاحب کو قاطع برہان کی بحث میں موید و ہم نوا بنانے کے خواہاں تھے مگر مولوی صاحب خلاف ہی رہے۔ حتیٰ کہ مرزا نے مولوی امین الدین پٹیالوی مولف "قاطع القاطع" کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا جو دعویٰ کیا تھا اس میں بھی مولوی ضیا الدین نے خلاف گواہی دی۔ ہتک آمیز فقروں کی توجیہہ ایسی کردی کہ وہ بے ضرر سے معلوم ہوں۔ فارسی پر مکمل قدرت رکھنے کی بنا پر مرزا غالب فارسی زبان کے بارے میں کس قدر حساس تھے اس کا اظہار بھی انہوں نے اسی خط میں کیا ہے۔ ذرا آخر میں مرزا کا یہ شذرہ بھی ملاحظہ کیجئے گا (آگے چل کر لکھتے ہیں اعیانِ عجم و بلغائے عرب نے فارسی و عربی کو باہم ربط دے کر ایک اردو پیدا کیا۔ سبحان اللہ۔ وہ زبان نکلی کہ نہ نری فارسی میں وہ خزانہ۔ نہ نری عربی میں وہ ذوق۔ زبانِ فارسی قواعد کے کتب خاکستر ہوگئے تھے اس میں طرہ یہ کہ عربی قواعد کے بڑے بڑے جلیل القدر رسالے مرتب ہوگئے تھے اور ہوتے جاتے تھے۔ بے چارہ فارسی زبان غریب الوطن بے سروسامان۔ نہ اس کی کوئی فرہنگ نہ اس کے قوانین کا کوئی رسالہ۔ نہ علم پارسی کا کوئی عالم باقی۔ دو چار ہزار لغت واسم ومثلِ زبان زد اہل عصر ہوں گے۔ فارسی کا حرف کہاں؟ فارسی کا نمونہ کہاں؟ فارسی زبان اعراب کی لونڈی۔ جو چاہا نام رکھ دیا۔ ضوالنہار کہہ کر پکارا۔ شمس النہار کہہ کر یاد کیا اور لونڈی چھوکری کہہ کر بلالیا۔ سو بھی جو اکابر فریقین مؤجد زبان اردو ہوئے تھے۔ وہ تسمیہ قواعدِ پارسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ 800 ہجری۔ 900 ہجری میں ہوس ناک لوگ فارسی کے فرہنگ لکھنے پر متوجہ ہوئے۔ نہ ایک نہ دو بلکہ ہزار در ہزار فرہنگیں فراہم ہوگئیں۔ یہاں مولانا غلام رسول مہر پھر پاورق میں وضاحت کرتے ہیں کہ یہ بیان بداہتہ مبالغے پر مبنی ہے۔

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہنری ملاح

طارق عزیز خان

جہاز رانی کو فروغ دینے میں عرب کے باشندوں نے بھرپور کوشش کی لیکن یورپ سے بھی کئی ایسے نام آتے ہیں جنہوں نے اس صنعت کو اوج پر پہنچایا۔

ایک شہزادے کا تذکرہ جس نے جہاز رانی کو نئی جہت دی

پرتگال کے بادشاہ جان اول (1357-1433) کا بیٹا شہزادہ ہنری، جو تاریخ میں ہنری ملاح کے نام سے مشہور ہے۔ وہ پہلا یورپین تھا کہ جس نے 15ویں صدی عیسوی کے دوران یورپی جہاز رانی میں نئی نئی جہتیں روشناس کروائیں۔ اس نے ملاحوں کی تربیت کا ایک پروگرام شروع کیا جس کے نتیجے میں شمالی بحراوقیانوس میں دریافتوں کے سنہری دور کی شروعات ہوئیں۔

14ویں صدی عیسوی کے دوران یورپ میں کرۂ ارض

پرتگلی کے تین بڑے خطوں (براعظم) کے ہونے کا نظریہ مشہور تھا۔امریکا کے وجود سے بے خبر یورپین اقوام کی دلچسپی کا محور و مرکز مشرق میں واقع ایشیائی سرزمین تھی اور ان کا ایشیا سے رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ ایشیائے کوچک کا زمینی راستہ سلک روٹ اور رومن انڈیا روٹ (بحیرہ روم، بحیرہ احمر اور بحیرہ عرب کا بحری راستے) تھا۔ بدقسمتی سے دونوں مروجہ راستوں پر عثمانی ترکوں اور اطالوی تاجروں کی اجارہ داری قائم ہونے کی وجہ سے مغربی یورپ اقتصادی بدحالی کا شکار تھا۔اپنی بیمار معیشت کو سہارا دینے کے لیے مغربی یورپ کی دو بڑی طاقتوں اسپین اور پرتگال اس کوشش میں تھے کہ ایک دوسرے سے پہلے اپنے دریافت کردہ بحری راستوں سے ایشیائی منڈیوں تک رسائی حاصل کرلیں۔ اسپین سے رقبے، آبادی اور وسائل میں کم تر ہونے کے باوجود پرتگال کا محل وقوع جہازرانی کی صنعت کے فروغ میں معاون تھا۔ 1381ء میں جان اول نے پرتگالی حکومت کی باگ دوڑ سنبھالنے کے بعد ہندوستان تک رسائی کے نئے بحری راستے کو دریافت کرنے کی منصوبہ بندی شروع کی۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں اس کے بیٹے ہنری کے تربیت یافتہ ملاحوں نے بحراوقیانوس میں دریافتوں کے دور کی بنیاد رکھی۔

ہنری 4 مارچ 1394ء میں پرتگال کی بندرگاہ اوپورٹو میں پیدا ہوا۔وہ پرتگال کے بادشاہ جان اول اور انگلستان کے بادشاہ ہنری چہارم کی بہن فلیپا کی تیسری اولاد تھا۔ ہنری کا بچپن مغربی پرتگال میں بحراوقیانوس کی لہریں گنتے ہوئے گزرا۔اسے 1410ء میں پرتگال کی بحریہ میں بطور ملاح بھرتی کیا گیا۔تاہم جغرافیہ اور جہازرانی سے متعلق اپنی قابلیت کے بل بوتے پر وہ جلد ہی کپتان کے عہدے پر پہنچ گیا۔اُس نے 1415ء میں شمالی مراکش میں واقع سیوٹا کی اہم بندرگاہ پر قبضے کی مہم میں حصہ لیا۔آنے والے برسوں کے دوران ہنری کی توجہ ہندوستان تک رسائی کے بحری راستے کی دریافت پر مرکوز رہی۔1418ء میں شہزادہ ہنری دارالحکومت لزبن میں تھا کہ اسے پرتگالی مہم جو، جوآؤ گون کیلوس زارکو (Joao Goncalves Zarco) کی طرف سے شمالی بحراوقیانوس میں خط استواء سے 32 ڈگری شمال اور 16 ڈگری مغرب پر واقع میڈیرا کے جزیرے کی دریافت کی خبر ملی۔ پرتگالی ساحلوں سے 900 کلومیٹر جنوب اور مراکش سے 650 کلومیٹر مغرب میں واقع 794 مربع کلومیٹر رقبے پر مشتمل میڈیرا وہ مقام تھا جہاں سے مشرق میں آبنائے جبل الطارق اور جنوب مغرب میں بحراوقیانوس کے بحری راستوں کو کنٹرول کیا جاسکتا تھا۔میڈیرا کی دریافت نے ہنری کی سوچ کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔

اس نے یہ اندازہ لگانے کے بعد کہ بحراوقیانوس کی مغربی وسعت کو شکست دینا فی الحال ایک پُرخطر اور مہنگا منصوبہ تھا، جنوب کی طرف سے بحراوقیانوس کو پار کرنے کی منصوبہ بندی شروع کی۔ ہنری نے سوچا کہ اگر لمبے فاصلے طے کرنے والے بحری جہازوں کے ساتھ ساتھ قابل مہم جوؤں کی ایک ٹیم تیار کی جائے تو مستقبل میں افریقا کے گرد گھوم کر ہندوستان تک رسائی کا بحری راستہ دریافت کیا جاسکتا ہے۔

1420ء میں ہنری کی تحریک پر پرتگالی مہم جو، بارتولومیو پیرسٹریلو اور ٹرسٹاؤ ویز ٹیکسیرا نے میڈیرا میں پہلی پرتگالی کالونی کی بنیاد رکھی۔اسی سال پرتگالی بادشاہ جان اول نے ہنری کو جنوبی پرتگال پر مشتمل صوبے الگاریو کا گورنر مقرر کردیا۔

25 مئی 1420ء کو پرتگالی بادشاہ کی طرف سے ہنری کو حکومت کے اہم عہدوں پر تقرری کے اختیارات حاصل ہوگئے۔ہنری نے اپنے ان اختیارات کو جہازرانی سے متعلق اپنے منصوبوں کی تکمیل کے لیے فنڈ اکٹھا کرنے کی غرض سے استعمال کیا۔اس نے جنوبی پرتگال کے علاقے کیپ ساؤسین ٹے کی بندرگاہ ساگریس میں نہ صرف یورپ بلکہ دنیا کے اولین "جہازرانی کے اسکول" کی بنیاد رکھی۔ہنری نے پرتگال بھر سے چن چن کر مہم جوئی کے شوقین افراد کو اس اسکول میں بھرتی کیا اور انھیں جہازرانی اور مہم جوئی کی تربیت دی۔

ہنری کے زمانے میں یورپ میں بادبانی بحری جہازوں کی ایک قسم "کاراک" اور "کیراول" منظرعام پر آچکی تھیں۔ یہ دونوں اقسام کے بحری جہاز دسویں صدی میں سکنڈے نیویا میں چلنے والے وائی کنگ اور 13ویں صدی میں شمال مغربی یورپ میں چل رہے کوگ بحری جہازوں کی ترقی یافتہ شکل تھے۔ ہنری نے اپنے اسکول میں کیراول بحری جہازوں کے نئے ڈیزائن کی تیاری کا کام شروع کیا۔اس نے جہازرانی سے متعلق نئے نئے اصول وضع کیے اور سمندری سفر میں مددگار قطب نما، نقشے اور بحری چارٹ تیار کیے۔وہ 1425ء تک ایسے کیراول بحری جہازوں کے ڈیزائن تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا جو محفوظ اور لمبے سفر کے لیے موزوں تھے۔ اُن بحری جہازوں کی لمبائی 75 سے 90 فٹ، چوڑائی 40 فٹ تک اور وزن 60 ٹن کے قریب تھا۔ہوا موافق ملنے پر وہ

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

تقریباً 7 کلومیٹر فی گھنٹا (3.78 ناٹ فی گھنٹا) کی رفتار سے سفر کر سکتے تھے۔ دو منزلوں پر مشتمل ان بحری جہازوں پر چھ بڑے بادبان لگانے کے تجربات کیے گئے۔ نئے کیراول جہازوں کی تیاری کے بعد ہنری کے تربیت یافتہ جہاز رانوں نے شمالی بحراوقیانوس اور افریقا کی مغربی ساحلی پٹی کی دریافت کا کام شروع کیا۔

1427ء میں پرتگالی مہم جو، گونکالو ویل ہو نے پرتگال سے 1400 کلومیٹر مغرب جبکہ خط استواء سے 37 ڈگری شمال اور 25 ڈگری مغرب کے خط پر واقع جزائر ایزورس کو دریافت کیا۔ 1433ء میں جان اول کے انتقال کے بعد نئے پرتگالی بادشاہ افانسو پنجم کی حمایت اور حوصلہ افزائی سے ہنری نے اپنا کام جاری رکھا۔ 1434ء میں اس کے شاگرد گل ایئس نے جنوبی مراکش میں واقع کیپ بوجاڈور کی براعظمی نوک دریافت کی۔ 1441ء میں نونو ٹرسٹاؤ اور ایئن تاؤ گون کیلوس نے جنوبی مراکش اور موریطانیہ کی سرحد پر واقع کیپ بلانک کو دریافت کیا۔ 1443ء میں پرتگالی بحریہ نے موریطانیہ کے ساحلوں کو دریافت کیا اور 1448ء میں کیپ آرگوئن کے علاقے میں ایک فوجی قلعہ تعمیر کیا۔ 1444ء میں ڈی نس ڈیاس نے سینی گال کے ساحلوں پر راس ورٹ (Cape Vert) اور 1446ء میں مغربی افریقا میں دریائے گیمبیا (Gambia) کا دہانہ دریافت کیا۔ 1450ء کے عشرے میں پرتگالیوں کو سینی گال کے ماہی گیروں نے شمالی بحراوقیانوس میں واقع جزائر کیپ ورڈے کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ 1455ء میں ایلوائس کاڈاموسٹو نے کینارے کے جزائر کی سیاحت کی جنھیں فرانسیسی ملاح 1334ء میں دریافت کر چکے تھے۔ کاڈاموسٹو نے 1456ء میں پرتگال سے 2500 کلومیٹر جنوب اور سینی گال سے 550 کلومیٹر مغرب میں واقع کیپ ورڈے کے جزائر کو دریافت کیا۔ 1460ء کے آغاز پر پیڈرو ڈی سینٹرا نے مغربی افریقا میں خط استواء سے 8 ڈگری شمال اور 12 ڈگری مغرب پر واقع سیرالیون کے موجودہ علاقے کو دریافت کیا۔ افریقا کی مغربی ساحلی پٹی کی دریافت کے بعد اب شہزادے ہنری کی نظریں جنوبی بحراقیانوس پر مرکوز تھیں۔ وہ جنوبی افریقا کی طرف ایک مہم روانہ کرنے کی سوچ رہا تھا کہ 13 نومبر 1460ء کے دن 66 سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔

شہزادے ہنری کی وفات کے بعد پرتگالی حکومت نے میڈیرا، ایزورس اور کیپ ورڈے کے ساتھ ساتھ مغربی افریقا کی تین ہزار کلومیٹر طویل ساحلی پٹی پر اپنا قبضہ مستحکم بنانے پر توجہ دی۔ جس کے بعد شمالی بحراوقیانوس میں ان کے کیراول بحری جہاز دندناتے پھر رہے تھے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہنری سے 2 ہزار سال پہلے فرعون مصر نیچو کا بیڑہ رکار بحری ملاح ہنو، افریقی ساحلوں کی چھان بین کر چکے تھے۔ تاہم ہنری کے مقابلے میں قدیم افریقی مہم جوؤں کی دریافتوں کے اثرات محدود رہے۔ ہنری کے ڈیزائن کردہ جدید کیروال بحری جہازوں کے مقابلے میں ان کے کمزور بحری جہاز اس قابل نہیں تھے کہ بحراوقیانوس کی وسعتوں میں مزید کوئی نئی کھوج بین کرتے۔ شہزادہ ہنری نے بذات خود کسی علاقے کی دریافت میں حصہ نہیں لیا، تاہم جہاز رانی اور مہم جوئی سے متعلق اس کی خدمات کو دیکھتے ہوئے اسے ''ہنری ملاح'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ 1960ء میں ہنری کے 500ویں یوم وفات کے موقع پر پرتگال کے دارالحکومت لزبن کی بندرگاہ کے قریب دریائے ٹاگوس کے دہانے پر دریافتوں کی ایک عظیم الشان یادگار کا افتتاح کیا گیا۔ ہنری کی صلاحیتوں کو خراج تحسین پیش کرتی یہ سنگی یادگار ایک بڑے بحری جہاز کے اگلے کھلے حصے کی ہے جس میں ہنری کو مہم جوؤں کے ایک گروپ کی قیادت کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

گزشتہ ایک صدی میں جو سائنسی ایجادیں منظر عام پر آئیں ان میں سنیما کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے، اگرچہ آج ہمارے لیے سنیما عجوبہ نہیں ہے لیکن انیسویں صدی کے آخر میں جب اس کی ایجاد ہوئی تھی تو دنیا کے لیے یہ معجزے سے کم نہ تھا۔ فوٹوگرافی کی ایجاد سے عکس کو دیرپا بنا دیا گیا تھا لیکن اس کو متحرک بنانے میں کئی برس تک کئی سائنسداں سرگرداں رہے۔ متحرک فلموں کی کہانی اس لحاظ سے ایک بہت ہی دلچسپ داستان ہے۔

سنیما کا پہلا مرحلہ تھا کنیماٹوگراف جو 19 ویں صدی کے آخر میں ایجاد کیا گیا۔ کنیما (Kinema) دراصل یونانی لفظ ہے جس کے معنی حرکت کرتی ہوئی تصویریں ہیں۔ بہت عرصے تک یورپی میں کنیماٹوگراف لفظ رائج رہا لیکن بعد میں فرانسیسی لفظ ''سنیماٹوگراف'' چل پڑا۔

مرسلہ: زاہد علی زاہد۔ کراچی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

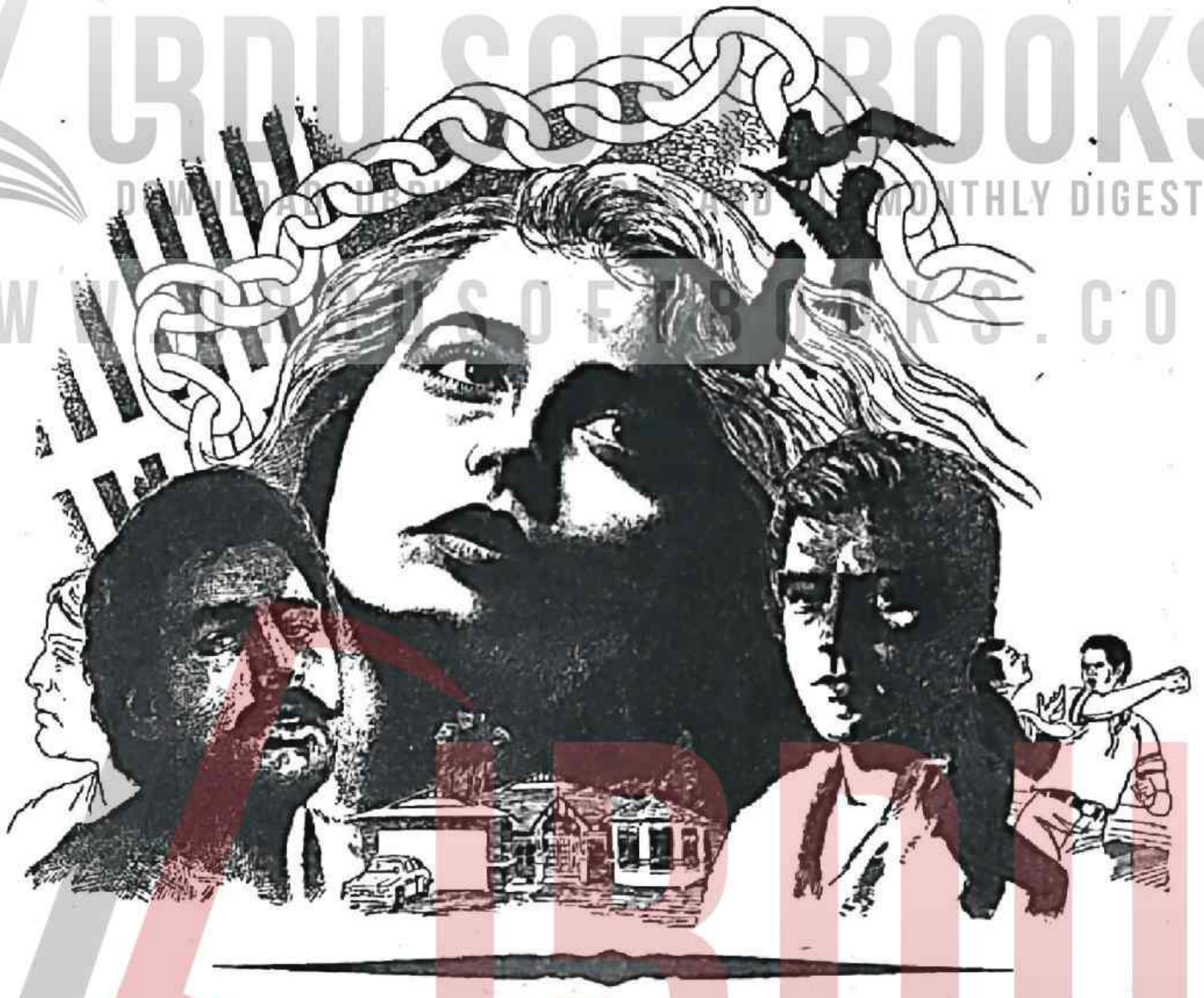

قسط نمبر: 5

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

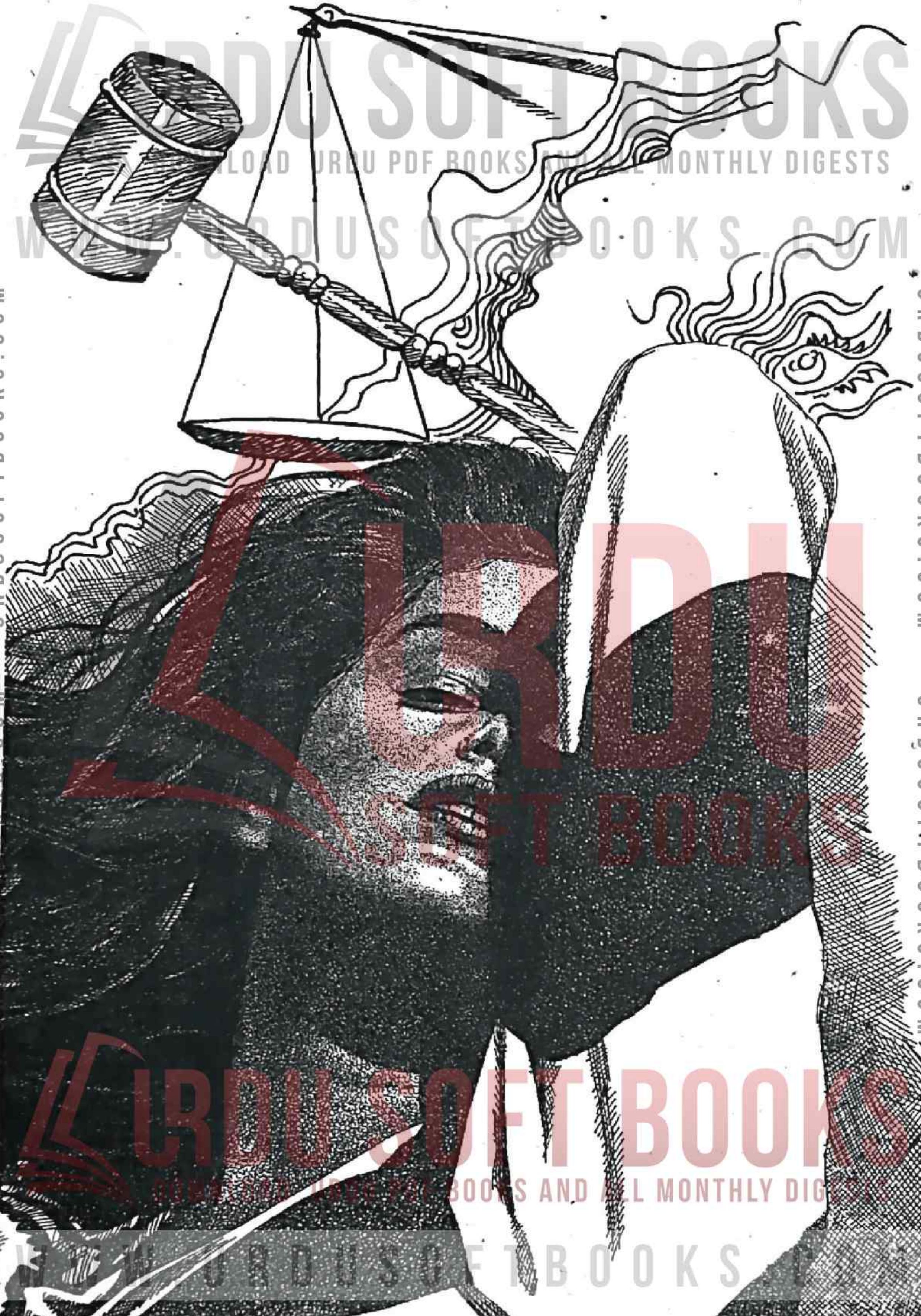

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
URDUSOFTBOOKS.COM
URDUSOFTBOOKS.COM
URDUSOFTBOOKS.COM
URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

(گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

رانا بشیر کی بیوی کا قتل ہو گیا تھا اور الزام آیا تھا احمد حسین پر۔ اس جرم میں اسے پھانسی ہو گئی۔ احمد حسین کا بیٹا نعمان ایڈووکیٹ زنیرہ کے ساتھ مل کر اصل قاتل کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران رانا بشیر اپنی بیٹی کے ساتھ نعمان کے دروازے پر پہنچا۔ وہ معافی مانگنے آیا تھا کیونکہ اب اسے بھی لگ رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ایک لاری اڈے کی یونین میں نائب ضلعی صدر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ اڈا ختم ہو جائے اور اس کی زمین پر عمارت بنا کر فروخت کی جائے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ تندہی سے کام کر رہے تھے لیکن ان کی چال نعمان انہی پر الٹ دیتا۔ ابھی وہ اس مسئلے پر غور کر ہی رہا تھا کہ رانا بشیر کی بیٹی نے اسے ایک ڈائری دی جو مقتولہ کی تھی جس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ قاتل کوئی اور ہے۔ نعمان ان دونوں مسئلوں پر کام کر ہی رہا تھا کہ ایک دن اس کے بھائی نعیم نے اس سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا کہ ہم ایک جوان بہن کے بھائی بھی ہیں اس کے لیے کچھ سوچنا چاہیے پھر اس نے کہا کہ میں نے بہنا کو اکثر رات میں کسی سے فون پر بات کرتے دیکھا ہے۔ باتوں سے لگا کہ وہ کسی کو پسند کرنے لگی ہے۔ نعیم کے جانے کے بعد میں سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ فرحانہ کا میسج آ گیا کہ اسے ڈائری کا پارٹ ٹوٹل گیا ہے۔ اگلے دن زنیرہ کے ساتھ میں فرحانہ کے گھر گیا تو ڈائری کے واقعات سنے جس نے رفعت قتل کے واقعے کو مزید الجھا دیا تھا۔ اس دن میں اڈے پر بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ آ گئے۔ ان میں عزیز خان بھی تھا جس پر اختر کی بہن ثوبیہ کی گمشدگی کا ذمے دار سمجھا جا رہا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

میری نظریں عزیز خان کے چہرے پر جم سی گئی تھیں اور اندر سے میرا پورا وجود، جیسے دل کے ساتھ ہی دھک ......دھک سا کرنے لگا تھا۔ وہ نہ صرف اس تصویر والے نوجوان کے نقوش سے ملتا جلتا تھا جو میں نے یونیورسٹی کے ایڈمن بلاک سے اس کا ڈیٹا فارم سے حاصل کی تھی، بلکہ اختر نے بھی مجھے عزیز خان نامی جس نوجوان کا حلیہ بتایا تھا یہ عزیز خان اس پر بھی پورا اترا تھا۔

بہرکیف...... میں نے فوراً اس کے بشرے سے نظریں ہٹالی تھیں اور ٹھیکے دار سائیں رکھو سمیت باری باری ان سب کے چہروں پہ ایک کاروباری سی مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی...... تعارف کا سلسلہ تو ہو چکا، اگر مناسب سمجھا جائے تو کچھ کاروبار کی بات کی جائے۔''

اس دوران میں ان تینوں نوجوانوں کے چہروں کا بڑے غور سے جائزہ بھی لے چکا تھا۔ یہ تینوں مجھے ''اینگری ینگ مین'' ٹائپ کے نوجوان دکھائی دیتے تھے۔ عموماً ایسے ''رئیس زادوں'' کے مشاغل کچھ اور ہوتے ہیں، یعنی موج مستی، سیر سپاٹے اور بیش قیمتی گاڑیوں میں ہائی فائی ساؤنڈ سسٹم کے اسپیکروں ڈیک پر اونچی آواز میں ڈسکو گیت سننا، وغیرہ...... یہ بھلا کیوں اور کیسے خود کو اس عمر میں کاروباری جھمیلوں میں ڈال رہے تھے؟ یا پھر ان کے ''بڑوں'' نے انہیں اس قسم کی آوارہ گردیوں سے بچانے کے لیے انہیں کام میں معروف رکھنے کا یہ طریقہ نکالا تھا؟ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ واقعی خود پیسا کمانا چاہتے ہوں اور ساتھ ہی کاروبار کو ایک مہم جوئی کے طور پر کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے ہوں۔

دوسری جو سب سے اہم بات میرے نزدیک تھی وہ میرے دیدہ و نادیدہ دشمنوں کی کوئی ''پلاننگ'' سازش تھی، ضروری نہیں تھا کہ یہ تینوں ہی میرے دشمنوں کے مہرے ہوں، ان میں سے کوئی ایک مہرہ ہو سکتا تھا اور وہ مہرہ مجھے جاگیر دار مہران خان کا یہ لاڈلہ بیٹا...... عزیز خان ہی لگتا تھا اور باقی دونوں اس کے دوست شاہ نواز اور بشیر خان تھے۔ تاہم ابھی اپنے ان خدشات پر میرا پوری طرح یقین کرنا، قبل از وقت ہی تھا مگر موجودہ حالات کے پیش نظر یہ سب سوچنا از بس ضروری بھی تھا۔

میبنہ طور پر شاہ نواز تو جامشورو کے کسی وڈیرے میر لکھ میر خان کا داماد تھا، جو مقابلتاً قدآور اور کسرتی جسم کا مالک تھا، رنگ گورا تھا، نقوش پُر وجیہہ تھے۔ بشیر جان درمیانے قد و قامت کا تھا، وہ کسی زمیندار کی اولاد تھا جبکہ عزیز خان تھوڑا ہلکے قد کا مگر خوب گھٹی ہوئی جسامت کا حامل نوجوان نظر آتا تھا، اس کا رنگ بھی گہرا سانولا تھا۔ آنکھیں چھوٹی اور مکارانہ تاثرات کی جھلک دیتی محسوس ہوتی تھیں۔ ان تینوں نے کاٹن کی بیش قیمت مکلف شلوار قمیص زیب تن کر رکھی تھیں۔

جب عزیز خان نے اپنے باپ حاجی مہران خان کا نام بتایا تو میں نے دزدیدہ نظروں سے اپنے قریب بیٹھے چاچا انور شاہ کی طرف دیکھا تھا، مقصد صرف ان کا ردعمل

دیکھنا نہیں تھا لہٰذا جب انہوں نے قدرے چونک کر میری جانب دیکھا تو میں نے انہیں آنکھ کے ہولے اشارے سے خاموش رہنے کا کہا اور یہی میرا اصل مقصد بھی تھا کہ کہیں وہ حاجی مہران خان کے نام پر اپنے منہ سے کچھ بول نہ پڑیں۔ میری آنکھ کے اشارے پر ان کی بے چینی کچھ کم ہوئی تھی۔ کیوں کہ وہ مجھ پر پورا بھروسا کرتے تھے۔ جانتے تھے کہ مجھے خطرات سے بچ کر اپنی منزل کا راستہ بنانا بہ خوبی آتا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بالخصوص عزیر خان، میری جانب بڑے غور غور سے تکے بھی جا رہا تھا۔

میں نے حال ہی میں ''اسکائی شاپ'' سے ایک خفیہ کیمرا پن خرید رکھا تھا۔ اسکائی شاپ کی خصوصی پروڈکٹ کے پبلسٹی میسج سیل فون پر اکثر آیا کرتے ہیں، میں نے ان کی ہوم ڈلیوری سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ خفیہ کیمرا پن فون کر کے منگوایا تھا۔ یقیناً یہ ایک عام آئٹم تھا اور کوئی بھی اسے اس کی مخصوص ساخت سے پہچان سکتا تھا، اسی لیے میں نے اس کی ساخت کافی حد تک چینج کر دی تھی اور اب یہ اصل سے کافی مختلف دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ پن اس وقت بھی میری جیب میں اٹکا ہوا تھا۔ میں نے یوں ہی اپنی شرٹ کی جیب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کے دوران اسے آن کر کے اس کی مائکرو لینس کا رخ ایک محتاط اندازے سے عزیر خان کی طرف موڑ کر اس کی مختلف زاویوں سے چند تصاویر اور مختصر سی ویڈیو کلپ بھی لے لیں۔

کاروباری گفتگو کی ابتداء کرتے ہوئے سائیں رکھیو نے میری طرف دیکھ کر اپنے ساتھ آئے ان تینوں نوجوانوں کی نمائندگی کے طور پر مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ''نعمان صاحب! ہمارے آنے کا مقصد تو آپ کے علم میں پہلے ہی آچکا ہوگا، اب ملاقات بھی ہو گئی اور تعارف بھی ہوتا گیا، میرا خیال ہے اب کاروبار کی بات ہو جائے تو بہتر ہوگا۔''

''جی رکھیو صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔'' میں نے اس کی بات کے اختتام میں اس کی طرف دیکھ کر فوراً کہا۔ اس دوران دو سونے چائے اور کچھ بسکٹ وغیرہ وہاں میز پر سجا دیئے تھے۔

تھوڑے توقف کے دوران میں نے انہیں چائے پینے کا کہا اور سائیں رکھیو کے جواب میں اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''رکھیو صاحب! مجھے آپ لوگوں سے کاروباری مراسم رکھنے میں خوشی ہوگی اگر بات ان معاملات کو سنجیدگی سے لینے کی ہے تو میں بھی آپ لوگوں سے کچھ کہنے کی کوشش کروں گا، اس اُمید پر کہ آپ لوگ یقیناً برا نہیں منائیں گے، کیوں کہ ابھی تک ہمارے درمیان کوئی بات فائنل نہیں ہوئی ہے۔''

''نہیں، اس میں بھلا برا ماننے کی کون سی بات ہے۔'' اس بار سائیں رکھیو کے قریب والی کرسی پر براجمان شاہ نواز نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''یوں بھی کاروبار اور باہمی اعتماد کے لیے یہی ضروری ہوتا ہے کہ جو بات ہو وہ پہلے ہی کلیئر کر دی جائے۔ یہ اچھا ہوتا ہے۔''

''میں یہی چاہ رہا تھا۔'' میں نے اس کی تائید میں گردن ہلائی اور اضافہ کیا۔

''درحقیقت ہمیں آپ کی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے، ہم خود بھی یہی چاہتے ہیں کہ اچھا ہے عوام کو سواری کے ساتھ ساتھ یہاں کاروباری لوگوں کو بھی ترسیل کی سہولیات میسر آتی رہیں، لیکن اگر یہ معاہدہ کرایہ جات کی بجائے خالصتاً پارٹنر شپ پر کی جائے تو میرا خیال ہے زیادہ بہتر ہوگا۔'' بالآخر میں نے اس ہونے والے معاہدے کی اصل غایت ظاہر کر ڈالی۔ کمرے میں تھوڑی خاموشی کا وقفہ گزرا، اس کے بعد عزیر خان نے میری طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

''ہم پہلے ہی سے تین پارٹنر ہیں اور جتنا روپیا لگانا تھا وہ ہم لگا چکے ہیں، مزید کی ابھی ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔ نہ ہی ہم چوتھے پارٹنر کے فی الحال متحمل ہو سکتے ہیں۔ ہاں! آگے چل کر ممکن ہے ہم ایسا کوئی ارادہ رکھیں گے تو پھر سوچا جا سکتا ہے مگر اب تو بالکل بھی نہیں۔'' وہ اتنا کہہ کر چپ ہو رہا۔ اس کا لہجہ حتمی سا محسوس کر کے میں نے بھی اسے مزید فورس کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور ہولے سے مسکرا کر اپنے سر کو اثبات میں جنبش دے دی۔

اس کے بعد ہمارے درمیان سرِ دست کرایہ وغیرہ کے معاملات طے پائے اور زبانی کلامی حتمی نتیجے پر پہنچنے تک اس کاروباری معاہدہ کو ایک ہفتے کے اندر اندر کاغذی شکل دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ یوں یہ معاہدہ خوش اسلوبی کے ساتھ طے پا چکا تھا، ہم نے ایک دوسرے کو اپنے کون ٹیکٹ نمبرز بھی دے دیئے تھے۔

ان سب کے رخصت ہونے کے بعد جب میں اور انور شاہ اکیلے رہ گئے تو وہ جیسے چھوٹتے ہی مجھ سے بولے۔

''اوئے بھتیجے! اس عزیر خان نامی نوجوان نے اپنے باپ کا جو نام بتایا تھا کہیں یہ وہی حاجی مہران خان تو.....''

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

''جی ہاں چاچا! یہ وہی ہے.....'' میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ''حاجی مہران خان، لینڈ مافیا کا ایک بڑا ''ڈون'' اور بلیو مون ہائیٹس بلڈر کمپنی کے مالک سیٹھ ستار کا گرو گھنٹال.....''

''اس کے باوجود تم نے.....'' چاچا انور شاہ نے شاید دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

''ہاں چاچا! اس کے باوجود میں نے اس کے بیٹے سے کاروباری روابط استوار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔'' میں نے جیسے ان کا جملہ مکمل کیا تو وہ بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

میں نے دو سو کو دو کپ چائے لانے کا کہا اور چاچا انور شاہ کے فکر مند چہرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے ان سے بولا۔

''چاچا! تم پریشان ہو گئے؟''

''پریشانی کی بات تو ہے بھائی بھتیجے!'' وہ ترنت بولے۔ ''دشمن ایک بڑے محاذ پر ہم سے شکست کھانے کے بعد دوسری چال چلنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس بہانے ہماری جڑوں میں گھسنا چاہتا ہے، یہ ان کی کوئی نئی سازش بھی ہو سکتی ہے بیٹا!'' وہ اپنی روایتی بردباری اور متانت سے... بولے تو میں نے کہا۔

''چاچا! اپنے سے زیادہ طاقت ور دشمن کو موقع دے کر ہی مارا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ جب تک چھپا رہتا ہے، اس کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ ہمارے خلاف اگلی کون سی چال چلنا چاہتا ہے۔''

''تمہاری بات کو میں رد تو نہیں کرتا مگر مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ حاجی مہران خان کیا ہمیں اتنا ہی الو سمجھے ہوئے ہے کہ ہم اس کی اتنی آسان سی سازش کو سمجھ نہ پائیں گے؟'' انور شاہ کی بات پر میں ہولے سے معنی خیز انداز میں مسکرایا اور پھر اسی لہجے میں بولا۔ ''چاچا! آپ عمر اور تجربے میں مجھ سے زیادہ ہیں لیکن معاف کرنا، ان سازشی عناصر اور مافیا کی ناخداؤں کا ابھی آپ کو وہ تجربہ حاصل نہیں ہوا جو مجھے ان چند برسوں میں ان کے ساتھ نبرد آزمائی کے دوران خوب اچھی طرح ہو چکا ہے۔''

''اس میں کوئی شک بھی نہیں بھائی بھتیجے!'' وہ بے اختیار مسکرا کر بولے۔ ''لیکن بس! میرے حلق سے یہ بات نہیں اتر رہی ہے کہ مہران خان ہمارے خلاف اتنی آسان سازش کھیلنے کی یہ بچکانہ کوشش کیوں کر رہا ہے؟''

''یہ بات سوچنا ابھی قبل از وقت ہو گا۔'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے کہ اسے پتا ہی نہ ہو کہ اس کا بیٹا عزیر خان ہمارے ساتھ کوئی کاروباری معاملات طے کیے ہوئے ہے۔''

''یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

میں نے اپنے ملیر گوٹھ والے دوست سائیں داد سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق انور شاہ کو بتایا کہ..... ''حاجی مہران خان جیسے جاگیردار لوگ نجانے کتنی شادیاں کر کے بیٹھے ہوتے ہیں اور ان کی جوان اولادیں، بالخصوص نرینہ اولادیں ان کے کہنے پر کم ہی ہوتی ہیں، وہ جانتی ہیں کہ ہم اپنے باپ کا فخر ہیں اور ان کے وارث بھی، وہ ان کی زندگی میں ہی خود کو جائیداد اور روپوں پیسوں کے معاملات میں کافی حد تک خود مختیار کر لیتے ہیں، کوئی بعید نہیں کہ ان میں ان کی ماؤں کا بھی دخل ہوتا ہو، جو اپنے شوہر کی ان گنت شادیوں کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار رہتی ہیں اور اپنی جوان نرینہ اولادوں کو ہتھیار کی شکل میں استعمال کرتی ہیں، اسی لیے میں کسی حد تک یقین سے یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ حاجی مہران خان کو اس بات کا پتا بھی نہ ہو گا کہ اس کا بیٹا عزیر ان کی سب سے بڑی مخالف پارٹی کے ساتھ کاروباری معاملہ داری استوار کر چکا ہے اور یہی بات ہمارے لیے سود مند ثابت ہو سکتی ہے اور یوں دیکھا جائے تو ہمیں حاجی مہران کے خلاف ایک چال چلنے کا موقع ملنے والا ہے۔''

میری بات پر چاچا انور شاہ حیرت سے منہ کھولے میرا چہرہ تکنے لگا اور پھر اسی لہجے میں بولے۔

''اوئے بھتیجے! تجھے تو واقعی ان لوگوں کا بڑا کھرا تجربہ ہو چلا ہے۔''

''ہاں چاچا! آپ بس دیکھتے جاؤ آگے ہوتا کیا ہے۔'' میں نے اسرار بھری مسکراہٹ سے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر ایک خیال فوراً ہی میرے ذہن میں کلک ہوا تو میں پُرسوچ لہجے میں بولا۔

''چاچا! اگر تو حاجی مہران خان کو اس بات کا علم نہیں کہ اس کا ایک بیٹا ہمارے ساتھ پارٹنر شپ کرنا چاہتا ہے تو ..... پھر سیٹھ ستار یا مہران خان کا ہمارا لاری اڈا انتقلی کے بہانے زمین پر قبضہ کرنے کا خواب خطرے میں پڑ سکتا ہے یا پھر اس کی کوئی سازش ہے تو پھر یہ ایک خطرناک چال ہو سکتی ہے، ہمیں اس کا کھوج لگانا ہو گا۔''

''بالکل! یہ بہت ضروری ہو گا۔'' انور شاہ بولا۔

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''میرے پاس اس بات کا کھوج لگنے کے لیے ایک ٹرمپ کارڈ سائیں داد...... کی صورت میں موجود ہے۔'' میں نے کہا۔ انور شاہ پُرخیال انداز میں اپنے سر کو جنبش دینے لگا۔

میں نے ابھی انور شاہ کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ عزیر خان ہمارے محلے کے رہائشی خورشید خاں المعروف منے میاں کی جوان بیٹی ثوبیہ کی گمشدگی کے حوالے سے میری نظروں میں پہلے ہی مشکوک ہو چکا ہے۔ تاہم بہت سی ایسی باتیں، میں مناسب وقت اور موقع محل کے مطابق چاچا انور شاہ کے گوش گزار بھی کرتا ہی رہتا تھا۔

ہم دونوں نے ایک ایک کپ اور چائے پی، اس کے بعد چاچا اٹھ کر چلے گئے۔ میں آج کی اس میٹنگ کے بارے میں تھوڑی دیر تک غور کرتا رہا۔ ثوبیہ کی مبینہ گمشدگی (میں ابھی اسے مبینہ ہی کہوں گا، جب تک کہ مجھے اس حقیقت کا صحیح طرح علم نہیں ہو جاتا کہ آیا وہ واقعی گم شدہ تھی یا اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ گئی یا بھاگی تھی۔ اغوا کا بھی امکان میں نے ابھی رد نہیں کیا تھا۔)

جانے کیا بات تھی کہ میری چھٹی حس مجھے بار بار اکساتی تھی کہ مجھے ثوبیہ کا مسئلہ بالضرور حل کرنا چاہیے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے دل و دماغ میں ابھی تک اپنے چھوٹے بھائی نعیم کی وہ بات گردش کرتی رہتی تھی جو اس نے بہنا عاصمہ کے سلسلے میں مجھ سے کہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے خدانخواستہ ایسا کچھ لگتا تھا کہ ثوبیہ کے بعد عنقریب میری بہنا عاصمہ کی باری تھی اور میں یہ تصور کر کے ہی لرز جاتا تھا۔ پھر خود کو تسلی دینے لگتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی۔ یہ محض ایک اتفاق ہی تھا کہ ادھر مجھے بہنا عاصمہ کے متعلق اس کی کسی لڑکے کے ساتھ ''انوالمنٹ'' کا پتا چلا تھا اور اُدھر خورشید خاں (منے میاں) کی بیٹی ثوبیہ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آ گیا، کوئی ضروری تو نہیں تھا کہ بہنا عاصمہ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا۔

میں نے اپنا سیل نکالا اور سدو بھائی کا نمبر ملانے لگا۔

میں نے سدو سے کام اور دیگر امور کے سلسلے میں دو دنوں کی جو مہلت مانگی تھی اسی میں، میں اس کی رہائش وغیرہ کا سارا بندوبست کر چکا تھا۔ ایک کمرے والا چھوٹا مکان میں نے اسے قائد آباد میں ہی کرائے پر لے دیا تھا، جو لاری اڈے سے زیادہ دور نہ تھا۔

''جی سر!'' رابطہ ہوتے ہی دوسری جانب سے اس کی آواز ابھری تھی۔

''تمہارا ایک کام آج سے شروع ہوتا ہے۔ اسی وقت میرے پاس آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''مجھے آنے میں آدھا گھنٹا لگ جائے گا سر!''

''اوکے، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

''رائٹ سر!'' اس نے مؤدبانہ سا جواب دیا اور میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

دفتری استعمال کے لیے دفتر میں دو کمپیوٹر موجود تھے۔ ایک تو حسابات والے کمرے میں موجود تھا جبکہ دوسرا میرے کمرے میں تھا۔ جبکہ پرنٹر ایک ہی تھا۔ جو حسابات والے کمرے میں موجود دوسرے کمپیوٹر کے ساتھ اٹیچ تھا۔ چوں کہ بلنگ اور دیگر چھوٹے موٹے واؤچرز وغیرہ کی پرنٹ آؤٹ کی زیادہ ضرورت اسی کمرے میں پڑتی تھی، اسی لیے پرنٹر کو وہیں رکھا گیا تھا۔ تاہم ایک وائر میرے کمپیوٹر کی بھی اس کے ساتھ منسلک کی گئی تھی۔

میں نے اپنے خفیہ پن کیمرے سے عزیر خان کی لی گئی تصاویر اپنے کمپیوٹر میں منتقل کیں اور اس کے بعد دوسرے کمرے میں جا کر اس کا پرنٹ آؤٹ نکال لایا۔ ساتھ ہی کمپیوٹر میں منتقل کردہ یہ سارا ''اسٹف'' اپنے اسمارٹ سیل فون میں بھی منتقل کر دیا۔

سدو وقت کا پکا نکلا، وہ نصف گھنٹا گزرنے سے پہلے ہی آ گیا۔ میرے پاس جو پرانی بائیک تھی وہ میں نے اسے دے دی تھی۔

میں نے اسے پوری راز داری کے ساتھ سارا کام سمجھایا تو اسی دوران مجھے اس کی ایک اور خوبی کا اندازہ ہوا کہ وہ تھوڑے سے کہے میں بہت سی باتیں سمجھ لیتا تھا۔ یعنی اسے بار بار سمجھانا یا بتانا نہیں پڑتا تھا۔ نیز اُسے اپنی عقلِ سلیم کو بھی استعمال کرنا آتا تھا۔ اس میں اس قدر اعتماد تھا کہ وہ برملا اپنے خیالات اور تجاویز بھی میرے ساتھ شیئر کر لیتا تھا لیکن اس کی ایک بات مجھے پسند نہیں آئی تھی کہ اُسے مجھے جو کام دینا ہوتا تو وہ مجھ سے اس کا پورا پس منظر جاننے پر بضد ہو جاتا، اگرچہ یہ پہلا کام تھا مگر اس نے مجھ سے اس کا پس منظر پوری صراحت کے ساتھ پوچھنا چاہا تھا، اس بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ اس طرح زیادہ بہتر طریقے سے اپنا کام سرانجام دینے کی کوشش کر سکتا تھا میں اگرچہ اتنی جلدی اس پر بھروسا کرنے کا قائل تو نہ تھا، لیکن میرا دل کہتا تھا کہ یہ ظاہراً الجلول سا نظر آنے والا یہ آدمی بھروسے کے لائق

ہے کیوں کہ اس کا انتخاب چاچا انور شاہ نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا تو وہ غلط نہیں ہو سکتا تھا۔

بہر کیف..... مجھے اسے عزیر خان سے متعلق صراحت بتانا پڑی۔ اس نے مجھ سے تصاویر لیں اور رخصت ہو گیا۔ باقی میں نے اسے عزیر خان کی اپنے اسمارٹ فون پر ویڈیو کلپ دکھا دی تھی۔

اس کام سے فراغت کے بعد میں نے عطا صاحب کو فون کر کے آج کی میٹنگ کے بارے میں بتا دیا کہ کاغذات کی تیاری کے بعد کرائے کی مد میں ہمیں پارٹی کی جانب سے چھ ماہ کا کرایہ ایڈوانس مل جائے گا۔ وغیرہ۔

اس کے بعد میں اپنے کچھ ضروری ..... کاموں میں مصروف ہو گیا۔ دو گھنٹے تک میں بغیر سر اٹھائے کام میں بزی رہا۔ اس کے بعد کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر میں تھکن سی اتارنے لگا تو ایسے میں مجھے کالیا کی فون کال موصول ہوئی۔

"ابے لے جگری .....! دشمن کر گئے اپنا کام..... خاور ..... میرا مطلب ہے عارف مچھندر جیل سے فرار کی کوشش میں مارا گیا....." کالیا نے چھوٹتے ہی مجھے اس چونکا دینے والی خبر سے آگاہ کیا تو میں جیسے سکتے میں آ گیا۔ پھر بہ مشکل میرے حلق سے بھنچی بھنچی آواز برآمد ہوئی۔

"کک..... کیسے اور کک..... کب ہوا یہ سب؟ میں نے تو آج کا اخبار پڑھا تھا اس میں تو....."

"آج شام کا اخبار پڑھنا..... میری خبر تو ان اخبار والوں سے بھی پہلے پہنچتی ہے جگری.....!" وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "لگتا ہے اس بلڈر لینڈ مافیائی ڈون سیٹھ ستار کو پتا لگ چکا تھا کہ خاور یعنی عارف مچھندر اب آئندہ کسی پیشی میں اس کا نام بھی اگلنے والا ہے۔"

"لیکن یار! اسے بھلا کیسے پتا چلا کہ عارف اپنے اگلے کسی بیان میں اس کا نام بھی اگلنے والا ہے؟"

"ابے لے جگری! آسان سی اور سمجھ میں آنے والی بات ہے یہ تو....." وہ بولا۔

"عارف مچھندر کے پہلے بیان کے بعد ہی سے اسے اپنا خطرہ بھی ہو گیا ہو گا، اسی لیے اس نے اس کا دھڑن تختہ کروا دیا۔"

اس کی بات پر تھوڑا غور کرنے پر مجھے بھی کالیا کی بات میں وزن محسوس ہوا تھا۔ بولا۔

"اگر یہ سچ ہے تو بہت برا ہو گیا یار کالیا!" میرے لہجے میں تفکر آمیز سا دکھ شامل تھا جسے محسوس کرتے ہوئے کالیا ازراہِ تشفی اپنے مخصوص لہجے میں مجھ سے بولا۔

"ابے لے جگری! تو کیوں فکر کرتا ہے، اپنا ایسی پھٹیگوں سے پہلے بھی پالا پڑتا رہا ہے۔ اسی لیے میں نے اس روز عارف کو صفورا والے گھر میں لا کر اس کے منہ سے اصل اور ساری حقیقت اگلوائی تھی کیوں کہ میں اس کے کورٹ کے پہلے والے بیان سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا۔ ہمیں تو معلوم ہی ہے ناں کہ یہ ساری سازش اسی سیٹھ ستار کی تھی۔"

"لیکن میرے یار! عارف کا ابھی والا یہ دوسرا اور تفصیلی بیان زیادہ کارآمد ہو سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ "جس طرح اس کے پہلے بیان پر اس راشی پولیس افسر راجا دلاور کی پیٹی اتری تھی، اب کی بار سیٹھ ستار کی باری ہوتی، وہ سیدھا جیل جاتا۔"

"جگری! تیرے دشمن بہت درندہ صفت ہیں۔ ایک ذرا سے شبہے پر اپنے ہی آدمی کو مار ڈالنے سے بھی نہیں ہچکچاتے، سچ پوچھ تو مجھے تیری فکر ستانے لگی ہے یار!"

کالیا نے اس بار پُرتشویش لہجے میں کہا تو بے اختیار مجھے بھی اپنے پورے وجود میں ایک جھرجھری سی آ گئی۔ آخر میں بھی عام انسان ہی تھا، درندہ نما انسانوں کے اس جنگل میں دیکھا جاتا تو مجھ جیسے کی بھلا اہمیت ہی کیا تھی؟ اسی جنگل میں میرے معصوم اور بے گناہ باپ کو پھانسی لگا دی گئی۔ وادن اور عارف جیسے لوگ بیدردی سے ہلاک کر دیئے گئے تو ان با اثر مافیائی طاقتوں کے سامنے میری کیا حیثیت تھی! لیکن میں پھر بھی اپنے محدود تر وسائل اور کم مائیگیوں سمیت ان "قد آور" مافیائی "چیفس" کے آگے ڈٹا ہوا تھا۔ کیوں؟ بس! ایک آگ تھی اندر میرے..... ایک جذبے کی آگ میری سرشت میں ان ارضی خداؤں کے آگے جھکنا یا سپر ڈالنا، شامل ہی نہ تھا۔ پتا نہیں وہ کون سی طاقت تھی جو مجھے اپنے سے کئی گنا، زیادہ طاقت ور دشمنوں کے آگے ابھی تک سیسہ پلائی دیوار بنائے رکھے ہوئے تھی۔ کچھ تو ایسا تھا میرے اندر کہ میں ابھی تک کامیابی سے ان کا مقابلہ کر رہا تھا۔

"ابے لے جگری! تجھے تو سانپ سونگھ گیا، میرا مطلب تجھے ڈرانا نہیں تھا یار! میں تو بس اسی لیے کہہ رہا تھا کہ تو اپنے دشمنوں کو اتنا ہلکا مت لینا۔" مجھے چپ سا

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

پاکر وہ بولا۔
''میں تو بس اسی لیے کہہ رہا تھا کہ تُو میرا ایک فلسفہ سمجھ لے..... اور وہ یہ کہ زہر کو ہمیشہ زہر سے ہی کاٹا جاتا ہے مگر تو زہر کو شہد سے کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب تک قانون ان بدمعاشوں کا کیا بگاڑ پایا ہے جو اس سماج میں معزز بنے پھر رہے ہیں؟ مگر تُو ہے کہ بس..... اب کیا کہوں میں''۔ وہ چپ ہو رہا۔ میں نے کہا۔
''کالیا! زہر کو زہر سے وہی لوگ کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں جو درحقیقت ان سماجی درندوں سے ہار مان چکے ہوتے ہیں۔ ہاں کالیا! اگر ہم بھی وہی طریقہ اختیار کریں جو یہ مجرم کرتے ہیں تو ہم میں اور ان میں کیا فرق باقی رہ جائے گا؟ یہ پولیس، قانون، عدالتیں کچہریاں..... کون ان پر اعتماد کرے گا؟ ہر طرف کالے قانون کی حکمرانی نظر آنے لگے گی۔ میں نے اگر اپنے دشمنوں کے خلاف علم بلند کر رکھا ہے تو وہ صرف اور صرف قانون کی بالادستی کے لیے ہی نہیں کر رکھا ہے بلکہ حق و راستی کا بول بالا دکھانے کے لیے کر رکھا ہے تاکہ اس میں میرے اللہ کی مدد بھی شامل رہے اور اس سے بڑھ کر طاقت ور میں کسی کو نہیں سمجھتا ہوں۔''
''میرے یار! پھر تو میں تیرے لیے دعا گو ہی رہتا ہوں کہ اللہ تجھے کامیاب کرے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ ضرور کہوں گا کہ کبھی کبھی ٹیڑھی انگلی کر کے بھی نکالا جاتا ہے اور ایسا ہوتا رہا ہے۔'' کالیا ایک گہری سانس خارج کر کے بولا۔
''ویسے تیرے لیے ایک مشورہ تھا میرا..... اگر تو مانے تو.....''
''کیسا مشورہ؟''
''سیٹھ ستار کو دھمکانے کا۔''
''یہ میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تاکہ وہ زیادہ اپنی طاقت کے خمار میں نہ رہے اور نہ ہی مجھے کمزور یا خوف زدہ ہو کر چپ بیٹھ رہنے والوں میں سے سمجھے۔''
یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اس روز والے واقعے سے آگاہ کر دیا جب بلڈر سیٹھ ستار اپنی بیش قیمت اور لمبی چوڑی کار میں اپنے مصلح گن مین کی معیت میں سوار تھا اور مجھے کار میں بیٹھے بیٹھے دھمکی دی تھی کہ میں اس کا راستہ کھوٹا کرنے سے باز آجاؤں بہ صورت دیگر میں ایک بھائی کا ہی نہیں بلکہ جوان بہن کا بھائی بھی ہوں۔
''واہ میرے یار.....! تُو تو واقعی چھپا رستم نکلا..... سیٹھ ستار تو گنگ ہو کر رہ گیا ہوگا پھر۔''
''ہاں! اس کی پُرغرور طاقت کے شیش محل میں اسی دن دراڑ ڈال گئی تھی اور اس کا گھمنڈ تڑخ کر رہ گیا تھا جب میں نے اس کے آفس جا کر اسے دھمکایا تھا۔'' میں نے کہا۔
''اسی لیے کالیا! تُو بے فکر رہ، جہاں میں سمجھتا ہوں کہ انگلی ٹیڑھی کرنی پڑے گی وہاں میں ایسا کرنے سے بھی نہیں چوکتا، بس! موقع محل کے مطابق سب چلتا رہتا ہے، کبھی گرم تو کبھی ٹھنڈا۔''
''ابے لے جگری!! جیو..... جیو!'' کالیا خوشی سے نعرہ بلند کرنے کے انداز میں بولا اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔
تھوڑی دیر مزید باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد کالیا نے کہا کہ وہ اپنے طور پر عارف کے مارے جانے کے اسباب کا کھوج لگانے کی کوشش کرے گا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ جیسے ہی اسے اس سلسلے میں کوئی اہم بات معلوم ہو وہ مجھے ضرور آگاہ کرے۔
رابطہ منقطع کرنے کے بعد میں چند ثانیے کے لیے گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا تھا۔
کالیا کی بہت سی باتیں میرے دل و دماغ میں گردش کرتی رہتی تھیں، وہ زمانے کا ''چکھا'' ہوا تھا اور جانتا تھا کہ سیٹھ ستار جیسے لوگوں سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔
لیکن میرا طریقہ کار دوسرا تھا۔ میں تو دشمنوں کے سلسلے میں بھی قتل و غارت گری کا قائل نہ تھا بلکہ ان کے لیے تو میں موت سے بڑی سزا یہی سمجھتا تھا کہ وہ بھرے بازار میں رسوا ہوں، ان کے چہروں سے وہ نقاب اتار پھینکوں، جنہیں پہن کر یہ خود کو شرفاء ظاہر کیے ہوئے ہیں اور یہی ان جیسوں کے لیے موت سے بڑھ کر سزا ہوتی ہے۔ ارشاد مٹھن کی مثال میرے سامنے تھی۔ اس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اگر کوئی اور غصہ ور انسان ہوتا تو اس کے ہاتھوں جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھتا یا مجھے طیش آجاتا تو میں اسے ہلاک ہی کر ڈالتا مگر پھر کیا ہوتا؟ ارشاد مٹھن مر جاتا، جو گناہ وہ ایک قبیح زیادتی کی صورت میں مجھ سے کر رہا تھا، اس کی زیادتی پر غالب آجاتا اور میں جیل چلا جاتا، کوئی بعید نہیں مجھے پھانسی بھی لگ جاتی، یوں میری آخرت و دنیا دونوں غارت جاتیں، جبکہ ارشاد مٹھن جیسا بدمعاش دونوں جہانوں میں سرخرو رہتا، محض اس لیے کہ وہ قتل ہوا لیکن یہی سزا اسے قانون کے دائرے میں ملی تو اس کی دنیا و آخرت دونوں ہی

خراب ٹھہریں۔ وہ آج بھی محلے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا، میڈیا میں اس کے ''سیاہ کارنامے'' کے چار دانگ چرچے ہوئے۔ وہ تو محلہ چھوڑنے کا بھی روادار نہ ہوسکا تھا کہ جہاں بھی جاتا وہاں اس کی ''شہرت'' پہلے سے پہنچی ہوئی ہوتی۔ لہٰذا اس نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ جتنی بھی ذلت کی زندگی باقی بچی ہے خاموشی کے ساتھ اسی محلے میں گزار دے اور وہ اب گزار رہا تھا۔ یہی نہیں اب اس پر ایک اور قیامت ٹوٹ پڑی تھی تو میں ہی اس کی مدد میں سب سے آگے تھا۔

شاید میرے حوصلوں کو مہمیز کرتی ہوئی یہی وہ نامعلوم قوت تھی جو مجھے اپنے سے زیادہ طاقت ور دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ عطا کرتی تھی۔ میں نے بھی سیٹھ ستار جیسے دشمنوں کو ایسی ہی شکست سے دوچار کرنا چاہا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں طیش میں قتل ہوکر مظلوم نہ قرار پائیں اور نہ ہی ان کے گناہ اس طرح دھو جانے کا باعث بنیں بلکہ میں انہیں آخرت اور دنیا میں بھی کہیں کا نہیں چھوڑنے والا تھا۔

کالیا کے فون کے بعد میں نے چاچا انور شاہ کو بتایا کہ میں ایک ضروری کام سے ذرا کہیں جارہا ہوں، پھر انہیں کچھ ضروری امور سمجھا کر اپنی مہران کار میں متعلقہ تھانے کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں ایک چوراہے میں سرخ سگنل پر رک کر میں نے ایک ہاکر سے تازہ شام کا اخبار خریدا تو اس میں مجھے عارف کے فرار اور پولیس مقابلے میں مارے جانے کی خبر پہلے ہی صفحے پر جلی حروف میں چیختی چنگھاڑتی ہوئی نظر آگئی۔ اس دوران بتی سبز ہوگئی اور میں نے اخبار لپیٹ کر برابر والی نشست میں پھینک کر کار آگے بڑھادی۔

نصف گھنٹے بعد میں متعلقہ تھانے میں تھا اور وہاں ابھی تک لوگوں کا اچھا خاصا ہجوم دکھائی دیا۔ ان میں صحافی برادری سے متعلق لوگ بھی تھے اور انتظامیہ کے بھی، احاطے سے باہر گیٹ پر بھی اتنا ہی لوگوں کا ہجوم نظر آتا تھا جو اندر داخل ہونے کی کوشش میں تھے مگر گیٹ پر متعین پولیس کے چند اہلکار ان کا راستہ روکے ہوئے تھے۔

میں کار میں ہی بیٹھا، اسٹیئرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ میں جانتا تھا، میں چاہے جتنی بھی کوشش کرلوں مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں مل سکتی اسی لیے میں چند سیکنڈوں تک اسی طرح کار کی سیٹ پر براجمان رہا۔

میرا خیال نہیں تھا کہ یہاں ایسی صورتِ حال ہوگی اسی لیے میں اندر جاکر کچھ دریافت کرنے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا مگر اب یہاں اندر باہر اس قدر ہجوم دیکھ کر میں نے سوچا کہ اس وقت واپس لوٹ جانا ہی بہتر تھا پھر کبھی یہاں آتا تو شاید ایسی صورتِ حال نہ ہو۔ لہٰذا ابھی میں واپس لوٹنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک میں بری طرح ٹھٹکا۔ مجھے انسپکٹر کی وردی میں ایک خرانٹ شخص دکھائی دیا جو اپنے ساتھی پولیس اہلکاروں کے ساتھ اندر سے باہر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گیٹ کی طرف ہی آرہا تھا اور قریب پہنچ کر وہ باہر کھڑے لوگوں کے مجمع سے درشت لہجے میں چلا کر انہیں وہاں سے چلے جانے اور ''اندر'' کردینے کی تہدید بھی کیے جارہا تھا۔ میں اسی کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتا ہوا اپنی کار سے نیچے اتر آیا تھا مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ انسپکٹر کی وردی میں، میں ایک ایسے پولیس آفیسر کو دیکھ رہا تھا جس کی کچھ روز پہلے ہی معطلی عمل میں آئی تھی اور اس کی پیٹی اتروا کر اسے کوارٹر گھاٹ بھی کردیا گیا تھا۔ لیکن اس وقت میری پھیلی ہوئی آنکھیں اُس راشی افسر ایس ایچ او انسپکٹر راجا دلاور کو ایک تکلیف دہ حیرت سے تکے جارہی تھیں، میری سانسیں اندرونی ابال سے بے ترتیب سی ہونے لگی تھیں اور رگوں میں دوڑتا لہو گرم ہونے لگا تھا۔ اب میرا یہاں سے واپس لوٹنا محال ہی تھا، میں نے لرزتے ہاتھوں سے اگنیشن سوئچ آف کیا اور کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا، اس کے بعد تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گیٹ کے قریب جا پہنچا، جدھر اب پولیس اہلکار وہاں موجود مجمع پر اب باقاعدہ لاٹھی چارج کرنے لگے تھے، ایسا وہ شاید اپنے افسر کی موجودگی یا اسی کے ایماء پر کرنے لگے تھے، اسی اثناء میں مجھے آگے بڑھنے کا موقع ملا، میری جلتی بلکتی نظریں ہنوز راجا دلاور پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی وقت ایک اہلکار لاٹھی سونتے میری جانب بڑھا تھا اور یہی وہ وقت تھا جب میں حلق کے بل چلایا تھا۔

''راجا دلاور.....!'' وہ اتنی تیز اور بلند آواز میں یوں بغیر منصب کے اپنا نام کسی کو لیتے دیکھ کر چونکا تھا اور پھر خرانٹ سی نظروں کو آواز کے تعاقب میں دوڑاتا ہوا میری طرف متوجہ ہوگیا۔ تب تک وہ اہلکار خاصے جارحانہ انداز میں مجھے اپنی لاٹھی کے زور پر پرے دھکیلنے کے لیے میرے نزدیک آچکا تھا۔

''ٹھہر جاؤ.....'' انسپکٹر دلاور نے اسی اہلکار کو روکا۔ ''اسے ذرا میرے قریب آنے دو، یہ مجھے اچھی طرح دیکھ لے۔'' وہ خاصا طنطنایا ہوا تھا۔ گیٹ لکڑی کا تھا جس کے

جالی دار چوبی فریم کے نزدیک وہ کھڑا میری جانب گھور رہا تھا۔

اپنے افسر کے حکم کی تعمیل میں میرے نزدیک لاٹھی سونت کر آنے والا وہ اہلکار یک دم ایک طرف کو ہو گیا اور میں نے آگے قدم بڑھا دیئے۔

اب میرا اور راجا دلاور کا چہرہ آمنے سامنے تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہمارے درمیان میں چوبی فریم کا خلاء تھا۔

''تم..... تم یہاں کیسے؟'' میرے منہ سے جیسے بہ مشکل یہ پھسلا تھا، میرے ان اٹکتے ہوئے الفاظ میں جھلاہٹ، طیش اور ایک طرح کی شکست خوردہ سی بے بسی پنہاں تھی، جس سے وہ خبیث گویا حظ اٹھاتے ہوئے اپنی بھنوؤں کو اچکا کر استہزائیہ لہجے میں بولا۔

''تو کیا پھر میری جگہ تمہیں اس وردی میں یہاں ہونا چاہیے تھا؟ ہاں! ایک وردی تمہارے لیے پہلے سے تیار رکھی ہوئی ہے میں نے، نمبر دس کی وردی جو عنقریب تم پہننے والے ہو۔'' میں اس کا اشارہ سمجھ کر بھنا گیا لیکن ظاہر ہے اس حاضر سروس پولیس افسر کے ساتھ میں کسی قسم کی تیز یا بدکلامی نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم اپنے اندر کے ابال کو کم کرتے ہوئے میں نے اس سے فقط اتنا پوچھا۔

''کیا عارف مچھندر تمہاری کسٹڈی میں ہی یہاں سے فرار ہوتے ہوئے مارا گیا تھا؟'' یہ استفسار کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر میری نگاہ اس کے عقب میں پڑی تھی۔ اندر پہنچ جانے میں کامیاب ہجوم کے لوگوں میں سے ایک شخص نجانے کیسے اس طرف کو متوجہ ہو گیا تھا اور اسی طرف ہی آ رہا تھا، یہ مجھے کوئی صحافی ہی لگا تھا کیوں کہ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ پیڈ اور قلم تھا، ایک چھوٹا سا مائیک بھی اس کی شرٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ نیز اس کے عقب میں ایک اور شخص کافی پھرتی کے ساتھ چلا آ رہا تھا جس نے بڑا سا ویڈیو کیمرا کاندھے پر اٹھا رکھا تھا۔

میرے سوال پر اس خبیث راجا دلاور کے بدہیت ہونٹوں پہ ایک شیطانی سی پُرغرور مسکراہٹ رقصاں ہو گئی تھی اور جواب دینے کی بجائے اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ بھی اگل ڈالا تھا۔

''ی ی..... یہ وہی ہے، جسے کچھ روز پہلے کورٹ کے حکم کے مطابق پٹی اتروا کر کوارٹر گھاٹ کر دیا گیا تھا، اسے نوکری سے بھی سسپنڈ کیا گیا تھا، مگر یہ یہاں کیوں اور کیسے دوبارہ تعینات ہوا ہے؟ اس سے پوچھو یہ سوال.....؟'' میں جیسے اس کھلی ناانصافی اور اندھیر نگری چوپٹ راج کے ستائے ہوئے بے بس انسان کی طرح ہسٹریائی انداز میں چلا کر اس صحافی سے بولا تو اس نے فوراً آگے بڑھ کر اپنا مائیک میرے قریب کر دیا، پن وہ اپنے کان میں اٹکا چکا تھا۔

''یہ لائیو کوریج ہے نوجوان بولتے رہو.....'' اس صحافی نے مجھے اکسایا، اس کا ساتھی ہم پر اپنا کیمرا فوکس کرنے لگا۔

''ی..... یہ..... یہ ایک نمبر کا راشی پولیس افسر اور لینڈ مافیا کا زرخرید ٹاؤٹ ہے..... دادن والے مرڈر کیس میں قاتلوں کا ساتھ دینے کے جرم میں اسے نوکری سے معطل کر دیا گیا تھا اور..... اور اب اسی کیس کے ایک اہم گواہ عارف مچھندر کو بھی دانستہ فرار کا موقع دیتے ہوئے اسے ہلاک کرنے کی سازش بھی اسی کی تیار کردہ ہے''

''بکواس کرتا ہے یہ.....'' راجا دلاور غصے سے بھنا کر بولا۔ ''یہ خود دادن کا قاتل تھا اور اس نے پیسوں کے بل پر اپنی ضمانت کروا لی، بہت جلد یہ دوبارہ قانون کی گرفت میں آنے والا ہے۔'' اتنا کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے ساتھی اہلکاروں کو مخصوص اشارہ بھی کیا، انہوں نے مجھے اور اس صحافی کو پرے دھکیلنا شروع کر دیا جبکہ خود راجا دلاور مجھے خشم آلود نظروں سے گھورتا ہوا واپس پلٹ گیا۔

پولیس والے مجھے پرے دھکیلنے لگے اور ادھر اندر اس صحافی اور کیمرا مین کو ہٹانے لگے، وہ دانستہ کوئی ایسی حرکت نہیں کر رہے تھے کہ ان کی ویڈیو لائیو چینل پر نہ آ جائے اسی لیے ان کی کوشش یہی تھی کہ وہ دانستہ اس رپورٹر اور کیمرا مین کے سامنے آ رہے تھے، تاکہ مجھے ''کلپ'' نہ کر سکے۔ جبکہ باہر متعین اہلکار اب مجھے باقاعدہ زدوکوب کرنے لگے تھے، یہاں تک کہ مجھے دھکیلتے ہوئے وہ احاطے کے گیٹ سے دور لے گئے اور پھر میرے آگے راستہ روکے تن کر کھڑے ہو گئے تاکہ میں دوبارہ گیٹ کا رخ کروں تو مجھے آگے بڑھنے نہ دیں۔

میں نے گیٹ کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا، میرا خیال تھا شاید اس صحافی کے لیے یہ سنسنی خیز خبر ہو گی لیکن مجھے یہ دیکھ کر ایک حیرت آمیز سی مایوسی ہوئی کہ وہ اپنے کیمرا مین کے ساتھ مجھے نظر انداز کر کے یوں پلٹ گیا تھا جیسے اس نے اپنے کیمرے کا جتنا ''پیٹ'' بھرنا تھا وہ بھر لایا تھا اور اب مزید سنسنی خیزی کی ''بازیافت'' کے لیے وہ میرے پیچھے

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

احاطے سے باہر آنے کا رسک لینا نہیں چاہتا تھا کہ دوبارہ اسے اندر داخل ہونے دیا بھی جاتا کہ نہیں اور وہ احاطے کے اندر کی سنسنی خیز خبروں سے محروم ہو جاتا۔ مجھ سے اسے ایک ہی خبر ملتی جو اس کے لیے ناکافی ہوتی۔ چاہے اندر اسے ہزاروں جھوٹی خبریں ملیں وہ اس کے لیے صحیح تھیں، مگر باہر آکر وہ ایک سچی خبر کو قتل کو ریج دینا نہیں چاہتا تھا، آخر کو اس صحافی نے بھی اپنا "کام" چلانا تھا، یہاں کسے سچائی کی تلاش تھی؟ یہاں تو بس "ریٹنگ" کی دوڑ تھی اور اپنے "زنبیل" کو زیادہ سے زیادہ چٹ پٹی اور مختلف النوع خبروں سے بھاری کرنا تھا۔

میں مایوس ہو کر پلٹ گیا اور اپنی کار میں آن بیٹھا۔ پولیس اہلکار لاٹھیاں زمین پر ٹکائے مجھے استہزائیہ مسکراہٹ سے یوں گھور رہے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں۔

"جاؤ میاں .....! جاؤ تم یہاں کہاں سچ کی ہانڈی اپنے ناتواں کاندھوں پر اٹھائے آگئے ہو۔ یہ تم پر ہی گرما گرم الٹ دی جائے گی اور اپنے سچ کے ساتھ تم خود بھی خاکستر ہو جاؤ گے۔ اپنی خیر مناؤ اور ہمیں ڈیوٹی کرنے دو .....چلو شاباش!"

اور میں واقعی وہاں سے مایوس ہو کر چلا آیا۔ لاری اڈے پر میرا جانے کو جی نہیں چاہا تھا۔ میں نے زنیرہ کو فون کیا وہ اپنے آفس میں ہی تھی، میں نے اُسے اپنے پہنچنے کا کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

میں اس وقت سخت انتشار کی زد میں تھا۔ رہ رہ کر میرے اندر سے ایک ابال سا اٹھ رہا تھا۔ یہ کیسی اندھیر تھی؟ ایک پولیس آفسر جسے معطل کر دیا گیا تھا وہ محض چند روز گزرنے کے بعد وہ نہ صرف اپنی سابقہ سیٹ پر موجود تھا بلکہ بڑے دھڑلے کے ساتھ اس نے میرے دشمنوں کے "ٹاسک" پر عمل پیرا ہوتے ہوئے سیٹ سنبھالتے ہی دادن قتل کیس کے ایک اہم گواہ کا چالاکی سے مرڈر بھی کروا دیا تھا جبکہ یہ خود بھی اسی کیس میں انوالو تھا۔

میں آندھی طوفان کی طرح کار دوڑاتا ہوا زنیرہ کے چیمبر میں پہنچا۔ وہ کسی کلائنٹ کے ساتھ مصروف گفتگو تھی اس کی سیکریٹری مسز نجمہ اقبال جو ایک ادھیڑ عمر خاتون تھیں، میں انہی کے کمرے میں سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرا اندر ابھی تک کھول رہا تھا، حالاں کہ میں آتشی فطرت کا مالک نہ تھا، بہت آبی مزاج رکھتا تھا اور یہی میرا ہتھیار بھی تھا جس کی بدولت میں دشمنوں پر فتح بھی پاتا رہا تھا، لیکن اس بار جانے کیا ہوا تھا کہ میں اپنی فطرت کے بالکل برخلاف کیفیات و ہیجان کا شکار ہو رہا تھا، یہ شاید اسی لیے تھا کہ میں نے اپنی زندگی میں آج تک ایسی اندھیر مچتی نہیں دیکھی تھی۔ اگرچہ میرے باپ کا بے گناہ پھانسی لگنا بھی کسی "اندھیر" سے کم نہیں تھا، مگر اس میں سارے شواہد کا رخ بڑی مہارت اور مربوط و بے داغ منصوبہ بندی کے ساتھ میرے بے گناہ باپ کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔ لیکن یہاں تو سب کچھ سب کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کے باوجود بھی یہ سب ہونا جنگل کے قانون ہی کے مترادف تھا۔

سامنے اپنی میز پر بیٹھی مسز نجمہ اقبال، اپنی شفاف عدسوں والی نفیس فریم کی عینک سے مجھے کبھی کبھی دزدیدہ سی نگاہوں سے تکنے لگتی تھی۔ وہ شاید میری اندرونی کیفیات کا اندازہ لگا رہی تھی۔ یہ حال ہی میں یہاں اپائنٹ کی گئی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا اور نہ ہی شاید اسے میرے بارے میں بھی۔ تاہم وہ اسے ایک معمول کی روٹین سمجھ کر ذرا دیر بعد ہی اپنے کام میں منہمک ہو گئی اور میں خود کو پُرسکون کرنے کی سعی میں مصروف ہو گیا۔

پیئن مجھے جانتا تھا۔ میں نے اسے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لانے کو کہا۔ وہ کانچ کے ایک گلاس میں میرے لیے پانی بھر لایا جسے میں ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ اندر زنیرہ کو میرے آنے کی خبر کر دی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اس کے کمرے سے ایک بوڑھے شخص کو اور دوسری ایک خاتون تھیں۔ ان کے جاتے ہی مسز نجمہ کا بزر گونجا، میں سمجھ گیا، زنیرہ نے مجھے ہی بلایا ہوگا، میں پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور مسز نجمہ کی طرف دیکھنے لگا اس نے ایک بٹن پش کر کے کچھ سنا اور میری جانب دیکھ کر ہولے سے مسکرا کر اپنی گردن اثبات میں ہلا دی۔ میں تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"خیریت؟ خاصے جوش میں نظر آرہے ہو؟" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس نے ہلکے گلابی رنگ کے لباس پر سیاہ رنگ کا کورٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔ گلابی لباس اور سیاہ ریشمی گاؤن کا امتزاج اس کے خوب رو چہرے اور گورے رنگ پر خاصا جچ رہا تھا۔ کشادہ آنکھوں میں ہلکا کاجل جھلک دکھا رہا تھا۔

"تم نے شاید آج کا اخبار نہیں پڑھا، لو پڑھ لو....." کہتے ہوئے میں نے شام کا خریدا ہوا تازہ اخبار اس کی جانب بڑھا دیا۔ مجھے دیکھ کر اس کا کھلتا چہرہ یک دم سنجیدہ سا ہو گیا۔ اخبار لے کر اس نے اس خبر پر نظریں جما دیں اور

اگلے ہی لمحے اس کا چہرہ تاریک سا پڑ گیا۔

''دیکھ لو..... کتنی اندھیر نگری ہے تمہارے اس کالے قانون کی دنیا میں.....'' میں نے دل کی بھڑاس نکالی۔ وہ ایک گہری ہنکاری خارج کر کے بولی۔ ''قانون کالا نہیں ہوتا..... لوگ کالے ہوتے ہیں اور وہی اسے کالا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''ایک ہی بات ہے، ناک کو چاہے آگے سے پکڑو یا ہاتھ گھما کر پیچھے سے.....'' میں نے تلخی سے کہا اور پھر اُسے یہ بھی بتا دیا کہ میں نہ صرف متعلقہ تھانے سے آرہا تھا بلکہ ایس ایچ او راجا دلاور سے بھی ملا تھا، نیز وہ اتنے بڑے واقعے کے باوجود پریشان یا تشویش زدہ ہونے کی بجائے کتنا مطمئن اور بے فکرا نظر آرہا تھا، اس کا بھی زنیرہ کو بتایا تو وہ بولی۔

''جن لوگوں کی پشت پر طاقت ور مافیائی قوتیں ہوتی ہیں وہ ہر قسم کا غیر قانونی کام اسی اطمینان اور دھڑلے سے کیا کرتے ہیں لیکن قانون کے ہاتھ بھی لمبے ہوتے ہیں، کبھی نہ کبھی وہ اس کے شکنجے میں آتے ضرور ہیں۔''

''مجھے اسی دن کا بے چینی سے انتظار ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا منگواؤں تمہارے لیے؟'' اس نے میرے دیکھتے ہوئے اچانک پوچھا۔

''کچھ نہیں، ٹھنڈے پانی کی طلب تھی وہ انتظار گاہ میں پی چکا۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا اور آگے بولا۔ ''اس خبیث ایس ایچ او نے مجھے ضمانت منسوخ کروانے کی دھمکی بھی دی تھی۔ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے؟ حیرت ہی کی بات ہے اسے اپنا کوئی ڈر نہیں کہ عارف مچھندر کا اس کی کسٹڈی میں ہلاک ہو جانا اس کے خلاف محکمہ جاتی تادیبی کارروائی کا بھی باعث بن سکتا ہے مگر وہ الٹا مجھے اندر کروانے کی دھمکی دے رہا تھا۔''

''درمیان میں ضرور کوئی بڑی گڑبڑ ہوئی ہوگی، میں پہلے اس کا پتا چلا لوں اور رہی بات تمہاری ضمانت وغیرہ کی تو اس سلسلے میں بے فکر رہو، میں ابھی ایک درخواست ٹائپ کراتی ہوں، تم اس پر اپنے دستخط کر دینا یہ تمہاری طرف سے ہوگی جبکہ دوسری میری طرف سے یعنی تمہاری وکیل کی حیثیت سے۔''

اس کی بات پر میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ سکیڑے اور اس سے رخصت ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''بیٹھو گے نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، میں چلوں گا، جب تک تم بھی اس سلسلے میں ضروری کام نمٹا لو..... اور ہاں! میں نے تمہارے اکاؤنٹ میں فیس کی ادائیگی کے سلسلے میں کچھ رقم جمع کرا دی ہے۔''

میری اس بات پر میں نے دیکھا کہ زنیرہ کا چہرہ ایک دم بجھ سا گیا، اسی لہجے میں بولی۔

''اس کی کیا ضرورت تھی نعمان؟ میں نے کب تم سے فیس کا تقاضا کیا تھا؟''

''میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم میرا ہر کام بہت دل جمعی سے اور اپنا سمجھ کے انجام دیتی ہو..... فیس پر تو تمہارا ویسے بھی حق بنتا ہے۔ چلوں گا۔''

میں اسے خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔

شام جھکنے لگی تھی۔ زنیرہ کو اس کی بالمشافہ اطلاع دینے کے بعد میں نے کار چلاتے ہوئے اپنے سیل پر کالیا کو بھی مطلع کرنا ضروری سمجھا۔ اگرچہ عارف کی پولیس کسٹڈی میں ہلاکت کی سب سے پہلے خبر اسی نے ہی مجھے دی تھی مگر وہ بہرحال یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں راجا دلاور دوبارہ متعین کیا جا چکا تھا۔

''ابے نلے..... جگری! یہ تُو کیا کہہ رہا ہے؟'' وہ چھوٹتے ہی بولا۔

میں نے اُسے مختصراً صراحت کے ساتھ وہی کچھ بتا ڈالا جو زنیرہ کے گوش گزار کر چکا تھا۔ وہ بھی ہکا بکا سا رہ گیا تھا۔

''لگتا ہے ان نامرادوں کے ہاتھ قانون سے بھی زیادہ لمبے ہیں لیکن خیر..... تُو بے غم رہے جگری! کہاں تک جائیں گے یہ، ہم بھی دیکھ لیں گے۔ پر جگری! تُو اپنی ضمانت کے سلسلے میں ابھی سے کچھ کر لے، ایسا نہ ہو کہ.....'' کہتے ہوئے اس نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے اُسے بتا دیا کہ میں اس سلسلے میں پہلے ہی ایڈووکیٹ زنیرہ کو مطلع کر چکا ہوں۔

''یہ تو تُو نے بہت اچھا کیا جگری!'' وہ بولا۔ ''لیکن یار! اس سیٹھ ستار کے ساتھ ٹیڑھی انگلی کرنا پڑے گی، اسے بتانا پڑے گا کہ وہ اگر جلیبی کی طرح گھیر گھاؤ کے جوہر دکھا سکتا ہے تو ہم بھی وہی کچھ اس کے ساتھ کر سکتے ہیں، فرق صرف اتنا ہوگا کہ وہ قانون کی آڑ میں اپنے مجرم مہرے آگے کھسکاتا ہے ہم دھڑلے کے ساتھ اس کی گردن دبوچیں گے، پر جگری! تُو مانے تب نا.....''

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

''کالیا! کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''سیٹھ ستار اگر اپنی سیاہ کاریاں قانون کی آڑ میں کرتا ہے تو وہ اس کے علاوہ بھی بہت کرنے کی سکت رکھتا ہوگا، اس کے پاس غنڈوں، بدمعاشوں کی کیا کمی ہوگی، ایک سے ایک کرائے کا قاتل اس کا راتب خور ہوگا۔ کئی بڑے سرکاری افسر اس کے راتب نواز ہوں گے۔ مگر وہ یہ سب جانتا ہے کہ اپنے کون سے مخالف سے کس ہتھیار سے لڑنا ہے۔ پھر وہ وہی ہتھیار استعمال میں لاتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم یا تمہارے اس استاد بھابھا کا گروہ سیٹھ ستار کے مقابلے میں کتنا طاقت ور ہے لیکن ایک بات کا ادراک میں بھی رکھتا ہوں کہ تمہارے گروہ جیسے نجانے کتنے گروہ اس کی سرکردگی میں ہوں گے، بہ قول تمہارے حریف گروہ لاڈلہ سائیں کی مثال تمہارے اور میرے سامنے ہے جسے سیٹھ ستار کی آشیر باد حاصل ہے۔''

میرے دل میں جو تھا وہ میں نے کالیا کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر کہہ ڈالا تھا۔ وہ بھی برا منائے بغیر ہنستے لہجے میں بولا۔ ''ابے لے ..... جگری! شاید تُو سیٹھ ستار سے خاصا خائف اور مرعوب لگتا ہے۔''

''یہ بات نہیں ہے میرے یار کالیا!'' میں نے تھوڑا جذباتی ہو کر کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تُو سیٹھ ستار جیسے مافیائی ڈان کو کمزور سمجھ کے جوش میں آ کر کوئی ایسی ویسی حرکت کر بیٹھے جو بعد میں خدانخواستہ تیرے لیے ہی نہیں میرے لیے بھی ضمیر کی خلش اور پچھتاوے کا سبب بن جائے، تُو میرا اچھا اور سچا دوست ہے اور تیرے لیے میرے دل میں بڑی قدر و قیمت ہے، اسی لیے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہمارے لیے بہتر ہوگا۔''

''ابے لے جگری! تُو کیا اپنے یار کو انڈا توڑ کے نکلا ہوا سمجھتا ہے..... زمانے کا چکھا ہوا ہوں میں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے میں نے، گروہ میں استاد بھابھا کے بعد میرا نمبر آتا ہے، چل.....! گروہ کی بات بھی چھوڑ۔ صرف اپنے بل بوتے پر اکیلے میں نے ایک دنیا کو تگنی کا ناچ نچایا ہے۔ کون کتنا پانی میں ہے، اس سالی تقدیر سے یہی تو اب تک سیکھا ہے میں نے، رہا یہ تمہارا سیٹھ ستار تو میں جانتا ہوں وہ کتنا دم رکھتا ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا میری جگری.....! طاقت ور دشمن کے حملوں کا کامیاب دفاع کرنا ہی بڑی بات نہیں ہوتی، اس کا اُسے سود کے ساتھ جواب لوٹانا بھی ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ ایک کے بعد ایک اور..... ایک سے بڑھ کر ایک زور آور حملے کرتا رہے گا، دشمن کو اپنی طاقت بھی دکھانا ضروری ہوتی ہے۔''

''تُو سیٹھ ستار کے ساتھ کیا کرنا چاہتا ہے؟'' بالآخر میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں کہا۔ تو وہ بولا۔ ''جیسے کو تیسا، میں سیٹھ ستار جیسے کاروباری لوگوں کی فطرت سے خوب واقف ہوں، جو اپنی اولاد سے زیادہ اپنے مال پر مرتے ہیں۔ ان کی املاک کو نقصان پہنچا دو تو یہ ان کے لیے اپنی اولاد کے مرنے سے بھی بڑا غم ہوتا ہے، اپنے مال و منال کی تباہی پر یہ تھرا اٹھتے ہیں۔ خیر..... جگری! وقت کے ساتھ ساتھ تجھے میری باتیں سمجھ میں آ جائیں گی، فقط اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

مجھے کالیا کی باتوں سے ہی نہیں، اس کے لہجے سے بھی برسوں کے گرگِ باراں دیدہ تجربے کی بو آتی محسوس ہوئی۔ میں اس کے ماضی سے کچھ زیادہ واقف نہ تھا پر لگتا ایسا ہی تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ، نامساعد حالات کی دودھاری چھری پر پاؤں رکھ کر نہیں، اپنی گردن رکھ کر گزرا ہے اور جو بات وہ کرتا تھا، وہ بے پر کی یا ڈینگ نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی کسی گروہی ''استاد'' کی طاقت کے زعم میں کی ہوتی تھی، اس کا ''زعم'' صرف اس کے وہ پیش آمدہ حالات ہوتے تھے جن کی گود میں وہ پل کر جوان ہوا تھا۔ کالیا جیسے لوگوں کے لیے یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی ذات میں ایک پورا ''گروہ'' تھے۔ گروہ ان سے نہیں بلکہ ان سے گروہ تھا لہٰذا وہ جو بات کہتا تھا اپنے انہی تجربات کی روشنی میں کرتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تُو کیا اس کا بوٹ بیسن والا آفس تباہ کرنا چاہتا ہے یا اس کی کلفٹن میں واقع دو ہزار گز پر محیط عالیشان کوٹھی کو آگ لگانا چاہتا ہے؟''

''کرنا تو میں اس سفاک انسان کے ساتھ ایسا ہی کچھ چاہتا ہوں جگری.....! لیکن ابھی تھوڑا مزید دھار کا اندازہ کر لوں اور ذرا اس حقیقت کا بھی پتا لگا لوں کہ آخر یہ راجا دلاور اور عارف والا معاملہ کیا ہے؟ یہ دلاور دوبارہ اپنی سیٹ پر بحال کس طرح ہوا؟''

''ٹھیک ہے تُو جب تک یہ پتا کر، کوئی خاص بات معلوم ہو جائے تو مجھے ضرور بتانا۔'' میں نے کہا اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔ میں نے کار کی رفتار بڑھا دی اور گھر کی راہ لی۔

محلے میں داخل ہوا تو یہاں کی سوچیں غالب آنے لگیں۔ منے میاں کی گمشدہ بیٹی ثوبیہ..... کے سلسلے میں ایک

مضبوط کلیو عزیر خان کی صورت میں میرے ہاتھ لگ تو چکا تھا اور اس کے پیچھے میں نے سدو بھائی کو لگا دیا تھا۔ میرے خیال میں توبیہ کے سلسلے میں یہ ایک اچھی پیش رفت تھی۔ جس سے یقیناً اس کے باپ منے میاں کو زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت ڈھارس ضرور مل سکتی تھی۔ اسی لیے میں پہلے گھر پہنچا۔ فہیم اور عاصمہ گھر پہ ہی تھے۔ مجھے بھی گھر پہنچتے پہنچتے تقریباً رات تو ہو ہی گئی تھی۔

حسبِ معمول رات کا کھانا ہم تینوں بہن بھائیوں نے مل کر کھایا۔ اس روز میرے اور فہیم کے درمیان ہونے والی عاصمہ بہن سے متعلق کچھ سنجیدہ نوعیت کی گفتگو کے بعد میں نے یہ بات محسوس کی تھی کہ فہیم، عاصمہ سے کچھ کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا۔ کھانا بھی خاموشی سے کھا کر اٹھ جایا کرتا تھا۔ عاصمہ اس سے کوئی بات کرتی بھی تھی تو وہ محض ہوں، ہاں کہہ دیتا۔ عاصمہ نے بھی یقیناً اپنے بھائی کی یہ بے رخی یا اوپرا پن ضرور محسوس کیا ہوگا لیکن وہ بھی چپ ہی رہتی تھی بلکہ اب تو اکثر ایسا بھی ہونے لگا تھا کہ فہیم ہمارے ساتھ اکٹھے بیٹھ کر کھانا بھی کم ہی کھایا کرتا تھا۔ بڑے بھائی کی حیثیت سے میں گھر کا بڑا اور سربراہ تھا، تاہم میں ان دونوں کے ساتھ محبت اور شفقت سے ہی پیش آتا تھا لیکن مجھے فہیم کا یہ رویہ پسند نہیں تھا۔ ابھی تو میں کھانے سے فارغ ہو کر ذرا دیر کے لیے حاجی کریم بخش کے ہاں جانے کا ارادہ رکھے ہوئے تھا۔ واپسی میں گھر آ کر میں نے سوچ رکھا تھا کہ فہیم کو اس کے رویے پر ٹوکنے اور سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

کھانے سے فراغت کے بعد میں فوراً گھر سے باہر نکل گیا اور سیدھا حاجی صاحب کی بیٹھک کا رخ کیا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے کہ ہر روز رات یا شام میں محلہ کمیٹی کے صدر حاجی کریم بخش کے ہاں مختصر سی ''بیٹھک'' لگا کرتی تھی۔ جس میں محلے ہی کے لوگ ہوتے تھے یا پھر ان کے قریبی دوست احباب۔

''میں وہاں پہنچا تو یہ بیٹھک خالی تھی۔ فقط ان کا وہی دھان پان سا ملازم اسلم ممو کا..... موجود تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی سلام کیا اور میں نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے دریافت کیا۔

''بھئی خیریت تو ہے، یہ آج بیٹھک کی رونقیں کیوں ماند پڑ گئی ہیں؟''

خلافِ توقع وہ کچھ سنجیدہ سا نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''ارے نعمان میاں! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی سب یہاں بیٹھے تھے کہ منے میاں اپنے بیٹے اختر کے ساتھ حواس باختہ سے یہاں آئے اور بولے۔ ایدھی کے لاوارث مردہ خانے سے فون آیا ہے۔ کسی نوجوان لڑکی کی لاش انہیں کہیں سے ملی ہے، دونوں باپ بیٹے وہیں گئے ہیں اور حاجی صاحب بھی ان کے ساتھ ہو لیے تھے۔

یہ اطلاع میرے لیے بھی لرزا دینے والی تھی۔ نوجوان لڑکی کی لاش کے ذکر پر ایکا ایکی ہی میرے بھنچے بھنچے ذہن میں منے میاں کی گمشدہ بیٹی توبیہ کا نام ہی ابھرا تھا۔

''کک..... کب گئے وہ لوگ یہاں سے؟'' میرے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز، بہ مشکل ہی برآمد ہوئی تھی۔ میرا دل دھک دھک کرنا شروع ہو گیا تھا۔

''ارے جناب! ابھی آپ کے آنے سے کوئی دس، پندرہ منٹ پہلے کی بات ہو گی۔''

''ایدھی کے اس لاوارث مردہ خانے کا کچھ اتہ پتا ہے تمہیں تو مجھے بھی بتا دو، میں بھی چلا جاتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔ میری بات پر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے تو یہ پتا نہیں چل سکا لیکن اگر آپ حاجی صاحب سے ان کے موبائل فون پر بات کر لیں تو.....'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے فوراً اپنی جیب سے اپنا سیل فون نکال کر حاجی صاحب کا نمبر پنچ کیا، دوسری جانب بیل جاتی رہی مگر فون ریسیو نہ ہو سکا، میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

''نہیں ملا نمبر؟'' اسلم ممو کا نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، شاید ابھی راستے میں ہیں۔ ممکن ہے ٹریفک کے شور میں بیل نہ سن پا رہے ہوں۔'' میں نے کہا۔ اچانک مجھے اختر کے نمبر کا خیال آیا کہ شاید وہ فون اٹینڈ کر لے لیکن پھر کچھ سوچ کر میں نے اسے فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اسلم سے بولا۔ ''تم ایک کام کرنا جیسے ہی حاجی صاحب وغیرہ تشریف لے آئیں تم مجھے ذرا آ کر مطلع کر دینا، میں ابھی جاگ ہی رہا ہوں۔''

''بہت بہتر جناب!'' اسلم ممو کا نے اپنے سر کو فدویانہ جنبش دیتے ہوئے کہا اور میں واپس گھر لوٹ آیا۔ عاصمہ اور فہیم اپنے کمرے میں تھے۔ دروازہ فہیم نے ہی کھولا تھا اور پھر اپنے کمرے کا رخ کیا تھا۔ میں آج عاصمہ بہن کے سلسلے میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا، اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ بہنا سے اس قسم کا رویہ نہ رکھے جبکہ ابھی ایسی کوئی بات نہیں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ہوئی تھی جس سے وہ یوں بہن سے ناراض رویہ رکھے لیکن ابھی منے میاں والے اس تازہ واقع کی خبر سن کر میں نے سر دست اپنا ارادہ بدل دیا۔ مجھے حاجی صاحب اور منے میاں کے لوٹنے کا بے چینی سے انتظار تھا اور بار بار یہی دعا کر رہا تھا کہ خدا خیر کرے۔

میں نے وال کلاک پر ایک نگاہ ڈالی، رات کے دس بج رہے تھے۔ میں کسی اخبار کا کوئی پرانا سنڈے ایڈیشن لے کر بیڈ پہ آ کر نیم دراز ہوا ہی تھا کہ اچانک میرے سیل پر میسج کی ٹون ابھری، میں نے ہاتھ بڑھا کر قریب تپائی پہ رکھا اپنا سیل اٹھا لیا۔ اسکرین پر دیکھا اور جب میسج پر نظر پڑی تو یکبارگی میرا دل بے طرح انداز میں دھڑکنے لگا۔ یہ فوزیہ کا ایس ایم ایس تھا۔ میں نے جلدی سے اسے اوپن کر کے پڑھا۔ لکھا تھا۔

''ہیلو! کیسے ہو؟ سو تو نہیں گئے؟'' میرے ہونٹوں پہ بے اختیار مسکراہٹ کھنچ گئی، میں نے فوراً رپلائی دے دیا۔

''میں ٹھیک ہوں، جاگ رہا ہوں اور تم؟''

''میری نیند تو اس وقت سے ہی ایک خواب بن کر رہ گئی ہے، جس دن تم نے اپنی محبت کی مہر ثبت کی تھی۔'' اس کے جوابی پیغام کے آگے ایک ''بلشنگ'' سمبل بلنک کر رہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ وہ کس روز والی ''مہر محبت'' کی بات کر رہی تھی۔ میں نے فوراً لکھا۔ ''اپنا بھی یہی حال ہے۔ تمہارے نرم لبوں کی حلاوت انگیز تپش ابھی تک میرے احساس کی شمعیں روشن کیے ہوئے ہیں کہ دلِ بے قرار کو کسی طور چین نہیں آ رہا۔''

''ہوں......تو آپ جناب کو شاعری بھی آتی ہے۔''

''آتی نہیں تھی اب آ گئی ہے جب سے تمہیں دیکھا تم سے ملا اور......'' میں نے دانستہ معنیٰ خیز انداز میں عبارت ادھوری چھوڑ کر ''ڈاٹس'' دے دیئے اور بریکٹ میں لکھا ''کال کرونا......تمہاری آواز سننے کو جی چاہ رہا ہے۔''

فوراً رپلائی آیا۔ ''ابھی کرتی ہوں۔''

میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ میں نے فوراً اپنا سیل فون ''سائلنٹ'' پر کر دیا۔ اسی وقت ڈسپلے پر فوزیہ کا نام ابھرا۔ اس کی کال آ رہی تھی جو میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ فوراً اٹینڈ کی۔

''ہیلو......! کیسے ہیں آپ؟''

بہت دھیمی، میٹھی اور مترنم سی اس کی آواز ابھری تھی۔ کسی کو دل کی گہرائیوں سے پسند کیا جائے اور پھر اس کی آواز سنو تو اسی طرح ہی سماعتوں میں رس گھولتی محسوس ہوتی ہے۔

''آپ کہنا ضروری تھا؟'' میں نے بھی محبت پاش لہجے میں کہا۔ جواب میں اس کی کھنکتی سی آواز ابھری۔

''محبت میں احترام بھی شامل ہو تو یہ جذبہ دل کو مزید نکھارتا ہے۔ ہاں! البتہ آپ مجھے تم کہہ سکتے ہیں۔''

شیریں لب و لہجے میں گوندھی اس کی آواز میں بھی ایک فسوں تھا۔ اس کے خیالات کی ندرت بے مثال تھی۔

''واہ......'' بے اختیار میرے منہ سے برآمد ہوا تھا۔

''ارے! کس بات کی واہ؟'' اک ادائے دل آراء سے پوچھا گیا۔

''آپ کے خیالات مجھے بلند پایہ محسوس ہوئے، اسی پر بے اختیار واہ کرنے کو جی چاہا۔''

''اچھا...... شکریہ جناب!'' وہ ہولے سے دلربا انداز میں کھلکھلائی۔

''بھلا شکریے کی کیا بات ہوئی۔'' میں بھی ہولے سے مسکراتے لہجے میں بولا۔ اچانک کال بیل بجی۔ میں چونکا۔ میں سمجھ گیا باہر اسلم موکا ہوگا۔ آواز سیل پر شاید فوزیہ نے بھی سن لی تھی۔ بہت دھیرے سے مستفسر ہوئی۔

''باہر کوئی آیا ہے؟''

''ہاں!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میرا ہی کوئی جاننے والا ہے۔ پلیز! مجھے تھوڑا ایکسکیوز کرو گی تم؟''

''آف کورس!'' وہ بھی یک دم بولی۔ ''آپ جا کر مل لیں۔ باتیں تو بعد میں بھی ہوتی رہیں گی۔''

''تھینکس۔'' میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا تو اسی وقت فہیم کمرے میں داخل ہوا۔

''بھائی جان! وہ اسلم آیا ہے۔ آپ کو بلا رہا ہے۔''

میں تب تک اُٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ سیل میں نے جیب میں رکھا اور فہیم کو بتایا۔

''میں نے ہی اسلم کو بلایا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اُسے ساری بات بتا دی۔

''خدا خیر کرے، میں حاجی صاحب سے مل کر ابھی آتا ہوں۔ تم جاگ رہے ہو ناں؟ ہو سکتا ہے مجھے ان کے پاس تھوڑی دیر ہو جائے۔''

''جی جی بھائی جان! آپ آرام سے آئیں، میں جاگ ہی رہا ہوں، دروازہ کھول دوں گا میں۔'' وہ بولا۔

''اللہ واقعی خیر کرے بھائی جان! پتا نہیں کیا ہوا ہوگا؟''

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میں ہولے سے اس کا کاندھا تھپتھپاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

باہر اسلم موجود تھا۔ میں نے بہ غور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ خاصا ستا ہوا تھا۔ مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ معاملہ نازک تھا۔

''خیریت ہے؟'' میں نے اس کے ساتھ ساتھ نیم تاریک سی گلی میں آگے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ حاجی صاحب کی واپسی کے بعد اسے بھی حالات کا علم ہوگیا ہوگا کیوں کہ اسلم ان کا پرانا ملازم تھا اور ہر بات کی جان کاری اسے بھی ہوتی تھی۔

''خیریت کہاں ہے جناب!'' وہ جواباً بولا۔ ''بس آپ خود ہی چل کر سن لیجئے گا سب کچھ۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے اور اس کے ساتھ چلتا ہوا، حاجی صاحب کی بیٹھک تک جا پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں وہ وہاں بیٹھے منے میاں کو تسلیاں دینے میں مصروف تھے۔ اختر بھی گم صم سا بیٹھا تھا۔ ان تینوں کے علاوہ وہاں اور کوئی تھا تو وہ میں اور اسلم تھے، مجھے دیکھتے ہی حاجی کریم بخش نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

''مجھے اسلم سے پتا چلا تھا کہ آپ لوگ مردہ خانے گئے تھے۔ اللہ خیر کرے کیا کوئی ایسی بات ہے؟'' میں نے حاجی صاحب کی طرف دیکھ کر کہا اور آخر میں منے میاں کے روتے ہوئے چہرے پر نظریں جما دیں۔

''بس بیٹا! اللہ ایسی بری گھڑی سے سب کو بچائے، کچھ مت پوچھو، اپنے بھائی خورشید پر کیسی قیامت بیتی ہے۔''

''کچھ اندازہ تو ہو رہا ہے مجھے، خورشید بھائی پر اللہ رحم فرمائے، آخر پتا تو چلے، آپ لوگ مردہ خانے گئے تھے؟''

''ہاں نعمان بیٹا! مردہ خانے سے خورشید بھائی کو کال آئی تھی، نمبر انہی کی بیٹی ثوبیہ کا تھا، جو انہیں لاش سے ملا تھا، اسی سے ہی انہوں نے کال کر ڈالی۔''

''لل..... لاش؟'' میرا دل دھکنے لگا۔

''نعمان بیٹا! ہم مردہ خانے سے ثوبیہ بیٹی کی ہی لاش دیکھ کر آرہے ہیں خدا غارت کرے نجانے کس بدبخت شیطان نے اس کے ساتھ ایسا گھناؤنا سلوک کیا ہے۔'' حاجی صاحب آزردہ سے لہجے میں بولے اور منے میاں نے پھر رونا شروع کر دیا۔ ایسے میں اچانک میں نے دیکھا کہ منے میاں کا بیٹا یعنی بدنصیب ثوبیہ کا بھائی اختر وہاں سے اُٹھ کر تیزی سے باہر نکل گیا شاید اس کی غیرت نے یہ گوارا نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی جوان بہن کے بارے میں یہ سب سنے جس کی حاجی کریم بخش مجھے تفصیل سنانے والے تھے۔ اُنہوں نے ایک گہری اور دکھ بھری سی سانس خارج کر کے جو کچھ مجھے بتایا، اس کا لب لباب یہی تھا کہ ثوبیہ کی لاش دو روز قبل پندرہ نمبر ملیر کے قریب واقع ایک خشک نالے کے قریب سے ملی تھی۔ اسے سب سے پہلے ایک کوڑا کچرا اٹھانے والے دو مزدوروں نے دریافت کیا تھا اور فوراً ون فائیو میں اطلاع دے ڈالی تھی۔ پولیس لاش کو متعلقہ تھانے لے گئی۔ وہاں سے اسے خودکشی کا کیس اور لاوارث قرار دے کر ایدھی کے لاوارث مردہ خانے بھیج دیا گیا۔ جہاں سے غسالہ کو اس کے بلاؤز کے اندر سے ایک سیل فون ملا جو اس نے فوراً منتظم کے حوالے کر دیا سیل فون آف تھا اسے آن کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کی بیٹری ڈاؤن ہو چکی تھی۔ اس میں دوسری بیٹری ڈال کر اسے آن کیا اور اس میں کوئی ایسا نمبر تلاش کیا گیا جو اس کے کسی قریبی عزیز یا رشتے دار کو ظاہر کرتا ہو۔ بالآخر اختر بھیا کے نام سے ایک نمبر سیو ملا تو اس پر منتظمین نے اطلاع کر دی۔ منے میاں کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کریں؟ تاہم انہوں نے سیدھا حاجی صاحب کے گھر کا رخ کیا اور انہیں ساری بات بتانے کے بعد اپنے ساتھ ایدھی کے اس مذکورہ مردہ خانے چلنے کی استدعا کی تھی، حاجی صاحب اس مشکل گھڑی میں بھلا کب انکار کرتے، فوراً ان دونوں بد نصیب باپ بیٹوں کے ساتھ چل دیئے۔

وہاں پہنچے تو ان پر یہ لرزہ دینے والا انکشاف ہوا کہ وہ لاش لاوارث نہیں بلکہ بدنصیب ثوبیہ کی ہی تھی۔ اپنی جوان بیٹی کی لاش دیکھ کر منے میاں تو وہیں غش کھا گئے تھے، ان کے بیٹے اختر نے ہی اسے سنبھالا تھا۔ ہوش آنے کے بعد حاجی صاحب نے انہیں یہی مشورہ دیا کہ وہ اب اسی تھانے جا کر اس کی رپورٹ کروائیں تاکہ پوسٹ مارٹم کیا جا سکے۔ وہ اس پر راضی نہ تھے لیکن ایدھی کی انتظامیہ نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے متعلقہ تھانے اس کی اطلاع دے ڈالی تھی کیوں کہ وہ ایسی کسی بھی صورت میں اس بات کے پابند تھے کہ جیسے ہی انہیں مردہ خانے میں پڑی کسی لاش کے وارث کا پتا چلے تو وہ فوراً متعلقہ تھانے اس کی خبر دیں۔

پولیس لاش کو پوسٹ مارٹم کرانے کی غرض سے ایک

قریبی سرکاری اسپتال لے گئی تھی۔

''خدا کے لیے حاجی صاحب! آپ لوگ کچھ کیجیے، میری بیٹی کی لاش کو چیر پھاڑ سے بچائیں، ہوگا کچھ نہیں، ہماری جگ ہنسائی ہو جائے گی۔'' خورشید خاں المعروف منے میاں نے حاجی کریم بخش کی طرف دیکھ کر منت کی تو میرا دل بھی اس کے لہجے کی بے چارگی پر دکھنے لگا۔ حاجی صاحب خود بڑے مغموم سے ہو رہے تھے۔ وہ اسے جواب دینے کی بجائے میری طرف دیکھ کر بولے۔

''نعمان بیٹا! تم ہی انہیں سمجھاؤ کہ یہ ضروری ہے، کم از کم پتا تو چلے یہ آیا قتل ہے یا خودکشی اور خودکشی کی بھی ضرور کوئی وجہ ہوتی ہے جبکہ بدنصیب ثوبیہ تو پہلے ہی سے گمشدہ تھی۔'' میں تھوڑا سوچ میں پڑ گیا اگرچہ میں بھی حاجی صاحب کی بات سے متفق ہی تھا مگر ایک قباحت تھی جس کا اظہار کرتے ہوئے میں نے کہا۔

''بات تو آپ کی درست ہی ہے حاجی صاحب! لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پولیس بھی تو ہم سے تفتیش کرے گی اور ہم ان سے یہ بات نہیں چھپا سکتے کہ ثوبیہ کچھ روز پہلے ہی سے گم تھی کیوں کہ پولیس یہی سوال کرے گی کہ ہم نے اس کی اطلاع تھانے میں کیوں نہ دی؟''

''بات تو تمہاری بھی غلط نہیں ہے۔'' حاجی صاحب پُرسوچ لہجے میں بولے اور چپ ہو رہے۔ میں نے کہا۔

''لیکن میرے خیال میں یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں ہے، پولیس کو ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاملہ بدنامی کا تھا اسی لیے پہلے ہم اپنے طور پر کوشش کر رہے تھے، تاہم ہمیں پولیس کو اطلاع تو دینا ہی تھی، یا پھر ہمیں اس کا پتا دیر سے لگا وغیرہ۔ لیکن اصل ایشو یہی ہے کہ ہمیں اس بات کا کھوج لگانا چاہیے کہ آیا یہ واقعی خودکشی تھی اور اگر تھی بھی تو اس کے پس منظر میں وہ کون سے عوامل کارفرما تھے جس کی وجہ سے ثوبیہ نے خودکشی کی، اگر نہیں تو پھر یہ کہیں قتل کی واردات تو نہیں جسے خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی ہو۔''

میری بات پر حاجی صاحب نے تو صاد کیا تھا، مگر منے میاں نے میری صراحت پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ بے چارہ ابھی تک اپنی پیشانی تھامے اور سر جھکائے ژولیدہ خاطر بیٹھا تھا۔

''کیوں بھئی خورشید خاں! کیا کہتے ہو؟ ہمیں یہ تو کرنا ہی پڑے گا، اب تو ایدھی انتظامیہ نے بھی ازخود ہی یہ معاملہ پولیس کے حوالے کر ڈالا ہے۔''

خورشید خاں پھر بھی خاموش رہا تو میں نے ہی ان کے قریب اپنی کرسی ذرا کھسکا کر ان کے کاندھے کو بہ آہستگی تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''دیکھو خورشید صاحب! معاملہ اس وقت بدنامی سے زیادہ اہم مجرم تک پہنچنا ہے۔ اصل مجرم کا کیفرِ کردار تک پہنچنا ضروری ہے۔ باقی انسان کی زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے ہی ہیں جو آپ پر اور آپ کے گھر والوں پر اس وقت بیت رہی ہے اس کا ہم سب کو افسوس اور بہت ملال ہے۔'' میرے سمجھانے پر خورشید خاں نے اپنا ستا ہوا غمگین سا چہرہ اٹھایا اور کمزوری آواز میں بولا۔

''آپ لوگ جو مناسب سمجھتے ہو وہ کرو..... میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔'' کہتے ہوئے بے اختیار اس کا لہجہ رندھ گیا اور اس نے پھر اپنا سر جھکا لیا۔ ایسے میں حاجی صاحب نے میری طرف دیکھ کر مجھے ایک ہلکا اشارہ کیا، جس کا مطلب میں نے یہی سمجھا کہ اب اس موضوع کو ختم کر دینا چاہیے کیوں کہ خورشید خاں نے یہ نازک معاملہ ہمارے ہاتھ میں دے دیا تھا اور اب اس نے وہی کچھ کرنا تھا جس کا ہم اسے مشورہ دیتے۔ لہٰذا تھوڑی دیر بعد میں اٹھ کر چلا آیا۔

میں نے ابھی ان لوگوں کو عزیر خان کے متعلق کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

رات نصف کے قریب تھی۔ محلہ سنسان تھا اور گلیاں ویران۔ کوئی اِکا دُکا اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں۔ گھروں کے درمیان گلی کے باہر مین روڈ پر بھی کبھی کسی گاڑی کے تیزی سے گزر جانے کی آواز آ جاتی تھی اور پھر وہی اتھاہ خاموشی کا راج طاری ہو جاتا۔

چند قدموں کے فاصلے پر وہ گلی تھی جہاں میرا گھر تھا۔ میں گھر میں داخل ہوا۔ فہیم نے ہی دروازہ کھولا تھا۔ میں نے اسے آج والے اندوہناک واقعے کے بارے میں بتا دیا، ہم دونوں کمرے میں ہی آ گئے تھے۔

''جیسی کرنی ویسی بھرنی..... یہی تو وہ بدبخت تھا جو ابا جان کے پھانسی لگتے ہی، بجائے ہمارا غم بانٹنے کے اس مردود ارشاد منشن کی ہاں میں ہاں ملایا کرتا تھا اور ہمارے خلاف اس کا ساتھ دیتا تھا۔ ہمارے مکان کے پیچھے پڑ گیا تھا۔'' فہیم تلخی سے بولا۔ ''ہمیں یہ مکان زبردستی بیچنے کے لیے کیسی کیسی دھمکیاں دیا کرتا تھا۔ حرام گوشت کھلاتا تھا یہ اس کے اعمالوں کی سزا ہے۔''

''نہیں فہیم! ایسا نہیں کہتے۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

"ہر انسان خود اپنے اعمالوں کا خدا کو جواب دہ ہے۔ انسانی ہمدردی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم مشکل میں سارے اختلافات بھلا کر ایک دکھی انسان کی مدد کریں۔" فہیم نے خاموشی سے بات سنی اور واپس اپنے کمرے کی طرف لوٹنے لگا۔ میں نے ہولے سے اسے پکارا۔

"فہیم!" وہ دروازے کے قریب پہنچ کر رکا، پلٹا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"جی بھائی جان؟"

"میں کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ عاصمہ سے تمہارا رویہ کچھ ٹھیک نہیں ہے، نہ تم اس سے کوئی بات کرتے ہو اور نہ ہی اس کی کسی بات کا جواب سیدھے منہ دیتے ہو۔" میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا تو وہ کچھ شاکی نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولا۔

"کیا عاصمہ نے آپ سے میری کوئی شکایت کی ہے؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ "میں نے خود یہ بات محسوس کی ہے، اسی لیے تم سے کہا تھا۔" میری بات پر وہ پھیکے انداز میں مسکرایا تھا۔

"میرا خیال ہے تمہیں اپنا رویہ درست کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ عاصمہ بہن مجھ سے تمہاری کوئی شکایت کرے۔" میرے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑی سی تلخی اتر آئی تھی جسے فہیم نے بھی فوراً محسوس کر لیا تھا اور اس نے مجھے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں اسی طرح پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے کھڑا رہا۔

فہیم کے انداز سے مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اسے میری بات بری لگی ہو۔ بہرکیف میں سر جھٹک کر اپنے بستر پر آ کر دراز ہو گیا۔

آج کی بھاگ دوڑ نے مجھے خاصا تھکا مارا تھا اسی لیے بستر پر لیٹتے ہی سو گیا تاہم صبح اپنے معمول کے وقت پر ہی جاگ گیا۔ حسبِ معمول مجھے عاصمہ بہن نے ہی جگایا تھا۔ میں نہا دھو کر فارغ ہوا اور ناشتے کی میز پر آ گیا۔ عاصمہ ناشتا لگا چکی تھی اور اب میرے سامنے والی کرسی پر براجمان تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر ایک گردشی نظر آس پاس ڈال کے اس سے فہیم کے بارے میں پوچھا۔

"کیا ہوا ابھی تک نہیں اٹھا ہے؟"

"بھائی تو اپنے وقت پر ہی جاگ گئے تھے۔" وہ جواباً بولی۔ "لیکن نجانے کیوں وہ آج ناشتا کیے بغیر ہی آفس چلے گئے۔"

"اچھا!" میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اُسے جلدی ہو آج آفس جانے کی۔" کہتے ہوئے میں نے کن انکھیوں سے عاصمہ کی طرف دیکھا تھا۔ وہ چپ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کا چہرہ اترا اترا سا نظر آ رہا تھا۔ ناشتا بھی وہ بڑی بے دلی کے ساتھ کر رہی تھی۔ ایک آدھ توس کھا کر وہ چائے پینے لگی۔ میں ذرا ناشتا بھاری کیا کرتا تھا۔

ناشتا کرنے کے بعد میں اپنے لاری اڈے پر جانے کی تیاری کرنے لگا، گاڑی کی چابی سنبھالی اور جب عاصمہ کو دروازہ بند کرنے کا کہہ کر باہر صحن میں دروازے تک آیا تو وہ بولی۔

"بھائی جان!"

"ہاں کہو؟" میں اس کی جانب پلٹا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ بولی۔ "بھائی جان! اگر آپ کو جلدی نہ ہو تو آپ سے ایک بات کرنا تھی۔"

"ہاں..... ہاں بہنا! کہو کیا بات ہے، مجھے کوئی جلدی نہیں ہوتی۔"

"وہ..... پپ..... پتا نہیں کیوں فہیم بھائی مجھ سے آج کل کچھ خفا خفا سے رہنے لگے ہیں۔" اس نے اسی طرح جھکے جھکے سر سے کہا تو میں ذرا چونکا۔ میں تو جانتا ہی تھا کہ فہیم، عاصمہ سے آج کل کچھ کھینچا کھینچا سا رہنے لگا تھا۔ تاہم ہولے سے مسکرا کر بولا۔

"ارے! وہ کیوں تم سے ناراض ہونے لگا؟ ایک ہی تو بہن ہے ہماری پیاری سی۔" پُرشفیق لہجے میں یہ کہتے ہوئے میں نے پیار سے اس کے سر پہ اپنا ہاتھ بھی رکھ دیا مگر وہ ہنوز چپ رہی تو میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے مزید کہا۔

"چلو! تم دل چھوٹا نہ کرو میں اس سے پوچھ لوں گا بلکہ کان کھینچوں گا اس کے..... ٹھیک؟ چلو اب تھوڑا سا مسکرا دو، تم نے تو ذرا سی بات پر اپنی گڑیا سی صورت ہی اتار لی ہے۔" میری بات پر عاصمہ بہنا نے ہولے سے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا۔

"شاباش! یہ ہوئی نا بات، اچھا چلتا ہوں دروازہ بند رکھنا۔" یہ کہہ کر میں باہر آ گیا۔ میری مہران گھر کے باہر ہی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کھڑی ہوتی تھی۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوگیا۔ میرا دھیان منے میاں والے معاملے کی طرف تھا۔ میں چند ثانیے کچھ سوچتا رہا اس کے بعد کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

لاری اڈے پہنچا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ گیارہ بجے تک میں وہاں کے مختلف اُمور نمٹاتا رہا، اس کے بعد میں نے اپنے چھوکرے دوسو کو چائے بنانے کا کہا۔

اسی وقت میرے سیل فون کی بیل گنگنائی..... فون فرحانہ کا تھا۔ اس کی جوش بھری آواز ابھری۔

''نعمان صاحب! آ..... آپ اس وقت کہاں ہیں؟ م..... میرا مطلب ہے اگر میں ابھی آپ سے ملنا چاہوں تو کہاں ملاقات ہوسکتی ہے آپ سے؟'' میں اس کی جوش میں لرزتی آواز پر ہی نہیں بلکہ لہجے پر بھی چونکا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اسے کسی خاص بات کی بھنک ملی ہو۔ وہ صرف میرے معاملے میں ہی نہیں بلکہ اپنی ماں کے اصل قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے بھی پُرعزم تھی۔ میں بولا۔

''کوئی خاص بات ہے تو بتا سکتی ہیں مجھے..... میں اس وقت اپنے کام کی جگہ پر ہوں جو آپ کی رہائش گاہ سے کافی دور ہے۔''

''نو پرابلم! گاڑی میں کیا مشکل ہے، آپ کہیں بھی ہوں گے میں بہ آسانی آپ کے پاس پہنچ جاؤں گی۔ بات اہم ہے جو میں فون پر نہیں بتا سکتی، میرے پاس کچھ اسٹف بھی ہے آپ کو دکھانے کے لیے۔''

میں نے کچھ سوچ کر اسے یہاں کا پتا بتا دیا۔

اس دوران دوسو چائے بنا لایا۔ چائے ختم کرنے کے بعد میں اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ حضرت لعل شہباز قلندرؒ کا عرس قریب تھا اور مجھے کم از کم سات لاریوں کا اضافی بندوبست کرنا تھا جن میں سے تین لاریاں میں نے اپنے اڈے سے اٹھا دی تھیں باقی ''روٹ'' پر لگی ہوئی تھیں جبکہ باقی چار لاریاں میں نے ٹھیکے پر اٹھانی تھیں۔ اس سلسلے میں، میں مختلف پارٹیوں سے رابطے کر رہا تھا۔ لکڑی کوچز تو مل رہی تھیں لیکن وہ مہنگی پڑ رہی تھیں، یوں بھی اس میں اتنے لوگوں کے سمانے کی گنجائش نہیں ہوتی جبکہ عام مسافر لاریوں میں لوگوں سے کھچا کھچ بھرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں، چاچا انور شاہ نے ٹھٹھہ کے ایک لاری اڈے ''اسٹارٹر'' سے بات کی تھی۔ اس نے صرف دو لاریاں پہنچانے کا وعدہ کیا تھا، باقی دو لاریوں کا بندوبست کرنے کے لیے میں اپنی سی کوششوں میں مصروف تھا مگر ابھی تک مجھے کچھ خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

دھابے جی میں بھی ایک لاری اڈا تھا مگر اس کے رابطے کے لیے میرے پاس کوئی کونٹیکٹ نمبر نہیں تھا، میں اسی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

کافی دوڑ دھوپ اور اِدھر اُدھر فون کھڑکانے کے بعد بالآخر میرا رابطہ کھارو کے ایک اسٹارٹر سے ہوگیا۔ اس نے تھوڑے زیادہ ریٹ پر دو لاریاں دینے کا وعدہ کرلیا۔ ان کاموں سے فارغ ہوا تو اچانک میری نگاہ کھڑکی سے باہر پڑی۔ ایک نیلے رنگ کی ہنڈا سٹی اسی طرف کو آرہی تھی جہاں انتظامی امور نمٹانے کی یہ پختہ کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ میں نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر فرحانہ کو بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اس کے چہرے پر سن گلاسز تھے اور بالوں کو نفاست سے گوندھ کر پیچھے کیے ہوئے تھے۔

میں نے دوسو کو آواز دے کر اسے ''کار والی'' کو سیدھا ادھر ہی لانے کے لیے باہر بھیج دیا اور خود کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے آرام سے بیٹھا رہا۔ تاہم خود اندر سے میں بھی بے چینی سے سوچ رہا تھا کہ آخر فرحانہ ایسی کیا اہم خبر لائی تھی جس کا تذکرہ اس نے فون پر کرنے کی بجائے مجھ سے اتنی دور ملنے کو ترجیح دی تھی؟ مطلب صاف تھا کہ وہ ضرور کوئی اہم خبر لائی ہوگی۔

ذرا ہی دیر میں فرحانہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے عقب میں دوسو تھا۔ فرحانہ نے گلاسز اوپر کر لیے تھے، اس کی کھلتی گوری شفاف رنگت پر سیاہ رنگ کا دھوپ والا چشمہ خاصا جچ رہا تھا۔ وہ بیش قیمت سمر لان سوٹ میں تھی اپنی اے سی کار سے ذرا دیر کے لیے باہر نکلتے ہی اسے گرمی لگنا شروع ہوگئی تھی۔ میرے کمرے میں روم کولر تھا، لیکن ظاہر ہے اے سی کے مقابلے میں یہ روم کولر کیا حیثیت رکھتا تھا۔

وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرائی تھی، میں نے خیر مقدمی مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ یہاں وہ پہلی ہی بار آئی تھی۔ ہائے، ہیلو کے بعد وہ میرے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت اور نفیس قسم کا ہینڈ بیگ تھا۔ وہ ایک سرسری سی نگاہ اطراف میں ڈالنے کے بعد ہلکی مسکراہٹ سے بولی۔

''خاصا کلاسیکل ماحول ہے یہاں کا..... پسند آیا۔ ورنہ تو اب تک میں نے شیشوں والے وال ٹو وال پیپرز اور

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

نجانے کیسے کیسے ڈیکوریٹڈ پیس سے سجے ہوئے فلی ائرکنڈیشنڈ آفس ہی دیکھے تھے، ایسا خالص کلاسیکی ماحول پہلی بار دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔"

میں نہیں جانتا تھا کہ اسے واقعی یہ غریبانہ طرز کا ماحول اچھا لگا تھا یا وہ محض مروتاً ایسا کہہ رہی تھی۔

"شکریہ!" میں نے مختصراً کہا اور اس کے پُررونق چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"کیا پئیں گی آپ؟ ٹھنڈا یا....."

"کچھ نہیں" کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا ہینڈ بیگ اپنے سامنے میز پر رکھ دیا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر فوراً مقصد کی بات کہہ ڈالی۔

"کیا کوئی خاص بات تھی؟"

"ہاں!" اس نے اپنے حلق سے ایک ہنکاری سے مشابہ سانس خارج کی۔ پھر اس نے اپنے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ساتھ ہی ایک الجھی ہوئی سی نگاہ قریب کھڑے دوسو پر ڈالی۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا اور دوسو کو میں نے باہر جانے کا اشارہ کردیا۔

"یہ میں آپ کو دکھانا چاہتی تھی۔" دوسو کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے اپنے ہینڈ بیگ کی زپ کھول کر ایک پوسٹ کارڈ سائز کی تصویر نکال کر میری طرف بڑھائی اور ایک عجیب سی مسکراہٹ سے بولی۔

"نعمان صاحب! اس تصویر کو غور سے دیکھئے اور بتایئے مجھے پہلے کہ اس میں آپ کو کیا خاص بات نظر آرہی ہے؟ آپ کی یادداشت کا امتحان بھی ہوجائے گا۔"

تصویر پر نظر ڈالنے سے پہلے میں نے اس کے دلکش چہرے کی طرف دیکھا تھا جو خاصا پُرجوش سا نظر آرہا تھا۔ اس کے بعد میں نے تصویر اپنے ہاتھ میں لے کر بہ غور اسے دیکھنا شروع کیا۔

اس نے اپنا ہینڈ بیگ ہنوز کھولے رکھا تھا، انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کے اندر سے اور بھی کچھ نکالنا چاہتی ہو۔ بہرکیف میں تصویر کو بہ غور دیکھنے لگا۔

یہ رنگین تصویر تھی اور کسی پارٹی میں کھینچی ہوئی لگتی تھی کیوں کہ اس میں آس پاس کا ماحول کچھ ایسا ہی نظر آتا تھا۔ تصویر میں چار افراد نظر آرہے تھے۔ ان میں ایک تو فرحانہ کا باپ رانا بشیر تھا جبکہ دوسری ایک خاتون باقی دو آدمی تھے۔ ایک تو رانا بشیر کی عمر کا ہی تھا جبکہ دوسرا نسبتاً جوان ہی نظر آتا تھا۔ ماسوائے رانا بشیر کے باقی تینوں افراد بہ شمول خاتون، میرے لیے اجنبی تھے۔ البتہ یہ تینوں افراد مجھے ایک ہی خاندان سے متعلق لگتے تھے یعنی باپ بیٹا اور ماں تاہم پھر بھی میں ان کو بہ غور دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر مجھے یاد نہیں آسکا تھا کہ میں نے ان مذکورہ تین افراد کو پہلے بھی کبھی دیکھا ہو۔ بالآخر میں نے سامنے بیٹھی فرحانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ جس کی نگاہیں بہ دستور میرے ہی چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"میں سوائے آپ کے پاپا کے کسی کو نہیں پہچان پارہا۔"

"آپ ان تین افراد کو پہچان بھی کیسے سکتے ہیں؟ کیوں کہ آپ نے پہلے کبھی ان افراد کو دیکھا ہی کب ہے؟" اس نے کہا اور میں اس کی بات پر چونکے بغیر نہیں رہ سکا کیوں کہ میں یہی سمجھا تھا کہ اس نے یہ تصویر مجھے اسی لیے دکھائی تھی تاکہ میں ان تینوں افراد کو پہچاننے کی کوشش کروں جو میرے لیے بالکل اجنبی تھے مگر اب اس کی یہ بات سن کر کہ اس نے یہ تصویر تو مجھے کسی اور مقصد کے لیے دکھائی تھی، میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"اس تصویر میں، میں آپ کو کچھ اور چیز دکھانا چاہ رہی ہوں، اب یہ سوچ کر ایک بار پھر اس تصویر کو غور سے دیکھیں۔" وہ مجھ سے دوبارہ بولی۔

میں نے قدرے الجھی ہوئی نظروں سے ایک ذرا اس کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ تصویر پر نظریں جمادیں۔ اب میں ان میں موجود ایک ایک فرد کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ تینوں فل کوٹ سوٹ میں تھے، خاتون بھی ایجڈ تھیں۔ جس نے بیش قیمت ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اب میں ان کے لباس تک کو بھی بڑے انہماک سے گھور رہا تھا میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر فرحانہ مجھے اس تصویر میں ایسی کیا شے دکھانا چاہ رہی تھی، جب کہ اُسے بھی معلوم تھا کہ اس کے باپ کے علاوہ میرے لیے باقی تین افراد سر بہ سر اجنبی بھی تھے؟

ایسے ہی وقت میں جب میں ہار مان کر تصویر فرحانہ کے حوالے کرنے کا ارادہ کررہا تھا تو اچانک میری نگاہ نسبتاً جوان نظر آنے والے شخص کی ٹائی پر پڑی اور جیسے مجھے ایک جھٹکا لگا، میری آنکھیں پھیل گئیں، میں نے تصویر کو ایک دم اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں کے بالکل قریب کرلیا۔ میری نظریں مذکورہ آدمی کی ٹائی پن پر جم کر رہ گئی تھیں۔

"اس تصویر میں، جو اہم اور چونکا دینے والی شے میں تمہیں دکھانا چاہتی تھی، وہ شاید تم نے دیکھ لی ہے۔" معا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

میری سماعتوں میں فرحانہ کی آواز ابھری۔

''ی..... یہ تو وہی ٹائی پن ہے۔'' میرے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا۔

''ہاں! بالکل وہی ہے۔'' اس نے یہ کہتے ہوئے دوبارہ اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔

''لو یہ دیکھو.....'' اس نے اپنے بیگ سے وہی ٹائی پن نکال کر میری طرف بڑھائی۔ یہ وہی ٹائی پن تھی جو رفعت خانم کے قتل کے کچھ عرصے بعد اس کے شوہر رانا بشیر کو اس کی اپنی اسٹڈی روم میں ملی تھی۔

میں نے فوراً اس کے ہاتھ سے وہ ٹائی پن لی جو ساتھ ہی لے آئی تھی۔ میں نے وہ ٹائی پن تصویر کے ذرا قریب کرتے ہوئے اس نوجوان کی ٹائی پن کے ساتھ کر کے دیکھی۔

''پن یہی ہے۔'' وہ بولی۔ ''میں نے اس تصویر کو اپنے اسمارٹ فون کے ویوور میں ڈال کر اور انلارج کر کے دیکھا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے مجھے اپنا لمبا چوڑا اسمارٹ فون آگے کر کے دکھایا۔ اس میں وہ ٹائی پن سامنے تھی، میں نے سیل لے کر ہاتھ میں پکڑی ٹائی پن کو میچ کیا تو دنگ رہ گیا اور فرطِ جوش سے بولا۔

''صد فیصد یہی ہے وہ ٹائی پن..... اس کا مطلب ہے یہی وہ پُراسرار شخص تھا جسے تمہاری مقتولہ مرحومہ ماں نے اپنے گھر میں دیکھا تھا۔''

''آف کورس۔'' وہ بھی جوش سے اپنے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے بولی۔

''کیا تم انہیں پہچانتی ہو؟ کون ہیں یہ لوگ اور کہاں رہتے ہیں؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''میں تو نہیں پہچانتی لیکن پاپا ضرور پہچانتے ہوں گے۔''

''آپ کو تو پہلی فرصت میں ان سے پوچھنا چاہیے تھا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''ویسے یہ تصویر آپ کو ملی کہاں سے؟'' ذہن میں اچانک ابھرنے والے اس سوال پر میں نے فوراً پوچھ لیا۔ وہ جواباً اپنے بالوں میں اٹکے ہوئے سن گلاسز کو اتار کے میز پر اپنے بیگ کے قریب رکھتے ہوئے بولی۔ ''او بوسلی! میں یہی کرنا چاہتی تھی لیکن پاپا کل صبح سے اپنے ایک ضروری بزنس ٹرپ پر آؤٹ آف سٹی ہیں۔ آج رات کو ہی ان کی واپسی ہوگی۔'' اتنا کہہ کر وہ لمحہ بھر کو رکی اور پھر میرے دوسرے سوال کا جواب دیتے ہوئے آگے بولی۔

''درحقیقت کل رات میں اکیلی گھر پر بور ہو رہی تھی۔ اگرچہ میری کچھ سہیلیاں بھی آئی ہوئی تھیں مگر وہ کب تک میرے ساتھ رہتیں؟ شام تک وہ لوٹ گئیں، اکیلی ہوتے ہی مما کی یادیں مجھ پر یلغار کرنے لگیں تو میں سوچنے لگی آخر میری مما کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟ اور اس نے کیوں ان کی جان لی؟ ویسے بھی دن بہ دن میرے اندر یہ خواہش بلکہ ایک عزم شدت کے ساتھ جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ کاش! کچھ ایسا ہو جائے، کوئی ایسا کلیو مجھے مل جائے کہ جس سے مما کا قاتل بے نقاب ہو کر اپنے انجام کو پہنچے، پھر اچانک مجھے اس ٹائی پن کا خیال آیا۔ میں اُسے بہ غور دیکھ کر یہ سوچنے لگی کہ یہ اس نامعلوم اور اصل قاتل تک پہنچنے کے لیے ایک اہم کلیو ہو سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ اس کا کھوج کس طرح لگایا جائے؟ اس بارے میں تو اکثر اور بہت بار میں نے اپنا دماغ لڑایا بھی، بالآخر کل رات شاید میں کچھ زیادہ ہی تنہائی محسوس کر رہی تھی اسی لیے..... میرے پاس سوچنے اور ذہن پر زور دینے کا زیادہ وقت بھی تھا تب ہی میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ابھرا کہ قاتل جو بھی تھا وہ یقیناً پاپا کا کوئی دوست نما دشمن بھی ہو سکتا ہے کیوں نہ پاپا کی البم دیکھی جائے۔ میں نے پاپا کی ڈھیر ساری تصاویر قالین پر پھیلا دیں، مجھ پر ایک جنون سا سوار ہو گیا میں ساری رات، حتیٰ کہ فجر تک پاپا کی مختلف تصاویر کو بڑے غور غور سے دیکھتی رہی بالآخر یہ تصویر مجھے ملی تو جیسے میری رات بھر کی تلاش بسیار کی محنت وصول ہو گئی۔''

وہ اتنی صراحت دینے کے بعد خاموش ہوئی تو میں نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

''تو کیا آپ نے ان تینوں افراد کی اور بھی تصاویر تلاشنے کی کوشش چاہی تھی؟''

''ہاں!'' اس نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ''لیکن..... ان تینوں افراد کی مزید کوئی تصویر مجھے نہ مل سکی۔'' اس نے جواب دیا۔ میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا بن گیا وہ میری طرف دیکھ کر اُمید بھرے لہجے میں بولی۔

''نعمان صاحب! آپ کیا کہتے ہیں؟ کیا ہم اب قاتل کے قریب پہنچ سکتے ہیں؟''

''یقیناً..... ہمارے ہاتھ ایک اہم کلیو تو پہلے ہی سے لگ چکا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن..... اس کی کھوج باقی

تھی، اب وہ بھی سمجھو مکمل ہونے والی ہے۔ تاہم ابھی ہم یہ دیکھیں گے کہ تمہارے پاپا اس تصویر کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔'' پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا، میں نے کچھ سوچ کر اس سے پوچھا۔

''کیا آپ نے ابھی تک اپنے پپا کو اس تصویر کے بارے میں بتایا ہے؟ میرا مطلب ہے فون وغیرہ پر آپ نے اس کا تذکرہ کیا ہے ان سے؟''

''نہیں، ابھی تک تو نہیں کیا لیکن ارادہ تو کیے ہوئے تھی۔'' اس نے جواب دیا۔

''ابھی آپ ان سے ایسی کوئی بات نہ کریں۔'' میں نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں، یہ موضوع آپ ان سے تب ہی چھیڑیں جب میں اور ایڈووکیٹ زنیرہ بھی وہاں، یعنی آپ کے گھر موجود ہوں۔''

میری بات پر وہ کچھ اُلجھن آمیز سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی اور پھر اسی لہجے میں بولی۔

''اس کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟''

''کچھ خاص نہیں۔'' میں نے پہلو تہی کرنا چاہی تو وہ بے اختیار ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی لیکن..... پاپا، مجھ سے یہ ضرور سوال کریں گے کہ اُنہیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

''اس کا آسان حل ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ جس وقت اپنے پاپا سے اس تصویر کا ذکر کریں گی تو مجھے اس سے تھوڑی دیر پہلے ہی مطلع کر دیجیے گا تب تک آپ اس تصویر کو تلاشنے کے بہانے ہمارے پہنچنے تک تاخیر کر سکتی ہیں۔ اپنے پاپا کو یہ ضرور بتا دیجیے گا کہ آپ نے ہم سے بھی فون پر اس تصویر کا ذکر کیا ہے اور اسی وقت تبادلہ خیال کے لیے ہمیں بلایا بھی ہے۔''

''کچھ عجیب سی ہی لگ رہی ہے آپ کی یہ بات مجھے.....'' وہ گومگو سے لہجے میں میری طرف دیکھ کر بولی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ کو عجیب لگ رہی ہے، لیکن..... اتنی ہے نہیں۔''

اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے میرے چہرے پہ ایک عجیب سی نگاہ ڈالی۔ کچھ دیر پہلے اس کا جوش اور ایک خوشی کی تمازت سے کھلا کھلا چہرہ اب مجھے یک دم بے رونق سا دکھائی دینے لگا تھا۔ شاید وہ میری بات کی تہہ تک نہیں تو کم از کم اس کا ''مطلب'' ضرور سمجھ گئی تھی۔

مگر..... مجھے بھی اس کی چنداں پروا نہ تھی کہ وہ میری بات کا کیا مطلب لیتی ہے اور اس کا برا مناتی ہے۔ بالآخر وہ کرسی سے اٹھ کر رخصت ہونے کی غرض سے بولی۔

''ٹھیک ہے، جیسا آپ سمجھیں، میں اب چلوں گی۔'' اس بار اخلاقاً میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک چور سی آخری نگاہ میرے چہرے پہ ڈال کر چلی گئی۔

میں دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہو گیا۔

وہ میری اس بات کا مطلب سمجھ تو گئی تھی کہ میرا اور زنیرہ کا اس طرح اس کی رہائش گاہ پر آنا ''چہ معنی'' رکھتا تھا لیکن میرے خیال میں یہ ازبس ضروری تھا کیوں کہ پولیس کی طرح میں بھی سب سے پہلا شبہ گھر کے فرد پر ہی کرتا تھا اور میری نظر رانا بشیر پر بھی تھی۔ اگرچہ اس سلسلے میں پہلے بھی میرے اور فرحانہ کے درمیان تھوڑی سی تلخی ہو چکی تھی مگر بات کسی ناراضگی کے بغیر ختم ہو جاتی تھی۔ یوں بھی مجھے اس کی ناراضگی کی بھلا کب پروا تھی۔

درحقیقت میں رفعت خانم مرڈر کیس سے متعلق کسی بھی رونما ہونے والے یا اس سلسلے میں کسی نئی پیش رفت پر سب سے پہلے فرحانہ کے باپ رانا بشیر کے تاثرات کا بہ غور جائزہ لینے کا خواہ ضرور رہتا تھا اور یہی بات فرحانہ کو تلخ لگتی تھی مگر مجھ سے اس بارے میں وہ کچھ زیادہ احتجاج یا اختلاف رکھنے کی جرأت نہیں کرتی تھی۔

بہرکیف..... میرے لیے یہ نئی اطلاع خاصی اُمید افزاء اور سنسنی خیز تھی۔ میں نے اسی وقت زنیرہ کو فون کر کے اس کے بارے میں مطلع کر ڈالا۔ اُس کے لیے بھی یہ خبر خاصی چونکا دینے والی تھی۔ تاہم اس نے آج شام میرے ساتھ رانا بشیر کی رہائش گاہ پر جانے کی معذرت کر لی تھی۔ وہ آج رات تک کسی اہم کیس کے سلسلے میں مصروف تھی۔

اس کے پاس میرے لیے ابھی کوئی خاص خبر نہ تھی کہ عارف مچھندر کے سلسلے میں کیا ہوا تھا؟ وغیرہ۔

میں پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ باہر موٹر بائیک کے رکنے کی آواز ابھری۔ میں نے گردن گھما کر کھڑکی سے باہر جھانکا اور چونک پڑا۔ سدو بھائی آیا تھا۔ اور اپنی بائیک کو سائیڈ اسٹینڈ پر کھڑی کر کے دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ شاید عزیر خان کے سلسلے میں کوئی خبر لایا تھا۔ میں بے چینی سے اس کے اندر داخل ہونے کا منتظر رہا۔ اگلے ہی لمحے وہ دروازے پر تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

دی۔ وہ مجھے سلام کر کے میرے اشارے پر سامنے والی کرسی سنبھال کے اس پر بیٹھ گیا۔

"کوئی خبر؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سب سے پہلے اس نے عزیر خان کے بارے میں وہی کچھ بتایا جو میں پہلے ہی سے جانتا تھا، فقط یہ کہ وہ حاجی مہران خان کا بیٹا تھا اور دوستوں کے ساتھ کاروبار کے سلسلے میں آج کل کراچی آیا ہوا تھا اور بلیر والی حویلی میں ہی رہائش پذیر تھا۔ وہ حاجی مہران خان کی پہلی بیوی سے تھا جو اس کے آبائی علاقے ٹھٹھہ میں ہی رہتی تھی۔ اس کی ایک بہن بھی تھی جو شادی شدہ تھی اور وہیں گھوڑا باڑی میں اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ بھائی کوئی نہیں تھا۔ گویا عزیر خان حاجی مہران کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔

اس سے آگے سدو بھائی نے مجھے بتایا۔

"آج کل یہ ڈیفنس کے ایک بڑے لگژری اپارٹمنٹ میں رہتا ہے۔ اس کے ہمراہ وہی تینوں دوست بھی رہتے ہیں جن کی تصویر آپ نے مجھے دکھائی تھی۔"

"شاہنواز خان اور بشیر خاں؟"

"جی ہاں سر!"

"آگے بتاؤ..... کوئی اہم خبر؟" میں نے متانت بھری سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے پہلے ایک نگاہ کمرے کے دروازے پر ڈالی اور پھر ہلکی آواز میں بولا۔

"سر! میں آپ کے پاس ہمیشہ تب ہی آؤں گا جب کوئی خاص خبر ہوگی۔ میں نے ان دو روز تک ان تینوں کی ریکی کی تھی ان کے پاس ایک مشکوک آدمی کو میں نے دیکھا تھا جس کا نام لاڈلہ سائیں ہے۔ اب یہ اتفاق ہی کی بات ہے کہ میں خود بھی اس شخص کو اچھی طرح جانتا تھا۔" وہ اتنا کہہ کر ذرا رکا اور میں لاڈلہ سائیں کے نام پر ذرا چونکا تھا۔ مجھے فوراً ہی یاد آ گیا تھا کہ یہ نام میں نے شاید ایک دو بار شیراز عرف کالیا کی زبان سے سنا تھا۔ یہ اس کے گروہ کے استاد بھابھا کا مخالف گروہ کا سرغنہ تھا۔ وہ آگے بتانے لگا تو میں نے اسے رک کر پوچھا۔

"ایک منٹ..... ذرا مجھے یہ بتانا کہ تم اس لاڈلہ سائیں کو کیسے اور کب سے جانتے ہو؟" اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولا۔

"میں داؤد چورنگی کے جس مال گودام کے مین گڈاؤن کیپر کے پاس کام کرتا تھا تو اس شخص کو میں..... وہاں اکثر گڈاؤن کیپر قاسم بھائی کے پاس آتے جاتے دیکھتا تھا۔ یہ شخص مجھے کچھ اچھے قماش کا نہیں لگتا تھا۔ وہ جب بھی آتا تھا تو دونوں کے درمیان بڑی رازدارانہ سی گفتگو ہوا کرتی تھی۔ مجھے قاسم بھائی پر بھی شبہ ہونے لگا تھا۔ گودام کا مالک رازق خان ایک شریف آدمی تھا اور میرا محسن بھی، وہ قاسم سے زیادہ مجھ پر اعتماد کرتا تھا۔ اسی لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے اس کے گوداموں میں کوئی ایسی ویسی غیر قانونی بات ہو۔

ایک دن رات کے ایک بجے جب میں ایک گودام کے کونے میں چارپائی ڈالے سو رہا تھا تو اچانک میری آنکھ کھلی۔ مجھے باہر کسی بھاری بھرکم ٹرک کی آواز سنائی دی۔ میں گودام سے باہر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑا سا ہیوی ٹرالر ٹرک گوداموں کے وسیع و عریض احاطے میں کھڑا تھا۔ اس پر ایک بڑا سا کنٹینر لدا ہوا تھا۔ اس کے ڈرائیونگ کیبن سے دو بھاری بھرکم آدمی اترے۔ ایک سفید رنگ کی پوٹھو ہاری جیپ بھی اندر داخل ہو رہی تھی جو ٹرک کے قریب آن رکی تھی، اس کے اندر سے وہی شخص برآمد ہوا۔ قاسم بھائی بھی وہاں آ چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا کہ تم سارا دن کے تھکے ہوئے ہو جا کر آرام کرو، یہ پشاور سے مال آیا ہے۔ میں خود ہی اتروا لوں گا۔ مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی کیوں کہ اس سے پہلے کوئی مال آنا ہوتا تو مجھے اطلاع ہوتی تھی کہ میں بھی مال اترواتے وقت مزدوروں کے ساتھ کھڑا ہو کر اپنی آنکھوں سے یہ ساری کارروائی دیکھوں اور مال کی تفصیل بھی لکھوں، خود قاسم بھائی اپنے کمرے میں پڑا اینڈتا رہتا تھا۔

بہرحال..... میں خاموشی سے اندر اپنے کمرے میں آ گیا مگر میں اندر سے کھٹک گیا تھا۔ میں دروازے کی جھری سے اپنی ایک آنکھ چپکائے باہر دیکھتا رہا۔ قاسم بھائی اور لاڈلہ سائیں آپس میں باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ باتوں کے دوران قاسم بھائی بار بار اپنی گردن موڑ کر اسی طرف دیکھتا بھی جاتا تھا، جدھر میں داخل ہوا تھا۔ پھر اچانک وہ اسی طرف تیز تیز قدموں سے آنے لگا، میں اُسے اسی طرف آتا دیکھ کر جلدی سے پلٹ گیا اور اپنی چارپائی پہ جا کر اُوپر چادر ڈالے سوتا بن گیا۔ معاً دروازہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلا۔ میں نے اپنے اُوپر لی ہوئی چادر کا ایک کونا سرکا کر دیکھا، وہ مجھے دروازے پر ہی کھڑا تھوڑی دیر تک اسی طرح گھورتا رہا اور پھر شاید یہ "تسلی" کرنے کے بعد کہ

میں سو رہا ہوں، وہ واپس اسی خاموشی سے لوٹ گیا۔ میں دوبارہ آہستہ سے اٹھا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لاڈلہ سائیں کے دو آدمیوں میں سے ایک دوبارہ ٹرک میں سوار ہوا۔ ٹرک کا انجن اسٹارٹ تھا۔ قاسم بھائی، لاڈلہ سائیں کو لے کر قریب ایک نسبتاً بڑے گودام کی طرف بڑھا۔ جس کا بڑا سا ہائڈرولک پریشر والا دروازہ پہلے ہی سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ اس گودام کا دروازہ اس قدر اونچا اور بڑا تھا کہ بہ آسانی تین راکٹ ٹرک، دو چھوٹے دس وہیلر ٹرک یا ایک بڑا ہیوی ٹرالر ٹرک اپنے دیو قامت کنٹینر سمیت اندر داخل ہو سکتا تھا۔

وہ ٹرک اسی طرح اندر داخل ہو گیا۔ یہ سب بھی اس گودام کے اندر تھے۔ دروازہ تھوڑا جھکا لیا گیا تھا۔ میں سمجھ گیا اندر کوئی کارروائی کی جا رہی ہو گی۔ لہٰذا میں نے ہمت کی اور بہ آہستگی اپنے گودام کا دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ وسیع و عریض احاطے میں فقط ایک ہی پول پر لگا دو سو واٹ کا بلب روشن تھا۔ ہر سو سناٹے کا راج تھا۔

اندر ٹرک کا انجن بند کر دیا گیا تھا۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا، مذکورہ گودام کی دیوار کی آڑ میں ہو گیا اور تھوڑا سا سر ابھار کر اندر جھانکا۔ قاسم بھائی، لاڈلہ سائیں اور ان کا ایک آدمی کنٹینر کے اندر گھسے ہوئے تھے، جس کے دونوں دروازے چوپٹ کھلے پڑے تھے۔ اندر روشنی کر دی گئی تھی۔ میں نے دیکھا کنٹینر کے اندر بڑی بڑی چوبی پیٹیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں اور لاڈلہ سائیں دو چار پیٹیاں کھول کر قاسم بھائی کو دکھا رہا تھا، ساتھ ہی اس سے کہہ رہا تھا۔

"یہ سارا خالص تیس کروڑ کا مال ہے۔" میں نے لاڈلہ سائیں کو قاسم سے دھیمی آواز میں کہتے سنا۔ "صرف دو دنوں کی بات ہے، کسی کو خبر نہ ہونے پائے اور نہ ہی کوئی پیٹی اس میں سے کم ہو۔ تمہارا کمیشن کھرا ہے، فکر مت کرنا، سمجھ گئے؟"

"آپ فکر ہی نہ کرو سائیں!" قاسم بھائی اس سے کہہ رہا تھا۔ "بھلا پہلے کبھی آپ کو شکایت کا موقع دیا ہے جو اب دوں گا۔"

"شاباش! اسی طرح ہمارے کام آتے رہو اور اپنا بھاری کمیشن کھرا کرتے رہو۔" لاڈلہ سائیں نے اس کی پشت تھپتھپائی تو قاسم بھائی اس سے دوبارہ بولا۔

"سائیں! آپ کو تو پتا ہی ہے کہ آپ کے کام میں، میں بھی کس قدر رسک اٹھاتا ہوں اگر اس مال میں سے کمیشن کے علاوہ مجھے بھی تھوڑا سا حصہ مل جائے تو....." اس نے معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو لاڈلہ سائیں نے پہلے تو گھور کر اس کی طرف دیکھا پھر ایک عیاری سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

"بڑا حرصی اور لالچی ہے تو..... ٹھیک ہے، ایک پیٹی نکال لینا اس میں سے، اب تو خوش ہے ناں؟"

"مہربانی سائیں وڈی مہربانی! آپ نے مجھ غریب کا بھی خیال رکھا۔" قاسم بھائی جلدی سے بولا۔ "دراصل سائیں! آپ کے سامان کی حفاظت کرنا آسان نہیں اور نہ ہی یہ مجھ اکیلے کے کرنے کا کام ہے، مجھے اس راز میں مجبوراً منشی کو بھی شامل کرنا پڑتا ہے، ظاہر ہے پھر اپنی کمیشن سے مجھے اُسے بھی کچھ حصہ دینا پڑتا ہے۔"

"ہاں..... ہاں اب زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کر۔" لاڈلہ سائیں اُسے ہلکے گھرکتے ہوئے بولا۔ "مگر زیادہ لوگوں کو اس راز میں مت شامل کرنا، ویسے یہ منشی تیرا اعتماد کا آدمی تو ہے ناں؟"

"بالکل سائیں! منشی پیارو لال ایک دم سُچل آدمی ہے، آپ کسی بات کی فکر نہ کرو، باقی لوگوں کو تو پتا بھی نہیں ہے کہ ان مال گوداموں میں اجناس اور دوسرے مال کے علاوہ اور کیا پڑا ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، اب مجھے چلنا چاہیے۔" لاڈلہ سائیں نے کہا اور اس کے بعد یہ لوگ پلٹنے لگے، میں فوراً سے پیشتر واپس دبے پاؤں اپنے گودام کی کوٹھڑی میں آ گیا اور دروازہ بند کر کے ایک بار پھر جھری سے آنکھ لگا دی۔ لاڈلہ سائیں اور اس کے دونوں آدمی اب قریب کھڑی اس سفید پوٹھوہاری جیپ میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

میں نے دیکھا کہ قاسم بھائی نے اپنی کوٹھڑی میں جانے سے پہلے ایک نظر میری طرف دروازے پر ڈالی اور پھر پلٹ گیا۔

تھوڑی دیر اور بیت گئی تو میں دوبارہ باہر نکلا، میرا رخ اسی گودام کی طرف تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس میں ایسا کیا تھا جس کے سلسلے میں اتنی رازداری برتی جا رہی تھی اور بھاری کمیشن دی جا رہی تھی۔ سمجھ تو گیا تھا میں کہ دال میں کچھ کالا ہے، میں گودام کے قریب پہنچا تو مجھے مایوسی ہوئی۔ دروازے پر بڑا سا تالا جھول رہا تھا۔ میں واپس لوٹ آیا۔

اگلے دن صبح، دیگر بار بردار ٹرک بھی آنے جانے لگے۔ اس

دوران وہ والا گودام نہیں کھولا گیا لیکن میں ایک موقع پا کر اور تالے کی چابی حاصل کر کے اندر پہنچ ہی گیا، جہاں وہی ٹرک کنٹینر سمیت کھڑا تھا۔ اس کا دروازہ بھی لاک تھا۔ میں ناکام واپس لوٹ آیا اور سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ان گوداموں کا مالک رازق خان میرا محسن تھا، وہ ایک نیک شریف اور پرہیزگار غریب پرور آدمی تھا۔ میں نے اسے ساری بات بتادی۔ اس نے میرا نام راز میں رکھتے ہوئے وہ گودام کھلوایا تو پتا چلا کہ اس ٹرک میں منشیات تھی۔ اس میں چرس، بھنگ اور ہیروئن بنانے والے کیمیکلز اور افیوم کی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں۔ بے چارے رازق خان جیسے شریف آدمی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ سادہ مزاج اور شریف انسان تھا، اس نے پولیس کو مطلع کرنا چاہا تو میں نے اسے منع کر دیا کہ منشی اور گڈاؤن کیپر صاف مکر جائیں گے اور الٹا آپ پھنس جائیں گے اور لاڈلہ سائیں جیسے منشیات فروش گینگسٹر سے بھی دشمنی مول لیں گے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ کسی کو بتائے بغیر ایک دن اور گزر جانے دیں جب تک یہ ٹرک یہاں سے نکال نہ لیا جائے۔ اس کے بعد آپ منشی پیارو لال اور قاسم بھائی کو نوکری سے بغیر کوئی وجہ بتائے فارغ کر دیں۔

رازق خاں کو میری یہ تجویز اچھی لگی، اس نے ایسا ہی کیا مگر اس کے بعد اس کا دل اس کاروبار سے خراب ہو گیا اور اس نے اپنا گودام بیچنے کا فیصلہ کر لیا، مگر مجھے اس نے نہیں چھوڑا اور کہا کہ وہ عنقریب ڈرائی فروٹ سپلائی کرنے کا کاروبار شروع کرنے والا ہے لیکن تب تک میں کہاں جاتا، اس دوران آپ کے چاچا انور شاہ وہاں آئے اور رازق خان نے میرے بارے میں انہیں بتایا اور یوں وہ مجھے یہاں آپ کے پاس لے آئے۔" وہ اتنا بتا کر خاموش ہو گیا۔

میں یک ٹک اس کے چہرے کی طرف تکے جا رہا تھا۔ میں اب تک یہی سمجھے ہوئے تھا کہ یہ بہ ظاہر الول جلول سا نظر آنے والا سدو بھائی..... مجھ پر اپنی تمام تر عادات و نفسیات سمیت کھل چکا ہے مگر اس کی باتیں سن کر مجھے لگا کہ یہ تو ابھی "ہنوز دلی دوراست" والی بات تھی۔ "چہار رستم" والی مثال، شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے مستعمل ہوتی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پہ نظریں جمائے رکھتے ہوئے کہا۔

"اب سلسلہ کلام وہیں جوڑ دو جہاں سے تم مجھے عزیر خان اور اس کے دونوں دوستوں کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"عزیر خان کی ریکی کرنے کے دوران....." اس نے آگے کہنا شروع کیا۔

"مجھے ان کے فلیٹ پر یہی شخص نظر آیا تھا۔ ان کے اپارٹمنٹ میں جھانک کر باتیں سننا میرے لیے ناممکن تھا کیوں کہ وہاں صرف چار فلور پر میزنائن کے علاوہ چھ اپارٹمنٹ تھے اور نیچے گیٹ پر انٹر لاک تھا، جس کے پاس چابی ہوتی تھی وہی اوپر جا سکتا تھا، نیز ایک چوکیدار بھی وہاں تعینات تھا۔ مطلوبہ اپارٹمنٹ دوسری منزل پر تھا۔

میں وہیں کہیں قریب ہی کھڑا ہو کر ان کے اترنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر لگ بھگ دو گھنٹوں بعد وہ شخص، یعنی لاڈلہ سائیں نیچے اترا تو اس کے ہمراہ عزیر خان اور شاہنواز بھی تھے۔ لاڈلہ سائیں اپنی اسی سفید جیپ میں آیا تھا وہ اس میں سوار ہو گیا جبکہ عزیر خان اور شاہنواز ایک سیاہ رنگ کی ہنڈا سٹی میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ میں نے اپنی بائیک ان کے پیچھے لگا دی اور محتاط روی کے ساتھ ان کا تعاقب کرتا رہا، کئی بار ایسا ہوا کہ تیز رفتاری کے باعث دونوں گاڑیاں نظروں سے اوجھل بھی ہوئیں لیکن ٹریفک کے رش اور کچھ میری چابک دستی کے باعث میں ان دونوں گاڑیوں کو پھر سے جا لیتا، اسی طرح یہ تعاقب کا کھیل کوئی گھنٹا پون جاری رہا اس کے بعد یہ لوگ صفورا چورنگی کو کراس کرتے ہوئے اولڈ ریس کورس گراؤنڈ کے سامنے واقع ایک متمول رہائشی علاقے میں داخل ہو گئے، جس کے داخلی راستے پر ایک بڑے سے بورڈ پر "گلشنِ عمیر" درج تھا۔

یہاں ایک منزلہ اور دو منزلہ بنگلوز بنے ہوئے تھے۔ وہاں سیکنڈ روڈ کے ایک بنگلے کے گیٹ کے باہر ہی یہ دونوں ...گاڑیاں کھڑی ہو گئیں۔ یہ شام کا وقت تھا۔ اپارٹمنٹ یا فلیٹ کے مقابلے میں کسی بنگلے یا گھر میں داخل ہونا آسان ہوتا ہے مگر یہاں بھی یہ شے مجھے ناممکن ہی نظر آ رہی تھی ایک تو بنگلے کے گیٹ پر مسلح گارڈ موجود تھا۔ دوسرے یہ ایک بڑا سا السیشن نسل کا کتا بھی وہاں ٹہل رہا تھا۔ تیسرے یہ کہ میں نقب زنی کا کوئی ایسا خاطر خواہ بندوبست بھی کر کے نہیں آیا تھا، تاہم میں نے وہ بنگلا نمبر وغیرہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ اس کے بعد میں واپس لوٹ آیا۔"

یہاں تک بتا کر اس نے اپنی بات ختم کر دی۔ میں پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ منشیات سے بھرا ٹرک، لاڈلہ سائیں کا عزیر خان سے گٹھ جوڑ، ہمارے اڈے

میں گڈز کا ٹھیکا حاصل کرنا۔ یہ سب مجھے ایک سوچی سمجھی منصوبہ سازی محسوس ہونے لگی تھی۔ اگر ایسا تھا جیسا کہ میں سدو بھائی کی ریکی کی تفصیل سننے کے بعد بہت سی باتوں کا اندازہ قائم کررہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ میں نے بروقت لینڈ مافیا کے دو بڑے ڈان یعنی حاجی مہران خان اور بلڈر سیٹھ ستار کے اہم مہروں کی دم پر پاؤں رکھ دیا تھا کیوں کہ عزیر خان حاجی مہران کا لاڈلہ بیٹا تھا جبکہ لاڈلہ سائیں سیٹھ ستار کا دست راست۔

اس کے بعد میں نے سدو بھائی کی توصیف کرنا ضروری سمجھتے ہوئے اُسے نئی ہدایت دی۔

”تم نے بہت اچھا کام کیا، اسی طرح اپنا کام جاری رکھو اور لاڈلہ سائیں سے زیادہ صرف عزیر خان پر کڑی نظر رکھو...... مجھے لگتا ہے کہ عزیر خان اور لاڈلہ سائیں کا آپس میں کوئی گٹھ جوڑ ہے اور عزیر خان کے دونوں دوست شاہنواز اور بشیر خان بھی اسی کے زیر اثر ہیں۔“

”جی ہاں سر!“ وہ بولا۔ ”رازق خان کے گودام سے ناکامی کے بعد لاڈلہ سائیں یقیناً اب اپنے منشیات کے کاروبار کے سلسلے میں ان نوجوانوں کو استعمال کررہا ہوگا۔“ اس کی بات پر میں نے بالآخر اسے بتا دیا کہ ہم عزیر خان اور اس کے مذکورہ دونوں دوستوں کو اپنے لاری اڈے میں گڈز قائم کرنے کا ٹھیکا بھی دے چکے ہیں۔ یہ سن کر سدو بھائی کے چہرے پر حیرت و تفکر کے آثار ابھرے۔ اسی لہجے میں بولا۔

”اچھا سر؟ تو اس کا پھر صاف مطلب ہے کہ وہ گڈز کی آڑ میں اپنا منشیات فروشی کا دھندا کرنا چاہتا ہے، یہ آپ کے لیے بہت خطرناک ہوگا سر! انہیں فوراً اپنے اڈے سے بے دخل کرکے ڈیل کینسل کردیں سر!“

”کرنا تو یہی پڑے گا، مگر ابھی نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں ابھی یہ دیکھنا چاہوں گا کہ اس کالے دھندے میں میرے دشمنوں کی فہرست میں اور کون کون لوگ شامل ہیں، اس کے بعد ہی میں کوئی ایسا لائحہ عمل ترتیب دوں گا کہ ہم پر بھی بات نہ آئے اور دشمن قانون کے شکنجے کی گرفت میں آجائیں۔“

میں نے تھوڑی دیر بعد سدو بھائی کو کچھ مزید نئی ہدایات دے کر رخصت کردیا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سدو بھائی کی اطلاعات میرے لیے بڑی کارآمد تھیں لیکن میں جس چیز کا سراغ لگانا چاہتا تھا وہ ابھی تک نہیں لگ سکا تھا، یعنی ثوبیہ اور عزیر خان کے درمیان کس قسم کے تعلقات تھے؟ نیز بدنصیب ثوبیہ کے مرنے یا خودکشی کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ تھا اور عزیر خان کس حد تک ثوبیہ کی بدقسمتی میں شامل تھا۔

ثوبیہ کی لاش پولیس کے سپرد کردی گئی تھی اور اب نجانے پوسٹ مارٹم کی کیا رپورٹ آئی تھی۔ اس سلسلے میں حاجی صاحب اور منے میاں اپنی ہی بھاگ دوڑ اور کوششوں میں مصروف تھے جبکہ میں نے ابھی کسی مناسب وقت کے انتظار میں حاجی صاحب اور منے میاں کو یہ حقیقت نہیں بتائی تھی کہ اختر نے اپنی بہن ثوبیہ کو جس شخص (عزیر خان) کے ساتھ دیکھا تھا اس کا میں پتا لگا چکا ہوں۔

سدو بھائی کو گئے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ اچانک میں نے بائیک کی گھوں گھوں کرتی آواز سنی، ایسا لگا جیسے کوئی بائیک سوار بڑی عجلت میں یہاں آیا ہے۔ میں یہی سمجھا شاید سدو بھائی دوبارہ آگیا ہے مگر جب میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو بری طرح ٹھٹک گیا۔ وہ کالیا تھا اور خاصا گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ وہ سیدھا میرے کمرے میں گھستا چلا آیا تھا۔

”ابے لے جگری! چل اُٹھ میرے ساتھ چلنا ہے تجھے۔“ وہ اندر آتے ہی مجھ سے بولا۔ میں تب تک اس کے استقبال کے لیے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”یار خیریت تو ہے...... کہاں لے جانا چاہتا ہے تو مجھے؟ کچھ بتا تو سہی۔“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا، خود میرا اپنا دل بھی تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

اس نے ادھر اُدھر دیکھا، پھر میرے کمرے میں کسی کو موجود نہ پا کر قریب آکر بولا۔

”تیری ضمانت منسوخ ہوگئی ہے اور وہ خبیث ایس ایچ او...... راجا دلاور کسی بھی وقت تجھے گرفتار کرنے کے لیے یہاں آسکتا ہے۔“ اس نے مجھے ایک پریشان کن اطلاع دی۔ میری پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں، اگرچہ مجھے اس کا اندازہ تھا کیوں کہ راجا دلاور نے مجھے یہی دھمکی دی تھی مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ سب اتنی جلدی ہوجائے گا۔

”ابے لے جگری! تو سوچ میں پڑ گیا؟ چل میرے ساتھ۔“ وہ مجھے سوچتا پا کر بولا۔

”یار! مجھے اپنے وکیل سے تو بات کرلینے دے۔“ میں نے کہا۔

”اس وقت کوئی وکیل تیرے کام نہیں آسکتا جگری!

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

تُو سمجھتا کیوں نہیں۔" وہ بولا۔

"اس بار تیرے خلاف دشمنوں کے تیور بڑے خطرناک ہیں۔ سوچ ذرا..... راجا دلاور کا دوبارہ اپنی نوکری پر بحال ہونا اور منشی دادن خان کے مرڈر کیس کے اہم گواہ کا خاتمہ اور اب تیری ضمانت کی منسوخی اور گرفتاری کے احکامات..... کیا مطلب ہے اس کا اور..... یہ تیرے ساتھ بھی عارف مچھندر والا حشر کرنا چاہتے ہیں۔ دیر مت کر میرے یار! ابھی چل میرے ساتھ، بعد میں بے شک اپنی وکیلہ سے مشورہ کر لینا۔ ابھی تیرا پولیس کے ہتھے چڑھنا انتہائی خطرناک ہو سکتا ہے۔"

وہ میرا اشارہ سمجھ گیا تھا، اسی لیے اس نے ایڈووکیٹ زنیرہ کا بھی تذکرہ کر ڈالا تھا۔ میں نے جلدی اپنا کچھ ضروری سامان سمیٹا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔

اس نے مجھے اپنی بائیک کے پیچھے بٹھایا اور طوفانی رفتار سے گیٹ کی طرف بائیک دوڑاتا چلا گیا، ابھی ہم گیٹ کراس کر کے باہر کی طرف نکلے ہی تھے کہ اچانک ایک پولیس موبائل سامنے سے آتی دکھائی دی جس کے ڈرائیونگ کیبن میں مجھے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر ایس ایچ او راجا دلاور بڑے ٹھسے کے ساتھ براجمان دکھائی دے گیا تھا۔

"ابے لے....." کالیا کے منہ سے بے اختیار نکلا اور اس نے اپنی بائیک کا ایکسی لیٹر پورا گھما دیا۔ متروکہ ماڈل کی طاقت ور انجن والی جی ٹو او ون ٹو فائیو کسی وحشی سانڈ کی طرح غرائی اور اس کا اگلا ٹائر اوپر کو اٹھا۔ میں پیچھے گرتے گرتے بچا اور خود کو سنبھالا۔ کالیا نے تیزی سے سامنے آتی پولیس موبائل کا راستہ کاٹا اور ایک زوردار زناٹے سے اس کے قریب سے گزرتا چلا گیا۔ ٹھیک اسی وقت مجھے عقب سے پولیس سائرن کے بنکارنے کی آواز سنائی دی اور میں نے ذرا اپنی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا تو پولیس موبائل کو ریورس ہو کر اپنے تعاقب میں آتے دیکھا۔

"پولیس موبائل ہمارے پیچھے لگ چکی ہے۔" میں نے بائیک کے طوفانی شور میں کالیا کو خبر کی۔

"بے غم ہو جا جگری! یہ ہمارے سائے کو بھی نہیں چھو سکتے، بس تُو مجھے ٹائمیٹ پکڑا رکھ۔" وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا اور بتدریج بائیک کی رفتار بڑھاتا چلا گیا مگر بائیک کی رفتار سے زیادہ میرا دماغ تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ ان گنت پریشان کن سوچوں کا ایک جال سا مجھ پر آن پڑا تھا۔

میرے دشمن کس قدر چالاک اور شاطر تھے، خود منظر عام پر آنے کی بجائے در پردہ رہتے ہوئے محض اپنی دولت اور اثر و رسوخ کے بل بوتے پر مجھ پر ایک کے بعد ایک وار کیے چلے جا رہے تھے۔ لاری اڈے کی زمین خالی کرنے کی ایک بڑی سازش میں نے ان کی بری طرح ناکام بنا دی تھی، جسے سیٹھ ستار ادنے پونے داموں خرید کر کوئی بڑا پلازا بنانے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

کالیا بائیک سواری کا ماہر تھا، پل کے پل وہ پولیس موبائل کی بھاری گاڑی کو جل دے کر تنگ سی گلیوں میں سے گزرتا ہوا، مین شاہراہ پر آ گیا۔ یہاں سے اس نے کورنگی انڈسٹریل ایریا کا رخ کیا۔ نصف گھنٹے میں وہ ایک نیم رہائشی کالونی میں داخل ہوا اور ایک کشادہ سے مکان کے سامنے بائیک کھڑی کر دی۔ بائیک کے شور کی آواز سے نجات ملی تو پتا چلا میرے سیل فون پر کسی کی کال آ رہی تھی جو نجانے کب سے بجی چلی جا رہی تھی کیوں کہ جب تک میں نے سیل جیب سے نکالا، بیل بجنا بند ہو چکی تھی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا تو زنیرہ کی پانچ چھ مسڈ کالیں آ چکی تھیں۔

مجھے کچھ اندازہ تو تھا کہ وہ مجھے کیوں کالیں کر رہی ہو گی مگر میں نے ابھی اس سے رابطہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

کالیا بائیک سے اترا اور میرے ساتھ مکان کے دروازے پر آیا۔ وہ دروازے پر زور زور سے دستک دینے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں جس لڑکے نے دروازہ کھولا تھا میں اُسے دیکھ کر پہچان گیا تھا یہ اس کا ساتھی ہی تھا۔ کالیا کے بیشتر ساتھی میرے بھی دیکھے بھالے تھے مگر ابھی تک میں ان کے ناموں کو ذہن نشین نہیں کر پایا تھا۔ کالیا مجھے لیے غراپ سے اندر داخل ہوا تھا۔ صحن دھوپ کی شدت سے جل رہا تھا وہ مجھے ایک کمرے میں لے آیا۔ یہاں اے سی لگا ہوا تھا۔ پکی مگر ننگی اینٹوں کا یہ مکان اندر سے بھی خاصا آرام دہ معلوم ہوتا تھا۔ یہاں مجھے چار پانچ افراد نظر آئے، باقی تو میری اور کالیا ہی کی عمر کے تھے جبکہ ایک شخص ذرا پکی عمر کا تھا اور خاصا صحت مند نظر آتا تھا۔ اس کا قد ٹھگنا اور رنگت خاکستری تھی۔ وہ سفید رنگ کے شلوار کرتے میں ملبوس تھا۔ منہ میں پان تھا۔ آنکھیں موٹی تھیں۔ وہ ایک صوفے کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے سیل فون پر کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ ہم پر نگاہ اس کی پڑی تو اس نے میری طرف دیکھ کر ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے اپنے ایک ہاتھ سے ہمیں قریب ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کالیا نے مجھے ہولے سے ٹہوکا دیا۔ میں خاموشی سے بیٹھ گیا اور دزدیدہ نظروں سے گردوپیش کا بھی جائزہ لینے لگا۔ وہاں موجود چار پانچ لڑکوں میں سے دو تین میرے جان پہچان کے تھے جو میری طرف دیکھ کر ہولے سے اشارتاً مسکرائے بھی تھے ان میں سے کچھ کے ہاتھ میں ٹی ٹی پستولیں تھمی ہوئی تھیں اور وہ خوامخواہ ہی ان کے کلپ چیک کررہے تھے۔ پھر ان میں سے تین کسی اندرونی گوشے میں کھلنے والے دروازے کی طرف جاکر غائب ہوگئے۔ باقی دو وہیں دو کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ میری نظر جب سامنے بیٹھے، فون پر باتیں کرتے ہوئے اس بھاری جسامت کے ٹھگنے آدمی پر پڑی تو اُسے میں نے اپنی طرف ہی گھورتے پایا، اگرچہ وہ ہنوز فون پر باتیں کررہا تھا۔ میری نظریں ملتے ہی اس نے جلدی سے فون پر کسی کے ساتھ اختتامی جملہ کہا اور پھر رابطہ منقطع کردیا۔

"یہ ہمارے استاد جی ہیں۔ استاد بھابھا....." کالیا نے فوراً مجھ سے اس ٹھگنے شخص کا تعارف کروایا..... اور اس کا مجھ سے۔

"اور..... استاد جی! یہ ہے اپنا جگری! نعمان احمد .....جس کے بارے میں، میں آپ کو بتاچکا ہوں۔"

میں اٹھ کر اس کی طرف ہاتھ ملانے کو بڑھا تو تب تک وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر اس نے میرا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ تھامنے کی بجائے اپنے دونوں بازو پھیلا کر مجھ سے بغلگیر ہوگیا۔ وہ مجھے خاصا جاندار محسوس ہوا۔ اس کے بعد مجھ سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور اسی طرح میرا ہاتھ پکڑے مجھے اپنے قریب صوفے پر بیٹھا دیا اور خود بھی براجمان ہوگیا۔ پھر سامنے کھڑے کالیا کی طرف گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے ہنس کر اس سے بولا۔

"تُو بھی بیٹھ جا، تجھے کیا سزا ملی ہوئی ہے کھڑے رہنے کی۔"

"ارے استاد جی! کیا ظالم زمانہ یاد دلادیا....." کالیا، استاد بھابھا کی بات پر ایک یاس زدہ سی ہنکاری خارج کرتے ہوئے بولا۔ "ایسی اسکولی سزائیں یاد آجاتی ہیں، جب ماسٹر صاحب سبق یاد نہ ہونے پر بینچ پر کھڑا کردیا کرتے تھے۔ آج سوچتا ہوں کہ کتنا اچھا کرتے تھے، اس وقت کھڑے ہوتے تو آج آرام اور سکون سے بیٹھے ہوتے۔" کہتے ہوئے کالیا اس صوفے پر بیٹھ گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے میں بیٹھا ہوا تھا۔ کالیا کی اس "اسکولی سزا" والی بات کے پیچھے اس کا تلخ تجربہ بول رہا تھا۔

"بھلا دے اپنے ماضی کو میرے شیر کالیا.....! آج کی بات کر یہ بتا تُو اپنے اس یار سے مجھے صرف ملوانے آیا ہے یا کوئی اور کام ہے؟" استاد بھابھا نے کالیا کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ ایک نظر مجھ پر ڈال کے جواباً اس سے بولا۔

"دونوں ہی کام سمجھ لو استاد جی! لیکن اس بار میرا یار برا پھنسا ہے۔" کالیا نے کہا اور اسے ساری تفصیل سنا ڈالی۔ جسے استاد بھابھا نے بڑے غور سے سنا اور پُرسوچ انداز میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔

"معاملہ واقعی گمبھیر ہے..... یہ تو نے اچھا کیا کہ اپنے یار کو سیدھا ادھر لے آیا کیوں کہ اس بار یہ پولیس کے ہتھے چڑھا تو سمجھو گیا، مجھے لگتا ہے یہ ساری وہی ٹیم جس نے اس کے باپ کو بے گناہ پھانسی دلوائی تھی۔" مجھے استاد بھابھا کی بات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے بھی کہ کالیا اُسے میرے بارے میں غائبانہ بہت کچھ بتاچکا تھا، دوسرے یہ کہ جو اندازہ اسے میرے دیدہ و نادیدہ دشمنوں کے بارے میں تھا وہی مجھے بھی تھا۔

میں نے کہا۔ "لیکن اس مسئلے کا حل صرف یہ نہیں ہے کہ میں پولیس سے چھپتا رہوں۔ مجھے اس کا سدِباب بھی کرنا ہوگا۔" اس پر کالیا نے مجھ سے کہا کہ میں اب آرام سے ایڈووکیٹ زنیرہ کو فون پر ساری صورتِ حال بتا سکتا ہوں مگر یہ نہیں کہ اس وقت میں کہاں اور کس کے پاس ہوں۔ میں نے اپنا سیل نکال کر زنیرہ سے رابطہ کرنے کے دوران اُسے بتایا کہ زنیرہ کی اس عرصے میں چار پانچ کالیں آچکی تھیں۔

"نعمان! تم کدھر ہو؟ میرا فون کیوں نہیں اٹینڈ کررہے تھے؟ میں تو سمجھی تمہیں پولیس لے جاچکی ہے؟" رابطہ ہوتے ہی اس نے تیزی سے کہا۔ اس کا لہجہ بہت متوحش اور کافی ہراساں ہورہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی اپنے کا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اس کا میرے بارے میں اس قدر تشویش زدہ اور متفکر ہونا مجھے بے چین کردیا کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ میرا اور زنیرہ کا تعلق اب تک ایک وکیل اور کلائنٹ سے ہٹ کر ایک طرح کی یا یوں سمجھ لیں انسانی ہمدردی نما دوستی میں بدل چکا تھا لیکن باوصف اس کے وہ مجھے جب بھی کسی مشکل یا مصیبت میں پھنسا محسوس کرتی تھی تو اس طرح فکرمند ہوجاتی تھی جیسے میں اس کا اپنا

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کوئی عزیز رشتہ دار ہوں۔

''میں اس وقت جہاں بھی ہوں بالکل خیریت سے ہوں اور اپنے کسی دوست کے ہاں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم بالکل خیریت سے نہیں ہو نومی!'' وہ بولی۔ ''تمہاری ضمانت منسوخ کر دی گئی ہے اور پولیس تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''جس وقت تم مجھے کالیں کر رہی تھیں اس وقت میں اپنے ایک دوست کے ساتھ روپوش ہونے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔''

''روپوش؟ یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ کس نے تمہیں یہ غلط اور بے وقوفانہ مشورہ دیا ہے؟''

''تو آپ کا کیا خیال ہے اس وقت مجھے لاک اپ میں اس راجب خور ایس ایچ او کے چنگل میں ہونا چاہیے تھا؟ تاکہ وہ میرا بھی عارف جھنڈر جیسا حشر کرتا؟'' مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ جھلاہٹ آمیز تلخ ہو گیا تھا۔

''میں نے یہ کب کہا تم سے؟ لیکن مجھے ایک کوشش تو کر لینے دیتے؟ اس طرح روپوشی اختیار کر کے تم خود کو قانون کی نظر میں مشکوک بنا رہے ہو۔'' وہ میری تلخی کا برا منائے بغیر بولی۔ میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''آپ نے اس راجا دلاور کے سلسلے میں اب تک کیا کیا؟''

''تم کیا سمجھ رہے ہو کہ میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں؟'' وہ بولی۔ ''میں اس سلسلے میں کورٹ میں تمہاری وکیل کی حیثیت سے ایک احتجاجی پٹیشن داخل کر چکی تھی اور اب جیسے ہی مجھے پتا چلا کہ تمہاری ضمانت منسوخ ہو چکی ہے تو میں اس سلسلے میں کورٹ سے رجوع کرنے والی تھی، ایسا نہیں ہو سکتا تھا کہ ایس ایچ او راجا دلاور تمہیں لاک اپ کر دیتا۔ اگلے دن ہی تمہیں کورٹ میں پیش ہونے کا عدالتی حکم نامہ جاری کر دیا جاتا مگر اب تم یہ سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ رہے ہو۔ پلیز! اپنی رضا کارانہ گرفتاری دے دو۔ میں سب سنبھال لوں گی آئم شیور......'' وہ پُرزور لہجے میں بولی۔ اس کی بات پر میں ایک الجھن اور مخمصے کا شکار ہو گیا تھا۔

''ایک بات بتاؤ......!'' وہ مجھے خاموش اور سوچتا پا کر یکدم بولی۔

''پوچھو!'' میں نے بے دلی سے کہا۔

''تم اپنے اسی دوست کالیا کے ساتھ ہو؟''

''ہاں!''

''ضرور پھر اسی نے ہی تمہیں یہ مشورہ دیا ہوگا۔ میری اس سے بات کرواؤ، میں اسے سمجھاتی ہوں۔'' کالیا کس قماش کا تھا یہ وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی، میری خاطر ایک سوبر اور سنجیدہ مزاج خاتون وکیل کا کالیا جیسے سے بات کرنا گوارا کرنا بھی اس کی میرے بارے میں ایک تفکیر کو ظاہر کرتا تھا۔ میں نے کہا۔

''اس سے بات کرنے کا کیا فائدہ، آخری فیصلہ میرا ہی ہوتا ہے، آپ میری قبل از وقت گرفتاری ضمانت کروا سکتی ہیں تو کروا دیں ورنہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔''

دوسری جانب ایک سناٹا سا طاری ہو گیا، زنیرہ کی جانب سے طول پکڑتی خاموشی پر مجھے مغالطہ ہوا کہ وہ لائن پر تھی یا نہیں، مجھے ہی ''ہیلو'' کرنا پڑا تو اس کی عجیب سی پُرنزاع آواز ابھری۔

''دیکھو! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو نومی!'' وہ ایک گہری سانس خارج کرنے کے انداز میں بولی۔ ''کسی روپوش کی ضمانت میں مشکل ہوتی ہے، اگر ہو بھی جاتی ہے تو کیس کمزور پڑ جاتا ہے۔''

''ٹھیک ہے میں تم سے تھوڑی دیر میں بات کرتا ہوں۔'' میں نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

''وہی وکیلہ صاحبہ ہوں گی! گرفتاری کا مشورہ دے رہی ہوں گی تمہیں!'' کالیا میری طرف دیکھ کر دوستانہ مسکراہٹ سے بولا تو میں نے اسے زنیرہ کے مشورے سے پھر بھی آگاہ کر دیا اور آگے بولا۔

''یار! وہ ایک قابل وکیل ہے۔ کیا وہ کوئی غلط مشورہ دے سکتی ہے؟''

''ابے لے جگری! لگتا ہے تُو اس کی باتوں میں آگیا۔'' کالیا جھٹ سے بولا۔ ''میرے یار! وہ ایک وکیل ہے اور یہی بات کرے گی، اب اُسے کیا معلوم کہ اندر کی کہانی کیا ہے۔ اندر کی کہانی تو ہم اندر والے جانتے ہیں ناں۔''

''نوجوان! میرے شیر کالیا کے مشورے بھی غلط نہیں ہوتے۔'' معاً استاد بھابھا نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''بقول اس کے، زمانے کا چکھا ہوا ہے یہ۔''

میں اپنی جگہ پریشان رہا۔ میں کسی جھولتے ہوئے

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

پینڈولیم کی طرح کبھی کالیا کی بات کو درست سمجھنے لگتا تو کبھی زنیرہ کا مشورہ مجھے صحیح لگتا۔ میرے چہرے پر جیسے پریشان کن سوچوں کا جال بن کر رہ گیا۔ ان لکیروں کو کالیا نے بھی بھانپ لیا تھا۔ بولا۔

''میرے یار! زیادہ فکر مند نہ ہو..... ابھی تو نے اس وکیلہ صاحبہ سے قبل از گرفتاری ضمانت کی جو بات کی تھی ناں وہ سولہ آنے ٹھیک کہی تھی۔ دیکھیں اب وہ کیا کرتی ہے۔''

میں نے کالیا کو بتا دیا کہ ایسی صورت میں کیس کمزور ہو جائے گا تو وہ بولا۔

''دیکھ جگری! میری ایک عمر بڑے بڑے مجرموں کے ساتھ مار ماری میں گزری ہے۔

مگر تیرے دشمن مجھے زیادہ خطرناک لگتے ہیں، چھپا دشمن بہت خطرناک ہوتا ہے خواہ وہ ہماری فکر کا نہ بھی ہو لیکن ظاہری دشمن کتنا ہی طاقت ور اور اثر و رسوخ والا ہو، وہ اتنا خطرناک نہیں ہوتا۔ تیرے دشمن سات پردوں میں چھپے ہوئے ہیں خود کو منظر عام پر لائے بغیر وہ اپنے مہروں کو کٹھ پتلیاں بنائے ہوئے ہیں اور خود پردے کے پیچھے صرف ڈوریاں ہلاتے ہیں۔ کئی مہروں کو اپنے دشمنوں پر قربان کرنے سے بھی نہیں چوکتے لیکن دوست اگر خدانخواستہ دشمن نے تم پر اپنے دو مہرے بھی قربان کرنا پڑے تو ان کا اتنا نقصان نہیں ہوگا جتنا کہ تمہارا..... سمجھ رہے ہو ناں میری بات؟''

کالیا کی بات میں کبھی رد نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ میرے باپ کو کس طرح گہری چال میں لا کر قانون کی آڑ میں دے کر اُسے بے گناہ پھانسی دلوادی اور اصل قاتل کا ہنوز کچھ پتا نہیں تھا۔ لینڈ مافیا سیٹھ ستار صرف ایک بار میرے سامنے ظاہر ہوا تھا اور دھمکی دے کر ایسا غائب ہوا تھا کہ دوبارہ میرے منہ نہیں چڑھا تھا اگرچہ میں خود اسے اس کی دھمکی کا جواب دینے کے لیے اس کے بوٹ بیسن والے عالیشان دفتر جا پہنچا تھا مگر اس نے ابھی تک اپنی کسی دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنایا تھا مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ چپ کا بیٹھ گیا تھا، وہ پردے کے پیچھے بیٹھا اپنی ڈوریاں ہلانے میں مصروف تھا اور میں اِدھر اُدھر بھاگتا پھر رہا تھا۔

اسی طرح پریشان کن سوچوں میں تھوڑا وقت اور بیت گیا۔ استاد بھابھا سے بھی اس دوران باتیں ہوتی رہی تھیں، اس کی باتوں سے مجھے محسوس ہوا تھا کہ وہ اپنے دوست

ہر باقاعدہ یا بے قاعدہ کھانے میں سبزی یا پھل شامل کرنے کی کوشش کریں۔ تمام طرح کی سبزیاں اور پھل قابل قدر وٹامن، معدنیات اور ریشہ فراہم کرتے ہیں۔ ان میں چکنائی بہت کم ہوتی ہے۔ پنیر، دودھ اور دہی میں بڑی مقدار میں کیلشیم ہوتا ہے جو مضبوط ہڈیوں اور جسم کی دیگر ضروریات کے لیے لازمی ہے۔ پنیر اور دودھ میں اگر چکنائی کم ہو تو بھی ان کا کیلشیم، پروٹین اور وٹامن بی کم نہیں ہوتا۔ گوشت، مچھلی، پھلیاں، مٹر اور دالیں ہمیں عمدہ پروٹین، وٹامن اور معدنیات فراہم کرتی ہیں تاہم یہ بڑی مقدار میں لینا ضروری نہیں۔ چکنائی والے گوشت، انڈے اور گری دار میوے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگرچہ یہ قوت بخش ہوتے ہیں لیکن ان میں چکنائی کی بڑی مقدار ہوتی ہے۔

مرسلہ: حسین آفاقی۔ لاہور

راست شیراز عرف کالیا کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ اس سے گروہ میں اس کی حیثیت کا مجھے اندازہ ہوا۔ وہ مجھے کسی اور کمرے میں لے آیا۔ یہاں اس نے میرے کھانے پینے کا بندوبست کروایا تھا۔ یوں بھی یہ وقت دوپہر کے کھانے کا ہو چکا تھا مگر مجھ سے کچھ کھایا نہ گیا بس! تھوڑا سا زہر مار کر سکا تھا۔

یہاں دیگر چھوکرے لڑکے اس کا حکم یوں بجا لا رہے تھے جیسے گروہ کا سردار یہی ہو۔

اسی وقت میرے فون کی بیل گنگنائی، میں یہی سمجھا کہ زنیرہ کا فون ہوگا، مجھے یاد آیا کہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اس سے یہ کہا تھا کہ میں سوچ کر ذرا دیر میں اسے فون کرتا ہوں لیکن اسکرین پر عاصمہ بہنا کا نمبر دیکھ کر میرا دل انجانے خدشات تلے تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''ہیلو، بہنا! خیریت تو ہے؟'' میں نے فوراً سیل کان سے لگاتے ہی پوچھا۔

''بھائی جان! آپ کہاں ہیں؟ خیریت سے تو ہیں ناں.....'' دوسری طرف سے عاصمہ بہنا کی گھبرائی ہوئی پریشان آواز ابھری۔ ''وہ..... وہ، پپ..... پولیس آئی تھی گھر پہ..... آپ کا پوچھ رہی تھی، فہیم بھائی کو لے گئی ہے اپنے ساتھ..... بھائی جان یا مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' اس کی

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آواز خوف سے کانپ بھی رہی تھی۔ اس اطلاع پر میں سکتے میں آ گیا۔ میرا حلق سوکھنے لگا، تاہم ہمت کر کے بولا۔

"کک..... کب ہوا یہ؟"

"بالکل ابھی ابھی ہوا یہ..... ایک موٹا سا پولیس انسپکٹر مجھے بھی بڑی گندی دھمکیاں دے کر گیا ہے۔" وہ لرزیدہ لہجے میں بتانے لگی اور میرے اندر ہول سے اٹھنے لگے۔

"وہ کہہ رہا تھا، جیسے تمہارا اپنے بھائی نعمان سے رابطہ ہو، کہہ دینا پولیس میں اپنی گرفتاری دے دے ورنہ وہ..... وہ فہیم بھائی کا برا حشر....." فرطِ غم سے وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکی اور ہچکیاں لے کر رو پڑی۔ بہن کو روتا بلکتا اور اس خبیث انسپکٹر کی دھمکی کا سن کر تم و غصے سے میری حالت غیر ہونے لگی اور رگوں میں دوڑتا لہو کسی لاوے کی مثل ابلنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

"بہنا! تم حوصلہ رکھو، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں ابھی گھر پہنچتا ہوں۔" میں نے دھک دھک کرتے دل سے اُسے تسلی دینے کی طفل سعی چاہی لیکن وہ فوراً ہراساں ہو کے بولی..... "نن..... نہیں بھائی جان! آپ گھر مت آنا ورنہ پپ..... پولیس آپ کو بھی....."

"تم فکر نہ کرو، حوصلہ رکھو بہنا، فہیم کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ میں کچھ کرتا ہوں۔" میں نے اپنے دل و دماغ کے جوار بھاٹے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اگر ڈر لگ رہا ہے تو تم حاجی صاحب کے ہاں جا سکتی ہو، میں ابھی اُنہیں فون کرتا ہوں۔"

"نن..... نہیں بھائی جان! میں یہاں ہی ٹھیک ہوں، اپنے گھر پہ..... آپ بس! فہیم بھائی کے لیے کچھ کیجیے۔" وہ ایک دم روہانسے لہجے میں بولی اور میں نے اسے اثبات میں جواب دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔

قریب موجود کالیا کی یک ٹک نظریں میرے چہرے پر ہی جمی ہوئی تھیں۔ وہ فون پر ہماری گفتگو سے بہت کچھ اندازہ لگا چکا تھا، تاہم میں نے اسے بتا دیا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک لمحے کو تشویش کے آثار نمودار ہو گئے۔ اسی لہجے میں بولا۔

"مجھے اس خطرے کا احساس تو تھا مگر....." اس نے دانت بھینچتے ہوئے کہا اور پُرسوچ انداز میں اپنا جملہ نامکمل کر کے ذرا رکا اور پھر بولا۔

"تو پریشان نہ ہو اور مجھے کچھ سوچنے دے ذرا....."

"اب سوچنے کے لیے کیا رہ گیا ہے کالیا!" میں نے مایوسی سے کہا۔ "وہ مردود پولیس افسر میرے گھر تک جا پہنچا ہے اور میری بہن کو گندی دھمکیوں کے علاوہ بھائی فہیم کو گرفتار کر کے لے گیا۔ کیسی اندھیر ہے یار.....!" میں جی جان سے جل اٹھا، فرطِ غم و جذبات سے میری آواز لڑکھڑانے لگی تھی۔ کالیا میری ڈوبی ہوئی حالت دیکھ کر مجھے دونوں بازوؤں سے تھامنے کے انداز میں پکڑتے ہوئے بولا۔

"حوصلہ کر جگری! تمہیں انہی اندھیروں کا پامردی سے مقابلہ کرنا ہے۔ سمجھا نہیں؟ دیکھ! مجھے دیکھ! یار اپنا سمجھتا ہے ناں مجھے تو بے غم ہو جا..... اب وقت آ گیا ہے کہ اس انسپکٹر کی جڑوں پر حملہ کیا جائے، میں ذرا استاد بھابھا کو صورتِ حال بتا کر آتا ہوں۔"

"نہیں کالیا!" میں نے فوراً کہا۔ "میرا خیال ہے مجھے ایڈووکیٹ زنیرہ کی بات مان لینی چاہیے تھی، میں اس سے بات کر لوں پہلے۔" کہتے ہوئے میں نے اپنے سیل سے زنیرہ کا نمبر ملایا۔ وہ جیسے میرے ہی فون کی منتظر تھی، پہلی ہی جانے والی بیل پر اس نے فون ریسیو کر لیا تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی میں نے اسے ساری بات بتا ڈالی۔ وہ پہلے سے زیادہ تشویش زدہ لہجے کی شدت سے بولی۔

"نومی..... نومی! پلیز فار گاڈ سیک! میری بات مان لو، مجھ پر بھروسا کرو، تمہارے دشمن تمہاری گرفتاری سے زیادہ تمہارے اس طرح سے روپوش ہونے پر خوش ہوں گے اور یہی اُن کی کامیابی ہے۔ تم خود سوچو اس طرح چھپ کر تم کب تک رہ سکتے ہو، جلدی فیصلہ کرو نومی! ایسا نہ ہو کہ وقت نکل جائے اور میں بھی تمہارے لیے کچھ نہ کر سکوں۔"

"مجھے کہاں آنا ہوگا؟" بالآخر میں نے اپنے سینے کے اندر گھٹتے آنسوؤں سے پوچھا۔

"تم میرے پاس آ جاؤ، میں خود تمہیں کورٹ لے کر پہنچ جاؤں گی۔ تم اپنی گرفتاری کورٹ میں دو گے، اس کے بعد وہ تمہیں کسی کے بھی حوالے کریں۔ میں اسی وقت تمہاری ضمانت اور اپنی احتجاجی پٹیشن کے لیے درخواست دائر کر دوں گی۔"

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

"اپنے چیمبر میں۔"

"میں وہیں آ جاؤں؟"

"یہی زیادہ بہتر رہے گا۔"

"میں ابھی پہنچتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ کالیا کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ دھواں

URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

دھواں ہو رہا تھا۔

"ی..... یہ تُو کیا کرنے جا رہا ہے میرے یار جگری!" وہ ٹوٹے ٹوٹے لہجے میں مجھ سے بولا۔

"کالیا! میرا چھوٹا بھائی اس رذیل راجا دلاور کے قبضے میں ہے۔ میری جوان بہن کو بھی اس نے گندی دھمکی دے رکھی ہے میرے دشمن اگر میرے ساتھ قانونی جنگ لڑ رہے ہیں تو میں بھی انہیں اسی زبان میں جواب دوں گا۔"

"مجھے کچھ کرنے تو دے جگری! تُو مجھ پر بھروسا کر، میں سب ٹھیک کرلوں گا۔ تیرے دشمن تیرے ساتھ قانونی جنگ نہیں لڑ رہے ہیں، یہ تیری بھول ہے۔" کالیا نے مجھے سمجھانا چاہا مگر میں جانے پر بضد رہا۔

"کالیا! میں چلوں گا، میرے پاس وقت نہیں ہے۔" میں نے جانے کے لیے قدم بڑھائے وہ مایوس نظر آنے لگا، مجھے روکتے ہوئے بولا۔

"ٹھہر جا پھر، میں خود تجھے چھوڑ آؤں گا۔" کہتے ہوئے اس نے اپنا چہرہ لٹکا لیا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔ مکان سے باہر نکلا، کالیا نے اپنی بائیک سنبھالی اور طوفانی رفتار سے اسے دوڑاتا ہوا، بالآخر مجھے ایڈووکیٹ زنیرہ کے چیمبر کے سامنے اتار کر لوٹ گیا۔

القصہ کوتاہ..... میں نے اپنی گرفتاری دے ڈالی۔ ساتھ ہی زنیرہ کے حوالے سے کورٹ سے استدعا کی کہ وہ متعلقہ تھانے سے میرے چھوٹے بھائی فہیم کی رہائی کا بھی حکم نامہ جاری کرے، وغیرہ۔ زنیرہ کو یہ وضاحت دینا پڑی تھی کہ اس کا موکل یعنی میں، پولیس کے خوف اور ضمانت کی منسوخی کے بعد گھبرا گیا تھا اور وہ مجھ سے (زنیرہ) سے ملنا چاہتا تھا اور اسی کے ذریعے وہ سب سے پہلے کورٹ میں حاضر ہو کے اپنی گرفتاری دینا چاہتا تھا۔

بہرکیف..... مجھے انسپکٹر راجا دلاور کے حوالے کر دیا گیا۔ میرا نئے سرے سے چالان بنایا گیا، زنیرہ نے بھاگ دوڑ کر کے اسی وقت میری کورٹ میں پیشی ممکن بنائی، میرے بھائی فہیم کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ میرے دل کو کچھ ڈھارس بندھی لیکن بدقسمتی سے زنیرہ کے پہلے سے داخل شدہ ایس ایچ او راجا دلاور کی نوکری پر بحالی کے خلاف احتجاجی پٹیشن، پبلک پراسیکیوٹر نے اپنے دھواں دھار دلائل سے خارج کروا دی کیونکہ عارف مچھندر نے عین آخری وقت میں اپنا بیان بدل دیا تھا یا اس سے بدلوایا گیا تھا۔ زنیرہ کو پیشی میں بحث اور دلائل کے دوران ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ عارف کو اسی طرح پہلے فرار کا موقع دے کر رہائی دلانے کا لالچ دیا گیا ہوگا، پھر اس کے بعد اسے پولیس مقابلہ شوکر کے ہلاک کر دیا گیا جبکہ مجھے جوڈیشل ریمانڈ پر سات روز کے لیے راجا دلاور کے حوالے کر دیا گیا۔

میں جس وقت اپنا سر پکڑے لاک اپ کی ننگی سیلن زدہ اینٹوں والے فرش پر بیٹھا تھا تو اس وقت زنیرہ خود بہت گھبرائی ہوئی پریشان سی مجھے طفل تسلیاں دینے کی ناکام کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔

"تت..... تم بالکل فکر نہ کرو نعمان! میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔" اس وقت ملاقات میں چاچا انور شاہ بھی اس کے ہمراہ تھے، وہ بھی مجھے تسلی دینے لگے۔

"ہاں بیٹا! تم پریشان نہ ہونا، ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" یہ دونوں اور بھی نجانے کن کن الفاظ میں میری تسلی اور شفی کیے جا رہے تھے اور شاید میری طرح خود ان دونوں کو بھی اپنے لہجے کے کھوکھلے پن کا احساس ہو رہا تھا لیکن مجھے تو جیسے ایک نامعلوم سی "چپ" کھا گئی تھی۔ میں نے ایک لفظ بھی ان سے نہیں بولا۔ میرے دل و دماغ میں جیسے مُردنی سی چھا گئی تھی۔ میرا اپنا "اندر" اس وقت جیسے دم توڑ گیا تھا اور دل چاہتا تھا کہ مجھے یہ دونوں اکیلا چھوڑ دیں۔ جب ایک سنتری نے فرش پر ڈنڈا بجا کر ملاقات کا وقت ختم کرنے کا اعلان کیا تو مجھے سکون ملا کیونکہ زنیرہ اور چاچا انور شاہ وہاں سے جا چکے تھے۔

سہ پہر آ پڑی تھی۔ میں دیوار سے اپنی پشت ٹکائے خالی الذہنی حالت میں بیٹھا تھا۔ یوں جیسے خود کو تن بہ تقدیر کر دیا ہو اب میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا کیا نہیں، اس بارے میں سوچنا جیسے ذہن اکتا گیا تھا۔ جو مزاج یار میں آئے، یا یوں کہہ لیں جو مزاج دشمناں میں آئے۔ اس قدر مایوسی اور بے دلی مجھ پر طاری تھی کہ مجھے انسان تو کیا یہ در و دیوار بھی بے مہر و بے مروت محسوس ہو رہے تھے۔ ایک عجیب سی ناقابلِ بیان وحشت ٹپکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی مجھے اس خاموش اور سرد ماحول سے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ میرا بلاوا آ گیا۔ مجھے ایس ایچ او راجا دلاور کے کمرے میں پہنچایا گیا تو میں ذرا چونکا۔ میں تو یہی سمجھے ہوئے تھا کہ اب وہ میرے ساتھ ایک تنہا ملاقات کرے گا، دھمکیاں دے گا، کچھ اپنی طاقت کے گن گائے گا اور پھر تشدد کی راہ پر مجھے ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی مرضی کا بیان مجھ سے دلوائے گا لیکن اس کے کمرے میں

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ایک گھٹے ہوئے جسامت کا سوٹ پوش شخص کرسی پر براجمان دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ مایوسیوں کے اندھیروں میں جیسے خوامخواہ ایک شمع اُمید ٹمٹما گئی کہ کہیں یہ شخص میری ضمانت کے لیے تو نہیں بھیجا گیا تھا؟ پھر میں اپنی اس خوش فہمی پر خود ہی اندر ہی اندر ہنس دیا کہ عالم بے بسی میں ایسے سراب دیکھنے میں آ ہی جایا کرتے ہیں۔

راجا دلاور اپنی بھاری بھرکم چیئر پر بڑے طمطراق کے ساتھ دھنسا بیٹھا میری ہی طرف خشمناک نظروں سے گھور رہا تھا۔

''سیٹھ صاحب! آپ ذرا اپنی کرسی اس طرف موڑ لیں .....'' راجا دلاور اپنے سامنے میز پر دھرے سیاہ رول کو اٹھا کر اپنی کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ تخاطب وہی شخص تھا جو اس کے سامنے کرسی پر براجمان تھا۔ اس نے ایک ذرا اپنی موٹی چربیلی گردن میری طرف موڑ کر دیکھا تو مجھے اس کا آدھا چہرہ نظر آیا۔ باوجود اس کے میں اسے پہچان گیا۔ اس موچھیل شخص کا چہرہ میں کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ بلیومون اسٹیٹ کا بلڈر سیٹھ ستار تھا، اس نے میری طرف کرسی گھمالی، تب تک راجا دلاور بھی چند قدم چلتا ہوا میرے نزدیک آ گیا تھا۔

''کیا سمجھتے تھے تم خود کو؟ پھنے خاں؟ یا تیس مار خاں..... ہیں؟ بولو.....!'' یہ سیٹھ ستار تھا۔ اس کا بھاری چربیلا چہرہ طیش کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا جبکہ راجا دلاور اسے بولتا پا کر چند قدم پیچھے ہٹ کر یوں کھڑا ہو گیا تھا جیسے سیٹھ ستار اس کا کوئی بڑا افسر ہو اور یہ اس کا ماتحت۔ کیونکہ یہ کہتے ہوئے سیٹھ ستار کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب میرے سامنے کھڑا شعلہ فشاں نظروں سے گھور رہا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ پل کے پل میرے اندر اتنی ہمت کہاں سے عود آئی تھی کہ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسی لہجے میں کہا۔

''سیٹھ ستار! یہی تو میری غلطی تھی کہ میں نے اب تک شرافت کا لبادہ اُوڑھے رکھا تھا اور خود کو تیس مار خاں سمجھنے کی غلطی نہیں کی تھی۔ جانتے ہو ناں..... جب شریف آدمی شرافت کا لبادہ اتار پھینکتا ہے تو اس سے بڑا بدمعاش کوئی نہیں ہوتا۔'' میری ترکی بہ ترکی جوابی کارروائی نے سیٹھ ستار کی جیسے آنکھیں پھاڑ ڈالیں۔ اُسے شاید میرے اس طرح بولنے کی امید نہ تھی، اس کا چہرہ غصے اور طیش کی شدت سے سرخ ہو گیا اور اس نے نفرت سے ہونٹ سکیڑ کر میرے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔ اس کے بھاری ہاتھ کے تھپڑ سے زیادہ مجھے احساس ذلت نے بچھاڑ کر رکھ دیا، میں چند قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑا گیا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔

''انسپکٹر.....! تمہاری موجودگی میں ایک غیر متعلقہ شخص مجھ پر ہاتھ اُٹھا رہا ہے۔ یہ کیسا قانون ہے؟'' میں غصے کی شدت سے سامنے کھڑے راجا دلاور سے دھاڑ کر بولا تو اس کی آنکھوں میں بھی خون اُتر آیا۔ وہ پُرتیش انداز میں دانت بھینچے میری جانب بڑھا اور اپنے ایک ہاتھ کے پنجے میں میری گردن دبوچ کر گھسیٹتا ہوا میز کے قریب لایا اور میرا سر میز کی سطح پر مارا۔ میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہو گئی۔ اس نے میری گردن چھوڑ کر اب بالوں سے مجھے دبوچ کر میرا سر دبائے رکھا تھا۔

''مجھے قانون سکھائے گا.....'' اس نے بھیڑیے جیسی غراہٹ کے ساتھ ایک فحش گالی دی اور میری پشت پر موٹے سیاہ رول سے وار کرنے لگا۔ گالی نے میرا سر گھما کر رکھ دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے ایکا ایکی میرے اندر کا شریف انسان دم توڑنے لگا ہو۔ میں حلق کے بل چلایا۔

''راتب خور کتے! اپنی گندی زبان سے میری بہن کا نام مت لے۔'' یہ کہتے ہوئے میں رسن بستہ حالت میں تڑپا اور اس کی گرفت سے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر اس بدمعاش ایس ایچ او کا پارہ بھی آسمان کو چھونے لگا۔ اس نے مجھے اسی طرح بالوں سے دبوچے ہوئے ننگے فرش پر گرا دیا اور لاتوں، مکوں کی مجھ پر بارش کر ڈالی۔ وہ جنونی کیفیت میں مجھ پر پل پڑا تھا۔

''ٹھہرو ذرا.....'' معاً سیٹھ ستار نے اسے روکا۔ راجا دلاور ہانپتا ہوا ایک طرف ہو گیا۔ سیٹھ ستار آگے بڑھا اور اپنا بوٹ میری گردن پر رکھتے ہوئے غرا کر بولا:

''ہم سے ٹکر لینے کا انجام تمہارا اس سے بھی زیادہ برا ہو سکتا ہے تیس مار خاں! اب بھی وقت ہے اپنی ضد سے باز آ جاؤ اور لاری اڈے کی زمین خالی کر دو..... ورنہ ادھر تم سلاخوں کے پیچھے پڑے سڑتے رہو گے اور ادھر تمہاری خوب صورت جوان بہن کی عزت کو ہم کھلونا بنا کر رکھ دیں گے۔''

''میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا.....'' اپنی بہنا کے بارے میں اس شیطان رزیل کی گندی زبان سے اس طرح

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

پھلبہری

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

قابل علاج مرض ہے

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملٹی ایوارڈ ہولڈر

اجمل زیدی

کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری

مکان نمبر 62، سٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1
فون: 2255880 - 2864595 (051)
موبائل: 0300-8566188
فیکس: 2261636

لاہور

گلف سینٹر

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27-اکتوبر

قیام

آفس نمبر 16
موبائل: 0300-8566188

پشاور

ہوٹل امین

یکم فروری تا 11 فروری
یکم جون تا 11 جون
یکم اکتوبر تا 11-اکتوبر

قیام

جی ٹی روڈ نزد جنکشن چوک پشاور شہر
فون: 9-2218215 (0521)
موبائل: 0300-8566188

ملتان

ہوٹل سلور سینڈ

28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

قیام

فون: 62-4518061 (061)
4582803 (0300-8566188)

کراچی

فورچون سینٹر

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

قیام

آفس 706، 7 فلور، شاہراہ فیصل
K.F.C کراچی
فون: 9-021-7012068
موبائل: 0300-8566188

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

کے کلمات نے میرا دماغ آتش فشاں بنا کر رکھ دیا اور میں نے زمین پر پڑے پڑے لوٹ لگائی، اپنی گردن اس کے بھاری بوٹ سے چھڑاتے ہی میں نے اپنی لات کو حرکت دی جو سیٹھ ستار کے پہلو سے مقدور بھر ٹکرائی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ گیا، ایسے میں راجا دلاور آگے بڑھا۔

"سر! آپ ادھر بیٹھ جائیں اور بے فکر رہیں، جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔" کہتے ہوئے اس نے اندر داخل ہونے والے دو اہلکاروں کو مجھے لے جانے کا حکم دیا۔ وہ مجھے اسی طرح بیدردی سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے اور ایک بار پھر لاک اپ میں لے جا کر پھینک دیا۔

"کالیا! میرے یار! میں نے تیری بات نہیں مانی..... کاش! میں تیری بات مان لیتا۔" میں لاک اپ کے سیلن زدہ فرش پر پڑا ہانپتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ میرے دل و دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ مجھے اب کالیا کی زہر کو زہر سے کاٹنے کی باتیں یاد آنے لگی تھیں۔ وہ مجھ سے یہی کہتا تھا کہ دشمن میرے ساتھ "قانونی بدمعاشی" کر رہے تھے اور میں شرافت کے قانون کا راگ الاپ رہا تھا۔ جس کی اس سماج میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ دولت، طاقت اور اثر و رسوخ کی لاٹھی سے ہر نسل کی بھینس کو ہانکا جا سکتا ہے۔ شرافت کی لاٹھی تو ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتی ہے، یہی حال شریفوں کا ہوتا ہے۔ میں ان قانونی بدمعاشوں کے آگے ٹوٹ رہا تھا، میری عزت نفس مجروح ہوئی تھی۔ کیسے کیسے گندے کلمات میں نے اپنی جوان معصوم بہن کے بارے میں سنے تھے۔ میرا خون کھولنے لگا تھا۔ میرے اندر قانون کی پاسداری اور عظمت کا جو بت تھا وہ ایک لمحے میں مسمار ہو چکا تھا۔ ایک ارشاد مٹن جیسے شخص کو شکست دے کر میں سمجھا تھا کہ میں نے دماغی چال سے بڑی فتح حاصل کر لی تھی مگر اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہر جگہ دماغ یا عقل نہیں چلتی، کچھ بڑے مگرمچھوں کے خلاف طاقت کا مظاہرہ بھی ضروری ہوتا ہے، جبکہ میرے دشمن دونوں کا استعمال کر رہے تھے۔ ایڈووکیٹ زنیرہ کے رٹے رٹائے قانونی اقوال کے مقابلے میں مجھے کالیا کے گرگ باراں دیدہ اور تجربے کی آگ میں کندن بنے تلخ جملے زیادہ سچے معلوم ہوئے۔

لیکن اب یہ بعد کی باتیں تھیں، ابھی میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا، اس کے خدشات مجھ سے زیادہ کالیا کو تھے لیکن مجھے زیادہ فکر اپنی نہیں بلکہ عاصمہ بہنا اور فہیم کی طرف سے لاحق ہونے لگی تھی سیٹھ ستار کی دھمکی نے مجھے اپنے چھوٹے بہن بھائی کی طرف سے تشویش زدہ سا کر دیا تھا۔

وہ سارا دن میرا سولی پہ گزرا اگلے دن مجھے پھر راجا دلاور کے سامنے پیش کیا گیا، اس وقت اس نے انسانیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے میرے ساتھ خلاف توقع نارمل انداز میں گفتگو کی اور ساتھ ہی یہ سمجھانا چاہا کہ میں ان لینڈ مافیاز کے راستے سے ہٹ جاؤں اور لاری اڈے کی زمین خالی کر دوں۔ دوسری اس کی شرط یہ تھی کہ میں منشی دادن کا قتل اپنے سر لے لوں، اس ضمن میں اس حرام خور نے مجھ سے یہی کہا کہ وہ اسے قتل عمد کی بجائے قتل اشتعال کا رنگ دیتے ہوئے کم سے کم سزا دلوا کر آزاد کر دیا جائے گا۔

میں جانتا تھا کہ یہ آئیل مجھے مار والی بات ہوتی۔ صاف مطلب تھا کہ اس طرح کے خود ساختہ بیان پر دستخط کرنا خود اپنا "ڈیتھ وارنٹ" جاری کرنے کے مترادف ہوتا۔

میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ خبیث گندی دھمکیوں پر اتر آیا۔

"مت بھولو کہ تمہاری ایک جوان اور خوب صورت بہن بھی ہے۔" اس کی بات پر میرا خون کھولنے لگا، میں نے اپنے غیرت جوش کو دباتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کی اللہ حفاظت کرے گا۔"

"تو تم نہیں مانو گے؟" اس کے بولنے کے انداز میں تہدید چھپی ہوئی تھی۔

میں نے ذرا مصلحت اندیشی سے کہا۔ "منشی دادن کا مرڈر کیس عارف مچھندر کی ہلاکت کے بعد کمزور پڑ چکا ہے، اس سے تمہیں اب کیا ڈر ہے؟ رہی بات لاری اڈے کی زمین خالی کرنا تو یہ ایک سرکاری ملکیت ہے، جس کا عوامی مفاد میں حاصل کیا گیا مختار نامہ میرے پاس نہیں ہے۔"

میں نے دانستہ عطا محمد کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ بولا۔

"زیادہ چالاک مت بنو۔" وہ ہولے سے غرایا۔ "اڈے کی منتقلی کی آڑ میں اس زمین کو خالی کرانے میں دو تہائی کامیابی حاصل ہونے لگی تھی لیکن تم نے اس کی شدید مخالفت کی تھی بلکہ اچھا خاصا کھڑاگ بھی کیا تھا۔ جس کے باعث یہ معاملہ دب گیا۔ تم شاید سمجھتے ہو کہ اس زمین کو حاصل کرنے میں صرف ایک سیٹھ ستار ہے، ہرگز نہیں، سیٹھ ستار تو خود ایک مہرہ ہے اگرچہ اس میں اس کا اپنا مفاد بھی ہے مگر شکر کرو کہ ابھی اس نے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ اصل مگرمچھ ابھی تمہارے مقابلے میں نہیں آیا ورنہ تو تم

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

اپنے خاندان سمیت کب کے ختم ہو چکے ہوتے۔"

"اصل مگر مچھ کون ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ میرے یوں استفسار پر اس کے کرخت چہرے پہ ایک تند سی لہر اُمڈی اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

"اس خطرناک شخص کا نام بھی مت لو، شکر کرو کہ ابھی اُسے ہم نے تمہارے بارے میں بتایا نہیں ہے کہ کون ہمارے کام کے بیچ روڑے اٹکا رہا ہے ورنہ تو پہلے ہی دن تمہارا بندوبست کر چکا ہوتا۔ یہ تو سیٹھ ستار کی مہربانی ہے تم پر کہ وہ خود ہی تمہارے ساتھ ایک ڈیل کر کے اس مسئلے کو نمٹانا چاہتا ہے۔" اس کی منافقانہ بات پر میرا اندر ہنسنے کو جی چاہا تھا کہ یہ مجھے کتنا بے وقوف سمجھے ہوئے تھے۔ میں خاموش ہو رہا۔

"کیا کہتے ہو پھر؟ کر رہے ہو اس بیان پر اپنے دستخط؟" اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک ٹائپ شدہ اسٹیمپ نکال لیا تھا وہی مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سوچ لو..... اگلی پیشی میں تو تم پر فرد جرم عائد ہونے ہی والی ہے۔" وہ مجھے خوف زدہ کرنے کے انداز میں بولا۔ "پھانسی نہیں تو عمر قید تو ضرور ہو گی ہی، یہ بھی نہیں تو آٹھ دس سال کی قید تو ضرور ہو گی۔ پورا مافیا گروپ اس وقت تمہارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ سوچو! دس سال کی قید بھی تمہارے لیے معمولی بات نہیں ہو گی اور یہ مت سمجھنا کہ وہ پھر بھی تمہیں چھوڑ دیں گے، تمہارا چھوٹا بھائی، بہن!"

"انسپکٹر.....! اب بس!" میں نے درمیان میں سرد و سپاٹ آواز میں کہا۔ اس چلتی ہوئی زبان کو ایک دم بریک لگ گئے۔ وہ بڑی خونخوار نظروں سے مجھے گھورنے لگا۔

وہ دن بھی گزر گیا۔

یہ اسی روز کا ذکر تھا۔ میں لاک اپ میں سلاخ دار دروازے کے قریب ہی بیٹھا، خلاؤں میں گھور رہا تھا کہ اچانک مجھے کچھ ہلکے شور کی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی زور زور سے باتیں کر رہا ہو۔ میں تھوڑا چونکا۔ بولنے کی یہ آوازیں اسی راہداری کی طرف سے آ رہی تھیں جہاں ہیڈ محرر اور ایس ایچ او کے کمرے تھے۔ مجھے ایک نسوانی آواز کے ساتھ مردانہ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں، مردانہ آواز مقابلتاً اُونچی ہونے کے باعث مجھے اس کے آہنگ سے ہی اندازہ ہوا کہ یہ آواز راجا دلاور ہی کی تھی، نسوانی آواز میں نہیں پہچان پایا، پھر خاموشی سی چھا گئی۔ میں چہرہ موڑے دیوار سے پشت اور سر اپنا ٹکائے بیٹھ گیا۔ چند ہی سیکنڈ گزرے تھے کہ سلاخوں پر سنتری نے ڈنڈا مار کے مجھے چونکا دیا۔

"چل اُٹھ! تیری ملاقات آئی ہے۔" سنتری کی کھرکھراتی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی اور میں نے چونک کر سلاخ دار دروازے کی طرف گردن موڑی۔ سامنے زنیرہ کھڑی تھی، یوں کہ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور سانس بھی پھولی ہوئی تھی۔

میں اُسے دیکھ کر ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیسے ہو تم نومی؟" وہ اپنی تیز تیز چلتی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"میں ویسا ہی ہوں جیسا دیکھ رہی ہو لیکن حالات مجھے کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے ہیں۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔ "شاید تمہارا مشورہ مان کر میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو نومی؟" وہ قدرے دکھ سے بولی۔ "کیا تم نہیں جانتے کہ میں تمہاری خاطر جو کچھ کر رہی ہوں صرف فیس کی خاطر کر رہی ہوں؟ نہیں نومی! میں تمہیں ان ساری مصیبتوں سے نکالنا چاہتی ہوں، جو نا کردہ ہیں۔ تمہیں اس میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھنسایا جا رہا ہے، بالکل اسی طرح جیسے تمہارے باپ کو پھنسایا گیا تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں سسکی اتر آئی تھی۔

میں نے بہ غور اس کا چہرہ دیکھا، ایک دلآویز سی شگفتگی لیے ہوئے اس کا چہرہ دکھ اور کرب کی عجیب غمازی کرتا محسوس ہوا مجھے۔ اس کی کشادہ آنکھوں میں تیرتی نمی کی جھلملاہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ میرے دکھ کو اپنا دکھ سمجھے ہوئے تھی، اس میں ہمدردی کے شائبے سے زیادہ کسی اور جذبے کی تمازت چمکتی محسوس ہوتی تھی۔

"اس کے لیے میں تمہارا مشکور رہوں گا۔" میں نے ہولے سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ تمہیں ایک انسانی ہمدردی کے ناطے نے میرے کیس میں ذاتی دلچسپی لینے پر مجبور کر رکھا ہے۔"

"صرف انسانی ہمدردی؟" اس نے ہولے سے کہا۔ مجھے اس کی آواز دور سے آتی سنائی دی۔ میں نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا، مجھے یوں لگا جیسے اس کے لبوں سے بے اختیاری میں یہ جملہ پھسلا تھا، جسے فوراً چھپانے کی غرض سے شاید اس نے مقصد کی بات کی طرف

WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

آتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ خبیث انسپکٹر تم سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میں نے بھی اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے ہیں یہ بتا کر کہ میں تمہارا کیس جوڈیشل کورٹ سے ہائی کورٹ ٹرانسفر کروانے میں کامیاب ہو چکی ہوں اگر اب بھی مجھے وہاں تمہارے کیس کے سلسلے میں تحفظات ہوئے تو سپریم کورٹ کا دروازہ کھٹ کھٹانے کا بھی راستہ میں نے ڈھونڈ رکھا ہے، دیکھنا اب تم نومی اسب سے پہلے اس کی وردی اترے گی اور یہ سیدھا جائے گا جیل۔''

میں اس کی بات پر ٹھٹکا اور کچھ سوچ کر میری پیشانی پر سلوٹوں کا جال سا بن گیا۔ بولا۔

''ہوسکتا ہے یہ خبر میرے لیے سعد ٹھہرے لیکن تمہیں اس خبیث دلاور کے منہ نہیں لگنا چاہیے تھا، اسے یہ سب نہیں بتانا چاہیے تھا، مجھے ڈر ہے کہیں میرے دشمنوں کی توپوں کا رخ تمہاری طرف نہ ہو جائے۔''

''میری فکر چھوڑو تم ہم وکیل لوگ ایسے حالات سے گزرتے رہتے ہیں اور ان سے نبرد آزما ہونا بھی جانتے ہیں۔'' وہ بولی۔ بس! تم بے حوصلہ مت ہونا، اب دوبارہ ایسی بات اپنے منہ سے مت نکالنا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھ سے کہی تھی۔ اوکے؟''

آخر میں وہ بڑی گہری نگاہوں سے میرے اترے اترے چہرے کو تکتے ہوئے بولی۔ میں نے اس کے لبوں پہ ایک نامعلوم سے احساس کی تمازت کو پگھلتے محسوس کیا اور ہولے سے صرف اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔ اسی وقت سنتری نے ملاقات کا وقت ختم ہونے کا اعلان کر ڈالا۔

''اچھا! اب میں چلتی ہوں، میں تمہیں یہی بتانے آئی تھی تاکہ تم مزید حوصلہ پکڑو، اب میں چلتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مجھ سے رخصت ہوگئی۔

میں اپنی جگہ پر واپس آکر بیٹھ گیا۔ ایڈووکیٹ زنیرہ کی باتوں سے مجھے کچھ اُمید تو ہوئی تھی کہ وہ اپنے طور پر میری رہائی اور اس کیس سے چھٹکارا دلانے کے لیے اپنی سی پوری کاوشوں میں لگی ہوئی تھی لیکن مجھے اس کا آج راجا دلاور کے ساتھ یوں منہ ماری کرنا مناسب نہیں لگا تھا، میرے ایک محتاط روخیال کے مطابق زنیرہ نے مجھے جس اُمید افزا خبر سے آگاہ کیا تھا وہ اسے کم از کم اس خبیث تھانے دار راجا دلاور کو نہیں بتانا چاہیے تھی کیونکہ وہ میرے دشمنوں کا زرخرید ہی نہیں ٹاؤٹ بھی تھا۔ وہ اس کی پشت پناہی کرتے تھے اور وہ ان کے وسیع تر مفادات کے لیے کام کرتا تھا۔ یہ خبر وہ پیشگی طور پر میرے دشمنوں تک پہنچا سکتا تھا۔

مجھے اب زنیرہ کی جانب سے بے چینی ہونے لگی تھی۔ میرے ساتھ ہمدردی میں یا کسی اور جذبے کے نتیجے میں اگر خدانخواستہ اُسے کچھ ہو جاتا تو یہ میرے ضمیر پر ایک پہاڑ جیسا بوجھ کے مترادف ہوتا۔

اسی وقت مجھے بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی اور ساتھ ہی قریب کھڑے سنتری کے سیلوٹ جھاڑنے کی ٹھکا ٹھک ابھری۔ میں نے گردن ذرا گھما کر دیکھا۔ وہی خبیث سلاخ دار دروازے کے ساتھ کھڑا مجھے گھور رہا تھا، اس کے ایک ہاتھ میں موٹا سیاہ رول تھا، جسے وہ ہولے ہولے اپنی سلاخوں پر بجاتے ہوئے مجھ سے بولا۔

''یہ کالے کوٹ والی عورت تمہیں جو خوش خبری سنانے آئی تھی، بڑی خطرناک قسم کی خوش فہمی میں مبتلا ہے، ضرور تمہارا دماغ بھی خراب کر گئی ہوگی۔''

میں چپ رہا۔ اس نے موٹا سیاہ رول سلاخوں کے اندر کر کے ہولے سے میرے کاندھے کو تھپتھپاتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''تم اپنی خاطر جمع رکھنا اور کل تک سوچ کر مجھے بتا دینا تاکہ ہم کچھ اور بندوبست کر سکیں، کیوں کہ تمہارے پاس تو ہماری بات ماننے کے سوا اور دوسرا راستہ نہیں ہے لیکن ہمارے پاس بہت سے راستے ہوتے ہیں، ایک نہیں تو دوسرا سہی، دوسرا نہیں تو تیسرا..... سمجھ گئے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پُرغرور انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگا کر واپس پلٹ گیا۔

وہ رات بھی میں نے لاک اپ میں گزار دی۔

اگلے دن سلاخ دار دروازے سے کسی نے آج کا تازہ اخبار اندر پھینکا۔ میں چونکا۔ ساتھ ہی ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''یہ آج کا تازہ اخبار ہے، صاحب نے بھیجا ہے، پڑھ لو، اس میں تمہارے لیے ایک اہم خبر ہے۔'' یہ سنتری تھا، کہہ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

میں نے اپنے قریب فرش پر پڑے اخبار کو اٹھایا۔ پہلے ہی صفحے پر ایک چیختی چلاتی خبر جلی حروف میں چھپی ہوئی تھی۔

''ایڈووکیٹ زنیرہ کل رات کار کے حادثے میں.....''

میں سکتے کے عالم میں آگے خبر پڑھتا چلا گیا۔

(جاری ہے)

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

بیت بازی

قارئین

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

عرفان حسین زیدی..........رانی پور

یہ لگتا تھا کہ جیسے میر محفل پیر رومی ہیں
کہ ہیں اقبال ان کے ہم نشیں کل شب جہاں میں تھا

(احسان علی کا جواب)

موموا قبال..........سیالکوٹ

وہ سلسلے تھے جو تعبیر کے اور خواب کے
چھوڑ گئے ہیں دن رات کے فاصلے

(فخر عالم راولپنڈی کا جواب)

نزاہت افشاں..........مہورہ فتح جنگ

اگر شعور نہ ہو تو بہشت ہے دنیا
بڑے عذاب میں گزری ہے آگہی کے ساتھ

(عبدالحکیم شر کراچی کا جواب)

اظہر الدین صدیقی..........حیدرآباد

یہ زندگی یہ زیست کا فانوسِ ہفت رنگ
اہلِ نظر کے واسطے اک عالمِ خیال

(ڈاکٹر روبی انصاری کا جواب)

سعید احمد چاند..........کراچی

اب کے برس بھی لکھا میں نے اس کے نام دیباچہ
میرے ذکر سے خالی رکھے جس نے اپنے باب تمام

(نشی عزیز مے وہاڑی کا جواب)

ارشاد حسن..........لاہور

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فراز تم کو نہ آئیں محبتیں کرنی

(بشیر حسن ساجد سرگودھا کا جواب)

طٰہٰ یاسین..........حیدرآباد

روز روتے ہوئے کہتی ہے زندگی مجھ سے
صرف اک شخص کی خاطر مجھے برباد نہ کر

(محمد خالد زوب کا جواب)

ہادیہ ایمان ہاہا ایمان..........فورٹ عباس

میں ڈھونڈتا ہوا آیا ہوں زندگی اپنی
میں تم سے شوق ملاقات میں نہیں آیا

(نزاہت افشاں فتح جنگ کا جواب)

سدرہ بانو ناگوری..........کراچی

میری فطرت میرا ملک میری منشا بھی ہے
آدمی جتنے بھی ہیں انسان بن جائیں سبھی

ملک فیصل..........لاہور

مجھ کو پردیس لیے پھرتی ہے روزی واصف
اپنے بچوں سے بہت دور بہت دور ہوں میں

عنایت مسیح..........کراچی

میری آنکھیں رات دن بس اس کی جانب ہیں شفیق
ان خلاؤں سے پرے وہ کون ہے ٹھہرا ہوا

(احمد جاوید ملتان کا جواب)

نزاہت افشاں..........فتح جنگ

اس نے قصداً بھی میرے نالے کو
نہ سنا ہو گا گر سنا ہو گا

(کاوش محمود کا جواب)

عبدالجبار رومی..........لاہور

اب تو چڑھتے سورج کے پجاری ہیں سبھی
بچھڑے تو مڑ کر بھی نہیں دیکھتے

(مجی رحمٰن برٹ لیٹ امریکا کا جواب)

نغمہ سراج..........منڈی بہاؤالدین

یہ سرخ سرخ سی آنکھیں جو دیکھتے ہو عزیز
جگر کا خون ہے یہ بادۂ شراب نہیں

وحید جہاں..........کراچی

یہ فتویٰ حکیم ہم نے لکھوایا ہے مجنوں سے
جو لوگ محبت کے منکر ہیں وہ کافر ہیں

URDU SOFT BOOKS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS

افتخار الدین .... سرگودھا
یہ کیسی سوچ ہے کیسا عمل ہے
خطا کر کے سزا سے لڑ رہا ہوں

عارفہ شیخ .... چنیوٹ
یہ درد ہمارے دل کا تھا یہ داغ جگر کے اپنے تھے
کس واسطے آس ہجر بھر کے یہ اوروں کو دکھلاتے ہم
(نزاہت الشال، فتح جھنگ کا جواب)

محمد حسن عثمانی .... جھنگ
میں ایک مدت سے ضبط کے پل صراط پر ہوں
کہ میری آنکھوں میں کوئی ساگر الٹ رہا ہے

شمیم الدین خیال .... لاہور
مرے ہونٹوں پہ ہے اک اسم اعظم
سو میں نے جو بھی سوچا ہو گیا ہے

شبنم رحمانی .... شادی وال
میرا ہر اک شعر صحیفہ لگتا ہے
مجھ پر فکر کے ہوئے ہیں الہام کئی

اختر عباس .... سرگودھا
موقع ملا تو میرے ہی بچوں کو کھا گیا
رکھا عزیز جس کو میں نے اپنی جان سے زیادہ
(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

عبدالستار .... ساہیوال
رسم و دستور ہمیشہ سے یہی ہے نصرت
عیب گنتے ہیں زمانے میں ہنر سے پہلے
(سیف اللہ ملک وال کا جواب)

امین الدین سیف .... سرگودھا
یادوں میں تیری ڈوبا رہتا ہے دل
ہر سو پکار ہے تو آجانا اب

غضنفر عباس مرزا .... اسلام آباد
یہ سب تکلفات ہیں ان کی طرف نظر نہ کر
اپنی خدا غزل سنا تعزیت جگر نہ کر

انور حبیب .... کوئٹہ
یوں بے خودی شوق میں حد سے گزر گئے
ہم بے خبر رہے وہ سینے سے گزر گئے

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

محمد توفیق .... کراچی
یہ نہیں کہ تیرے فراق میں، میں اجڑ گیا یا بکھر گیا
ہاں محبتوں پہ جو مان تھا وہ نہیں رہا میرے گمشدہ

محمد احسن جاوید .... ڈیرہ غازی خان
تیرے وصل کی ہے آرزو اپنی الفت کی انتہا
تیرے ہجر کا تصور ہے ناکامیوں کی ابتداء
(سید محمد حسین شاہ حیدر آباد کا جواب)

عبدالجبار رومی .... لاہور
یہاں روز نکلتا ہے سہانا سورج
بارہا کیا ہے میں نے نظارہ صبح کا
(نازش فاطمہ خانپور کا جواب)

رضا احمد اعوان .... دریا خان بھکر
ناموں کا اک ہجوم سہی میرے آس پاس
دل سن کے ایک نام دھڑکتا ضرور ہے
(ہادیہ ایمان ماہا ایمان ڈاہرانوالہ کا جواب)

نعیم غوری .... ننکانہ صاحب
اک کسیں آنکھ نے کچھ زخم دیے تھے مجھ کو
اب کوئی آنکھ ملاتا ہے تو دل روتا ہے

انور حسین .... کمالیہ
الفت میں تیری ہو گئے مدہوش اس قدر
خود اپنی ذات ہی کو تماشا بنا لیا

ماہ نور تبسم .... ملتان
اے جان کی اُمید پر زندہ ہوں ابھی تک
اک دن شب ظلمت کی سحر ہو کے رہے گی

عابدہ علی .... واہ کینٹ
اپنی تو عادت ہے، یہ بری ہے کہ بھلی ہے
ہنستے ہوئے ہر بات زمانے کی سہی ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ درپانت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 جون 2017ء تک علمی آزمائش 138 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

ثمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)

99

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش-138

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک گمی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 جون 2017ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

خالد جہانگیر خان نے انڈین ٹیم کے رکن کی حیثیت سے 1932ء میں انگلستان کے خلاف ٹیسٹ میچ کھیلا۔ دو خالہ زاد جاوید برکی اور ماجد خان نے ٹیسٹ میچوں میں پاکستانی ٹیم کی قیادت کی۔ بچپن ولز کپن لاہور میں گزرا۔ وہیں ایک قریبی عزیز جاوید زمان خان نے اسے ابتدائی سطح پر کرکٹ کی تربیت دی۔ 1974ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی کرکٹ ٹیم کی قیادت کی۔ پہلی ٹیسٹ سیریز 81-1980ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف لاہور میں بنائی۔ 1982ء میں انگلینڈ کے دورے کے لیے پاکستانی ٹیم کی قیادت کی اور لارڈز کے مقام پر انگلینڈ کو تاریخی شکست دی، محسن حسن خان کا ان کے بارے میں کہنا تھا۔ "وہ بہت اچھا کھلاڑی اور اچھا کپتان ہے۔ آج تک وہ بلاوجہ کسی سیاست میں نہیں الجھا۔" مگر آج کل وہ سیاست میں اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

علمی آزمائش 136 کا جواب

جگر مرادآبادی 1893ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ اردو کے شعراء میں ایک بڑا نام ہے۔ غزل گوئی کی وجہ سے ان کا مقام بہت بڑا مانا جاتا ہے۔ 9 ستمبر 1960ء کو گونڈہ میں انتقال ہوا۔

انعام یافتگان

1-احسان خان (کوئٹہ) 2-ذیشان افضل (ملتان) 3-نوید حبیب (کراچی)
4-فیض الحسن (کراچی) 5-روحی بانو (سکھر)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔
کراچی سے قمر زمان قمر، جہانزیب احسن، شاہین اجمل، جاوید احمد، ابریز احمد، جبران صدیقی، سلطان فتح، ملائکہ

URDU SOFT BOOKS
DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS
WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

ادریس، احسان گل، عارف جاں، احمد رشید، صائمہ بلوچ، حریم فاطمہ، مدثر حسن خان، ادریس خان، وحید حسن، اشفاق حسن۔ لاہور سے بلقیس بٹ، بتول جعفری، بینش صدیق بھٹی، زرین سلمان، مجید آفریدی، شہباز خان، مدثر ملک، ریاض الحسن، نازش سیال، ہادی گجر، کمال حسن، محمد انور، خواجہ صدیق، محمد احسن، کامران احمد، خالد ملک، زرین مجید، رمضان علی، ریاض پاشا، آصف بٹ، شاہ انور۔ پنڈی سے انور خان، حمید الحق، نقش ملتانی، طلعت امتیاز، اظہر الدین خان، نسیم اسلم صدیقی۔ اسلام آباد سے شاہد ایاز، اسلم ملک، شفیق حسن، صداقت علی، غزالہ محسن، شاکر علی، انور بلوچ، جمیل احمد، توفیق بچہ، حنیف علی محمد، طارق خان، چراغ حسن، امجد علی، جمیل نوری۔ حیدرآباد سے ندیم حسن، عبید الرحمن، عبدالجبار، عنایت انصاری، جنید حسن، عثمان فصیح الدین، جمیل احمد، عطاءاللہ انصاری، حنیف شاہ، محمد اقبال حسن، عرضی خان اچکزئی۔ سیالکوٹ سے عباس احمد صدیقی، نسرین ایاز، سوموزند، جاوید احمد، انعام الحسن، آصف محمد شاہ، اقبال علی، نعیم الدین، خواجہ جاوید، محمد خان، وزیر علی پاشا۔ پشاور سے مختار احمد، شاہ علی، نعیم شاہ بخاری، عنایت گجر، نیاز شاہ نوازش، حسین طوری۔ کوئٹہ سے اشرف محمد خان، نیاز احسن، فرقان، احمد ممتاز، عمیر احمد، محمد دانش، افتخار خان۔ ملتان سے محمد امین چشتی، رضیہ سلطان، وسیم علی احمد، فرحان سرور، شیخ فرید، ظفر احمد، اقبال علی۔ رحیم یار خان سے آصف ملک، ماہ زیب، ایاز احمد، آصف ملک، ماہین فاطمہ، شرمین فاطمہ، ماہ نور، عنایت ایاز احمد، شاہین احمد۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے ظہور احمد، بتول جعفری، اشفاق احمد، حریم، داؤد حسن۔ سرگودھا سے نسیم حیات، صاحب جان، جاوید ملک، عنایت بٹ، رملا فاروقی۔ حسن ابدال سے یاسین اشرف، نینا اشرف۔ بلل ہزارہ سے دانش صدیقی، نسیم جنت شمیم۔ فورٹ عباس سے افتخار، سید محمد علی۔ اوکاڑہ سے زرفشاں حیات۔ میرپور اے کے سے شاہ بھٹ، فیروز لیاقت۔ اٹک سے شہباز الحسن۔ چکوال سے مدثر علی، کوکب جمال۔ میرپورخاص سے انور کمال جہاں آرا — وہاڑی سے ریاض منور شاہ۔ سکھر سے کامران احمد، عبدالغنی، خالد کنور۔ کوٹ ادو سے عباس خان، نظیر انصاری۔ بہاولپور سے صادق صدیق، بلقیس اختر۔ بہاولنگر سے محمد توفیق، رشید انور۔ جھنگ سے شازیہ ممتاز، رفیق سلطان۔ فیصل آباد سے میمونہ احمد، فیصل اختر، راجن پور سے علی زریون، افضل خان۔ گوجرانوالہ سے نعمان حسن، راحیل احمد۔ سانگھڑ سے جبران توفیق، محمد قمر، جہانزیب۔ چترال سے ثمر اختر۔ ڈیرہ غازی خان سے عنایت حسن۔ جھنگ سے عباس علی، عنایت بھٹی۔ جھنگ سے فرقان شیخ، انیس احمد جاوید، امجد بخاری، عاصم سہیل، شاہ احمد، آس محمد، خالدہ فاروقی، ادریس محمد خان۔ شادی پور سے ہارون، نیاز بٹ، واثق علی، نورین اصغر۔ تلہ گنگ سے مرزا کلیم احمد، اختر عباس، صولت حیات، اشرف علی۔ فیصل آباد سے منور سلیم، عباس علی اصفہانی، دلاور حسن۔ بدین سے عباس علی سانڈ۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ چکوال سے فرحین، عارف بٹ۔ بہاولپور سے مہناز اکرم ملک۔ بہاولپور سے کلیم بخاری، علی علی اوسط زیدی، ہارون محمد، توصیف خان، ملک اختر عباس، الیاس حسن، عباس حیدر، جمیل خان، زاہد علی، طٰہٰ حسن، الیاس اختر بٹ، صدیق حسن صدیقی، ظفر احمد ظفر۔ پشاور سے سردار سوہن سنگھ، ارباب محمد، فتح الحق، زریاب اچکزئی، نادر خان، امیر حسن، ساجد فرحت، نادر حسن زئی، باقر رضی طوری بنگش، ناہید سلطانہ، انور حسن خان، انعم ممتاز، ذیشان فرحت اللہ، داروغہ خان۔ ساہیوال سے توصیف خان، حسن اختر، کمال الدین، ضیاء الاسلام۔ میرپور اے کے کاظم علی بھٹو۔ قصور سے صدیق بھٹی، اشرف بٹ، عبدالخالق، نیاز حسین سید۔ خان بیلہ سے عنایت علی، یاسین فراز۔ سید محمد عرفان جعفری، شگفتہ، مشتاق، حبیب الرحمن عبدالرشید۔ لاہور سے خاقان صدیقی، عباس بٹ عرف چھوٹا پہلوان، ظفر الحسین، فیضان بٹ، اسرار علی خان، انعام افضل، وسیم انصاری، نیاز فیضانی، حق فرید پراچہ، زاہد علی سید، نعمان خان، مغیث الدین، ارباب افضل رسول بخش، احمد پہلوان، اشرف علی ترمذی، نذر نیازی، ماہا خان، انیس احمد گل، رحمت اللہ خان، نوید شہباز، اشرف خان، محمد فیض بخش صدیقی، بتول زیدی۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، احمد شیراز، ظفر خانزادہ، سرفراز بٹ، وسیع الدین ہمدانی، احمد نیاز، عقیب الدین، عابد الدین، گل فراز میمن، ناہید عابد فرحت بانو، ملک ارشد، عبدالوحید، نوشاد گجر، محمد حسین، سلمان نیازی، مسرت بٹ، نصیر نقوی، نعمان کلیم، عاجز ضیا عابدی، یاسین خان، اشرف اللہ، سبطین ظفر، بدر ہٹی، خاقان اچکزئی، ظہیر باری، عنبرین پلیجو، ضیا پلیجو، آفتاب بٹ، عنایت جعفری سید، مرزا دلدار حسین، کائنات سید، قیام حسین، گل بدین، نذر حسین عابدی، طفیل آفاق، اشرف علی، عثمان عثمانی، بدر علی ادریس، احسن ہارون، باسط علی۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین۔

URDU SOFT BOOKS DOWNLOAD URDU PDF BOOKS AND ALL MONTHLY DIGESTS WWW.URDUSOFTBOOKS.COM

خود اعتمادی

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

انسان میں اگر خود اعتمادی ہو تو وہ اپنی راہ کی ہر رکاوٹ کو ٹھوکروں میں رکھ سکتا ہے۔ اس کی زندہ مثال میں خود ہوں۔ میں نے کس طرح حالات کا رخ موڑا اسے آپ بھی ملاحظہ کریں۔ میری زندگی تباہی کے قریب پہنچ چکی تھی لیکن میں نے خود اعتمادی کی بدولت بکھرتی ہوئی زندگی کو سنبھال لیا۔ ایسا کس طرح ممکن ہوا یہ میں نے بیان کردیا ہے تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔

سعدیہ علی

(لاہور)

میں بیاہ کر سسرال آئی تو مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ شوہر کا تو کہنا کیا، وہ پہلی رات ہی مجھ پر لٹو ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ ساس، سسر، نندیں اور دیور سب ہی مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے۔ ایک مہینا تک تو ساس نے مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیا۔ وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ مل کر سارے کام نمٹا لیتی تھیں۔ یہ سب کچھ مجھے بہت عجیب سا لگتا کیونکہ مجھے اپنے گھر میں کام کرنے کی عادت تھی اور میں یونیورسٹی سے آنے کے بعد گھر کے کاموں میں امی کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ شادی کے بعد بھی میں نے اپنی عادت کے مطابق کام کرنا چاہا لیکن ساس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ کام کرنے کے لیے ساری عمر پڑی ہوئی ہے۔ یہ تمہارے گھومنے پھرنے کے دن ہیں، نئی دلہن کام کرتے ہوئے اچھی نہیں لگتی۔

ایک طرح سے یہ اچھا ہی تھا کیونکہ میں اور علی روزانہ شام کو کہیں نہ کہیں گھومنے چلے جاتے۔ شروع کے دو ہفتے دعوتوں کی نذر ہو گئے۔ آئے دن میکے اور سسرال میں کہیں نہ کہیں کوئی دعوت ہوتی اور ان دعوتوں میں عموماً گھر کے تمام افراد کو مدعو کیا جاتا تھا۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ میرے ایک ماموں نے صرف مجھے اور علی کو دعوت پر بلایا جس پر ہماری ساس کا موڈ بگڑ گیا۔ انہوں نے اسے اپنی توہین سمجھا اور باتوں باتوں میں مجھے بہت کچھ سنا دیا۔ اس واقعے سے مجھے ان کی ذہنیت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ہر معاملے میں انہیں اہمیت دی جائے، اپنی اہمیت جتانے کے لیے ہی انہوں نے اب گھریلو کام کی ذمے داری مجھ پر ڈالنا شروع کر دی تھی۔ یہ پہلا سبق تھا جو مجھے سسرال میں سیکھنے کو ملا۔

اس کے علاوہ میں نے ایک اور بات نوٹ کی کہ جب بھی میں اور علی کہیں گھومنے پھرنے جاتے تو میری ساس کا موڈ بگڑ جاتا اور وہ منہ لپیٹ کر لیٹ جاتیں۔ غالباً وہ یہ چاہتی تھیں کہ ہم پورے گھر کو ساتھ لے کر جائیں جو عملاً ممکن نہ تھا۔ مثلاً شادی کے کچھ دنوں بعد ہی علی کے کچھ دوستوں نے ایک گیٹ ٹوگیدر پارٹی کا اہتمام کیا جس میں ان سب کی بیگمات نے شرکت کی۔ میں اور علی اس پارٹی میں چلے تو گئے لیکن میرا وہاں بالکل دل نہ لگا کیونکہ جانتی تھی کہ واپسی پر کس ردِعمل کا سامنا کرنا ہوگا اور بالکل ایسا ہی ہوا۔ ہماری واپسی رات گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ اس وقت عموماً گھر کے سب افراد جاگ رہے ہوتے تھے لیکن اس روز سناٹا چھایا ہوا تھا اور سب لوگ اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ ہم دونوں میاں بیوی کا یہ معمول تھا کہ گھر واپس آنے پر ساس صاحبہ کو سلام ضرور کرتے تھے۔ جب علی نے ان کے کمرے میں جھانکا تو وہ منہ لپیٹے لیٹی ہوئی تھیں۔ علی نے انہیں آواز دی تو انہوں نے کروٹ دوسری جانب کر لی۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ وہ علی سے بات کرنا نہیں چاہتیں چنانچہ ہم دونوں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلے آئے لیکن میرے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ چنانچہ میں نے علی سے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امی کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب بھی ہم لوگ باہر جاتے ہیں ان کا موڈ بگڑ جاتا ہے۔ کیا وہ یہ چاہتی ہیں کہ میں تمہارے ساتھ باہر نہ جاؤں اور گھر میں پڑی سڑتی رہوں۔''

''ان کے اس رویے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔'' علی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میری شادی

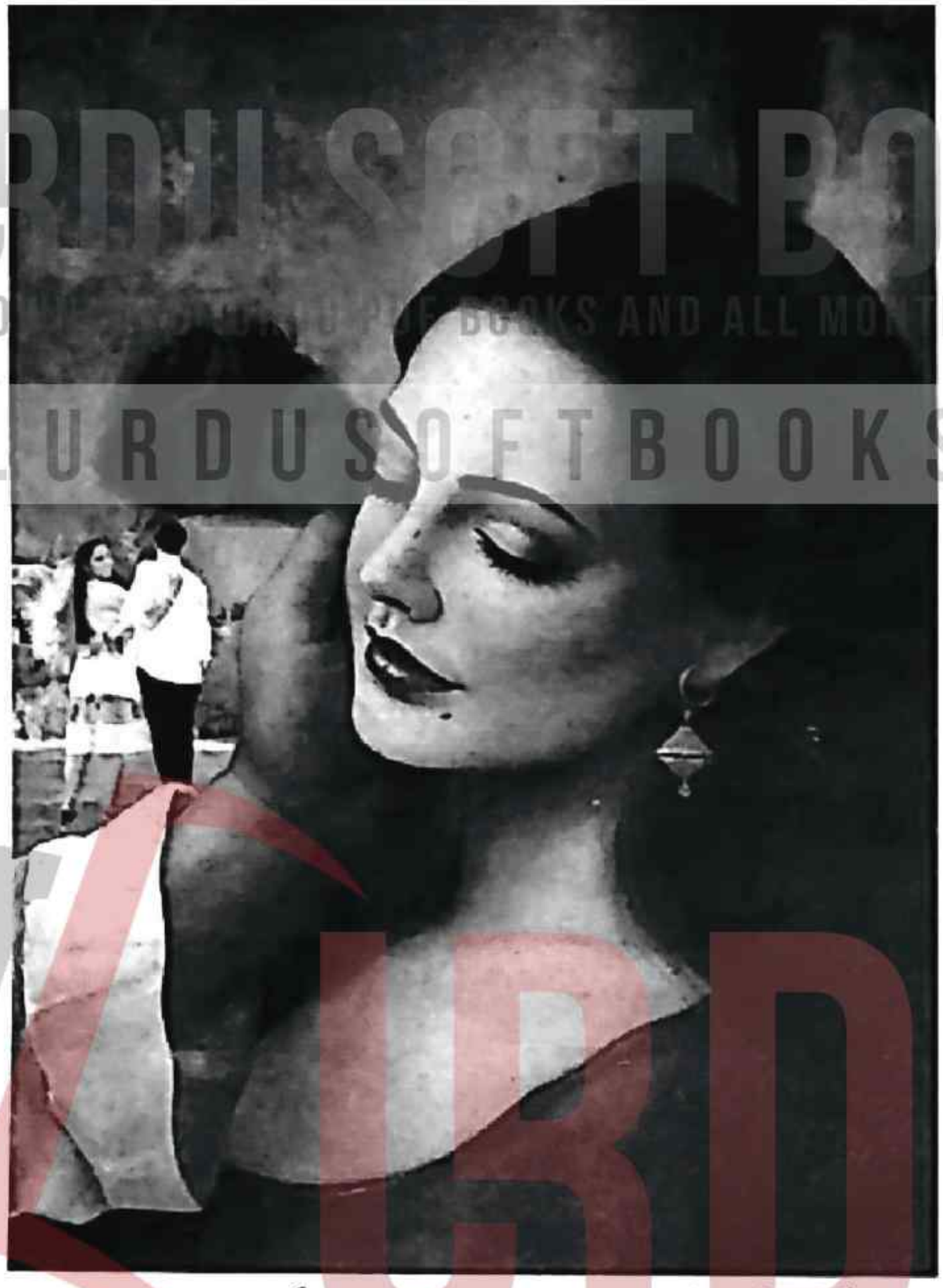

آپ سے ہوئی ہے، پورے گھر سے نہیں۔ ٹھیک ہے وہ میری بزرگ ہیں، ان کا ادب و احترام مجھ پر واجب ہے لیکن یہ بے جا پابندیاں مجھے قبول نہیں۔"

"ٹھیک ہے جو تمہارا دل چاہے کرو۔ میں اس معاملے میں کچھ نہیں کرسکتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی یہی چاہتے ہیں۔"

"یہ میں نے کب کہا؟" وہ جلدی سے بولے۔ "لیکن ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ انہیں شکایت کا کم سے کم موقع ملے۔"

"آپ نے وہی بات دوسرے پیرائے میں کہہ دی۔" میں نے تڑخ کر کہا۔ "ٹھیک ہے۔ اب میں بھی کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ کہیں گے تب بھی نہیں۔"

"سعدیہ! تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو۔ ضروری نہیں کہ امی کا موڈ اسی بات پر خراب ہوا ہو۔ کوئی اور وجہ بھی ہوسکتی ہے۔" اس بار علی کا لہجہ قدرے تلخ تھا۔

میں سمجھ گئی کہ وہ اپنی ماں کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتے۔ اس لیے میں نے بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ یہ تو مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ اپنے بھائی بہنوں بلکہ خاندان کے کسی بھی فرد کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس گھر میں میری حیثیت ایک نوکرانی سے زیادہ نہیں بلکہ نوکرانی بھی اپنے کام کا معاوضہ لیتی اور ہفتے میں ایک دن چھٹی کرتی ہے، جب کہ میں چوبیس گھنٹے کی ملازمہ تھی اور مجھے بمشکل پانچ چھ گھنٹے سونے کے لیے ملتے تھے۔ ورنہ سارا دن گھر کے کاموں اور شوہر کی ناز برداری میں لگ جاتی تھی۔ پہلی تاریخ کو علی جیب خرچ کے نام پر کچھ روپے مجھے دے دیا کرتے تھے ورنہ میں اپنی ہر ضرورت کے لیے ان کی محتاج تھی۔

بہت جلدی ساس کا اصل روپ میرے سامنے آگیا۔ انہوں نے آہستہ آہستہ گھر کا سارا کام مجھ پر ڈال دیا اور خود دن بھر ٹی وی دیکھتیں، اخبار پڑھا کرتیں یا ٹیلی فون پر اپنے رشتے داروں یا ملنے جلنے والیوں سے گپ شپ کیا